

1

دیوی



طاہر جاوید مغل

دیوی..... شانی اور رستم کے متضاد جذبیوں کی کہانی..... ان میں سے ایک شبنم ہے اور ایک شعلہ..... ایک شیشہ ہے اور ایک پتھر.....

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

دیوی

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

طاہر جاوید مغل

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

علی میاں پہلی کیشنز

20- عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

فون: 042-37247414

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

نوٹ:

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف (طاہر جاوید مغل) اور پبلشرز

(علی میاں پہلی کیشنز) محفوظ ہیں۔ ادارہ علی میاں پہلی کیشنز نے اردو زبان اور ادب کی

ترویج کیلئے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی

اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

(اس ناول کے آخری صفحات پر ادارہ علی میاں پہلی کیشنز کی مطبوعات کی مکمل فہرست ملاحظہ کیجئے۔)

کتاب گھر کی پیشکش

پیش لفظ

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

دیوی ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے مزاج اور اپنی فطرت کے لحاظ سے انوکھی تھی۔ یہ سیدھی سادی لڑکی جب بے آسرا ہو کر روشنیوں اور رنگوں سے بھرے ہوئے ایک بہت بڑے شہر میں پہنچی تو اسے انسان کا اصل روپ دیکھنے کا موقع ملا۔ اسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے موقع شناس اور مطلب پرست ملے۔ اس نے خود کو اس تنہا ہرنی کی طرح محسوس کیا جو راستہ بھٹک کر درندوں سے بھرے ہوئے تاریک جنگل میں نکل آئی ہو، شخص پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا۔

لیکن نہیں..... ابھی دنیا میں کچھ لوگ موجود تھے جن پر اعتبار کیا جاسکتا تھا اور اسے ایک ایسا شخص ملا جو واقعی قابلِ اعتبار تھا۔ وہ اپنی فطرت میں جدا تھا۔ وہ ایک قاتل ڈاکو تھا، لیکن اس کے سینے میں ایک انسان کا دل دھڑکتا تھا۔

ان دونوں کے ملاپ نے ایک حیرت انگیز روداد کو جنم دیا۔ شانی اور رستم کی یہ روداد دو متضاد جذبوں کی کہانی بھی ہے۔ ان میں سے ایک شبنم ہے اور ایک شعلہ۔ ایک شیشہ ہے اور ایک پتھر۔ ایک کو زمانے نے ڈاکو بنایا ہے، صرف مارنا اور انتقام لینا سکھایا ہے۔ دوسرے کو اس کی فطرت نے دیوی بنایا ہے۔ وہ صرف پیار کرنا اور معاف کرنا جانتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں لیکن ایک دوسرے کے ساتھ چلنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ انہیں منہ زور محبت کی ڈور نے ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہے۔

یہ ایک نامی گرامی مجرم اور ایک اونچے خاندان کی ”چھوٹی چوہدرانی“ کا ملاپ ہے۔ وہ اپنے اپنے مزاج اور ذہن کے مطابق اپنے خوفناک مسائل سے نبھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کامیاب کون ہوتا ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کہانی پڑھ کر کریں۔

☆ ☆ ☆

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

سردیوں کا سورج تیزی سے مغرب کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ رنگ والی گاؤں میں درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ ہوا میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔ گاؤں سے چند کھیت دور با بے خدا بخش کانواں تھا۔ بیلوں کی جوڑی چکر کاٹ رہی تھی اور کھالے میں سفید چمکیلا پانی تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ گاؤں کی کچھ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر رہی تھیں۔ ان میں جھوٹی پچیاں بھی تھیں، لڑکیاں بھی اور دو چار درمیانی عمر کی عورتیں بھی۔ پاس ہی چند بچے ملیشیا کی شلوار قمیص پہنے کھیل کود میں مصروف تھے۔ شانی کو پانی نہیں بھرنا تھا، وہ بس یونہی اپنی سیٹلی سکیئر کے ساتھ کنوئیں پر چلی آئی تھی۔ شام کے وقت شانی کو حویلی سے باہر نکلنا اور کھلی ہوا میں گھومنا اچھا لگتا تھا خاص طور سے جب سکیئر ساتھ ہوتی تھی تو اسے زیادہ لطف آتا تھا۔ سکیئر اس کے بچپن کی سیٹلی تھی۔ سکیئر ایک عام کاشت کاری بیٹی تھی جب کہ شانی گاؤں کے چوہدری ارشاد کی اکلوتی دھی رانی تھی۔ دونوں کی حیثیت میں نمایاں فرق تھا مگر ان کی دوستی ہر چیز سے بالاتر تھی۔ دونوں حویلی کے اندر باہر چڑیوں کی طرح چبکتی پھرتی تھیں۔ گاؤں کی ساری گلیاں اور راستے انہیں اپنے گھر کے صحن جیسے لگتے تھے۔ گاؤں کے سب لوگ بھی تو جانے پہچانے تھے کوئی چاچا تھا، کوئی اماں، کوئی بھائی ہر بوڑھی عورت بے بے اور ہر درمیانی عمر کی عورت ماسی تھی۔

گاؤں کی فضا میں ایک گہرا اپنا پن تھا۔ اسی اپنے پن کا اعجاز تھا کہ گاؤں کی لڑکیاں گھر کی چار دیواری سے باہر بھی آزادانہ جھلیں کرتی تھیں اور ان کے ہنسی مذاق سے قرب و جوار گونجتے تھے۔ اس روز بھی کچھ ایسی ہی فضا بنی ہوئی تھی شانی نے شرارت سے صغرا کو مٹی کا ڈھیلا مارا تھا اب صغرا اور شیم پانی سے بھری ہوئی کٹوری لے کر شانی کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی نوخیز تھیں لیکن شانی کے بدن میں چستی اور چلک ان دونوں سے زیادہ تھی۔ اس نے بڑی آسانی سے انہیں دو تین چکے دیئے اور راستے کی طرف نکل آئی، سامنے سے سکیئر جھپٹی..... سکیئر سے بچنے کے لئے شانی نے تیز رفتار ہرنی کی طرح خود کو ایک دم روک کر پھر رخ پھیرا..... اور یہی وقت تھا جب اس سے غلطی ہوئی۔ وہ اپنے کھیل میں اتنی مگن تھی کہ سامنے سے آنے والے تیز رفتار گھڑ سوار کو نہیں دیکھ سکی۔ گھڑ سوار نے شانی کو بچانے کے لئے زور سے لگا میں کھینچیں۔ گھوڑی کی گردن اوپر کواٹھی اور وہ ہنہانہ ہوئی ذرا ترچھی ہو گئی۔ بہر حال اس کی رفتار میں اب بھی کوئی خاص کمی نہیں ہوئی تھی۔ گھڑ سوار کا ایک گھٹنا شانی کے کندھے سے ٹکرایا اور وہ لڑھک کر لیکر کے ایک درخت سے جا لگی۔ چند گز آگے جا کر گھوڑی رک گئی۔ شانی گرتے گرتے بچی تھی پھر بھی درخت کے ساتھ ٹکرانے سے اس کی ایک کہنی چھل گئی تھی۔

لڑکیاں اور عورتیں ایک دم شانی کے ارد گرد اکٹھی ہو گئیں۔ اس کی آستین اٹھائی گئی۔ گورے گورے خوبصورت بازو پر خراش کی سرخی نمایاں دکھائی دے رہی تھی۔ گھڑ سوار دو تھے۔ ایک جوان سال تھا اور اپنے لباس سے کھاتے پیتے گھرانے کا نظر آتا تھا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ اس نے ایک دو بار پہلے بھی اس شخص کو کنوئیں کے آس پاس دیکھا ہے۔ شاید ایک بار وہ گاؤں کے بازار میں بھی نظر آیا تھا۔ دوسرا درمیانی عمر کا سانولا سا شخص تھا۔ اس کے کندھے پر رائل تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نوجوان کا کارندہ ہے۔ دونوں گھڑ سوار گھوڑوں سے اتر آئے تھے۔ سکیئر نے جوان سال گھڑ سوار کو مخاطب کرتے ہوئے غصے سے کہا۔ ”اندھے ہو، دیکھ کر نہیں چلا جاتا تم سے؟“

گھرسوار مسکرایا تو اس کی چوڑی ناک کچھ اور بھی چوڑی نظر آنے لگی۔ اس کے کانوں کے نیچے گوشت کی بہتات تھی اور جڑے کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک سخت گیر اور سخت جان شخص ہے، وہ اطمینان سے بولا۔ ”یہ بات تم اپنی اس سہیلی سے کہو تو زیادہ مناسب ہے۔“

”زیادہ زبان نہ چلاؤ، جاؤ اپنا کام کرو۔“ شانی نے غصے سے سُرخ ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی تکلیف کے آثار بھی تھے۔

جواں سال شخص اب دلچسپی سے شانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”بڑا غصہ آ رہا ہے بھی۔“ اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر دیدے مکائے۔

”بدتمیزی کرنے کی ضرورت نہیں، جاؤ یہاں سے۔“ شانی نے پھر طیش بھرے لہجے میں کہا۔

گھوڑی سے نکلنے سے چند سیکنڈ پہلے صغراں نے شانی پر پانی پھینک دیا تھا۔ اب یہ پانی اس کی گردن اور گریبان کو بھگور رہا تھا۔ اس کیلے پن کی وجہ سے شانی کی سانسوں کا اتار چڑھاؤ بہت نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وہ دیہی خوبصورتی کی کامل تصویر تھی۔ نازک، سبک بدن اور دودھ کی طرح سفید..... اب اس سفیدی میں غصے کا سُرخ رنگ بھی گھلا ہوا تھا۔

جواں سال شخص بے ساختہ چند قدم چل کر اس کے قریب آ گیا۔ اس کی گرم نگاہیں شانی کے سر پر سے چمکی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنا بالوں بھرا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”کہاں چوٹ لگی ہے جناب کو؟“ انداز میں ہمدردی سے زیادہ شرارت تھی۔

اس سے پہلے کہ اجنبی کا ہاتھ شانی کے جسم سے چھوتا، بجلی سی چمکی شانی نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنا ہاتھ گھمایا، چٹاخ کی آواز سے ایک تھپڑ جواں سال شخص کے گال پر پڑا۔ اس کا گندی رنگ یکا یک سیاہی مائل، سُرخ ہو گیا۔ اس کا درمیانی عمر کا ساتھی اپنی جگہ پر تڑپ گیا۔ اس نے بڑے خونخوار انداز میں شانی کی طرف بڑھنا چاہا۔ ”خبردار۔“ سیکند دیوار بن کر شانی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ سیکند سے کندھا ملا کر صغراں کھڑی تھی۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے چوہدری جی پر ہاتھ اٹھایا ہے۔“ درمیانی عمر کا شخص گرجا اور اس نے سیکند اور صغراں کو دھکیل کر شانی کی طرف بڑھنا چاہا۔ اس کا انداز خطرناک تھا لیکن پھر وہ رک گیا۔ جواں سال شخص نے اپنے ہاتھ سے اسے روک دیا تھا۔

”نہیں..... اکبرے..... جانے دے اسے۔“ جواں سال شخص نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس لہجے میں امن پسندی اور درگزر کے بجائے جنگ اور طیش کا رنگ جھلکتا تھا۔

درمیانی عمر کے شخص نے جس کا نام اکبرے لیا گیا تھا، پھنکارتے ہوئے اپنے مالک کی طرف دیکھا، پھر اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا پڑھا کہ قدرے ٹھنڈا ہو گیا۔

جواں سال چوہدری کا ایک گال اور کان سُرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہولے ہولے اپنے گال کو سہلایا۔ اس کی تیز نگاہیں بدستور شانی کے سر پر تھیں۔ گھمبیر آواز میں بولا۔ ”یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔“

”چل جا اپنا کام کرو۔“ ایک ادھیڑ عمر عورت بولی۔ ”نہیں تو ابھی گاؤں کے مرد آ جائیں گے..... مار مار کر جتھ پیر توڑ دیں گے تم دونوں کے۔“

جواں سال شخص نے جیسے ادھیڑ عمر عورت کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کی نگاہوں کا طیش بدستور شانی کے جسم کو چھید رہا تھا۔ موٹے موٹے سانولے ہونٹوں پر اب ایک زہریلی سی مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں گھڑسوار دھول اڑاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ سکیہ نے اپنی اور دھنی کا کنارہ پھاڑ کر شانی کی کہنی پر باندھ دیا۔ اسی دوران میں درختوں کے اندر سے رنگ والی گاؤں کا سابقہ چوکیدار بابا نتھا اپنی لاٹھی ٹیکتا ہوا عورتوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے یہاں پہنچنے سے پہلے سارا واقعہ تو نہیں دیکھا تھا لیکن جو اس سال چوہدری اور اس کے کارندے اکبرے کی جھلک ضرور دیکھ لی تھی۔

لڑکیوں کے پاس پہنچ کر بابا نتھا بولا۔ ”کیا ہوا دھی رانیو..... یہ بندے تم سے کیا کہہ رہے تھے؟“

سکیہ نے ایک ہی سانس میں سارا واقعہ کہہ سنایا اور شانی کی زخمی کہنی بھی دکھا دی۔

بابے تھے کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آرہے تھے۔ دور کچے راستے کے آخری سرے پر دونوں گھڑسواروں کی اڑائی ہوئی دھول ابھی تک باقی تھی۔ اس بکھری بکھری سی دھول کے ذرات ڈوبے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے اور ان کے عقب میں کماد کے بلند کھیت تھے۔ بابے تھے نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ نارپور کا چوہدری فاخا تھا۔“

”چوہدری فاخا؟ یہ کون ہے؟“ صغرا نے ناک چڑھا کر پوچھا۔

”بڑی اوتری شے ہے۔“ بابے تھے نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور پھر لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بزرگانہ ناراضی دکھائی دی۔ شانی کی زخمی کہنی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اتنی چھوٹی سی خراش کے لئے تم نے اتنا جھگڑا ڈال دیا ہے۔“

”بابا! بات خراش کی نہیں ہے وہ لفنگا شانی پر ہاتھ ڈال رہا تھا۔“ سکیہ نے تنک کر کہا۔

بابے تھے نے کچھ نہیں کہا، بس خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ صغرا نے کہا۔ ”بابا یہ نارپور کا نام تو شاید پہلے بھی کہیں سنا ہوا ہے لیکن یہ چوہدری فاختے کا نام پہلی بار سن رہے ہیں۔ یہ کس باغ کی مولیٰ ہے؟“

”یہ اچھا بندہ نہیں ہے۔ اس کا باپ بھی ایک نمبر کا سخت اور کرخت زمیندار تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے تین مزارعوں کو بجلی والے ٹوکے میں دے کر کٹوا دیا تھا۔ اگر دھی رانی نے اسے تھپڑ مارا ہے تو یہ آسانی سے نہیں بھولے گا۔ اس کے بدلے میں کچھ نہ کچھ کرے گا ضرور۔“

”کیا کر لے گا، فوج لے کر آجائے گا، بڑے دیکھے ہیں ایسے سورمے۔“ ادھیڑ عورت نے سر جھٹک کر کہا۔

لڑکیاں ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگیں..... شانی بھی ان باتوں میں شریک ہو گئی۔ بابا نتھا اپنی گمشدہ بکری ڈھونڈتا ہوا آگے نکل گیا..... بات آئی گئی ہو گئی۔ معمولی سی خراش تھی۔ شانی نے گھر میں بتانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ دیکھا جاتا تو اس واقعے میں قصور اس کا اپنا ہی تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی خود ہی گھوڑی کے آگے آگئی تھی۔ اگر وہ یہ بات اباجی کو بتاتی تو سب سے پہلے تو اسے ہی ڈانٹ ڈپٹ ہونا تھی اور اباجی کی ہلکی سی ڈانٹ بھی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ جس سے پیار زیادہ ہو اس کا مارا ہوا پھول بھی تکلیف دیتا ہے۔

اباجی سے شانی کو بہت پیار تھا۔ وہ ان کی اکھوتی بیٹی تھی، دو بھائی تھے۔ ایک تو کاروبار کے سلسلے میں کویت میں مقیم تھا اور دوسرا گاؤں میں ہی تھا لیکن اسے اپنے مشغلوں سے ہی فرصت نہیں تھی۔ گھر میں اس کے پاؤں کم کم ہی نکلتے تھے۔ آج کے شانی ہی تھی جو رات کو ان کے پاؤں دباتی تھی۔ جمعے کی دوپہران کے سر میں سرسوں کے تیل یا دیسی گھی کی مالش کرتی تھی۔ ان کی کھانسی کی دوا، ان کی عینک، پگڑی اور جوتی وغیرہ کا خیال رکھتی

تھی۔ یہ چیزیں چوہدری ارشاد کو ہمیشہ مقررہ جگہ پر پڑی ملتی تھیں اور یہی وہ ہمیشہ سے چاہتے تھے۔ یوں تو شانی کی مرحومہ ماں بھی ان باتوں کا بہت خیال رکھتی تھیں، اکثر ان سے بے پرواہی بھی ہو جاتی تھی۔ ایسے میں چوہدری ارشاد بڑے جزبز ہوتے تھے۔ ان کی زندگی میں سلیقہ تھا، ترتیب تھی اور وہ چاہتے تھے کہ دیگر اہل خانہ کے رویے میں بھی یہ صفات آجائیں۔

شانی کی والدہ تقریباً تین سال پہلے سرطان جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر انتقال کر گئی تھیں۔ ان کے علاج معالجے پر چوہدری ارشاد نے روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا اور بات صرف روپے ہی کی نہیں تھی، انہوں نے چھ ماہ تک ہر طرح کی بھاگ دوڑ کر کے خود کو بھی ہلکان کیا تھا۔ انہی دنوں میں شانی کو اندازہ ہوا تھا کہ اس کے امی ابا جو بظاہر عام سی زندگی گزار رہے ہیں درحقیقت ایک دوسرے سے کتنی محبت رکھتے ہیں۔ شانی کی ماں کے موت کے بعد بھی وہ ایک سال تک سنبھل نہیں سکے تھے۔ باپ بیٹی سینکڑوں ہی دفعہ ایک دوجے کے گلے لگ کر روئے ہوں گے اور تنہائی میں بیٹھ کر پچھرنے والی کو یاد کیا ہوگا۔ درحقیقت چوہدرانی آسیہ کی موت کو اہل خانہ میں سب سے زیادہ چوہدری ارشاد اور شانی نے ہی محسوس کیا تھا۔ شانی تو تین چار ماہ تک بستر سے لگی رہی تھی پھر اس خیال سے کہ غمزدہ باپ کو اس کی ضرورت ہے، وہ تمام تر ہمت کو بروئے کار لا کر سنبھلی تھی اور باپ کی خدمت و دلجوئی میں لگ گئی تھی۔ اب ان واقعات کو تین ساڑھے تین سال گزر چکے تھے۔ زندگی اپنے معمول پر آچکی تھی۔

اس روز شام کو کنوئیں پر جو واقعہ ہوا تھا وہ بظاہر تو شانی کو بھول گیا لیکن اس کے دماغ کی گہرائی میں کہیں محفوظ رہا۔ کسی وقت بیٹھے بیٹھے اچانک اسے اس اجنبی کی سُرخ آنکھیں اور چوڑی ناک یاد آ جاتی، تپھر کھانے کے بعد اس نے جن تیز برجھی جیسی نگاہوں سے شانی کو گھورا تھا وہ بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتی تھیں۔ بابے تھے کے الفاظ بھی شانی کو یاد تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ”فاخا اچھا بندہ نہیں ہے۔“ اور یہ کہتے ہوئے بابے کی بوڑھی آنکھوں میں عجیب سا ہراس اُتر آیا تھا۔

تین چار مہینے بعد ہی زندگی کی گہما گہمی میں یہ واقعہ دھندلا گیا۔ روز و شب کی اُڑتی ہوئی گرد بڑی بڑی خبروں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ یہ چھوٹا سا حادثہ بھی دب گیا تھا۔ شام سے ذرا پہلے خدا بخش کے کنوئیں پر عورتیں اسی طرح پانی بھرتی تھیں۔ لڑکیاں اکھیلیاں کرتی تھیں، کنواریاں، سہانگنیں اور ادھیڑ عمر کی سب ایک رنگ میں رنگی ہوتی تھیں۔ ان کے قریب ہی بچے کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔ بیلوں کی جوڑی اپنا دائرے کا سفر جاری رکھتی تھی لیکن پتا نہیں کیا بات تھی ان مصروفیات کے دوران میں بھی کسی وقت اچانک شانی کے سینے میں خوف ایک ٹکلی شے کی طرح چھب جاتا تھا۔ ایسے میں اس کی نگاہ خود بخود مشرق کی طرف اٹھ جاتی۔ اسی جانب جہاں سے وہ دونوں گھڑسوار نمودار ہوئے تھے۔ اور پھر جھگڑا ہوا تھا۔

ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ شانی نے دور سے کسی گھڑسوار کو دیکھا اس کا دل دھک سے رہ گیا اور ذہن میں اسی فاخانامی گھڑسوار کا ہیولا ابھر آیا۔ دو تین بار وہ رات کو بھی ڈری۔ ایک مرتبہ عادل بھائی کے کسی دوست نے بڑے زور سے حویلی کا بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ دوسری مرتبہ قریبی گھر سے ایک نقب زن پکڑا گیا تھا اور اس کی وجہ سے شور بلند ہوا تھا۔ دونوں مرتبہ پتا نہیں کیوں آپوں آپ اس کا دھیان اجنبی گھڑسوار کی طرف چلا گیا تھا۔ بہر حال جوں جوں گزرتے گئے شانی کے ذہن سے گھڑسوار سے دوسری ملاقات کا خوف کم ہوتا گیا۔ یہ انسانی ذہن کی خصوصیت ہے کہ اس میں کوئی بھی خوشی یا پریشانی تادیر اپنی شدت برقرار نہیں رکھ سکتی۔

تین چار ماہ بعد کی بات ہے ایک روز شانی اپنے ابا جان کی پابندی کی طرف بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھی ساتھ ساتھ وہ انہیں ایک کتاب بھی پڑھ کر سنارہی تھی۔ ایک جگہ کہانی کا رن لکھا تھا۔ ”کبھی کبھی ہم کیوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خطرہ ٹل گیا ہے لیکن خطرہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے بلکہ اکثر پہلے سے زیادہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو خوش اور نارمل رکھنے کے لئے اکثر ہمیں خود کو دھوکا دینا پڑتا ہے۔ خود کو سمجھانا پڑتا ہے کہ سب اچھا ہے..... جب کہ سب اچھا نہیں ہوتا۔ ہم وقت کو ٹالتے رہتے ہیں..... وقت ملتا رہتا ہے لیکن پریشانی اور تکلیف کینسر کے کسی اندرونی پھوڑے کی طرح اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔“

یہ تحریر پڑھتے پڑھتے پتا نہیں کیوں اچانک ہی کئی روز بعد شانی کا دھیان ایک بار پھر جنبی گھر سواری کی طرف چلا گیا..... وہ یہ سوچ کر کانپ گئی کہ کسی روز وہ خبیث اچانک ہی تو اس کی پرسکون زندگی کو درہم برہم نہیں کر دے گا۔ پتا نہیں وہ کہاں اوجھل ہو گیا تھا اگر وہ اسے ایک دوبار نظر آ جاتا اسے گھورتا یا تنگ کرنے کی کوشش کرتا یا کسی اور طریقے سے اپنی موجودگی ثابت کرتا تو شاید شانی کے ذہن سے اس کے حوالے سے اتنا خوف نہ ہوتا لیکن وہ تو اس دن کے بعد ناپید ہی ہو گیا تھا۔ شانی نے ایک دفعہ اپنی دادی سے سنا تھا۔ ”جو لوگ جلدی سے ہار مان لیتے ہیں وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔“

ابا جان کی آواز نے ایک دم شانی کو چونکا دیا۔ ”اوشانی! کہاں گم ہو گئی ہے پڑھتے پڑھتے۔“

شانسی بری طرح چونک گئی۔ کتاب سنبھالتے ہوئے بولی۔ ”کک..... کچھ بھی نہیں ابا جی..... وہ یونہی..... ایک بات یاد آگئی تھی۔“

”تجھے کوئی پریشانی تو نہیں ہے نا بیٹی؟“ چوہدری ارشاد نے بڑے لاڈ سے پوچھا۔

”نہیں ابا جی..... آپ کے ہوتے ہوئے پریشانی کی کیا مجال ہے کہ میرے پاس آئے۔“

چوہدری ارشاد نے اپنے سفیدی مائل بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولے۔ ”دھی رانی! تو جانتی ہی ہے آج کل اپنے کام کے بکھیروں میں الجھا ہوا ہوں۔ وائی بیٹی کے خرچے روز بروز زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ کھا دوں کی قیمتیں آسمان پر ہیں..... بیج، کیڑے مار دوائیاں، کھیت مزدوری، بجلی، ڈیزل ہر شے کے ریٹ چڑھے ہوئے ہیں، فصل کے ریٹ وہی کے وہی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے اس بار بھی گندم کی فصل کا حال اچھا نہیں ہوگا۔“

”ابا جی! آپ پریشان نہ ہوا کریں اتنا..... سب ٹھیک ہو جائے گا آدھا قرضہ تو اتر ہی گیا ہے باقی بھی جلدی اتر جائے گا۔“

چوہدری ارشاد گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بیٹی کو کیسے بتاتا کہ قرضہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس کے چھوٹے بیٹے عادل سلطان نے تین چار ماہ پہلے فصل آباد سے چند من سستی الاپچی خرید لی تھی۔ بعد ازاں یہ الاپچی چوری کی لنگی۔ عادل کو اس سودے میں منافع تو کیا ہونا تھا اصل رقم بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ چوہدری ارشاد کو فوری طور پر تیس پینتیس لاکھ کا انتظام کر کے اسے دینا پڑا۔

در اصل یہ ادھارتب سے چلا آرہا تھا جب شانی کی والدہ بیمار ہوئی اور اس کے علاج معالجے پر چوہدری ارشاد کو روپیہ پانی کی طرح بہانا پڑا۔ اس نے زمین رہن رکھ کر کچھ قرضہ بینک سے لیا کچھ ادھر ادھر سے اکٹھا کیا یہ مل ملا کر تقریباً ستر لاکھ روپیہ بن جاتا تھا۔ اس میں سے تقریباً پینتیس لاکھ روپیہ اس نے پچھلے سال چکا دیا تھا کیونکہ ربیع اور خریف دونوں کی فصلیں اچھی ہوئی تھیں مگر تقریباً اتنی ہی رقم تین چار ماہ پہلے اسے پھر سے ادھار لینا پڑ گئی تھی۔ چوہدری ارشاد کا ہاتھ روز بروز تنگ ہوتا جا رہا تھا لیکن اس نے گھر والوں سے اور خصوصاً شانی سے اپنی پریشانی چھپا رکھی تھی۔

☆=====☆=====☆

وقت گزرتا رہا اور دو سال اسی طرح مزید گزر گئے۔ شانی اب بھر پور جوان تھی۔ اس کی عمر بیس سے کچھ کم ہی ہوگی۔ اس کا انگ انگ لشکارے مارتا تھا اور تن بدن میں جوانی کا رس بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی طرف دیکھنے والے کا دل موہ لیتی تھی۔ لڑکے تو لڑکے اس کی سہیلیاں بھی اسے عاشقانہ نظروں سے دیکھتی تھیں۔ اس کی ہر نی جیسی آنکھیں، معصوم مسکراہٹ، لمبے سیاہ بال، نہایت متوازن اور نازک جسم اور سب سے بڑھ کر اس کی گفتگو کا دلربا انداز..... اس سے ملنے والا اس کی طرف کھینچتا ہوا چلا جاتا تھا۔ بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں کہ بڑی قسمت والا ہوگا جو گاؤں کی اس روشنی کو ڈولی میں بند کر کے اپنے گھر لے جائے گا۔ حال اور مستقبل کی فکروں سے آزاد وہ اپنے بائل کے آگن میں فلاںچیں بھرتی پھرتی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن اس کی پازیب کی جھنکار اس کی دلگداز ہنسی یہ سب مل جل کر حویلی کو جگمگا دیتے تھے۔ وہ ایک خوش رنگ تتلی کی طرح چوہدری ارشاد کے ارد گرد چکر لاتی رہتی تھی اور چوہدری ارشاد یہ سوچ کر غمزہ ہو جاتا تھا کہ اب یہ تتلی بہت جلد اس کی نظروں سے اوجھل ہونے والی ہے۔ وہ اس کے گھر کی رونق تھی۔ اس کی زندگی کا جواز تھی لیکن اسے کسی اور کا گھر بسانا تھا..... کسی اور کی زندگی بننا تھا۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ چوہدری ارشاد نظر بھر کر اس کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا شاید وہ اس لئے نہیں دیکھتا تھا کہ وہ تو اس کی ہے ہی نہیں..... اس نے تو بس ایک مہمان کی طرح اٹھا رہے ہیں برس اس کے گھر میں گزارے ہیں اب اسے اپنے اصل گھر چلے جانا ہے۔ بائل کے آگن کو ہمیشہ کے لئے اداس چھوڑ کر۔ اس آگن میں بس اس کے قہقہوں کی بازگشت رہ جانی ہے یا اس کے گڈیاں گڈے اور پرانے کپڑے۔

زندگی میں ہر موڑ اپنے مقررہ وقت پر پہنچ جاتا ہے۔ زندگی کے سفر کی رفتار سُست کر کے ایسے موڑوں کو تھوڑی دیر کے لئے ٹالا تو جاسکتا ہے لیکن ان سے بچا نہیں جاسکتا۔ شانی کی شادی کا موڑ بھی جلد ہی پہنچ گیا۔ خاندان میں تو کوئی ایسا لڑکا تھا نہیں جس کے بارے میں سوچا جاسکتا۔ یقینی بات تھی کہ لڑکا خاندان سے باہر ہی کا ہوگا۔ دو تین مہینے تک خاموشی سے تلاش ہوتی رہی۔ اس دوران میں ایک لڑکا چوہدری ارشاد اور اس کی منہ بولی بہن آمنہ یعنی شانی کی پھوپھی کو پسند بھی آیا لیکن لڑکے والے ”حیثیت“ کے لحاظ سے کم تھے۔ چوہدری ارشاد چاہتا تھا کہ سدھی بہت امیر کبیر نہ ہوں لیکن ہم پلہ تو ہوں۔ شانی ناز و نعم میں پلی تھی اس نے ایک بڑی حویلی میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کی پیشتر ضروریات بغیر کہے پوری ہوتی تھیں..... محنت مشقت کی اسے عادت نہیں تھی۔ چوہدری ارشاد اور اس کی بہن کو یہ ساری باتیں مد نظر رکھنا تھیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ شانی ان سے کہیں بہت دور نہ چلی جائے۔ وہ اسے اپنے آس پاس ہی رکھنا چاہتے تھے۔ شانی نے دیہی علاقے میں رہنے کے باوجود انٹر میڈیٹ کیا ہوا تھا۔ کوئی ایسا لڑکا بھی منتخب نہیں کیا جاسکتا تھا جو ان پڑھ یا کم پڑھا لکھا ہو۔ بہت سی سوچنے کی باتیں تھیں۔

چوہدری ارشاد اور ان کی منہ بولی بہن جب اس ہم پر نکلے تو انہیں اندازہ ہوا کہ معاملہ اتنا آسان بھی نہیں ہے..... مناسب رشتہ ڈھونڈنے کے لئے انہیں کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ انہی دنوں شانی کے ایک چچا رئیس احمد نے ایک اچھے رشتے کا سراغ دیا۔ لڑکا مقامی معیار کے مطابق پڑھا لکھا بھی تھا۔ لاہور میں اس نے ٹیکسٹائل کا کارخانہ لگا رکھا تھا۔ گاؤں میں بھی زمین تھی۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ شانی کا چچا رئیس احمد انہیں کافی عرصے سے جانتا تھا۔ کچھ عرصے سے رئیس احمد کی زمینوں کی ساری کپاس اسی فیملی کی ٹیکسٹائل فیکٹری میں جاری تھی۔ معلوم ہوا کہ رئیس احمد نے ٹیکسٹائل کے کام میں تھوڑا بہت سرمایہ بھی لگایا ہوا ہے۔

شانی کے چچا یعنی رئیس احمد کی بات پورے گھرانے میں بہت مانی جاتی تھی۔ خاص طور سے چوہدری ارشاد چھوٹے بھائی کی بات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ ان سے چھوٹا تھا اس کے باوجود وہ اسے عزت و احترام سے ”رئیس جی“ کہہ کر بلاتے تھے۔ رئیس احمد نے جب رشتے کا بتایا اور یہ بتایا کہ لڑکا اور خاندان ان کا دیکھا بھالا ہے تو چوہدری ارشاد لڑکا دیکھنے سے پہلے ہی پچاس فیصد آمادہ ہو گئے۔

چند دنوں بعد دیکھ پرکھ کے مرحلے کا آغاز ہوا۔ پہلے چوہدری ارشاد آمنہ، رئیس احمد اور آمنہ کی بیٹی نگہت لڑکے والوں کے گھر گئے۔ اس کے بعد لڑکے کی بھابی اور چند رشتے دار عورتیں شانی کو دیکھنے آئیں۔ بظاہر لوگ اچھے ہی لگ رہے تھے، خوشحال اور رکھ رکھاؤ والے بھی نظر آتے تھے۔ انہوں نے شانی کو دیکھا اور پسند کیا۔ خواتین کے ساتھ آنے والے ایک سات آٹھ سالہ بچے کو تو شانی اتنی پسند آئی کہ اس نے ڈیڑھ دو گھنٹے تک شانی کی گود سے اترنے کا نام نہیں لیا۔

دو ہفتے بعد شانی کی فیملی کے کچھ اور لوگ لڑکے والوں کے گھر گئے اور تقریباً مطمئن ہو کر واپس آئے۔ صرف پھوپھی آمنہ کا خیال تھا کہ لڑکا عمر میں تھوڑا سا زیادہ لگتا ہے۔ شانی بیس سال سے بھی کم تھی جب کہ لڑکے کی عمر اٹھائیس کے قریب تھی۔ اس موقع پر رئیس احمد نے زور دے کر کہا کہ لڑکوں کے بیاہ کے حوالے سے اٹھائیس سال زیادہ عمر نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ لڑکا اپنا کاروبار رکھتا ہے، خود مختار ہے، مندوں اور دیوروں وغیرہ کا بھی کوئی جھنجھٹ نہیں ہے۔

چوہدری ارشاد نے کہا: ”بھئی ڈاکٹر اور انجینئر وغیرہ تو آج کل پینتیس سال کے بعد شادیاں کر رہے ہیں اٹھائیس انتیس سال زیادہ عمر نہیں ہے۔ ویسے بھی لڑکوں میں ظاہری خوبیوں سے زیادہ اندرونی خوبیاں دیکھنی چاہئیں۔“

سلسلہ جنابانی جاری رہا اور پھر ایک روز بھاری بھر کم کپڑوں اور زیوروں سے لدی ہوئی کچھ عورتیں آئیں اور ”شگن“ کر گئیں۔ لڑکے کی بھابی نے بڑی شفقت سے شانی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا منہ میٹھا کرایا اور اس کے ہاتھ میں کچھ روپے تھما دیئے۔ شانی کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے دیس نکالے کی سزا ملنے کا وقت آ گیا ہے۔ ایک دم ہی اپنا گھر اسے پرایا لگنے لگا۔ اس کے قدم جیسے زمین سے اکھڑ گئے وہ آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہو گئی۔

چند روز بعد شانی کے گھر والے بھی گئے اور لڑکے کے ہاتھ پر روپے رکھ آئے۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ دونوں گھرانوں کو رشتہ منظور ہے۔ پانچ چھ روز تک شانی روتی رہی پھر آہستہ آہستہ اس نے خود کو سنبھالنا شروع کر دیا۔ اپنی مرحومہ ماں کی باتیں اسے یاد آنے لگیں وہ اس کا سر منہ چوم کر کہا کرتی تھیں: ”تو تو پرایا دھن ہے بیٹی، دھی رانیاں پیدا ہوتے ہی دوسرے گھر کی ہوتی ہیں، دھی غریب کی ہو یا کروڑ پتی کی اسے اپنا گھر چھوڑ کر دوسرا گھر بسانا ہی پڑتا ہے۔“

پہلے تو شانی حیران ہو کر سوچتی تھی کہ وہ اتنا سب کچھ کیسے چھوڑ سکے گے۔ اپنا گاؤں، گاؤں کی گلیاں، گاؤں کے لوگ، سہیلیاں، اپنے ابا جی، ابا جی کا ویٹر..... ویٹرے میں نیم کا درخت، درخت پر چمکتی چڑیاں، یہاں کی جھسیں اور یہاں کی شامیں؟ لیکن پھر دیرے دیرے اس کا دل حوصلہ پکڑنے لگا۔ سیکہ دن رات اس کے ساتھ چپکی رہتی تھی اور کھٹی میٹھی باتیں کرتی تھی۔ اس کی باتیں سن سن کر شانی کے سینے میں کہیں گہرائی کے اندر ایک

میٹھی میٹھی سی لہر بھی جاگنے لگی تھی۔

اس نے اپنا ہونے والا دوا لہا ابھی تک دیکھا نہیں تھا مگر اس کی دھندلی سی تصویر شانی کے دل و دماغ میں جگہ بنانے لگی۔ شوہر اور بیوی کے باہمی تعلقات کے حوالے سے شانی حیران کن حد تک معصوم تھی مگر یکینہ دن رات اس کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ وہ معصوم نہ رہے۔ کبھی کبھی صغراں بھی اس ”سازش“ میں شریک ہو جاتی تھی۔ شانی کبھی غصہ کرتی، کبھی شرماتی اور کبھی سنی اُن سنی کر دیتی۔

گھر میں شانی کے بیاہ کی تیاریاں چپکے چپکے شروع ہو گئی تھیں۔ پھوپھی آمنہ شانی کی ایک ممانی کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے ہفتے لاہور جانے لگیں اور سامان سے لدی پھندی واپس آنے لگیں۔ ایک بار عادل اور ایک بار اباجی بھی ان کے ساتھ لاہور گئے۔ اباجی کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں آج کل معمول سے گہری ہو گئی تھیں۔ شانی کو دیکھ کر وہ ایک دم مسکرانے لگتے تھے اور یوں ظاہر کرتے تھے کہ انہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے لیکن شانی جانتی تھی کہ وہ اندر سے کتنے پریشان ہیں۔ ایک تو ظاہر ہے کہ شانی کی جدائی ہی کی فکر تھی۔ اس کے علاوہ ان کی معاشی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ اکلوتی بیٹی کی شادی تھی، لڑکے والے بھی خوشحال لوگ تھے، ضروری بات تھی کہ شادی کے انتظامات شایان شان ہوں۔ چوہدری ارشاد جیسے وضع دار شخص کے لئے یہ ہرگز ممکن نہیں تھا کہ وہ بیٹی کی شادی پر کسی بھی حوالے سے اپنا ہاتھ کھینچ کر رکھتا۔

شانہ اور عادل سلطان جانتے تھے کہ ان کے اباجی آج کل تنگ دست ہیں اور وہ زبردست خوشحالی جو والدہ مرحومہ کے دنوں میں تھی اب مکمل طور پر اوجھل ہو چکی ہے لیکن اصل حالات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ چوہدری ارشاد کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا تھا۔ تقریباً دو مرتبے نہری زمین کا مقدمہ چل رہا تھا اور پچھلے تین سالوں میں لاکھوں روپیہ اس مقدمے پر خرچ ہو چکا تھا۔ جو زمین زیر کاشت تھی اس کی آمدن بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کم آمدن میں ہی سے قرض کی قسطیں ادا ہوتی تھیں اور سارے اخراجات چلتے تھے۔ یہ بڑی قیمتی نہری زمین تھی اور اسی کی وجہ سے ابھی تک چوہدری ارشاد کے گھرانے کا بھرم قائم تھا لیکن اب چوہدری ارشاد کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ اس میں سے کم از کم ایک تہائی زمین بیچ دیں۔ بڑھتے ہوئے معاشی تقاضوں کا جواب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

☆=====☆

بہار کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ پہلے منگنی کا پروگرام بنا لیکن پھر یہ طے ہوا کہ ایک ڈیڑھ مہینے کے اندر شادی ہی ہو جائے۔ شادی کا پروگرام وسیع پیمانے پر تیار کیا گیا تھا۔ چوہدری ارشاد کے گھرانے میں رواج تھا کہ ”تقریب“ سے ایک ماہ پیشتر ہی چولہے پر دیگیں چڑھا دی جاتی تھیں۔ روزانہ عورتیں اکٹھی ہوتی تھیں، ڈھولک بجتی تھی، گیت گائے جاتے تھے، سب کو دعوت عام ہوتی تھی جس کا جی چاہے آتا تھا اور مہمان کی حیثیت سے کھانا کھاتا تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ یہ تین ہفتے بعد کی تاریخ تھی مقامی رواج کے مطابق اسے ”دن متھنا“ کہتے تھے۔ دن متھنے کے ساتھ ہی شادی کی رونق شروع ہو گئی۔ نائی دیگیں کھڑکھڑانے لگے اور حویلی کے صحن میں ایک زرنگار شامیانے کے نیچے ڈھولک کی آواز گونجنے لگی۔ شانی کو معلوم تھا کہ اباجی نے اپنی نہری زمین کا کچھ حصہ فروخت کر دیا ہے۔ اس سودے کے بعد وہ کئی روز تک گم صم بھی رہے تھے لیکن آج کل وہ خاصے مطمئن نظر آ رہے تھے۔ شانی ان کے چہرے پر خوشی کی جھلک دیکھتی تھی۔ ایک رات جب وہ اباجی کو دودھ دے کر اور ان کے پاؤں دبا

کرواپس آرہی تھی تو حویلی کے برآمدے میں بھائی عادل سے ملاقات ہوگئی۔ وہ شلواری قمیص میں تھا، لمبے بال شانے پر جھول رہے تھے، اس کی چوٹی پکڑتے ہوئے بولا۔ ”کہاں سے آرہی ہے چھپکلی؟“ وہ اچھے موڈ میں اکثر اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔

”اباجی کے پاؤں دبا کر آرہی ہوں۔ کبھی تم بھی دبا دیا کرو۔“

”جب تم چلی جاؤ گی تو میں دبا دیا کروں گا۔ ابھی تو گزارہ ہوئی رہا ہے۔“

”سارے اچھے کاموں کے لئے میرے جانے کا ہی انتظار ہو رہا ہے؟“

”یہی سمجھ لو۔“ عادل نے کہا۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔ ”ویسے چھپکلی! لگتا ہے کہ تمہاری قسمت اچھی ہے اچھا خاوند مل رہا ہے تجھے۔“

شانی کا رنگ حیا سے سُرخ ہو گیا۔ نازک گلابی رخساروں کے نیچے جیسے دو شمعیں جل اٹھی تھیں۔ اس سے پہلے کہ شانی کوئی جواب دیتی، عادل گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”مذاق کی بات تو علیحدہ رہی لیکن بندہ ہے سمجھ دار اور ہمدرد..... دوست بنانا اور سنبھالنا جانتا ہے۔ چاچا ریکس ایسے ہی اس کے گن نہیں گاتے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شانی نے پوچھا۔

”اس نے اباجی کو بھی ٹیکسٹائل کے کام میں پیسہ لگانے کی آفر کی ہے اور میں نے غور کیا ہے یہ بڑی اچھی آفر ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اُمید ہے کہ ہماری کپاس کی فصل بھی اچھے داموں بکے گی، کیونکہ کھیت سے سیدھی فیکٹری میں پہنچے گی۔ یہ نہیں کہ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے تمہارے دوہلا میاں کو بھی فائدہ ہوگا۔“ آخری الفاظ کہتے کہتے عادل کا لہجہ پھر شرارتی ہو گیا تھا۔

شانی اس کے بال پکڑنے کے لئے جھپٹی، وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا اور پھر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی کی نہایت پتلی کمر بل کھا کر رہ گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بھائی کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

دو ہفتے تک شادی کا ہنگامہ جاری رہا۔ جوں جوں شادی کا دن نزدیک آرہا تھا، حویلی کی رونق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پوری عمارت کا رنگ و روغن مکمل ہو چکا تھا۔ درختوں کی کاٹ چھانٹ ہو گئی تھی، نئے پودے لگ گئے تھے..... گاؤں سے گزر کر حویلی تک آنے والے راستے کو بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا۔ جہاں سے اینٹیں اکٹری ہوئی تھیں وہاں نئی اینٹیں لگائی گئیں، کمروں کو خوب اچھی طرح لیمپ پوت دیا گیا۔ گاؤں میں بجلی موجود تھی تاہم اضافی روشنی کے لئے گوجرانوالہ سے دس جزیئر منگوائے گئے۔ برات کورات گاؤں میں ہی رہتا تھا ان کی رہائش اور طعام کا وسیع بندوبست ایک ہفتہ پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ براتیوں کی تفریح کے لئے کھیل تماشے اور شکار وغیرہ کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ چوہدری ارشاد نے چھ سال پہلے اپنے بڑے بیٹے سجال کی شادی بڑے چاؤ اور دھوم دھام سے کی تھی، اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹی کی رخصتی میں کسی طرح کی کمی رہ جائے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ بیٹا بیٹانی ہوتا ہے۔

جس دو پہر شانی کو بوسیدہ سے کپڑے پہنا کر مایوں بٹھایا گیا اور اس کی جھولی میں رسم کے طور پر لمبی ہوئی گندم ڈالی گئی، وہ دیر تک سوچوں میں گم رہی، اپنوں سے جدا ہونے کے دن قریب تر آرہے تھے۔ ایک میٹھا رشتہ ٹوٹ رہا تھا اور ایک کٹھا میٹھا سا رشتہ بن رہا تھا۔

جب مایوں کی رسم ختم ہوئی تو سہ پہر ہونے والی تھی۔ گاؤں کی سہائیں اور کنواریاں کچھ دیر کے لئے گھروں کو چلی گئیں، تاکہ شام کو پھر سے تازہ دم ہو کر ڈھولک بجانے اور ناچنے گانے کے لئے حویلی آسکیں۔ شانی کچھ دیر آرام کرنے کے لئے چھت پر چلی گئی۔ چھت سے دور تک گاؤں کے ہرے بھرے کھیت کھلیاں نظر آتے تھے اور وہ راستہ بھی نظر آتا تھا جس پر سے کسی کو آتا تھا۔ ٹھیک سات روز بعد کسی دور دراز گاؤں سے اسے یہاں پہنچنا تھا اور ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ وہ اسے عزت و محبت اور خلوص دے گا، ان زخموں پر اپنے حسن سلوک کا مرہم رکھے گا جو "بابل کے گھر" سے جدائی کے سبب شانی کے دل پر لگیں گے۔ وہ اسے شریک حیات بنائے گا اور ہر دکھ سکھ میں ہمیشہ اس کا شریک رہے گا۔

وہ سوچ رہی تھی جب آمنہ پھوپھی کی بڑی بیٹی فوزیہ بیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر آگئی۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ غالباً اس کے پاس کوئی اہم خبر تھی پھر شانی کو اندازہ ہوا کہ اس نے کوئی شے اپنی اوڑھنی کے پلو میں چھپا رکھی ہے۔

"کیا ہے یہ؟" شانی نے غور سے اوڑھنی کے پلو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اتنی معمولی سی چیز نہیں ہے کہ یونہی دکھا دوں۔ پہلے ہماری مٹھی گرم کرنی پڑے گی بھی۔"

"اچھا کروں گی۔"

"نہیں..... نہیں..... پانچ سو روپے نکالو..... کل سہ پہر منشی خادم کو گوبرانو الہ بھیجیں گے وہاں سے رس ملائی منگوائیں گے۔"

"اچھا بھی، دکھاؤ تو سہی، کیوں پریشان کر رہی ہو۔"

"نہ جی نہ..... ادھار نہیں چلے گا پر دیسیوں سے ادھار کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔" کچھ دیر تک دونوں میں تکرار ہوئی پھر شانی نے وعدہ کر لیا کہ وہ ابھی نیچے جا کر پانچ سو روپے دے دے گی۔

فوزیہ نے اندرونی جوش کو بمشکل چھپاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے اس "ہونے والے" کی تصویر ہے۔ امی نے بڑی مشکل سے لی ہے وہ تو دیتے ہی نہیں تھے کہتے تھے ہمارے ہاں رواج نہیں۔ امی نے بہت منت کی تو کہنے لگے کہ کوئی اچھی تصویر ہی نہیں۔ تمہاری ہونے والی جیٹھانی نے بس کسی طرح ایک البم سے نکال کر دے دی۔"

شانہ کا دل یکبارگی شدت سے دھڑکنے لگا۔ سانسوں کی لئے خود بخود چڑھ گئی۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ فوزیہ سے کہہ دے کہ وہ تصویر دیکھنا نہیں چاہتی۔ جب جیتا جاگتا شخص سات دن کی دوری پر تھا پھر تصویر دیکھنے کی کیا ضرورت تھی لیکن پھر فوزیہ کا جوش و خروش دیکھتے ہوئے وہ انکار نہ کر سکی۔

فوزیہ نے بڑے ڈرامائی انداز میں اوڑھنی کا پلو آہستہ آہستہ تصویر سے سر کاٹنا شروع کیا۔ پہلے سر سے پردہ سرکا، پھر آنکھوں سے پھر منہ سے..... پھر وہ پورے کا پورا شانی کے سامنے تھا۔ شانی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا..... اسے کچھ یاد آ رہا تھا، اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہری دوڑنے لگی، پھر اس کا رنگ زرد ہوتا چلا گیا۔ وہ اس تصویر کو پہچان رہی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی یہ اندیشہ موجود نہیں تھا کہ فوزیہ کی اوڑھنی کے پیچھے سے یہ چہرہ نمودار ہوگا۔

فوزیہ کی دور افتادہ آواز جیسے کسی کنوئیں کے اندر سے برآمد ہوئی اور شانی کے کانوں تک پہنچی۔ ”یہ ہیں فاخر احمد صاحب..... ہمارے جیجا جی اور تمہارے وہ..... ناک ذرا سی بڑی ہے لیکن ٹھوڑی کی وجہ سے اوپری نہیں لگتی ہے۔ بال تو زبردست گھنگھریالے ہیں اور آنکھیں دیکھو تو کیسی چمکتی ہوئی ہیں.....“

شانہی بھی ان آنکھوں میں ہی دیکھ رہی تھی۔ ہاں یہ وہی آنکھیں تھیں، سو فیصد وہی آنکھیں تھیں۔ اسے وہ بھولا بسر اسانظر ایک دم یاد آ گیا تھا۔ اس شخص کا شانی کے ذہنی بازو کی طرف ہاتھ بڑھانا۔ شانی کا ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کے منہ پر طمانچہ مارنا، اس کے راقفل بردار کارندے کا مشتعل ہونا اور غضب ناک انداز میں شانی کی طرف بڑھنا..... پھر اس شخص کا اپنے کارندے کو روک دینا اور کہنا ”نہیں..... اکبرے جانے دے اسے۔“ اس کے بعد اس..... اس کے بعد فاخانامی اس شخص نے انہی آنکھوں سے اسے گھورا تھا۔ ہاں یہی برے کی طرح چھیدتی ہوئی آنکھیں تھیں، یہ آنکھیں آج بھی شانی کو چھید رہی تھیں..... یہ آنکھیں بزبان خاموشی شانی سے کہہ رہی تھیں۔ ”تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہیں بھول جاؤں گا تم نے کیسے سمجھ لیا کہ بات سردیوں کی اسی شام کو اسی کنوئیں کے کنارے ختم ہو جائے گی۔ بات ختم نہیں ہوئی ہے بات تو ابھی دور تک جائے گی۔“

فوزیہ بھی تصویر ہی کی طرف دیکھ رہی تھی اس لئے شانی کے تاثرات اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ چند لمحے بعد جب فوزیہ نے شانی کی طرف دیکھا وہ اپنے تاثرات پر کسی حد تک قابو پا چکی تھی۔ پھر بھی اس کی شفاف پیشانی پر پسینے کی نمی چمکنے لگی تھی۔

فوزیہ نے بڑے غور سے شانی کا چہرہ دیکھا اور بولی۔ ”کیا بات ہے بھئی..... تم تو گم سم ہی ہو گئی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے پسینے چھوٹ گئے ہیں۔ یہ کوئی ایسا ڈراؤنا چہرہ تو نہیں ہے میری جان۔“

”نن..... نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

فوزیہ پوسٹ کارڈ ساز تصویر پر نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔ ”آج کل کے منڈے تو بس کڑیوں کی طرح ہی ہوتے ہیں خاص طور سے شہری منڈوں کا تو حال ہی نہ پوچھو..... اس چہرے کو دیکھو..... ماشاء اللہ مردانہ پن ہے۔ مرد ٹھوڑے سے کرخت نہ ہوں تو وہ مرد لگتے ہی نہیں۔ مجھے تو یہ کسی ڈھول سپاہی کی طرح لگ رہا ہے۔ جی دار..... ٹیکھا اور ایک دم کڑک۔“

فوزیہ بول رہی تھی لیکن اس کی آواز جیسے شانی کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے ذہن میں تو بس ایک ہی سوال کی گونج تھی۔

”یہ کیسے ہو گیا؟ یہ کیوں ہو گیا؟“

اس نے خود کو بڑی مشکلوں سے سنبھال رکھا تھا۔ پتا نہیں کب فوزیہ کی باتیں ختم ہوئیں، کب شانی چھت سے اُتری اور کب اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ باہر زنگار شامیانے کے نیچے ڈھولک بج رہی تھی۔ چند لڑکیاں لہک لہک کر گاری تھیں۔

اکھیاں اڈیک دیاں دل وا جاں مار دا

آجا پردیسیا واسطہ امی پیار دا

شانہی کے دماغ میں آندھی چل رہی تھی۔ اس آندھی میں خوفزدہ خیال خشک پتوں کی طرح اڑتے پھرتے تھے..... اس کا دل گواہی دے رہا

تھا کہ یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت ہوا ہے۔ ایک گہری سازش کے تحت یہ شخص منصوبہ بندی کے ذریعے آگے بڑھا ہے اور بالآخر اس تک آپہنچا ہے۔ چچا رئیس کے ساتھ اس کی دوستی بھی یقیناً اسی منصوبے کا حصہ رہی ہوگی۔ اس نے انہیں مٹھی میں لیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چوہدری ارشاد کے خاندان میں ان کی بات بہت مانی جاتی ہے..... اس نے ان کے ذریعے رشتے کی بات آگے بڑھائی تھی اور اب تو صورت حال یہ تھی کہ شانی کے ابا جی یعنی چوہدری ارشاد خود بھی اس کے گن گاتے تھے۔ پھر اس کے ذہن میں اپنے گاؤں کے بابے تھے کا خیال آیا۔ بابے تھے نے اس شخص کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ شانی کے کانوں میں گونجنے لگا۔ (بابے تھے کوفت ہوئے دو سال گزر چکے تھے)

اودھ میرے خدایہ کیا ہو گیا؟ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی..... لڑکیاں اتنی بے بس اور بے خبر کیوں ہوتی ہیں۔ جن کے ساتھ انہیں زندگی جیتنا ہوتی ہے پوری حیات کا سفر کرنا ہوتا ہے وہ ان کی شکل بھی نہیں جانتیں۔ ان کی شکل اس وقت ان کے سامنے آتی ہے جب وہ سہاگ کی بیج پر ہوتی ہیں اور ہونے والا ہر کام ہو چکا ہوتا ہے..... اس کے بعد انہیں صرف قبول کرنا ہوتا ہے اور خود کو سمجھوتوں کی آغوش میں گرانا ہوتا ہے۔

شانہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ابھی اباجی کے کمرے میں جائے گی۔ ساری مصلحتیں اور سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر ہر بات انہیں بتا دے گی۔ انہیں سمجھا دے گی کہ یہ فخر دراصل کون ہے؟ اور اس شادی کی آڑ میں وہ کون سی پرانی رنجشیں چکانا چاہتا ہے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی لیکن پھر بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ اسے جیسے کسی نے تھام لیا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا لیکن عقب میں کوئی نہیں تھا۔ شاید اس نے خود ہی اپنے آپ کو روکا تھا۔ وہ بے قراری سے کمرے میں ٹپٹپٹ لگی۔ اباجی کا چہرہ بار بار اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ آج کل کتنے خوش اور مطمئن تھے وہ ان کا سارا اطمینان غارت کرنے جا رہی تھی۔ اس کی شادی پر وہ لاکھوں روپے خرچ کر چکے تھے اور لاکھوں کا انتظام و انصرام ہو چکا تھا۔ سب کچھ طے اور مکمل تھا۔ کارڈز تک بانٹے جا چکے تھے۔ کئی ہفتوں کی بھاگ دوڑ، محنت و مشقت اور دوسری اب اپنا صلہ پانے والی تھی۔ صرف چھ دن درمیان میں تھے اور یہ کیسا تکلیف دہ انکشاف ہوا تھا شانی پر.....

وہ بے دمی ہو کر صوفے پر ڈھس گئی۔ وہ اباجی کی حد سے بڑھی ہوئی پریشانیوں کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ان کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ اپنی عزت اور سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے بڑے جتن کر رہے تھے۔ وہ سوچنے لگی کیا شادی کی تقریبات کے اس آخری مرحلے میں وہ اتنا بڑا صدمہ برداشت کر لیں گے۔ وہ پہلے ہی بیمار تھے کیا یہ دھچکا ان کے لئے قابل قبول ہوگا۔

تو پھر وہ کیا کرے؟ کیا سب کچھ جانتے بوجھتے خاموش رہ جائے۔ اپنے آپ کی قربانی دے دے؟

فوراً ہی ایک دوسرا سوال اس کے ذہن میں اٹھا۔ کسی نے اس کے اندر سے پکار کر کہا۔ ”تم اپنے اباجی کو ایک صدمے سے بچانے کی کوشش میں لا تعداد صدموں کے حوالے کر دو گی۔ جب شادی کے بعد تمہاری ازدواجی زندگی تباہ ہوگی تمہیں دھکے دے کر سسرال سے نکالا جائے گا یا ذلیل و خوار کر کے رکھا جائے گا تو پھر اباجی صدموں سے دوچار نہیں ہوں گے؟ بہتر ہے کہ یہ کڑوا گھونٹ ابھی بھرو۔ ابھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا ہمت کرو اور سب کچھ اپنے بڑوں کے گوش گزار کر دو۔“

وہ مایہ بے آب کی طرح تڑپتی رہی اور کمرے میں گھومتی رہی۔

سہیلیاں بار بار آئیں تاکہ اسے شامیانے میں لے جا کر سہاگ کے گیت گائیں اور اس کے کانوں میں نرم گرم سرگوشیاں کر سکیں لیکن اس نے طبیعت کا بہانہ بنا کر ہر بار انہیں منع کر دیا۔

رات کو وہ بہت تھوڑی دیر کے لئے سو سکی۔ صبح سویرے اس نے کھڑکی میں سے دیکھا تو اباجی صحن کی گھاس پر ننگے پاؤں ٹہل رہے تھے۔ شانی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ دروازہ کھول کر نکلے اور بھاگ کر اباجی کے گلے سے لگ جائے۔ پھر اسی طرح گلے سے لگے لگے سب کچھ انہیں بتا دے۔ غالباً وہ اسی ارادے سے باہر بھی نکلی تھی لیکن پھر ایک دم ٹھنک گئی۔ وہ ستون کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے سنا اباجان گنگنارہے تھے۔ ہو لے ہو لے بابا بلھے شاہ کی کوئی کافی ان کے ہونٹوں سے مترنم شکل میں نکل رہی تھی۔ آج بہت عرصے بعد شاید سال ڈیڑھ سال بعد اس نے اباجی کو یوں گنگناتے سنا تھا۔ ان کا گنگنا نا اس بات کی علامت تھا کہ وہ خوش ہیں۔ وہ اسی وقت گنگنایا کرتے تھے جب خوش ہوتے تھے۔ وہ بچپن سے ان کی آواز سنتی آئی تھی۔ کبھی ان کی چھاتی پر سر رکھ کر کبھی ان کے کندھے پر سوار ہو کر، کبھی ان کے ساتھ کھیتوں کی سیر کرتے ہوئے۔ ان کی آواز بڑی میٹھی تھی۔ اس آواز کے ساتھ خوشی کی ایک لہری سفر کرتی تھی اور شانی کے دل میں اُتر کر تھی۔

ایک دم ہی شانی کے سارے ارادے ریت کی دیواروں کی طرح دھڑام سے گر گئے اسی دوران میں اباجی نے اسے دیکھ لیا۔ ”اوئے شانی“ وہاں کیا کر رہی ہو؟“ وہ اونچی آواز میں بولے۔

”بس آپ کو دیکھ کر باہر نکل آئی۔“

”اب نکل آئی ہو تو ادھر آؤ۔ گھاس پر ننگے پاؤں چل کر دیکھو مزہ آجائے گا۔“ وہ بولے۔

شانی باہر صحن میں آگئی اور شبنم آلود گھاس پر ننگے پاؤں اباجی کے ساتھ چلنے لگی۔ انہوں نے چلتے چلتے اپنا ایک بازو شانی کے کندھوں پر رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اسی طرح چہل قدمی کرتے ہوئے وہ بولے۔ ”آج رات میں دیر تک تیرے بارے میں سوچتا رہا“ سویرے عادل کی حالت عجیب ہو رہی تھی پتا نہیں کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ جو دعا بھی مانگوں گا ضرور پوری ہوگی۔ میں نے یہیں گھاس پر نماز پڑھی اور پھر تیرے لئے بڑی لمبی دعا مانگی..... دعا مانگ کر میرے دل کو عجیب سی تسلی ہو گئی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ہم نے تیرے لئے جو فیصلہ کیا ہے وہ بڑی برکت والا ہے۔ تو بہت خوش رہے گی شانی..... دیکھنا تجھے بتائی نہیں چلے گا کہ تو ہم سے جدا ہوئی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے اباجی۔“ وہ گہری اداسی سے بولی اور کچھ اور بھی باپ کی بغل میں گھس گئی۔

”دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا۔ فاخر بڑا اچھا لڑکا ہے میرے دل کی گواہی ہے کہ بہت جلد تم دونوں کے مزاج مل جائیں گے ایسی اپنائیت ہوگی تم دونوں میں کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔“ شاید چوہدری ارشاد کچھ اور بھی کہتے لیکن یہ محسوس کر کے کہ بیٹی شرمارہی ہے اور ان کے بازو کے نیچے سٹ رہی ہے تو انہوں نے موضوع بدل دیا۔ ”پتا ہے میں یہاں ننگے پاؤں گھومتے ہوئے کیا گنگناتا ہوا تھا؟“

”کیا؟“ اس نے ہولے سے پوچھا۔

”یہ ایک کافی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ غم اور خوشی تو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں جہاں غم ہوگا وہاں خوشی بھی ضرور آئے گی شرط صرف یہ

ہے کہ بندہ بُرے وقت میں صبر سے اچھے وقت کا انتظار کرے۔“

باپ کو خوش اور مطمئن دیکھ کر شانی کے ہونٹوں کو تالا سا لگ گیا۔ وہ جو کچھ کہنے آئی تھی وہ اس کے سینے میں ایک آگ کی طرح تھا لیکن اب گھٹ کر چنگاری کی طرح رہ گیا۔

دو پہر سے ذرا پہلے سیکنہ آدھمکی۔ وہ زبردستی اس کے کمرے میں گھس آئی اور پلنگ پر اس سے باقاعدہ کشتی کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اسے گدگداتی بھی جا رہی تھی۔ ”ایسی کم تیری طبیعت کی، ابھی طبیعت خراب ہونے کے دن کہاں ہیں، ابھی تو طبیعت اچھی ہونے کے دن ہیں۔“

شانے نے اسے بہتر اہٹانے کی کوشش کی مگر وہ کہاں ٹلنے والی تھی جب تک شانی کے دودھیا چہرے پر تھوڑی سی ہنسی نہیں آئی اس نے اسے چھوڑا نہیں، دھینگا مشتی کے بعد دونوں ہانپ گئیں اور پھر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر سنجیدگی سے دیکھنے لگیں۔

”ہاں اب بتا..... کیوں طبیعت کی خرابی کا رولا ڈال رہی ہے۔ اصل بات کیا ہے؟“

غیر متوقع طور پر ایک دم شانی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ سیکنہ حیران رہ گئی، وہ سمجھ گئی کہ بات واقعی اہم ہے۔ اس نے اصرار کے ساتھ شانی سے پوچھا اور شانی نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد سب کچھ سیکنہ کے گوش گزار کر دیا۔

دونوں سہیلیاں بہت دیر تک گم صم بیٹھی رہیں۔ تقریباً تین سال پرانے واقعے کی تفصیلات کسی فلم کے مناظر کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں، کافی دیر بعد سیکنہ نے شانی کے بکھرے بکھرے بالوں کو اس کے کانوں کے پیچھے اڑسا اور کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ”شانے، یہ سب ایک اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”نہیں سیکنہ، یہ تو خود کو دھوکا دینے والی بات ہے۔“

کچھ دیر گہری خاموشی طاری رہی تب سیکنہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”چلو مان لیا کہ یہ ایک اتفاق نہیں ہے..... تو ابھی..... اب پیچھے ہٹنے والی بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو بڑی بدنامی والا معاملہ ہو جائے گا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے اور پھر سب سے بڑھ کر چاچا جی (چوہدری ارشاد) کا خیال آتا ہے، ان کے دل پر کیا گزرے گی شانی..... وہ لوگوں کو کیا جواب دیں گے کہ بالکل کنارے پر پہنچ کر سب کچھ کیوں ختم ہو گیا ہے۔“

”میری سوچ سوچ کر تو اپنے اندر مر رہی ہوں۔ اب جی پہلے ہی بال بال قرضے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ میری خوشی کے لئے پتا نہیں انہوں نے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ اب بیٹی کا بار سر سے اتارنے کا وقت آیا ہے تو سب کچھ چو پٹ ہو رہا ہے۔“

دونوں تادیر سر جوڑ کر بیٹھی رہیں اور اپنی عقل سمجھ کے مطابق اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہیں۔ ان کی سوچ میں سنجیدگی تھی اور ایثار و صبر کا وہی آفاقی جذبہ تھا جو قدرت نے بہت حوا کے اندر روز اول سے محفوظ رکھا ہے۔ دیرے دیرے شانی ایک نتیجے پر پہنچ رہی تھی۔ سیکنہ نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا دل کہتا ہے شانی، سب ٹھیک ہو جائے گا، وہ تیری من موئی صورت دیکھے گا تو ساری پچھلی باتیں بھول جائے گا، دیکھ لینا تیرا پیارا سے پیچھے مڑ کر دیکھنے ہی نہیں دے گا۔ اگر وہ کوئی سخت بات کہے بھی تو تم خاموشی سے سن لینا بلکہ اس سے معافی مانگ لینا۔“

اپنے شوہر کی عزت کرنے سے عورت کی عزت گھٹتی نہیں بڑھتی ہے۔“

”لیکن سیکنہ! اگر پھر بھی.....؟“

”مجھے یقین ہے شانی! تیری محبت اسے سب کچھ بھلا دے گی، چار پانچ دنوں میں وہ تیرے پاؤں دھوتا نظر نہ آئے تو میرا نام بدل دینا۔“

رات کو بھی شانی دیر تک سوچتی رہی۔ سیکنہ نے جو کچھ کہا وہ گویا اس کے اپنے دل کی آواز تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ جو واقعہ ہوا اس میں کس کی عداوت یا کدورت کو دخل نہیں تھا۔ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا..... شانی کی جگہ کوئی لڑکی بھی ہوتی تو وہ اس واقعے میں اسی طرح کارِ عمل ظاہر کرتی۔ شانی کا دل بھی یہی کہہ رہا تھا کہ اس کا ہونے والا مجازی خدا اس معمولی واقعے کو بنیاد بنا کر اس کی اور اپنی زندگی میں مستقل زہر نہیں گھولے گا۔ بہر حال ان سارے مثبت خیالات کے باوجود وہ ابھی تک کسی حتمی فیصلے تک نہیں پہنچ پائی تھی۔

رات کو وہی ہوا جو اکثر ہوا کرتا تھا۔ وہ بستر پر لیٹی اور اس نے سونے کے لئے اپنا سر تکیے پر رکھا تو اس کی نظریں خود بخود سامنے دیوار پر جم گئیں۔ وہاں اس کی ماں کی تصویر تھی، ہلکی نیلی قمیص جس کے گلے پر خوبصورت کڑھائی تھی۔ سر پر لیس دار دوپٹا، چہرے پر نیکی اور آنکھوں میں ممتا کا سمندر۔ وہ تصویر کی طرف دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ دھیرے دھیرے جیسے تصویر میں زندگی کی لہر دوڑتی چلی گئی، پھر وہ مکمل طور پر زندہ ہو گئی، جیتی جاگتی..... اپنی لاڈلی کی طرف محبت سے دیکھتی ہوئی..... اکثر ایسا ہوا کرتا تھا۔ ماں جیتی جاگتی حالت میں اس کے سامنے آ جاتی تھی وہ کچھ بولتی نہیں تھی لیکن شانی اس کی آنکھوں سے اپنے ہر سوال کا جواب پڑھ لیتی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا کہ ماں اس سے بہت دور ہونے کے باوجود اس کے پاس ہے۔ اس کی رہنمائی کرتی ہے جیسے اپنی زندگی میں کیا کرتی تھی۔ آج بھی وہ کچھ کہہ رہی تھی اپنی لاڈلی کے درد کو محسوس کر کے اس کی دل جوئی کر رہی تھی۔ شانی نے غور سے ماں کی آنکھوں میں دیکھا..... یہ آنکھیں جیسے کہہ رہی تھیں تم جو کچھ سوچ رہی ہو وہ ٹھیک ہے، تم آگے قدم بڑھاؤ، عورت تو نام ہی قربانی کا ہے۔

☆=====☆=====☆

اک قطرہ خون

ایک قطرہ خون، مصنفہ عصمت چغتائی صاحبہ کی تحریر ہے جس میں انہوں نے مشہور واقعہ کر بلا اور نواسا رسول سیدنا امام حسینؑ کی شہادت کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ایک ایسی تحریر جسے پڑھ کر آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جائیں گی اور دل بے اختیار خدا کے حضور سر بسجود ہو جائے گا۔ **عصمت چغتائی صاحبہ** کی یہ کتاب آپ کتاب گھر کے سیکشن **اسلامی تاریخی ناول** میں پڑھ سکتے ہیں۔

اور پھر وہ دن بھی آگیا جب دولہا راجا کی بارات کو نار پور سے رنگ والی میں پہنچنا تھا۔ بارات میں دوشاندرا فلانگ کو چڑھیں۔ بیس کے قریب کاریں تھیں۔ پانچ چھ لینڈ کروزر اور پچاس اس کے علاوہ تھیں۔ دولہا نے نار پور سے رنگ والی کے مضافات تک کا سفر تو لینڈ کروزر میں کیا تھا، لیکن گاؤں میں داخل ہوتے ہی اسے ایک شاندار سفید بگھی میں سوار ہونا تھا۔ یہ بگھی ایک روز پہلے ہی مقررہ مقام پر پہنچ چکی تھی۔ چار گھوڑوں والی اس زبردست بگھی میں سوار ہو کر جب دولہا اپنی بارات کے ساتھ گاؤں کی طرف روانہ ہوا تو یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بینڈ باجوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا لیکن پھر بھی بے تحاشا آتش بازی ہو رہی تھی اور بموں کے فلک شکاف دھماکے تھے۔ دولہا کے یار دوست بے دریغ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دہن کو بیابان نہیں بلکہ اٹھانے آئے ہیں۔

شروع میں ہی ایک بدمزگی ہو گئی۔ مقامی رواج کے مطابق گاؤں کے داخلی راستے پر کچھ عورتوں اور لڑکیوں نے ہنجرہوں کے ساتھ مل کر بارات کو روکا اور ان سے ہنسی مذاق کیا۔ یہ ایک عام سی رسم تھی اس میں دولہا اور اس کے دوستوں سے چھیڑ چھاڑ کی جاتی تھی اور ان کے راستے میں روڑے اٹکائے جاتے تھے۔ بارات کے بزرگوں میں سے کچھ لوگ پیار محبت سے کہہ کر یا کچھ روپے دے دلا کر باراتیوں کا راستہ صاف کرتے ہیں لیکن نار پور سے آنے والے باراتیوں کو اس رسم میں شاید اپنی توہین نظر آئی۔ کچھ باراتی عورتوں سے جھگڑ پڑے اور انہیں دھکیل کر راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف سے قدرے سخت جواب ملا تو وہ باقاعدہ ناراض ہو گئے، نوبت تلخ کلامی تک پہنچ گئی۔ اس سے پہلے کہ معاملہ مزید بگڑ جاتا، چوہدری ارشاد کے چھوٹے بھائی رئیس احمد کو خبر ہوئی اور وہ دو تین بزرگوں کو لے کر بھاگ بھاگ موقع پر پہنچا اور مشتعل باراتیوں کو بمشکل ٹھنڈا کر کے معاملہ رفع دفع کیا۔

باراتیوں کو ٹھہرانے کے لئے حویلی کے علاوہ دودھ گھر مکانوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ یہ دونوں مکانات رنگ والی کے سرکردہ زمینداروں کے تھے اور انہیں رہائش کے لئے بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا تھا۔ ایک مکان تو حویلی کے بالکل ساتھ ہی واقع تھا لیکن دوسرا تھوڑے فاصلے پر تھا۔ جن افراد کو اس دوسرے مکان میں ٹھہرایا جانا تھا انہوں نے ناک بھوں چڑھائی اور شکوہ کیا کہ انہیں باقی بارات سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

شام سے پہلے پہلے یہ پریشانی کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی۔ دہن والے پہلے ہی بوکھلائے ہوئے تھے اب مزید بوکھلا گئے۔ ہنگامی طور پر حویلی کا وہ حصہ خالی کر لیا گیا جہاں چوہدری ارشاد کے خاندان کی عورتوں اور بچوں وغیرہ کو رات بسر کرنا تھی، افراد تفری میں نئے انتظامات کئے گئے اور اس جگہ کو باراتیوں کی رہائش کے قابل بنایا گیا۔ پھر بھی فضا میں ایک کشیدگی سی موجود رہی۔ اس کشیدگی کی وجہ وہ واقعہ ہی تھا جو بارات کے گاؤں میں داخل ہوتے وقت پیش آیا تھا۔

دولہا کی گہری سنجیدگی اور رعب داب عورتوں میں موضوع گفتگو بن رہا۔ وہ بہت کم مسکراتا تھا چنچل لڑکیاں سوچ رہی تھیں کہ نکاح کے بعد دولہا سے چھیڑ چھاڑ کی رسمیں وہ کس طرح پوری کریں گی۔ خاندان کے بزرگوں نے بھی انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ زیادہ شوخی اور طراری نہ دکھائیں۔

رات کے کھانے کے بعد باراتیوں نے اپنے طور پر جشن کا اہتمام کیا۔ وہ اپنے ساتھ لاہور کی چند ہنگی رقاصائیں لائے تھے، رات گئے تک ناچ گانا ہوا، بڑھکیں ماری گئیں اور امارت کے زبردست مظاہرے کے طور پر رقاصوں پر لاکھوں کرنسی نوٹ نچھاور کئے گئے۔ یہ ہلا گلا ضرورت

سے کچھ زیادہ تھا اور گاؤں کے سنجیدہ لوگوں کو پسند نہیں آیا۔ غیر معمولی شور شرابے کی وجہ سے رات گئے تک گاؤں کے اکثر مکین سو نہیں سکے یہاں تک کہ جب گاؤں کی مسجد سے ”تہجد“ کی اذان بلند ہوئی تو اس وقت بھی رقص و سرور کی محفل میں کسی طرح کا وقفہ نہیں کیا گیا۔ مسجد کے مؤذن جو اکثر امامت بھی کراتے تھے، چوہدری ارشاد کے ایک دور کے رشتے دار تھے اور حاجی معصوم کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ وہ اذان کے فوراً بعد حویلی پہنچے اور چوہدری ارشاد سے ملے۔ انہوں نے اپنا غصہ بمشکل دبا رکھا تھا۔ چوہدری ارشاد سے بولے۔ ”ارشاد بھائی ان لوگوں نے ساری رات آفت مچائے رکھی ہے اب صبح نماز روزے کا وقت ہے اب یہ شور شرابا ختم کر دیں۔“

جی تو چوہدری ارشاد کا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ وہ من چلوں کی اس ٹولی کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ وہ اپنا شغل میلا ختم کر کے اب کچھ دیر آرام کر لیں لیکن وہ ضبط کئے ہوئے تھے۔ وہ اگلے دس بارہ گھنٹوں میں کوئی بھی ایسی بات کرنا نہیں چاہتے تھے جس سے بد مزگی میں اضافہ ہو..... اور اس کا نتیجہ بعد میں شانی کو بھگتنا پڑے۔ اس نے حاجی معصوم کو بڑے تحمل سے سمجھا بھجا کرواپس بھیج دیا۔

تیس چالیس افراد کی جس ٹولی نے رات بھر ہنگامہ مچائے رکھا تھا وہ تو صبح دم نڈھال ہو کر سوئی رہی تاہم باراتیوں کا ایک دوسرا گروہ جس میں دو لہا صاحب بھی شامل تھے صبح سویرے شکار کو نکل گیا۔ شانی کے چچا رئیس احمد اور ان کے دو ملازم بھی ساتھ تھے۔ دوپہر سے ذرا پہلے یہ اطلاع چوہدری ارشاد تک پہنچی کہ شکاری گروپ ذخیرے میں مچھلی کا شکار کر رہا ہے اور اس کے لئے بم استعمال کر رہا ہے۔ ذخیرے سے مراد پانی کا وہ ذخیرہ تھا جو رنگ والی کے نواح میں واقع تھا اور جسے چوہدری ارشاد نے بڑی چاہت سے ایک وسیع مچھلی فارم کی شکل دے رکھی تھی۔ یہاں وہ لوگ صرف جال یا گنڈی سے مچھلی پکڑتے تھے..... بم استعمال کرنے کا انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی بم کے ذریعے مچھلی کو ہلاک کر کے پکڑنا ایک ناپسندیدہ طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس اطلاع پر چوہدری ارشاد اور اس کے دیگر عزیزوں کو بہت دکھ ہوا۔ بہر حال چوہدری ارشاد نے آج ہونٹ سی رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔

کل ”شروعات“ میں ہی جو بد مزگی پیدا ہو گئی تھی وہ اسے کسی طور بڑھاوا دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ معاملہ اس کی جان سے پیاری لاڈورانی کا تھا۔ ایک دن تو کیا وہ اس کے لئے زندگی بھر کے لئے اپنے ہونٹ سی سکتا تھا۔

دوپہر کے فوراً بعد نکاح ہوا۔ نکاح کے بعد کھانا اور کھانے کے بعد مختلف رسمیں ادا کی گئیں۔ شانی دلہن کے سُرخ لباس میں کوئی آسمانی شے نظر آرہی تھی۔ جو نگاہ اسے دیکھتی تھی بس کہیں کھو کر رہ جاتی تھی۔ گڑیا سی معصوم کا بچہ سی نازک پری چہرہ رنگت ایسی جیسے دودھ میں شہد اور گلاب ملا ہوا ہو۔ جب وہ آری کی رسم کے لئے اپنے دو لہا کے پہلو میں بیٹھی تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ اس جوڑی میں توازن کی کمی ہے۔ فاخر احمد چوڑا چکلا اور عمر میں تھوڑا سا بڑا لگتا تھا۔ شانی اس کے پہلو میں بیٹھی کچھ اور نازک اور چھوٹی موٹی محسوس ہوتی تھی۔

کسی نے رسماً کہا۔ ”چاند سورج کی جوڑی ہے۔“

لیکن اگر یہ چاند سورج کی جوڑی بھی تھی تو پھر چاند سورج کی راتوں کا تھا اور سورج جون جولائی کی گرم ترین دوپہر کا متمتیا ہوا اور شعلہ صفت۔ بزرگوں کی ہدایت کے مطابق جوتا چھپائی اور دودھ پلائی وغیرہ کی رسموں کے دوران میں لڑکیوں نے زیادہ چھیڑ چھا نہیں کی اور یہ رسمیں

جلدی سے ختم ہو گئیں۔ شانی کی رخصتی کے موقع پر چوہدری ارشاد بے حد اداس اور غمزدہ نظر آئے۔ شانی کی جدائی کے موقع پر یہ اداسی اور غم سمجھ میں آنے والی بات تھی لیکن لگتا تھا کہ بات اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ رخصتی کی رسموں کے دوران میں ایک دو بار شانی کی نگاہ والد کے چہرے پر پڑی اور اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ اب کون ابا جان کے سر ہانے دودھ لے کر کھڑا ہوگا، کون ان کی ٹانگیں دبائے گا، کون جمعے کے جمعے ان کے سر میں ماش کرے گا، اُن گنت خیالات تھے جو شانی کو آبدیدہ کر رہے تھے۔ وقت رخصت وہ ابا جان کے سینے سے چمٹ کر یوں روئی کہ دل جیسے آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایک ایک سیٹلی بلکہ گاؤں کی ہر عورت کے گلے لگ کر روئے لیکن جو اسے جیون کے بندھن سے باندھ کر اپنے ساتھ لے جا رہے تھے ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ انہیں عصر سے پہلے پہلے ہر صورت میں روانہ ہونا تھا۔ دولہا اور اس کے رفقاء بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ انہیں وداع کی ہر رسم بے کار اور طویل محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ روتی سسکتی اپنوں سے جدا ہو گئی۔ سسرال کی ایک کچم شیم عورت نے اسے تقریباً کھینچ کر کبھی کے قریب پہنچا دیا۔ کبھی پر سوار ہونے کے بعد اس نے مڑ کر ایک نظر اپنے گاؤں پر ڈالی۔ سارا منظر رو رہا تھا۔ لگتا تھا ہر جاندار وہ شے اشک بار ہے۔ وہ گلیاں جن میں وہ کھیلی کودی تھی وہ درخت جن میں جھولے ڈالے تھے وہ باغیچے جن سے پھول چنے تھے وہ سب اسے بھیگی آنکھوں کے ساتھ الوداع کہہ رہے تھے۔ وہ انجانے لوگوں اور انجانے گلی کوچوں کے سپرد ہو رہی تھی۔

اپنے گاؤں سے رخصت ہوتے وقت شانی کو کچھ ادھور سا لگ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اہم بات بھول رہی ہے کوئی بہت اہم بات اس کے ارد گرد اتنا شور اور ہنگامہ تھا کہ وہ بات اس کے ذہن کی گرفت میں نہیں آئی۔



کرشن چندر کے بہترین افسانے

کرشن چندر کے بہترین افسانے، مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے افسانوں پر مبنی ہے، اس کتاب میں اُن کے افسانے، برے پھنے، زندہ نوادر، نیوٹرل زون، ٹیسر پچر، پرنس فیروز، تائی ایسری، جامن کا پیڑ، بھیاجی، سا بھجے کا مردہ، ملکہ کی آمد، داتن والے، جولی کیساں، شنو، خوشی، پینگ پینگ فننگ، آؤ مرجائیں، ٹیکسی ڈرائیور، کچر ابا بابا، تنہائی کا پھول، سپاہی۔ کرشن چندر نے ہمیں فلم انڈسٹری کے لئے بھی کام کیا جہاں انہیں فلم نگری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اپنے انہیں مشاہدات کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنا مشہور ناول ”چاند کا گھاؤ“ لکھا جو کہ ہمیں فلم انڈسٹری کی ہی کہانی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کشمیر میں بھی گزارا اسلئے ان کے کچھ ناولوں کا پس منظر کشمیر کے زندگی پر مشتمل ہے۔ **کرشن چندر کے بہترین افسانے** کتاب گھر کے افسانے سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

نارپور میں شانی کا نیا گھر بڑا شاندار تھا، گاؤں کے بچوں بچہ یہ بھی ایک شاندار حویلی تھی۔ یہ حویلی چوہدری ارشاد کی حویلی سے تقریباً دو گنا بڑی تھی۔ اس کی آرائش میں بھی بے دریغ رو پیہ خرچ کیا گیا تھا، کوشش کی گئی تھی کہ حویلی کو کچھ شہری رنگ بھی دیا جائے۔ حویلی کی بناوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بنے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اونچے اونچے دروازے بڑے بڑے فانوس، قالین پوش راہداریاں، دیواروں پر تصویریں..... وہ سب کچھ تھا جو رہائشی عمارتوں کو ہر شکوہ بناتا ہے لیکن ایک بات نمایاں تھی۔ اس ساری سجاوٹ میں کہیں کہیں بھونڈا پن بھی نظر آتا تھا۔

مختلف رسموں کے بعد سکوی میٹھی شانی کو جس کمرے میں پہنچایا گیا وہ عورتوں سے کچھ کھج بھرا ہوا تھا۔ شوخ رنگ کے کپڑے، بھاری بھاری گہنے، یہ عورتیں اور لڑکیاں شوخ قہقہے لگاتی ہوئی شانی پر گری جارہی تھیں۔ وہ جیسے کوئی نئی خریدی ہوئی بھیڑ بکری تھی، کوئی اس کی چھوٹی سی ناک پر تبصرہ کر رہی تھی، کوئی اس کے ہونٹوں پر، کوئی زیورات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ یہ سارے مشاغل شانی کے لئے سخت وحشت کا باعث تھے۔ اس کا دل اندر ہی اندر ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ کیا ہونے والا ہے؟ کیا ہوگا؟ یہ سوال ایک شعلے کی طرح شانی کے سینے میں اٹھتا تھا اور پورے جسم میں جلن سی پھیل جاتی تھی۔ ماضی کے چند مناظر بار بار شانی کی نگاہوں کے سامنے آتے تھے اور ہر بار ان مناظر سے وابستہ اندیشے گھمبیر ہو جاتے تھے۔ کل تک وہ اپنوں میں تھی۔ اس کے چاروں طرف محبت اور شفقت کی بارش تھی، آج ارد گرد کوئی چہرہ مانوس نہیں تھا، کوئی آواز جانی پہچانی نہیں تھی، وہ انہنی چہروں اور آوازوں میں گھری ہوئی تھی اور اپنے اندر سمٹ رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے تو اسے یوں لگا کہ وہ ایک قیدی ہے، اسے میدان کارزار سے اچک کر اغیار کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اب حریف سپاہ کی چھٹی ہوئی نظریں اس کے چاروں جانب جال بن رہی ہیں۔

نارپور واپس پہنچتے پہنچتے رات بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ تھکاوٹ سے شانی کا پہلے ہی بُرا حال تھا اور پورے عورتوں نے اس بُری طرح کمرے میں ہجوم لگایا کہ شانی کی طبیعت بگڑنے لگی۔ اس کی ہتھیلیوں پر پسینہ تو پہلے سے ہی آ رہا تھا، اب متلی بھی محسوس ہونے لگی، عورتوں میں سے ایک سمجھ دار خاتون نے شانی کی کیفیت بھانپ لی۔ اس نے کہہ سن کر عورتوں کو کمرے سے باہر نکالا۔ رش ذرا کم ہوا تو شانی کو پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں برف ہو رہے تھے، چہرہ بھی ہلدی تھا۔ دو ملازماؤں نے اس کی ہتھیلیوں اور تلووں کی مالش شروع کر دی۔ ایک عورت دستی پتکھے سے ہوا دیئے لگی، سیون آپ میں پانی اور نمک ملا کر اسے تھوڑا تھوڑا پلایا گیا، متلی تو کم ہو گئی لیکن بدن کا ٹمپر پچرا سی طرح رہا۔ پسینہ بھی آتا رہا۔

کوئی بولی۔ ”نازک سی ہے بے چاری، لگتا ہے جسم میں خون ہی نہیں ہے۔“
دوسری نے کہا۔ ”غریب گھر کی ہو تو پھر بھی بندہ کہے..... اچھے بھلے کھاتے پیتے گھر کی ہے، پھر بھی اتنی سی جان یہ بھلا کیا بات ہوئی۔“
ایک تیسری آواز شانی کے کانوں میں پڑی۔ ”یہ آج کل کی کڑیوں کو خود بھی تو فیشن کی مار ہے، جسم پر بوٹی نہیں چڑھنے دیتیں، چار پڑوپیاں دانے اٹھائیں تو کمر میں چک پڑ جاتی ہے۔ ایک ہمارا وقت تھا ڈھائی من کی بوری اٹھا کر کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے۔“
ایک جلی کئی سی آواز دور سے سنائی دی۔ ”جسم پر بوٹی نہیں ہوگی تو غش تو پڑیں گے۔“

دواڑھائی گھنٹے بعد شانی کی طبیعت سنبھل گئی لیکن تب تک رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا، عورتوں نے اسے جگہ عروسی میں نہیں بھیجا۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا۔ شانی کو امید تھی کہ وہ کل تک خود کو پوری طرح سنبھال لے گی..... اور ماحول سے بھی مانوس ہو جائے گی۔

دن چڑھ گیا، ایک بار پھر گہما گہمی شروع ہو گئی۔ شانی کے ارد گرد جو باتیں ہو رہی تھیں ان سے شانی کو معلوم ہوا کہ دولہا صاحب صبح سویرے پٹواری کے ساتھ کسی کام سے نکل گئے ہیں اور اب ناشتے کے لئے ان کی واپسی کا انتظار ہو رہا ہے۔ دولہا کی واپسی گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوئی۔ اس دوران میں سینکڑوں ہی اندیشے شانی کے ذہن میں کلبلا رہے، کہیں یہ بات نہ ہو؟ کہیں وہ بات نہ ہو؟ آخر وہ صبح سویرے کیوں چلے گئے ہیں؟ ناشتہ بھی نہیں کیا ہے، کسی کو بتایا بھی نہیں ہے۔

دولہا صاحب واپس آئے تو شانی کی جان میں جان آئی۔ ناشتہ ان دونوں نے اکٹھے کیا دیگر لوگ بھی موجود تھے۔ ابھی تک شانی نے شوہر کو نظر بھر کر دیکھا نہیں تھا۔ ناشتے کے دوران میں گھونگھٹ کی اوٹ سے اس نے ایک نظر شوہر کے چہرے پر ڈالی۔ جو پہلا تاثر شانی کے ذہن میں ابھرا وہ ایک سنجیدہ گہرے اور جسمانی طور پر مضبوط شخص کا تھا۔ ایسا شخص جو معاملات کو کنٹرول کرنا جانتا تھا جو دوسروں کا تابع نہیں ہوتا بلکہ دوسرے اس کے تابع ہوتے ہیں۔

ولیمہ تین روز بعد تھا۔ دوپہر کو شانی نے نہا دھو کر پھر سے اپنا عروسی لباس پہن لیا۔ آج وہ خود کو تازہ دم اور قدرے مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ سہ پہر کو سونے کے بہانے دیر تک کمرے میں بند رہی اور خود کو پیش آنے والے حالات کے لئے ذہنی طور پر تیار کرتی رہی۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اس کا شوہر ”خدا بخش کے کنوئیں“ پر پیش آنے والے واقعے کا ذکر کرے یا نہ کرے۔ وہ اس واقعے پر شوہر سے معذرت ضرور کرے گی وہ نہیں چاہتی تھی کہ زندگی کے نئے سفر کا آغاز دل میں کوئی پھانس رکھ کر کیا جائے۔ وہ پوری سچائی اور محبت کے ساتھ اپنی نئی زندگی کو گلے لگانا چاہتی تھی۔ وہ خود کو ایک ایسی خود پسند کی لئے تیار کر رہی تھی جس میں گریز اور غیریت کی الائنس تک نہ ہو اپنی ماں کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ ماں جو زندگی میں ہر قدم پر اس کی رہنمائی تھی اور مرنے کے بعد بھی ہر مشکل میں اس کے قریب ہوتی تھی۔

اس کی ماں قربانی، ایثار اور ضبط و تحمل کی تصویر تھی۔ پورے گاؤں میں ہر چھوٹا بڑا بزرگ اور بچہ انہیں وڈی آپا کہتا تھا اور واقعی انہوں نے آپا بن کر دکھایا تھا۔ وہ سب کا ایسے ہی خیال رکھتی تھیں جیسے اپنے گھر کے افراد کا رکھا جاتا ہے، کسی کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا، کسی کے مسئلے کو اپنا مسئلہ جان کر اسے حل کرنے کی کوشش میں لگ جانا..... ہر کسی کے غم اور خوشی میں پورے اخلاص سے شریک ہونا ان کا وطیرہ تھا۔ اپنی نندوں، دیوروں اور دیورانیوں کی طرف سے انہیں کئی سخت ترین امتحانوں میں ڈالا گیا لیکن وہ ہر کڑے امتحان میں سرخرو ہو کر نکلیں اور ہر امتحان کے بعد ان کی عزت و تکریم میں اضافہ ہی ہوا۔ ان کی موت پر اہل علاقہ بلک بلک کر روئے تھے۔ آج وہ ایک مثال کی حیثیت رکھتی تھیں اور کئی لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت..... عقیدت کی حدوں کو چھوتی تھی۔ شانی اسی باہمت ماں کی نیک سیرت بیٹی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ قدرت نے اسے بھی ایک امتحان میں ڈالا ہے۔

اور یہ شب عروسی تھی، وہ پھولوں کی بیج پر تھی، کھڑکیوں پر دبیز پردے تھے، شیشم کے بلند دروازے کے سنہری ہینڈل میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کا شوہر اندر آ گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ مزہ اور دبیز قالین پر بے آواز چلتا قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ شانی کا دل اس کے سینے میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑایا تھا۔ وال کلاک کی ٹک ٹک کے سوا کمرے میں کوئی آواز نہیں تھی۔ ایک میٹھی میٹھی سی لہر شانی کے سر پا میں دوڑ رہی تھی۔

لا تعداد بوجھل لمحے گزر گئے، کمرے کے ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، گٹھڑی بنی شانی نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور پھولوں کی لڑیوں کی

اوٹ سے دیکھا۔ فاخر صوفے پر بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں غنودگی سی تھی، چہرہ بے تاثر تھا۔ کیا سہاگ رات کو دو لہا کا چہرہ اتنا سا پاٹ ہوتا ہے۔ اس نے حیرت سے سوچا۔

تب ایک بار پھر اس کی نگاہوں میں ”خدا بخش کے کنوئیں“ کے مناظر گھومنے لگے، ایک ٹیس سی شانی کے دل میں اٹھی۔ اس نے چند لمحے مزید انتظار کیا پھر اپنی تمام تر ہمت اور طاقت جمع کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ مجھ سے ناراض ہیں شاید؟“

چند سیکنڈ بعد بھاری بھر کم آواز ابھری۔ ”ناراض؟ کس بات پر؟“

”میں جانتی ہوں آپ ناراض ہیں..... وہ واقعہ ایسا نہیں تھا جسے آسانی سے بھولا جاسکے۔ اس کے باوجود آپ نے مجھے اپنے قدموں میں جگہ دی ہے۔ اپنا شریک حیات بنایا ہے اسے آپ کا بڑا پین ہی کہا جاسکتا ہے۔“

”نہیں اس واقعے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔“ ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب ملا۔

”آپ کے نزدیک اہمیت نہ ہوگی لیکن میرے نزدیک ہے، آپ کی زندگی میں آنے کے بعد یہ اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ میرا رد عمل شاید ضرورت سے زیادہ سخت تھا۔ میں اس واقعے پر آپ سے معافی مانگتی ہوں۔“

کوئی جواب نہیں ملا بس ایک گہری سانس کھینچی گئی اور اس کے بعد گھمبیر خاموشی طاری ہو گئی، وہی وال کلاک کی ٹک ٹک گونجنے لگی۔

شانی نے کافی دیر تک فاخر کے بولنے کا انتظار کیا، اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ہونٹ بھی لرزاں تھے، تب ایک بار پھر وہ ہمت کر کے بولی۔ ”در..... دراصل اس وقت مجھے یوں لگا جیسے آپ.....“

”میں نے کہا ہے نا اس واقعے کی خاص اہمیت نہیں ہے۔“ فاخر نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹی۔

وہ سہم کر رہ گئی۔ فاخر کا آخری جملہ کانوں میں گونجنے لگا..... اس واقعے کی کوئی خاص اہمیت نہیں..... مطلب یہ تھا کہ کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہے۔

پھر تھوڑی دیر بعد شانی نے دوسرے زاویے سے اس فقرے کو سوچا۔ فاخر نے کہا تھا ”اس واقعے کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔“ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کسی اور واقعے کی اہمیت ہے۔ وہ ایک بار پھر جان سے لرز گئی۔

حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کا ریشمی گھونگھٹ منتظر تھا کہ اسے اٹھایا جائے لیکن گھونگھٹ کو اٹھانے والے ہاتھ اس سے دور تھے۔ وہ ساکت بیٹھی رہی۔ ان ہاتھوں کا انتظار کرتی رہی۔ پتا نہیں کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی پھر کوئی دھپ سے آکر اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ یہ فاخر تھا۔

”چلو لیٹ جاؤ تم بھی۔“ خشک لہجے میں کہا گیا۔

شانی چند لمحے تذبذب میں رہی پھر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی ہوئی نیم دراز ہو گئی اور پھر دراز ہو گئی۔ ”لائٹ تو بجھا دو۔“ ایک بار پھر غیر جذباتی اور تحکمانہ آواز ابھری۔

بات کرنے کے اس عام سے انداز نے شانی کو خجل کر دیا۔ وہ ذرا بوکھلا کر اٹھی اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا لیپ آف کر دیا۔ اس کا شوہر چند فٹ کے فاصلے پر بے تعلق سالیٹا ہوا تھا۔ وہ میٹھی میٹھی سی لہر جو سر شام سے شانی کے بدن میں چل رہی تھی اچانک ہی کہیں دم توڑ گئی خود سپردگی اور محبت

کے سلگتے ارادے، سفید راکھ کی طرح بجھ گئے۔ فاخر کروٹ بدل کر لیٹ گیا تھا۔ وہ پتا نہیں کتنی دیر تک سیدھی لیٹی رہی پھر کی طرح ساکت اپنے مقدر پر حیران..... پھر اس نے بھی ہو لے سے کروٹ بدل کر رخ دوسری طرف کر لیا۔ گھونگھٹ ابھی تک اس کے چہرے پر تھا لیکن اب اس میں جذبات کے ستارے نہیں جھلملائے تھے وہ کپڑے کے کسی بیکار چھتھرے کی طرح شانی کے حسین رخسار پر دھرا تھا۔ وہ سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ بات بھی نہیں تھی کہ شانی کے تہلکہ خیز ”قرب“ نے فاخر کو متاثر نہ کیا ہو۔ وہ کتنی بھی معصوم سہی لیکن ایک عورت کی نظر رکھتی تھی اور عورت اپنی طرف اٹھنے والی نظر کے درجہ حرارت کو لمحوں میں جان جاتی ہے۔ شانی اچھی طرح جانتی تھی کہ فاخر نے خود پر جبر کر کے خود کو اس سے دور رکھا ہوا ہے۔

رات گزر گئی، کھڑکیوں کے باہر چڑیاں چپکنے لگیں تو شانی نے کھڑکیوں سے پردے ہٹائے باہر ایک منگلی روشنی پھیل رہی تھی فاخر گہری نیند سو رہا تھا۔ شانی نے اس کے چہرے پر ایک سہمی ہوئی سی نظر ڈالی۔ نیند کی حالت میں وہ اپنی عمر سے کچھ اور بھی بڑا لگ رہا تھا۔ نیچے والا جبر ابھت چوڑا، کلمے پھولے ہوئے اور ناک پھیلی پھیلی سی۔ شانی کو اچانک اپنی دادی کی بات یاد آگئی۔ وہ کہا کرتی تھیں نیند کی حالت میں بس کوئی کوئی خوبصورت لگتا ہے، اکثر ایک دم اول جلول لگنے لگتے ہیں چادر فاخر پر سے کھسک گئی تھی اور اس کی پشت ذرا بے ڈھنگے انداز میں نظر آ رہی تھی۔ شانی نے ڈرتے ڈرتے چادر سیدھی کی اور پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ باہر لان میں گھاس شبنم سے گیلی تھی اسے ابا جان یاد آ گئے۔ صبح سویرے گھاس پر ننگے پاؤں چلنا ان کی عادت تھی۔ اس نے سوچا شاید وہ بھی اس وقت چڑیوں کی چہکار سن رہے ہوں اور چہل قدمی کر رہے ہوں۔ اس نے اپنے سفید گلابی پاؤں چپل کی قید سے آزاد کئے اور انہیں ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر لے آئی اسے ٹہلتے ہوئے تین چار منٹ ہوئے تھے۔ وہ گلاب کے ایک پودے کو دیکھنے کے لئے گاڑینا کی اونچی باڑ کی طرف گئی۔ اس نیم تاریک گوشے میں اچانک اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر اپنے سامنے دیکھا اور سر تا پا لرز گئی۔ وہیل چیئر پر ایک بدہیت شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کا گوشت ایک طرف سے لٹکا ہوا تھا ایک آنکھ بھی نیم وا تھی اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر بڑا اور سیاہ تھا اور وہ اپنی عمر رسیدہ لیکن نہایت غصیلی آواز میں گرج کر کچھ بولا۔

شانی کو الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن لہجے میں پوشیدہ شعلہ فشاں کڑک نے اسے سر تا پا لرزادیا۔ بدہیت بوڑھا آگے کو جھکا اس نے ایک ہاتھ وہیل چیئر کے ایک پیپے پر گھمایا چیئر ڈھلوان پر تھی تیزی سے شانی کی طرف آئی۔ یوں لگا جیسے بوڑھا اسے دھکیلے یا تھپڑ مارنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ شانی دہشت کے عالم میں پیچھے ہٹی اور پھر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ بوڑھے کی غضب ناک آواز اسے کمرے کے اندر تک سنائی دی تھی۔ شانی نے خوف کے عالم میں دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

فاخر اسی طرح بے خبر سو رہا تھا۔ شانی کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا اور پھر ہولے سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

کہیں یہ اس کے دادا سر تو نہیں ہیں؟ یہ سوال تیزی سے شانی کے ذہن میں ابھرا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کے سر تو فوت ہو چکے ہیں لیکن دادا سر حیات ہیں وہ بیمار رہتے ہیں۔ شانی کی معلومات کے مطابق ان کے جسم کا ایک حصہ فالج زدہ تھا۔ شادی کی گہما گہمی میں شاید اس کے دادا سر بھی اس کے آس پاس کہیں موجود رہے ہوں لیکن وہ انہیں دیکھ نہیں پاتی تھی۔ اب یہ سوال ایک دردناک چیخ کی طرح شانی کے ذہن میں ابھر

رہا تھا کہ کہیں یہی بدنما اور قہرناک بوڑھا تو اس کا دادا سر نہیں۔ اگر وہ اس کا دادا سر تھا تو پھر اس بری طرح اس پر خفا کیوں ہوا تھا؟ شانی نے تو کچھ کہا نہیں تھا، کچھ کیا نہیں تھا وہ ابھی تک اس منظر کی دہشت سے لرز رہی تھی۔

کچھ دیر بعد فاخر بیدار ہو گیا۔ ایک بے چارہ سا گھونگھٹ شانی کے چہرے پر اب بھی تھا لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ گھونگھٹ نکالنے اور گھونگھٹ اٹھانے والی رات تو گزر چکی تھی۔ شانی نے کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں فاخر سے کچھ نہیں کہا۔ ناشتے پر بھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ناشتے کے بعد فاخر نے سپاٹ لہجے میں شانی سے کہا۔ ”میں پہلی تاریخ کو لاہور جا رہا ہوں، شام تک آ جاؤں گا تم حویلی میں گھوم پھر سکتی ہو۔ میں نے بھابھو مقبول سے کہہ دیا ہے وہ تمہیں سب سے ملائے گی اور یہاں کے رہن بہن کے بارے میں بھی بتائے گی۔“

فاخر کے آخری الفاظ شانی کو کچھ اچھے نہیں لگے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی اجڈ گنوار ہو اور اسے یہاں کے اصول قاعدے سکھائے جانے ہوں۔ بہر حال اس نے ناگواری کی شکن اپنی پیشانی پر نہیں آنے دی۔ وہ بہت کچھ سننے کا حوصلہ لے کر اس چار دیواری میں اُتری تھی اور سچی بات تو یہ تھی کہ ابھی اسے کچھ زیادہ سہنا نہیں پڑا تھا۔ اس کے بیشتر اندیشے ابھی تک غلط ہی ثابت ہوئے تھے۔ کل تک اس کے دل کی گہرائی میں کئی طرح کے خدشے چھپے تھے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کہیں اسے فاخر کی طرف سے کسی کرخت یا جنونی رویے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کل رات یہ خطرہ باطل ثابت ہوا تھا۔ کل رات شانی نے ماضی کے ناخوشگوار واقعے کا ذکر بھی کر دیا تھا اور اس واقعے کے حوالے سے فاخر نے معمولی ردِ عمل ظاہر کیا تھا اور یہ ایک خوش آئند بات تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ شانی کے ذہن میں ایک نئی کھلک بھی پیدا ہوئی تھی۔ فاخر نے جو الفاظ استعمال کئے تھے ان سے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس واقعے کے علاوہ بھی کوئی وجہ نزاع ہو سکتی ہے۔ کیا کوئی اور واقعہ تھا؟ کوئی ایسا واقعہ جو ابھی تک شانی کے علم میں نہیں تھا۔ جس کی جڑیں ماضی میں یا کہیں ماضی بعید میں تھیں۔ پتا نہیں کیوں یہ سب سوچتے ہوئے شانی کے ذہن میں ایک بار پھر بدنما بوڑھے کی چیخ دھاڑ اور اس کی زہریلی نگاہیں آ گئیں۔

فاخر اپنی بھاری بھر کم جیب پر دو چار باڈی گارڈز کے ساتھ شہر چلا گیا۔ شانی، بھابھو مقبول کے ساتھ حویلی میں گھومنے پھرنے لگی۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ خوب بچی سنوری بھی تھی لیکن سجاوٹ میں سلیقہ کم اور دولت کی نمائش زیادہ تھی۔ اس حویلی میں مہرجی کو سربراہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مہرجی دراصل شانی کے دادا سر ہی کو کہا جاتا تھا۔ ان کی عمر سو سال سے اوپر بتائی جاتی تھی۔ مہرجی کے دو پوتے یعنی چوہدری بشیر اور چوہدری فاخر اس حویلی میں آباد تھے۔ چوہدری بشیر کی بیوی بھابھو مقبول تھی اور چوہدری فاخر کی نو بیوا تھا خود شانی تھی۔ چوہدری بشیر کے دو بچے بھی اہل خانہ میں شامل تھے۔ اس شاندار حویلی میں ایک مردانہ اور ایک زنانہ حصہ تھا۔ دو درجن کے قریب ملازم اور خادمائیں خدمت کے لئے موجود تھیں۔ شانی نے دیکھا کہ اس کی سرالی عورتیں سب کی سب خوب ہٹی کٹی تھیں۔ انہوں نے بھاری کپڑے اور بھاری زیور پہن رکھے تھے۔ شانی کو ان کی نگاہوں میں سچی محبت کے سوا ہر شے نظر آئی۔

شانی، بھابھو مقبول کے ساتھ حویلی میں گھومتی رہی لیکن اس کا ذہن مسلسل صبح سویرے ہونے والے واقعے میں اٹکا رہا۔ دوپہر کے کھانے سے ذرا پہلے بھابھو تیزی سے شانی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے فرہ چہرے پر پریشانی تھی۔ کمرے میں آتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور

شانی کو کندھوں سے تھامتے ہوئے بولی۔ ”شانی یہ تم نے آتے ساتھ ہی کیا کر دیا ہے۔ مہرجی کو ناراض کر دیا ہے تم نے وہ تو ایک دم غصے میں ہیں۔“

شانی نے لرز کر کہا۔ ”بھابو! میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“

”تو صبح سویرے پھلواری میں گئی تھی؟“

”ہاں، پھلواری میں تو گئی تھی۔“

”بس وہی بیڑا غرق کیا تو نے وہاں نہیں جانا تھا۔“ بھابو نے شپٹا کر کہا۔

”کیوں وہاں کیا ہے؟“

”بس کچھ ہے وہاں۔“ بھابو نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مہرجی نے منع کیا ہوا ہے، وہاں ان کے سوا کوئی نہیں جاسکتا۔ مالی نے بھی جانا ہو تو ان سے پوچھ کر جاتا ہے تو بغیر پوچھے وہاں چلی گئی اور دھڑکنے مارنے لگی۔“

”مم..... مجھے کیا پتا تھا بھابو۔“ شانی نے نہم کر کہا۔

”اب پتا نہیں مہرجی کا غصہ کہاں چڑھے اور کہاں اترے۔“ بھابو نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں ہجڑوں کی ایک ٹولی صحن میں آگئی اور مبارک سلامت کا شور بلند کرنے لگی۔ شانی اور بھابو کی بات و ہیں کی وہیں رہ گئی۔

☆=====☆

طاہر جاوید غل کے قلم سے اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت

پہاڑوں سے نکلنے والے، چٹانوں سے لڑنے والے اور
طوفانوں سے الجھنے والی ایک وحشی نوجوان کی داستان

تاریخ کے ڈھکے چھپے گوشوں سے
کشید کیا ہوا ناقابل فرسوش ناول

ایاق

خونخوار منگول چنگیز خان کے
خون آشام عہد کی ایک جھلک

دو جلدوں میں مکمل - 500 روپے

اپنے قریبی بکسٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میوہ ہسپتال، لاہور۔

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

Ph: 7247414

براہ راست
منگوانے
کا پتہ

شانی رات تک سہمی رہی۔ فاخر حویلی واپس آیا تو پہلے مہرجی کی طرف ہی گیا۔ وہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد وہ شانی کے پاس کمرے میں آیا۔ شانی نے چور نظروں سے دیکھا۔ فاخر کا سنجیدہ چہرہ معمول سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ گھمبیر آواز میں بولا۔ ”تم نے بے خبری میں مہرجی کو ناراض کر دیا ہے۔ وہ پھلواری میں کسی کو آنے نہیں دیتے، میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ ان کا غصہ ٹھنڈا تو ہو گیا ہے لیکن ختم نہیں ہوا۔ تم جا کر تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ جاؤ، ٹھیک ہو جائیں گے۔“ کچھ ہی دیر بعد ڈری سہمی شانی حویلی کے ایک کشادہ کمرے میں اپنے دادا سر مہرجی کے روبرو تھی۔ وہ پرانی طرز کے ایک بہت بڑے پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھے، ٹانگیں ایک قیمتی چادر سے ڈھکی ہوئی تھیں، دائیں ہاتھ میں ایک منقش حقے کی ٹہنی، کمرے کی دیواروں پر کلہاڑیاں، تلواریں اور رافلز وغیرہ آویزاں کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ الماری میں کچھ دیسی دوائیں شیشے کی بوتلوں میں رکھی تھیں۔

جس شخص کو یہاں مہرجی کہا جاتا تھا، اس کے چہرے پر بائیں طرف بد نما داغ تھے اور گوشت لڑکا ہوا تھا، چہرے کے اس حصے کو دیکھ کر ذہن میں ایک کراہیت آمیز خوف جاگتا تھا۔ چہرے کی دائیں جلد صحت مند تھی، دائیں آنکھ میں ایک تیز چمکیلی روشنی تھی۔ اس روشنی میں شانی کو اپنے لئے قہر اور نفرت کے آثار نظر آئے۔ شانی نے جھک کر سلام کیا اور سر کوند امت آمیز انداز میں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

فاخر نے آنکھوں کے اشارے سے شانی کو سمجھایا کہ وہ مہرجی کی پابندی کی طرف بیٹھ جائے۔ شانی چند لمحوں تک تذبذب میں رہی پھر بیٹھ گئی۔ جونہی وہ بیٹھی عمر رسیدہ شخص کے جسم نے بے چینی سے حرکت کی، پھر اس کے فالج زدہ ہونٹوں سے وہی غصیلی غوغاں برآمد ہونے لگی جو اس سے پہلے شانی نے علی الصبح سنی تھی۔ مہرجی کی آواز میں بلا کی سختی تھی اور ان کی اکلوتی سلامت آنکھ جیسے شعلے برسا رہی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے شانی کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا لیکن فاخر ان کی بات غالباً سمجھ رہا تھا۔

شانی نے بے چارگی کے عالم میں شوہر کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارے سے شانی کو سمجھایا کہ وہ دادا سسر کی ٹانگیں دبانا شروع کر دے۔ اپنے عجیب الوضع دادا سسر کے جسم کو ہاتھ لگاتے ہوئے شانی ہچکچاہٹ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پھر فاخر کی طرف دیکھا اس مرتبہ فاخر نے تحکمانہ اشارہ کیا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ مہرجی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ان کی ٹانگیں دبانا شروع کر دے۔

شانی نے دل کڑا کر کے اپنے ہاتھ مہرجی کی پلپی پنڈلیوں پر رکھ دیئے۔ وہ دبائے لگی مہرجی کے ہونٹوں سے تھوڑی دیر تک ناقابل فہم غصیلے الفاظ نکلتے رہے پھر ان الفاظ پر خاموشی غالب آ گئی، وہ ٹانگیں دباتی رہی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فقط مٹھی چا پی ہی کرتی رہے یا کچھ کہے بھی۔ اس نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے فاخر کی طرف دیکھا۔ فاخر نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں جوڑ کر اشارہ دیا کہ وہ معافی مانگ لے۔

شانی نے معذرتی لہجے میں کہا۔ ”معاف کر دیں دادا جی۔ مجھے پتا نہیں تھا پتا ہوتا تو کبھی ایسی غلطی نہ کرتی۔ میری وجہ سے آپ کو دکھ پہنچا میں بہت شرمندہ ہوں۔“

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ بس تیز سانسوں کی آواز سنائی دیتی رہی ایسی سانسیں جن میں عجیب ناگواری باس تھی۔ فاخر اسے وہاں تنہا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ شانی بے چین سی بیٹھی رہی اور پاؤں دباتی رہی۔ ایک بار اس نے ہمت کر کے دادا سسر کے بڑے

ہوئے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ ان کی اکلوتی سلامت آنکھ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی آنکھ میں اب بھی غصہ و درگزر یا نرمی کی جھلک نہیں تھی۔ یہ آنکھ اب بھی لشکارے مار رہی تھی۔ شانی کو یوں لگا جیسے اس آنکھ میں فتح مندی کی جھلک ہے۔۔۔۔۔ شانی کو یوں اپنے قدموں میں جھکا دیکھ کر مہرجی کے کسی اندرونی جذبے کی تسکین ہو رہی ہے۔ کیا یہ صرف اس کا وہم ہے یا حقیقت میں ایسا ہے؟ وہ سوچتی رہی اور اس کے کول ہاتھ مہرجی کی کہنہ سال پٹلی پنڈلیوں پر لرزرتے رہے۔ مہرجی کی سانسوں کی باس میں شانی کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی لیکن فاخر اسے تنہا چھوڑ کر پتا نہیں کہاں نکل گیا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد بھابھو آئی اور اس نے اس قید بامشقت سے شانی کو یہ کہہ کر رہائی دلائی کہ فاخر اسے بلارہا ہے۔

اس کی نازک کلاسیاں بری طرح دکھنے لگی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو فاخر وہاں نہیں تھا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ بھابھو نے صرف دادا سر سے اس کی جان چھڑانے کے لئے کہا تھا کہ فاخر اسے بلارہا ہے۔

وہ رات بھی ایسے ہی گزر گئی۔ شانی اور اس کا شوہر بستر کے دو کناروں پر علیحدہ علیحدہ لیٹے رہے۔ شانی نے ایک دو بار کروٹ بدلی۔ اس کے کپڑوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اس کی چوڑیاں چھٹکیں۔ شاید غیر ارادی طور پر اس نے شوہر کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ پتھر کی طرح ساکت اپنی جگہ لیٹا رہا۔ اس کے کشادہ سینے سے اس کی بھاری بھر کم سانس ایک پھنکار کی طرح نکلتی رہی اور پھر داخل بھی ہوتی رہی۔ کسی وقت شانی کا دھیان شادی کے روز پیش آنے والے واقعات کی طرف بھی چلا جاتا تھا اس روز کچھ بد مزگی ہوئی تھی بعد میں مچھلیوں کے شکار کے موقع پر بھی چند تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا تھا کہیں فاخر کے ذہن پر ان تازہ واقعات کا اثر تو نہیں تھا؟

اگلے روز شانی کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ کھڑکیوں سے باہر اجالا پھیل چکا تھا دور کہیں نار پور کے کھیتوں میں ڈیزل انجن ”کو.....کو“ کی آواز سے چل رہا تھا۔ ابھی دھوپ نہیں نکلی تھی۔ پھلواری میں پھول کھلے تھے گھاس پر اوس چمک رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس اوس پر ننگے پاؤں چلنے کے لئے شانی کا دل چل جاتا لیکن اب تو وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مہرجی کا گلڑا ہوا غضب ناک چہرہ کسی میخ کی طرح شانی کے ذہن میں گڑا ہوا تھا۔

وہ ہولے ہولے سیڑھیاں چڑھتی حویلی کی چھت پر چلی گئی۔ نار پور کی حیثیت ایک چھوٹے سے قصبے کی تھی کچے اور پکے دونوں طرح کے مکانات یہاں موجود تھے۔ مکانات سے آگے کھیتوں کے سلسلے تھے سنہری گندم حدنگاہ پھیلی ہوئی تھی کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ تھے۔ ان درختوں اور سنہری گندم کے ان کھیتوں سے آگے افق تھا اور افق سے آگے اس کامیکہ تھا۔ جہاں اس کے اباجی تھے اور اس کے سارے ”اپنے“ تھے۔ وہ ”اپنے“ جواب غیر محسوس ہونے لگے تھے۔ اچانک شانی کو کھٹ کھٹا کھٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ذرا جھجکتی ہوئی منڈیر کی طرف گئی۔ منڈیر کے جھروکوں میں اس نے دیکھا اور حیران رہ گئی دلچسپ نظارہ تھا۔ اس کا شوہر فاخر صرف ایک لنگوٹ میں نظر آ رہا تھا۔ دراصل یہ اس کی دھوتی تھی جسے اس نے لنگوٹ کی شکل میں کسا ہوا تھا۔ اس کا ٹھوس جسم ورزشی تھا اور سارے کا سارا گھنے سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ فاخر کے ہاتھ میں ایک چمکتی لائٹھی تھی۔ وہ بیک وقت دو افراد سے لٹھ بازی کر رہا تھا۔ فاخر کے انداز میں بلا کی پھرتی اور مہارت تھی۔

شانہ دیکھتی رہی اور اسے اپنا بھائی عادل سلطان یاد آ گیا۔ عادل بھی تو لائٹھی چلانے کا ماہر تھا۔ دو سال پہلے نوران شاہ کے میلے میں اس

نے لٹھی چلانے کا مقابلہ کیا تھا اور پندرہ پنڈوں کے جوانوں میں سے اسے پہلا انعام ملا تھا اور یہ شوق صرف عادل کو ہی نہیں تھا، جوانی میں اس کے ابا جی، چچا، بھائی اور چچا مشتاق بھی لٹھی چلاتے تھے۔۔۔۔۔ یہ ایک طرح سے ان کا خاندانی شوق تھا۔ اس کے ابا جی تو رائل کلب کا نشانہ لینے میں بھی مہارت رکھتے تھے، بچپن میں شانی نے خود دیکھا تھا کہ ملازم خادم حسین چینی کی پلیٹوں کو ہوا میں اچھالتا تھا اور ابا جی نشانہ لے کر ان پلیٹوں کو ہوا میں ہی پھینچو کر دیتے تھے۔ دس بارہ پلیٹوں میں سے شاید ہی کوئی پلیٹ گولی سے بچتی ہو۔

شانہ منڈیر کے رخنے میں سے اپنے توانا شوہر کو لٹھ بازوں سے برسرِ پیکار دیکھتی رہی۔ شوہر کے عریاں جسم کو دیکھتے ہوئے اسے عجیب سی جھک محسوس ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئی ہیں وہ رخنے سے پیچھے ہٹ گئی اور چھت کے درمیان میں جا کر چہل قدمی کرنے لگی۔ کھٹ کھٹا کھٹ کی آوازیں بدستور اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

وہ سوچنے لگی عادل اور فاخر کا شوق مشترک ہے ہو سکتا ہے یہ شوق دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئے۔ ایک دو ملاقاتوں میں جب وہ ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگیں۔ اس نے سوچا جب وہ دونوں ملیں گے تو وہ ان کے مشترک شوق کا ذکر ضرور کرے گی۔ پھر اسے یاد آیا کہ صرف ایک دن بعد ویسے کی تقریب ہے۔ اس تقریب میں اس کے میکے سے بھی سب کو شریک ہونا تھا۔ اس کے دل میں خوشگوار دھڑکن جاگنے لگی۔ ابا جی اور عادل کو دو بارہ دیکھنے کے خیال سے ہی اس کے اندر پھول سے کھل گئے۔ ان سے جدا ہوئے صرف دو روز ہوئے تھے لیکن شانی کو لگ رہا تھا کہ دو سال گزر گئے ہیں۔ مقامی رواج کے مطابق ویسے کے بعد شانی کو میکے چلے جانا تھا۔۔۔۔۔ اور پندرہ بیس روز وہاں گزارنا تھے۔ اپنی گلیوں اپنی سہیلیوں اور اپنے پیاروں سے ملنے کا خیال ہی شانی کے لئے جاں فرما تھا۔

اگلے روز دوپہر سے تقریب کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ حویلی کے صحن میں اور صحن سے باہر بڑے بڑے شامیانے لگائے گئے تھے۔ حویلی کے پچھواڑے ایک میدان میں اُن گنت چولہے بنائے گئے اور دیگوں کی کھڑکڑاہٹ سنائی دینے لگی حویلی کی طرف آنے والے راستوں کو خوب اچھی طرح سجا سنوار دیا گیا۔ شام کو مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ مہمانوں کی آمد کے ساتھ ہی لاہور سے بلائے گئے فوجی بینڈ نے طربیدار دھنیں بکھیرنا شروع کر دیں۔ ورائٹی شو کے لئے بھی لاہور سے فن کار بلائے گئے تھے۔ ورائٹی شو کا نام تو بس آڑ کے لئے استعمال ہو رہا تھا اصل کام ناچ گانے اور رقص و سرور کا تھا۔

شانہ ان ساری مصروفیات سے الگ تھلگ تھی اسے فقط اس بات سے دلچسپی تھی کہ اس کے گھر والے آ رہے تھے اور اسے چند دن کے لئے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے وہ جیسے ایک ایک پل گن کر گزار رہی تھی۔

رات کو سونے سے پہلے فاخر نے پوچھا۔ ”کتنے دن رہو گی؟“
وہ اپنے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے عام سے لہجے میں بولی۔ ”جتنے دن آپ کہیں۔“

”اگر میں کہوں کہ دو دن رہ کر واپس آ جاؤ تو آ جاؤ گی۔“
”اگر آپ ایسا کرنا مناسب سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

”مجھے پتا ہے کہ تمہارے ابا جی ایسا نہیں کرنے دیں گے وہ بڑے بے چین ہوں گے تمہارے لئے..... سنا ہے کہ بڑا پیار کرتے ہیں تم سے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”سنا ہے سارا پنڈا تمہارا دیوانہ ہے۔ بھابھو کہتی تھی جس سے بات کرو تمہاری تعریفوں کے پل باندھتا ہے۔“ شانی نے اس بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ فاخر نے بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تعریفیں تو تمہاری یہاں بھی شروع ہو گئی ہیں بھابھو اور بچے تو تمہارے گن گاتے ہی تھے اب ملازموں نے بھی گن گانے شروع کر دیئے ہیں۔“

”لل..... لیکن..... کچھ لوگ مجھ سے..... ناراض بھی لگتے ہیں۔“ شانی نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”مم..... میرا مطلب ہے کہ دادا جی.....“ شانی نے جلدی سے بات بدلی۔

”ان کی ناراضگی تم نے ابھی دیکھی نہیں وہ ہم سب کے بزرگ ہیں ان کی ہر بات برداشت کرنا پڑتی ہے۔“ فاخر کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

اس رات بھی شانی منتظر رہی لیکن فاخر کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی۔ وہ پتھر کی طرح ساکت و جامد بستر کے ایک کنارے پر ٹکا رہا۔ شانی نے کئی بار کروٹ بدلی۔ اپنی گت رنگ چوڑیوں کی جھنکار اس کے کانوں تک پہنچائی لیکن کوئی آواز جیسے اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ یہ بات اپنی جگہ حقیقت تھی کہ فاخر کو دیکھ کر اور اس کے ساتھ ایک کمرے میں رات گزار کر شانی کے دل میں کوئی کلی نہیں کھلی تھی۔ کوئی ایسی ہوا نہیں چلتی تھی جس سے دل کا موسم بدل سکے..... لیکن پھر بھی ایک میٹھی میٹھی سی لہر تھی جو فاخر کی قربت کے سبب اس کے بدن میں جا گئی تھی۔ اسے خود پیردگی پر ابھارتی تھی..... وہ خدائی حکم کے مطابق اپنا تن من اپنے شوہر پر نچھاور کرنا چاہتی تھی لیکن جسے وہ سب کچھ سوچنا چاہتی تھی وہ بے خبر تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ شانی کی خواہش ہی نہیں رکھتا تھا..... شانی نے اس کی سرخی مائل آنکھوں میں طلب کی چنگاریاں دیکھی تھیں لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے ان چنگاریوں کو جان بوجھ کر شعلہ بننے سے روکا ہوا ہے۔

بہر حال شانی کو اس بات کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ دوری تا دیر برقرار نہیں رہے گی۔ بستر کے درمیان کی

خالی جگہ جلد پُر ہو جائے گی۔

اگلے روز صبح سویرے ”رنگ والی“ سے دونائی شگن کی مٹھائی لے کر نار پور پہنچے۔ ان کی زبانی شانی کو پتا چلا کہ اس کے گھر والے شام سے تھوڑی دیر پہلے نار پور پہنچیں گے۔ انہیں رات یہیں بسر کرنا تھی۔ اگلے روز ویسے کے فوراً بعد انہیں شانی سمیت واپس روانہ ہو جانا تھا۔ شانی اپنے گاؤں سے آنے والے دونوں افراد سے یوں ملی جیسے کوئی قریبی عزیزوں سے ملتا ہے۔ وہ دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی اور گاؤں کی ایک ایک بات پوچھتی رہی۔ اسے نانیوں کی زبانی یہ بھی پتہ چلا کہ چھ روز بعد اس کی عزیز سہیلی صغرا کی منگنی ہے یہ خبر جتنی اچانک تھی اتنی ہی خوشگوار بھی تھی۔ شانی کے دل میں بڑی خاموشی کے ساتھ درجنوں لذو پھوٹ گئے۔

جس وقت شانی بڑی وارفتگی کے ساتھ اپنے گاؤں کے نانیوں سے بات کر رہی تھی دو آنکھیں کھڑکی کی اوٹ سے اسے گھور رہی تھیں۔ ان

آنکھوں میں ناپسندیدگی صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ یہ اس کے شوہر کی آنکھیں تھیں۔

شام کو رنگ والی کے مہمان پہنچ گئے۔ وہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی نارپور کی حدود میں داخل ہو گئے لیکن ان کی گاڑیوں کو نارپور میں داخل ہونے کے لئے آدھا پون گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ پتا چلا کہ شامیہ نے اور کراکری وغیرہ لانے والے ایک ٹرک کا ایکسل عین اس راستے پر ٹوٹ گیا تھا جہاں سے مہمانوں کی گاڑیوں کو حویلی تک پہنچنا تھا۔ ٹرک کو راستے سے ہٹانے کی کوششوں میں کافی وقت ضائع ہوا (اس بات کا پتا شانی کو ڈھائی تین ماہ بعد چلا کہ ٹرک خراب نہیں ہوا تھا بلکہ کیا گیا تھا، مقصد یہ تھا کہ رنگ والی سے آنے والے مہمانوں سے اس ”تاخیر“ کا بدلہ لیا جائے جو نارپور کے باراتیوں کو شادی کے دن جھیلنا پڑی تھی) یقیناً یہ اخلاق سے گری ہوئی حرکت تھی جو مہر خاندان کی کج روی کو ظاہر کرتی تھی۔

شانہ کئی منٹ تک اباجی کے گلے سے لگی رہی۔ ان سے جدا ہوئی تو بھائی کی ہانپوں میں سا گئی۔ فاخر اور اس کے گھر والوں نے مہمانوں کی آؤ بھگت کی لیکن بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس آؤ بھگت میں محبت سے زیادہ نمود و نمائش پائی جاتی ہے۔ بہر حال رات خیریت سے گزری۔ شانہ آج دوسرے کمرے میں اپنی چچا زاد بہن ناصرہ اور سہیلی شیم کے ساتھ سوئی تھی۔ وہ دونوں اسے چھیڑتی رہیں اور اٹے سیدھے سوال پوچھتی رہیں۔ شانہ نے کوشش کر کے باتوں کا رخ صغرا کی منگنی کی طرف موڑ دیا۔ صغرا کی منگنی اور شادی کا شانہ کو اتنا چاہا تھا کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر رنگ والی پہنچ جائے۔ رات رات میں ہی تینوں سہیلیوں نے منگنی کا لمبا چوڑا پروگرام بھی بنالیا۔

اگلے روز ولیمہ تھا۔ دعوت ولیمہ سے تھوڑی دیر قبل شانہ کی چچی نصرت نے شانہ سے کہا کہ وہ اپنا ضروری سامان سنبھال لے۔ شانہ کمرے میں چلی گئی اپنے چند جوڑے میک اپ کی چیزیں اور اس طرح کا دیگر سامان اس نے بڑے اٹیچی میں رکھنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں اسے اپنے عقب میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا فاخر کھڑا تھا۔ سفید دھوٹی اور قمیص پہنے ہوئے کندھوں پر ایک ریشمی چادر تھی ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں اور پاؤں میں سنہری کھسچک رہا تھا۔ ”کہاں کی تیاری ہے؟“ وہ مخصوص سنجیدگی سے بولا۔

”آپ کو پتا ہی ہے گھر جا رہی ہوں۔“

”کس کے گھر؟“ فاخر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”اپ..... اپنے..... میرا مطلب ہے اباجی..... کے ساتھ۔“ شانہ کی زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ یہ جان کر حیران ہوئی کہ چند دن میں ہی ”اپنا“ کہنا کتنا مشکل ہو گیا ہے وہ گھر جہاں اس نے زندگی کے انیس سال گزارے ہیں۔

فاخر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تم نہیں جا رہی ہو۔“

الفاظ شانہ پر بجلی بن کر گرے۔ وہ حیرت سے فاخر کا گندی چہرہ دیکھنے لگی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”مم..... میں سمجھی نہیں۔“ وہ لرز کر بولی۔

”میں فارسی میں نہیں بول رہا، تم آج نہیں جا رہی ہو۔ اگلے ہفتے میں نے رنگ والی کی طرف جانا ہے، میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا۔“

”مم..... مگر..... اباجی اور.....“ آواز شانہ کے خشک حلق میں ایک کر رہ گئی۔

”اگر مگر کچھ نہیں۔“ فاخر نے درشتگی سے کہا۔ ”دادا جی کی طبیعت آج صبح خراب ہو گئی ہے، کل لاہور سے دوڑا کٹر انہیں دیکھنے کے لئے آرہے ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ آپریشن کرانے کا کہیں؛ اگر ایسا ہوا تو پرسوں دادا جی کو لاہور لے جانا پڑے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے موقع پر تم رنگ والی چلی جاؤ۔“

شانی جیسے ایک دم بے جان سی ہو گئی تھی۔ وہ کچھ بھی بول نہ سکی۔ فاخر یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ ”اپنے گھر والوں کو بتا دو کہ تم اگلے ہفتے آؤ گی۔“ شانی بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ اس کی ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا تھا۔ بالکل وہی کیفیت تھی جو شادی کے روز ہوئی تھی اور وہ عورتوں میں بیٹھے بیٹھے تقریباً بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں پھر وہی حالت نہ ہو جائے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور قالین پہ ٹھلنے لگی۔ اس کی نگاہ میں گھر والوں کے خوش و خرم چہرے گھوم گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ انہیں یہ تکلیف دہ خبر کیسے پہنچائے۔

اسی دوران میں چچی نصرت کمرے میں آ گئیں۔ شانی کا بچھا ہوا چہرہ دیکھ کر ایک دم ان کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔ ”کیا ہوا میری رانی؟“ انہوں نے اسے پکارتے ہوئے پوچھا۔ شانی نے اپنے سینے میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے دل کو بمشکل سنبھالا اور ساری بات چچی کے گوش گزار کر دی، وہ بولیں۔ ”ابھی ہم رات کو تو مل کر آئے ہیں مہرجی سے تب تک تو ٹھیک تھے۔“

”صبح طبیعت بگڑی ہے۔“ شانی نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ بات اباجی عادل، چچا ریکس اور دیگر اہل خانہ کو بھی معلوم ہو گئی۔ عادل خاص طور پر مضطرب نظر آنے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا جوان خون جوش مار رہا ہے۔ وہ دبے ہوئے لیکن سخت لہجے میں بولا۔ ”مجھے تو یہ پابندی بالکل اچھی نہیں لگی، مہرجی کی طبیعت تو پہلے بھی ایسی ہی تھی اور اگر فرض کیا کہ دو تین دن میں انہیں ہسپتال لے جانے کی ضرورت پڑتی بھی ہے تو شانی واپس یہاں آ سکتی ہے بلکہ میں اسے خود چھوڑ جاؤں گا۔“

”ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ چچی نصرت نے تائید کی۔

”میرا خیال ہے کہ میں خود جا کر فاخر سے بات کرتا ہوں۔“ عادل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

چوہدری ارشاد نے جوان بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ ”نہیں پتر! بات بڑھانے سے فائدہ نہیں اب شانی پر ہمارا حق کم اور اس کے گھر والوں کا زیادہ ہے۔ اگر وہ شانی کا نہ جانا بہتر سمجھتے ہیں تو ہمیں زور نہیں دینا چاہئے۔“

”اباجی! میں..... کوئی ٹانگ تو نہیں پکڑ رہا..... منہ زبانی بات ہی کرنے لگا ہوں نا، اب دو دن میں اتنا بھی حق نہیں رہا ہمارا۔“

اسی دوران میں چوہدری ارشاد نے کھڑکی میں سے دیکھ لیا کہ فاخر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے کی طرف آرہا ہے۔ چوہدری ارشاد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر عادل کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا، ضبط کی وجہ سے عادل کا چہرہ لال ہو گیا، فاخر کے اندر آنے سے پہلے ہی وہ باہر چلا گیا۔ فاخر نے باقی گھر والوں کے سامنے بھی وہی بات کہی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے شانی کے سامنے کہی تھی۔ چوہدری ارشاد نے کہا ”ٹھیک ہے پتر، جیسا تم مناسب سمجھتے ہو۔“

سہ پہر کے وقت شانی کے گھر والے شانی کے بغیر ہی رنگ والی واپس روانہ ہو گئے۔ سب کے دل بجھے ہوئے تھے اور سب سے زیادہ شانی

کا بچا ہوا تھا۔ اس نے خود پر بمشکل ضبط کر رکھا تھا۔ چند لمحوں کے لئے اس نے محسوس کیا جیسے وہ ایک قیدی ہے اور اس کے گھر والے اس سے ملاقات کے بعد جیل سے واپس چلے گئے ہیں۔ ان لوگوں کے جاتے ہی وہ ہاتھ روم میں گھس گئی اور دیر تک روتی رہی۔

شام کے بعد شانی کو پتہ چلا کہ جن دو ڈاکٹروں نے کل مہرجی کو دیکھنے آنا تھا وہ آج ہی آگئے ہیں اور مہرجی کا معائنہ کر رہے ہیں۔ عشاء کے بعد بھابھو مقبول سے شانی کی ملاقات ہوئی۔ شانی نے پوچھا۔ ”بھابھو دادا جی کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”کچھ بھی نہیں ہے انہیں۔“ بھابھو نے بے زار لہجے میں کہا۔ ”مہینے میں ایک دو بار ان کا وہ بہت بڑھ جاتا ہے..... کیا کہتے ہیں اسے..... بلڈ پریشر..... سانس اوکھا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔“

”اور وہ آپریشن؟“

”ہر نیا کا آپریشن ہونا ہے اس کا تو دو سالوں سے سن رہے ہیں پتا نہیں کہ ہونا بھی ہے کہ نہیں۔“

”ڈاکٹر آئے تو ہوئے تھے انہوں نے کچھ نہیں بتایا؟“

”نہیں بس دو ایسے وغیرہ دے کر چلے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپریشن کے لئے ابھی ان کی حالت ٹھیک نہیں۔“

بھابھو مقبول سے باتیں کر کے شانی کے دل کا بوجھ کچھ اور بڑھ گیا۔ اسے لگا کہ اس کے دادا سر کی بیماری کا بس بہانہ بنایا گیا ہے ورنہ فاخر چاہتے ہی نہیں تھے کہ اسے گھر والوں کے ساتھ رنگ والی بھیجا جائے۔ وہ ایک دم اداس اور غمزدہ ہو گئی۔ اپنے گھر والوں کے سٹے ہوئے چہرے یاد کر کے اس کا دل رونے لگا..... پھر اسے صغرا کا خیال آیا وہ سوچنے لگی جب اسے معلوم ہوگا کہ وہ اس کی منگنی پر نہیں آسکے گی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔

اس رات شانی نے کھانا بھی نہیں کھایا، بس فاخر کا ساتھ دینے کے لئے ایک دو لقمے لئے اور انہیں بھی دیر تک منہ میں گھماتی رہی لیکن آج وہ محسوس کر رہی تھی کہ فاخر خلاف معمول ذرا اچھے موڈ میں ہے، وہ اسے اپنے ساتھ ٹھلانے کے لئے چھت پر لے گئے۔ رات کے دس بجے تو وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ فاخر کے سامنے شانی پُرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن سینے میں گہری اداسی کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ کمرے میں آ کر فاخر نے ڈیک پر ہلکا سا میوزک لگا دیا۔ پنجابی گیت تھے اور انتخاب بھی زیادہ اچھا نہیں تھا۔ یہ پہلی بار تھی کہ شانی اپنے کمرے میں موسیقی کی آواز سن رہی تھی لہذا جیسی بھی موسیقی تھی، غنیمت تھی۔

ایک دم شانی نے محسوس کیا کہ فاخر کی سلگتی نگاہیں اس کے سراپا پر ہیں۔ وہ بستر پر نیم دراز تھا اور اسے ادھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ شانی کے ذہن میں ایک اطلاعی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ چند لمحے بعد فاخر کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔ ”آج ذرا وہی شادی والا جوڑا تو پہن کر دکھاؤ۔“

شانی کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اطلاعی گھنٹی کی آواز درست تھی۔ آج اس کے شوہر نے اسے پکارا تھا..... لیکن یہ کیا بات تھی آج تو اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں وہ خود کو بالکل خالی محسوس کر رہی تھی۔ مٹی کی مورت..... اس کے سینے میں بس ایک زرد دادا ہی تھی اور آنکھوں کے پیچھے سسکیاں چھپی ہوئی تھیں۔

اسے پکارنے کے لئے اس کے شوہر نے آج یہ کیسا دن منتخب کر لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کئی بار خود سپردگی کا مستحکم ارادہ لئے رات کی دہلیز پر آئی تھی۔ ایسے میں اس کی آنکھیں خواب ناک ہوتی تھیں اور بدن میں ایک بیٹھی سی لہر بھی چلتی تھی لیکن آج تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ مٹی کا ڈھیر ہو رہی تھی۔ ”کیا سوچ رہی ہو؟“ فاخر کی آواز پھر ابھری۔ اس بار لہجے میں ہلکا سا تحکم بھی چھپا ہوا تھا۔

ایک بار تو شانی کے جی میں آئی کہ کہہ دے۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں سونا چاہتی ہوں۔“ یا پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہہ دے۔ ”فاخر مجھے منافقت پر مجبور نہ کریں..... آج میرے پاس ایسا کچھ نہیں جو آپ کو دے سکوں..... آج میں صرف دھوکا کروں گی۔“ لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکی..... اور وہ بھی نہیں کہہ سکی جو پہلے سوچا تھا اور وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔

فاخر خاموش تھا، وہ بھی اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھی شاید فاخر کی مردانہ انا آڑے آرہی تھی۔ وہ شانی کے سامنے اپنی خواہش دہرانا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے۔ شانی کی فراست نے محسوس کیا کہ وہ کچھ دیر مزید یونہی بیٹھی رہی تو فاخر کے منہ سے کوئی بہت سخت بات نکل جائے گی یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ غضب ناک ہو کر پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل جائے..... وہ خود کو سنبھال کر اپنی جگہ سے اٹھی اور الماری کی طرف بڑھ گئی کچھ ہی دیر بعد اس کے ہاتھ میں عروسی جوڑا تھا۔

وہ عجیب رات تھی۔ شانی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اپنے آپ سے..... اپنے جسم سے بہت دور چلی گئی تھی۔ وہ کسی کی بانہوں میں تھی گرم پھنکارتی ہوئی سانس اس کے چہرے اور گردن سے نکراتی تھیں۔ کسی کی گرم جوشی اسے اتھل پتھل کر رہی تھی لیکن اسے کچھ احساس نہیں تھا۔ خوشی اور محبت اس سے بہت دور تھی۔

اور پھر صبح ہوگئی۔ ایک ناگوار تکلیف دہ رات کی صبح۔ وہ بے ترتیب پڑی تھی، بکھری بکھری سی، اجڑی اجڑی سی..... اس کا رنگ زرد تھا..... مایوسی اور توہین کا غبار سا اس کے ”سراپا“ سے چمٹا تھا۔ ایک فٹ کے فاصلے پر فاخر بے خبر سو رہا تھا۔ وہ سیدھا لیٹا تھا۔ اس کے چوڑے چکلے جسم پر پریچھ کی طرح بال تھے سوتے میں اس کے سینے سے ایک گونجدار آواز نکل رہی تھی۔ جیسے وہ نیند کی حالت میں بھی اپنے کسی ملازم یا مزارعے پر غضب ناک ہو رہا ہو۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور گندمی چہرہ متمتا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں شانی کو اس سے کراہت سی محسوس ہوئی۔ حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا وہ اس کا شریک زندگی تھا۔ اس ڈر سے کہ اس کراہت میں مزید اضافہ نہ ہو جائے شانی نے اپنی نگاہ پھیر لی۔ غیر متوقع طور پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ سر گھٹنوں میں دے کر کچھ دیر سکتی رہی پھر بستر سے اٹھ گئی۔

صبح نوبے کے بعد جب فاخر کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا تو اس کا موڈ بہت اچھا نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت تھی۔ خلاف معمول اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں بھابھ اور اس کے بچوں سے چند باتیں بھی کیں، بہر حال شانی سے اس کا رویہ وہی تکلف والا رہا۔ شانی کی آنکھیں سُرخ تھیں اور طبیعت میں بھی کسلندی تھی لیکن فاخر نے ایک بار بھی اس کا حال نہیں پوچھا..... ہاں دروازے سے باہر نکلتے ہوئے شانی کی نگاہ سے اس کی نگاہ ایک لمحے کے لئے ملی۔ شانی کو اس کی نگاہ میں عجیب سی چمک نظر آئی۔ اسے یوں لگا کہ یہ فتح مندی کی چمک ہے۔

دو پہر کو شانی نے اپنے دادا سر مہرجی کو دیکھا، وہ جیل چیئر پر بیٹھے تھے اور اسی پھلکاری میں تھے جس میں قدم رکھنے کی کسی کو اجازت نہیں

تھی۔ انہوں نے سر پر ایک تولیہ ڈال رکھا تھا جس کی وجہ سے ان کا بدنما چہرہ چھپ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے عین سامنے کسی شے کو یک ٹک دیکھتے چلے جا رہے ہیں۔ شانی دبے پاؤں پھلکاری کے قریب سے گزر گئی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ مہرجی کی نگاہ اس پر پڑ جائے پہلے دن والے تجربے کے بعد اسے مہرجی سے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ سیدھی بھابھو کے کمرے میں چلی گئی۔ بھابھو کا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ بھابھو اپنے بڑے بچے ندیم کو نہلا رہی تھی۔ وہ چھ سات سال کا تھا اور بے حد شرمیلے ماں نے اسے الف ننگا کیا ہوا تھا شانی کو دیکھ کر وہ شرمانے لگا۔ ”بہت تنگ کرتا ہے اب موسم بدل گیا ہے پھر بھی نہانے کے ڈر سے بھاگ جاتا ہے۔“ بھابھو نے کہا۔

”ہاں..... اس معاملے میں بچے اکثر تنگ کرتے ہیں۔“

بھابھو ندیم سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”دیکھو..... چچی نہا دھو کر آئی ہے کتنی پیاری لگ رہی ہے۔“

پہلے تو شانی نے فقرے کو عام انداز میں لیا لیکن جب اس کی معنی خیزی پر غور کیا تو اس کے رخسار ایک دم تپ گئے۔ ندیم کو تو لیے سے خوب رگڑے دینے کے بعد بھابھو شانی کی طرف آگئی۔ اپنے گیلے گیلے ہاتھ میں اس کی کلائی تھامتے ہوئے بولی۔ ”آؤ ادھر بیٹھو پلنگ پر.....“ پھر وہ ایک دم چونک سی گئی۔ اس نے شانی کی کلائی چھوڑ کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تب اس کے رخسار کو چھو اور بولی۔ ”ہاں..... ہائے..... تیرا تو سارا پنڈا تپ رہا ہے لگتا ہے کہ بخار چڑھا ہوا ہے۔“

شانی کو اندازہ ہوا کہ اسے واقعی بخار ہو گیا ہے۔ منہ خشک ہو رہا ہے اور جسم دھک رہا ہے۔ بھابھو نے اسے اپنے کمرے میں ہی لیٹا لیا۔ ایک ملازمہ کو بھیج کر اس نے نارپور کے پرانے حکیم صاحب کو بلا لیا۔ حکیم نے دو واغیرہ دی اور کمرے کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے کہا۔

شام کو فاکر آیا تو اسے پتا چلا کہ شانی اوپر بھابھو کے کمرے میں ہے اور اسے بخار ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ فوری طور پر اوپر آتا لیکن وہ نہا کر اور کپڑے بدل کر آیا۔ اس نے رسمی انداز میں شانی کی مزاج پرسی کی اور نیچے چلا گیا۔ بھابھو نے اس سے کہہ دیا تھا کہ شانی آج اسی کے کمرے میں رہے گی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ فاکر کے آنے سے شانی کو تسلی ہوتی لیکن اسے تسلی تب ہوئی جب وہ مزاج پرسی کر کے کمرے سے چلا گیا۔ جتنی دیر وہ کمرے میں رہا شانی کے دل و دماغ میں عجیب سے بے چینی کلبلائی رہی۔ اسے لگا جیسے گرم پھنکاروں جیسی سانس اس کی گردن اور چہرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ اس کے رخساروں پر کانٹے چھ رہے ہیں اور اس کا دم گھٹ رہا ہے۔

اگلے روز سہ پہر تک شانی کا بخار اتر گیا..... لیکن نیچے جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بھابھو کے کمرے میں اسے اپنے کمرے سے کہیں زیادہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے بھی کمزوری اور طبیعت میں گراوٹ موجود تھی۔ وہ دوسری رات بھی بھابھو کے کمرے میں رہی..... فاکر بس ایک چکر لگا کر واپس چلا گیا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ شانی کا یوں دوسری رات بھی بھابھو کے کمرے میں گزارنا اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ چاہتا ہے کہ شانی اپنے کمرے میں آجائے بہر حال یہ بات اس نے زبان سے نہیں کہی۔

تیسرے روز شام کے وقت شانی کی طبیعت میں پھر تھوڑا سا بھاری پن آ گیا۔ اب پتا نہیں یہ جسمانی تکلیف تھی یا ذہنی دباؤ کے سبب ایسا

تھا۔ اپنے کمرے کا خیال آتے ہی شانی کے سینے میں عجیب سی گھٹن پیدا ہو جاتی تھی گرم سانوں اور رخساروں پر چھتے ہوئے نکیلے کانوں کا احساس اسے بے کل کر دیتا تھا۔ بھابھو نے اسے دو روز اپنا مہمان بنایا تھا۔ اب وہ ایک دانا جیٹھانی کی حیثیت سے چاہتی تھی کہ شانی واپس کمرے میں جائے لیکن شانی کی ہچکچاہٹ اور اس کی گرمی ہوئی طبیعت کو دیکھ کر اس نے شانی پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ دونوں بچے بھی شانی سے لپٹ لپٹ جا رہے تھے۔ وہ اسے ہر صورت اپنے کمرے میں رکھنا چاہتے تھے۔

اس رات فاخر ذرا دیر سے گھر آیا۔ شانی اس کے آنے سے پہلے ہی سونے کے لئے لیٹ چکی تھی۔ بھابھو کا چھوٹا بیٹا منان اس سے لپٹ کر سویا ہوا تھا۔ دس بجے کے قریب دروازے سے باہر بھاری قدموں کی آواز آئی پھر دروازہ کھلا اور شانی کو اندازہ ہوا کہ فاخر اندر آیا ہے۔ بھابھو مقبول نے دبی ہوئی سرگوشی سے اس سے کہا۔ ”سورہی ہے شام کو طبیعت پھر ذرا خراب ہو گئی تھی۔“

عجیب ترین نوب کے قلم سے شاہکار ناول

قیمت
150
روپے

پتھر کا شیشہ

”کیا ہو گیا تھا؟“ فاخر نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کچھ نہیں..... کہتی تھی سر ذرا بھاری ہے۔“

”اور تم نے سمجھ لیا کہ سچ مچ ایسا ہی ہے۔“ فاخر کے لہجے میں طنز تھا۔

”تو کیا وہ جھوٹ بول رہی تھی۔“

”جانے دو بھابھو..... میں کوئی کا کا نہیں ہوں۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔ شانی آنکھیں بند کئے دم سادھے لیٹی رہی۔ کمرے سے باہر جا کر بھی دونوں باتیں کرتے رہے۔ مدھم آوازیں شانی کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ فاخر نے کہا۔ ”بھابھو تم خواہ مخواہ اسے سر پر چڑھا رہی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

جواب میں بھابھو نے کہا۔ ”چل ایک دن اور اسے آرام کر لینے دے۔ اس کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے ویسے بھی ملوک سی تو ہے۔“

”سب نخرے ہیں بھابھو اور تمہیں پتا ہے میں نخرے اٹھانے کا عادی نہیں ہوں۔ میں اس لئے بیاہ کر نہیں لایا ہوں اسے..... کہ سر ہانے کھڑا ہو کر اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھتا رہوں۔ اسے گھر کا کام..... سنبھالنا ہوگا۔ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنا ہوں گی۔“

”سب کچھ کرے گی فائے ابھی اسے دن ہی کتنے ہوئے ہیں آئے ہوئے دو چار دن میں، میں خود اس سے زردہ پکواؤں گی اور کام پر لگواؤں گی۔“

کچھ دیر تک دیور بھابی کی چونچ لڑتی رہی پھر فاخر سیڑھیوں کو اپنے پاؤں سے کوٹتا ہوا نیچے چلا گیا۔

کوئی دو گھنٹے بعد شانی کو پیاس محسوس ہوئی اس نے منان عرف منا کو بڑی آہستگی سے خود سے جدا کیا اور پانی کے کولر کی طرف گئی۔ ایک کھڑکی میں سے اس کی نگاہ نیچے صحن میں گئی۔ پھلواڑی کے پاس پختہ روش پر فاخر ٹہل رہا تھا۔ وہ سگریٹ پھونک رہا تھا اور اس کی چال میں بے زاری اور جھلاہٹ نظر آتی تھی۔ کمرے میں تار کی تھی اس لئے فاخر اسے نہیں دیکھ سکتا تھا، پھر بھی شانی کے جسم میں سر دلہری دوڑ گئی۔

اگلے روز اتفاقاً شانی کی مشکل آسان ہو گئی۔ لاہور میں ٹیکسٹائل کے مزدوروں نے کوئی جھگڑا کیا تھا اور فاخر اس جھگڑے کو نمٹانے کے

لئے لاہور چلا گیا تھا تو قہقہے کی اس کی واپسی دو تین دن کے بعد ہو سکتی۔

یہ مہلت شانی کے لئے بڑی مفید تھی۔ وہ اس دوران میں اپنا دل ٹھکانے پر لاسکتی تھی اپنے ذہن سے اس خوف اور ناپسندیدگی کو کھرچ سکتی تھی جنہوں نے تین رات پہلے اس کے اندر جگہ بنائی تھی۔ اسی روز وہ نیچے اپنے کمرے میں آگئی، دوپہر کو اس نے اپنے بے ترتیب کمرے کو سنبھالا۔ کمرے کی سجاوٹ میں کچھ نئی چیزوں کا اضافہ کیا، شوخ رنگوں کے ڈیزائن دار پردوں کی جگہ دھیمے رنگوں کے خوشنما پردے لگائے، شام کو بھابھو اور اس کے بچوں کے ساتھ پجاری میں بیٹھ کر ہوا خوری کے لئے وہ کینڈا اور امرود کے باغوں کی طرف گئی۔ انہوں نے کچھ دیر نہر کے کنارے ٹھنڈی ہوا کا مزہ لیا۔

اگلے روز بھی سارا دن شانی خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی، ساتھ ساتھ وہ فاخر کے رویے کو سمجھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ کسی وقت تو شانی کو شک ہوتا تھا کہ فاخر جان بوجھ کر کج روی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ یہاں آنے کے ایک روز بعد جب وہ فاخر کے قریب آنا چاہتی تھی، اس کی بانہوں میں سما کر سب کچھ بھولنا چاہتی تھی، وہ اس سے دور رہا تھا لیکن جب میکے نہ جاسکے کے سبب وہ دل گرفتہ اور دکھی تھی، وہ اس کے قریب آ گیا تھا۔ اس کے انداز میں محبت اور نرمی نہیں تھی، سرکشی اور من مانی تھی۔ ایسی من مانی جو دل میں پھول کھلانے کے بجائے کراہت جگاتی ہے۔

بے شک میکے نہ جاسکے کے سبب شانی اب بھی غم زدہ تھی لیکن اس نے اپنے فطری ”ضبط“ کو بروئے کار لا کر خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ اسے رہ رہ کر صغرا کی مٹگنی اور منگنی کی رونقوں کا خیال آتا تھا لیکن ہر بار وہ یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیتی تھی۔ اسے اُمید تھی کہ تین چار روز تک اپنے وعدے کے مطابق فاخر اسے خود رنگ والی چھوڑ آئے گا۔

تیسرے روز صبح سویرے ہی شانی کو معلوم ہو گیا تھا کہ شام کو فاخر گاؤں واپس پہنچ رہا ہے۔ اس نے سہ پہر کو نہا دھو کر اپنا بہترین لباس پہنا۔ ملازمہ ”پکھی“ باغ سے مویہ اور گلاب کے بہت سے پھول توڑ لائی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے دو گجرے بنا کر نئی مالکین کو دیئے۔ گجرے پہن کر شانی نے اپنی کلاسیاں دیکھیں اور پکھی سے بولی۔ ”بڑے پیارے گجرے بناتی ہے تو۔“

”گجرے اتنے پیارے نہیں ہیں، آپ کی بانہوں میں سج کر اتنے پیارے ہو رہے ہیں۔“ وہ شانی کو والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے اپنے رومال سے ایک اور ہار نکالا، یہ گلاب اور مویہ کے گلابوں کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ سُرخ گلابوں کو دیکھ کر شانی کو اپنے میکے کے گلاب یاد آ گئے۔ گلاب کے وہ چند پودے اس نے بڑی محبت اور لگن سے لگائے تھے۔ بچوں کی طرح ان کا خیال رکھتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر اداس ہو گئی کہ پتا نہیں وہ پودے کس حال میں ہوں گے۔ بابا فخری ان کو پانی دیتا بھی ہوگا یا نہیں؟

اچانک حویلی کے مین گیٹ سے باہر گاڑیوں کے تیز ہارن سنائی دیئے۔ فاخر واپس آ گیا تھا۔ شانی نے اپنے ذہن سے میکے کے گلابوں کو نکال کر چہرے کو فوراً تروتازہ کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد فاخر سفید شلوار قمیص اور واسٹ میں ملبوس لمبے لمبے ڈگ بھرتا حویلی میں داخل ہو رہا تھا۔ شانی کو سامنے برآمدے میں دیکھ کر وہ ذرا سا ٹھنکا، شانی سر پر دو پٹا درست کر کے آگے بڑھی اور شوہر کو سلام کیا وہ سلام کا جواب دیتا ہوا مہرجی کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

وہ بڑی سہانی رات تھی، فضا میں مویہ اور رات کی رانی کی مہک تھی، نہر کی جانب سے آنے والی خوشگوار ہوا دل میں ہلکی سی ترنگ جگاتی تھی

لیکن اس رات بھی وہی کچھ ہوا جو شروع کی راتوں میں ہوا تھا۔ وہ رات گئے تک ایک بڑے رجسٹر میں کچھ حساب کتاب جوڑنے میں مصروف رہا پھر تھکا تھکا سا بستر پر لیٹا اور کچھ ہی دیر بعد شانی اس کے مدھم خراٹوں کی آواز سن رہی تھی۔ وہ دیر تک جاگتی رہی یہ بات اس پر واضح ہوتی جا رہی تھی کہ فاخر جان بوجھ کر ایسا رویہ اختیار کرتا ہے۔ جب وہ شانی کو اپنی طرف مائل دیکھتا ہے تو بے رخی اختیار کرتا ہے۔ جب وہ شانی میں گریز کی کیفیت دیکھتا ہے تو اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہ اذیت پسندی کی ہی ایک شکل تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ اس سوال کے جواب میں کنوئیں والا واقعہ شانی کے ذہن میں تازہ ہو جاتا تھا لیکن فاخر نے خود کہا تھا کہ اس واقعے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ تو کیا پھر کوئی اور واقعہ تھا وہ کیا واقعہ ہو سکتا تھا؟ کیا مہرجی کا بھی اس واقعے سے کوئی تعلق تھا؟

فاخر نے شانی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلے ہفتے خود اسے ”رنگ والی“ چھوڑ آئے گا۔ اگلا ہفتہ آگیا اور شانی منتظر تھی کہ اس کا شو ہر میکے جانے کے بارے میں اس سے کچھ کہے۔ ہفتے کی شام کو وہ بڑی شدت سے منتظر تھی۔ اسے توقع تھی کہ شاید کل اتوار کے روز وہ رنگ والی کا رخ کریں گے لیکن رات آٹھ بجے کے قریب شدید بارش شروع ہو گئی جو ساری رات جاری رہی..... نشیبی جگہوں پر پانی کھڑا ہو گیا۔ بہر حال اگر فاخر چاہتا تو اس موسم میں بھی سفر کیا جاسکتا تھا۔ اس کے پاس ہر موسم میں استعمال کی جانے والی گاڑیاں موجود تھیں لیکن وہ تو شاید خود ہی کسی بہانے کا منتظر تھا۔ اس نے شانی سے کہہ دیا کہ اس ہفتے وہ رنگ والی نہیں جاسکیں گے۔ شانی کو مایوسی تو ہوئی، تنہائی میں دو چار آنسو بھی آنکھوں سے نکلے تاہم اس نے خود کو جلد ہی سنبھال لیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کو ایسے دھچکے وقتا فوقتاً برداشت کرنا ہی پڑیں گے۔

اگلے روز شام کو فاخر نے اس سے کہا۔ ”جاؤ دادا کے پاس سے ہواؤ۔ آج بھابھو بھی گھر میں نہیں ہے۔“
دراصل یہ معمول تھا کہ رات سونے سے پیشتر بھابھو یا بھابھو کا بڑا بیٹا ندیم..... دادا کی ٹانگیں دباتے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ وہ بھی بہت جلد اس معمول میں شامل ہونے والی ہے۔ فی الحال شاید نو بیٹا ہوتا ہونے کی وجہ سے اس کی مستقل ڈیوٹی نہیں لگائی گئی تھی۔ وہ شوہر کی ہدایت پر دادا سر کے کمرے میں پہنچ گئی۔ ایک ملازم پہلے ہی مٹھی چانی میں مصروف تھا۔ شانی کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ شانی کے ہاتھوں میں ناگوار سانسوں کی وہی جانی پچپانی باس نکرائی اور اس کا دل مالش کرنے لگا۔ مہرجی گاؤں کے سہارے نیم دراز تھے۔ منقش حقے کی طویل نئی (نالی) کا آخری حصہ ان کے سینے پر دھرا تھا۔ ناگوں سے اوپر تک سفید چادر کھینچی نظر آتی تھی۔ بالائی جسم پر ویل کا کرتہ تھا جس میں سے بوسیدہ سانولے گوشت کی جھلک نظر آتی تھی۔ لشکارے مارتی ہوئی اکلوتی آنکھ کی جھپن سے نظر چرا کر شانی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی اور سر جھکا کر ٹانگیں دبانے لگی۔ پلپلا گوشت ہاتھوں میں آیا تو دل گھبرانے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ دن کا بیشتر حصہ اس طرح گزرتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ملازم مہرجی کی مٹھی چانی کرتا رہتا ہے..... یوں لگتا تھا کہ مہرجی کے بوڑھے جسم کو مٹھی چانی اور مالش کا نشلگ گیا ہے۔

وہ خاموشی سے دباتی رہی اور اس بات کی منتظر رہی کہ ابھی کچھ دیر میں مہرجی اسے ہاتھ روکنے کے لئے کہہ دیں گے مگر وہ تو جیسے ”بس“ کا لفظ منہ سے نکالنا بھول ہی گئے تھے۔ شانی دباتی رہی اس کی نازک کھانیاں دکھنے لگیں، ناگوار باس کے سبب سانسوں کی گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ آج تو بھابھو بھی گھر میں نہیں تھی۔ پچھلی دفعہ اسی نے آکر شانی کو اس قید با مشقت سے رہائی دلائی تھی۔ ایک دفعہ ہمت کر کے شانی نے چور نظروں سے مہرجی کا

چہرہ دیکھا۔ ان کی ناکارہ آنکھ بالکل بند تھی جب کہ کارآمد آنکھ نیم وا تھی۔ غنودگی میں ہونے کے باوجود یہ آنکھ شانی کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ کچھ ایسی کیفیت تھی..... اس آنکھ میں کہ شانی جھر جھری سی لے کر رہ گئی۔ مہرجی کی پنڈلیاں دبا دبا کر اب اس کی انگلیوں میں سکت نہیں رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اٹھ کر چلی جائے لیکن پھر مہرجی کا بے پناہ طیش اور غصیلہ پن ذہن میں آ گیا۔ وہ اپنے کام میں جتی رہی۔ کچھ دیر بعد مہرجی کے ہونٹوں سے ایک سرسراتی ہوئی غصیلی آواز نکلی، اس کے ساتھ ہی انہوں نے ٹانگوں کو بے چینی سے جنبش دی مطلب یہی تھا کہ وہ ٹھیک سے نہیں دبا رہی۔ شانی پھر رہی سہی قوت جمع کر کے پلپے ماس کو سکون پہنچانے کی کوشش کرتی رہی، اس کی پیشانی پر اب پسینہ چکنے لگا تھا..... پتا نہیں کتنی ہی دیر اس عذاب میں گزر گئی۔ تب اچانک شانی کے کانوں میں بے ہودہ خراٹوں کی مدھم آواز گونجی اس نے چور نظروں سے دیکھا۔ اس کا دادا اس سرسور ہا تھا۔ اس کا آدھا چہرہ جو مفلوج تھا مزید بد نما نظر آنے لگا تھا، جلد پر عجیب سے دھبے تھے اور ادھ کھلے ہونٹوں سے رال بہہ رہی تھی۔ وہ ہولے سے اٹھی اور باہر نکل آئی۔

☆=====☆=====☆

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

لڑکی، چور سپاہی

قیمت: 200

طاہر جاوید مغل

آتش پرست

قیمت: 150

وجیہ سحر

چارھے

خارزار

فی حصہ
قیمت: 60

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عجیب لڑکی

قیمت: 200

یعقوب جمیل

اپنے قریبی بکسٹال یا ہاگر سے طلب فرمائیں

علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور۔

اسٹاکسٹ

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

Ph: 7247414

براہ راست
منگوانے
کا پتہ

نارپور سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر بھابھو مقبول کامیکہ تھا۔ اس گاؤں کا نام پار کے تھا۔ دیہات میں بہار کی آمد پر اکثر میلے ٹھیلے ہوتے ہیں۔ پار کے میں بھی ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ بدھ کا ایک دن عورتوں کا دن تھا۔ بھابھو اور اس کے دونوں بچے میلے میں جانے کے لئے کئی دن سے پروگرام بنا رہے تھے۔ انہیں منگل کی دوپہر چلے جانا تھا۔ بدھ کو میلہ دیکھ کر جمہرات کی سہ پہر کو واپس آنا تھا۔ ندیم اور مننا بضد تھے کہ شانی کو بھی اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ بھابھو نے بھی میلے کی اور اپنے گاؤں کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ شانی کے دل میں اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ بھابھو نے مناسب موقع دیکھ کر فاخر سے شانی کے لئے اجازت لے لی تھی۔ اب شانی بھی دو دن کے لئے ان کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک اُمید یہ بھی تھی کہ شاید اس کے گاؤں رنگ والی سے بھی میلے میں کچھ لوگ آئیں، ہو سکتا تھا کہ چچا ریکس یا چچا مشتاق کی فیملی میں سے ہی کوئی آجائے، لگتا تھا کہ اپنوں کی صورت دیکھے اسے مہینوں گزر گئے ہیں۔

منگل کی صبح شانی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے چھوٹا سا اٹیچی تیار کر لیا تھا فاخر ناشتہ کر چکا تھا اور اب اپنے زرعی فارم پر جانے کے لئے پرتول رہا تھا اچانک اس کی نظر شانی کے اٹیچی پر پڑی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے اپنے مخصوص بھاری بھر کم لہجے میں کہا۔

”میرا سامان ہے، بھابھو کے ساتھ جانے کے لئے رکھا ہے۔“

”بھابھو کے ساتھ؟ کہاں؟“

”ان کے گاؤں، آپ سے پوچھا تو تھا۔“

”نہیں نہیں..... آج نہیں جاسکتی ہو تم لاہور سے میرا ایک دوست اور اس کی بیوی آرہی ہے۔ ہو سکتا ہے شام سے پہلے پہنچ جائیں۔“

شانہ سنائے میں رہ گئی پھر ہمت کر کے بولی۔ ”لیکن..... یہ تو بڑی بد مزگی ہو جائے گی سب تیار ہیں۔ ندیم اور مننا تو صبح سویرے ہی مجھے

جگانے آگئے تھے..... وہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ ان کا دل بڑا بڑا ہو گا۔“

فاخر کا چہرہ ایک دم خون کے دباؤ سے تاریک ہو گیا۔ اپنے لہجے پر حتی الامکان قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں ندیم اور مننے کا خیال ہے لیکن

ان کا خیال نہیں جو صرف ہم سے ملنے کے لئے لاہور سے آرہے ہیں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا..... لیکن۔“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ فاخر پھنکارا۔ ”اگر میری اجازت سے جانا چاہتی ہو تو پھر میری طرف سے اجازت نہیں ہے۔“ وہ پاؤں پٹختا ہوا

باہر نکل گیا۔ شانی بے دم ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

اس شام وہ بے حد افسردہ تھی، ندیم اور مننا تقریباً روتے ہوئے ”پار کے“ گئے تھے۔ بھابھو بھی دل گرفتہ تھی سارا پروگرام دھرا رہا گیا۔ اگر فاخر

گھر میں ہوتا تو شاید بھابھو اس کی منت کر کے اسے منانے کی کوشش کرتی لیکن وہ تو شانی کو حکم سناتے ہی جیب میں بیٹھ کر فارم چلا گیا تھا۔ یقیناً اسے

بھی معلوم تھا کہ بھابھو اس کا فیصلہ بدلنے کی کوشش کرے گی۔

لڑکی، چور سپاہی

طاہر جاوید مغل

قیمت: 200

شانی کو زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ وہ مہمان بھی نہیں آئے تھے جن کے استقبال کے لئے فاخر نے شانی کو جانے سے روکا تھا۔ مہرجی کے خاص ملازم اکبر نے بتایا تھا کہ چوہدری فاخر کے مطابق لاہور سے آنے والے مہمان آج نہیں آرہے۔

اب شانی کو پتا نہیں تھا کہ ان مہمانوں کو واقعی آنا بھی تھا یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات بھی فاخر نے ایسے ہی کہہ دی ہو۔ اس سے پہلے بھی شانی کو میکے جانے سے روکنے کے لئے اس نے مہرجی کے ہسپتال جانے کا بہانہ بنایا تھا۔ ندیم اور منا کے روتے ہوئے چہرے بار بار اس کی نگاہوں میں آ رہے تھے اور وہ افسردہ تر ہو رہی تھی۔ جو اٹیچی کیس اس نے پار لے جانے کے لئے بڑے شوق سے تیار کیا تھا وہ اسی طرح بند پڑا تھا۔ وہ اٹیچی کیس کھول کر کپڑے الماری میں لٹکانے لگی۔ اسی دوران میں فاخر کے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے اپنی گیلی آنکھیں پونچھ لیں۔

فاخر کمرے میں داخل ہوا۔ آج وہ قدرے خوشگوار موڈ میں لگتا تھا۔ اس نے مہمانوں کے نہ آنے کے بارے میں کوئی وضاحت کرنا ضروری نہ سمجھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکیٹ تھا جو اس نے صوفے پر پھینک دیا اور بستر پر نیم دراز ہو گیا۔

شانی نے چہرے پر حتی الامکان ہلاکت پیدا کی اور بولی۔ ”چائے پیئیں گے؟“

”نہیں ابھی دادا کے پاس سے پی کر آیا ہوں۔“

”کپڑے بدلیں گے؟“

”میں تو نہیں بدلوں گا، لیکن اگر تم چاہو تو بدل سکتی ہو۔“

”میں..... سمجھی نہیں۔“

وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قدرے بے زاری سے بولا۔ ”یہ کیا ہر وقت شلوار قمیص پہنے رہتی ہو۔ یہ دیکھو میں نے لاہور سے ساڑھی

منگوائی ہے تمہارے لئے، زبردست رنگ ہے۔“

شانی کے دل پر چوٹ سی لگی لیکن اس نے تکلیف کا اثر چہرے پر نہیں آنے دیا۔ اس نے اپنے میکے کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس سے

پہلے بھی ایک دو موقع پر جب اس نے میکے کے کپڑے پہن رکھے تھے فاخر نے ایسے ہی ناک بھوں چڑھائی تھی۔ اس نے خاموشی سے ساڑھی کا ڈبا

اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ ”بہت اچھی ہے۔“ اس نے کہا۔

”پہنو تو پھر پتا چلے گا کہ کتنی اچھی ہے۔“ فاخر سنجیدگی سے بولا۔

وہ ساڑھی لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور پھر پہن کر آ گئی۔ فاخر کی تیز حرارت نظریں اس کے سرپا سے لپٹنے لگیں۔ یوں لگتا تھا کہ اس

کے جسم کا ہر حصہ اس کی نگاہوں کی زد میں ہے۔ اگر کسی حصے پر فاخر کی نگاہیں نہیں پڑ رہی تھیں تو وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ روئی روئی سی سُرخ آنکھیں۔

کچھ دیر بعد فاخر نے بھی کپڑے بدل لئے اور بولا۔ ”چلو آؤ چھت پر ٹہلتے ہیں۔“ وہ چھت پر چلے آئے منڈیر کے اوپر سے شانی کی نگاہ

نیچے پھلوا ری پر پڑی، وہی پُر اسرار پھلوا ری جہاں مہرجی کے سوا کوئی نہیں جاتا تھا..... وہ ڈنیل چیئر پر بیٹھے تھے اور پھلوا ری میں موجود تھے لیکن آج وہ

اکیلے نہیں تھے۔ آج تو ان کے ساتھ ان کا پہلوان نما ملازم اکبر بھی موجود تھا۔ اکبر نے شانی نے نار پور آنے کے دو روز بعد ہی پہچان لیا تھا۔ یہ

وہی غصیلہ شخص تھا جس نے اس موقع پر شانی پر اٹھل تانے کی کوشش کی تھی۔ اس واقعے کو تین سال گزر چکے تھے لیکن شانی کو سب یاد تھا..... شانی نے چھت پر سے دیکھا۔ اکبر کوئی چیز زمین میں دبا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوں۔ شانی کی بس ایک نگاہ اس منظر پر پڑی پھر اس نے دھیان دوسری طرف کر لیا۔

آج کی رات فاخر کا موڈ ویسا ہی تھا جیسا ان کے ”ملن“ کی پہلی رات کو تھا۔ شانی کے دل کا موسم بھی وہی تھا جو ”ملن“ کی پہلی رات کو تھا۔ وہ اداس تھی..... خود کو بالکل خالی محسوس کر رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک با وفا بیوی کی حیثیت سے اس کے پاس فاخر کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ فاخر اس پر مہربان ہونے کے لئے ایسا وقت کیوں منتخب کرتا تھا جب وہ کسی مہربانی کی متحمل نہیں ہوتی تھی۔ ہاں یہ ویسی ہی رات تھی اور اس رات وہی سب کچھ ہوا جو پہلے ہوا تھا..... اس کی روح نے اس کے جسم کا ذرا سا ساتھ بھی نہیں دیا۔ اس کے معصوم دل میں محبت کی کوئی کلی نہیں کھلی اس کے چہرے سے گرم ناگوار سانسیں نکلائیں۔ اس کے رخساروں پر کانٹے چھبے..... وہ روندی گئی، مسلی گئی اور خود سے دور کھڑی یہ سب ہوتے دیکھتی رہی۔

صبح جب اس نے کچھ شیم..... بالوں بھرے فاخر کو اپنے پہلو میں جو خواب دیکھا تو اس کے دل میں محبت کے بجائے کراہت جاگی۔ اس کا سانس سینے میں پھر سے گھٹنے لگا۔ اس ڈر سے کہ یہ کراہت مزید نہ بڑھ جائے اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ نو دس بجے کے قریب جب فاخر تیار ہو کر فارم پر جانے کے لئے نکلا تو وہ بہت ہشاش بشاش تھا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ سی چمک تھی۔ پتا نہیں اس چمک کو دیکھ کر شانی کو کیوں احساس ہوتا تھا کہ اس کے سرال اور اس کے میکے کے درمیان کوئی پرانا تعلق موجود ہے..... پرانا اور ناخوشگوار۔

شانہ کو رنگ والی سے اپنی رخصتی کے لمحے یاد تھے۔ ان لمحوں میں اباجی کچھ زیادہ ہی افسردہ اور دکھی نظر آئے تھے۔ شانی کو یوں لگا تھا کہ یہ دکھ صرف اس کی رخصتی کا نہیں ہے بات اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ وہ اباجی سے پوچھنا چاہتی تھی شاید یہ مالی پریشانی کا کوئی سلسلہ تھا..... یا اس کے علاوہ کوئی بات تھی؟ لیکن اب تک پوچھنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملا تھا..... اور پتا نہیں کب تک نہیں ملنا تھا اسے اپنے میکے سے رخصت ہوئے اب بارہ دن ہونے کو آئے تھے اسے یقین تھا کہ وہاں رنگ والی میں سب بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اباجی اور پھوپھی آمنہ ہر روز ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر حویلی کو آنے والی راہ دیکھتے ہوں گے۔ وہ خود بھی تو کسی بے قرار پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی مگر ابھی فوری طور پر آزادی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

شام تک شانی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ اسے ہلکا سا بخار بھی ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے اندر بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے یہ ٹوٹ پھوٹ جسم سے زیادہ روح کی تھی۔ اسے لاہور میں دیکھا ہوا ایک واقعہ یاد آ رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنی مرحومہ ماں اور اباجی کے ساتھ شاہی قلعہ اور مینار پاکستان دیکھنے لاہور گئی تھی۔ وہ لوگ شام کے وقت انارکلی بھی گئے تھے۔ کراکری کی ایک خوبصورت دکان میں اچانک ایک بچہ اہوا بیل گھس آیا تھا۔ ایک منٹ کے اندر اندر اس نے شاندار دکان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ شانی خود کو اس دکان کی طرح محسوس کر رہی تھی۔

ساری رات وہ بخار میں پھنکتی رہی۔ اگلے روز بھابھو مقبول اور بچے واپس آ گئے وہ بھابھو کے ساتھ اوپر والے کمرے میں چلی گئی۔ موسم گرم

ہوتا جا رہا تھا اور پورا کمر از یادہ ہوا دار اور روشن تھا وہ ایک رات بھاؤ اور بچوں کے ساتھ رہی۔ اس کی طبیعت تھوڑی سی سنبھل گئی۔ وہ ابھی مزید اوپر والے کمرے میں رہنا چاہتی تھی، بچوں کا اصرار بھی یہی تھا لیکن بھاؤ کچھ خائف نظر آتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فاخر اس بات پر خفا ہوگا۔ اس کا موڈ پہلے ہی اچھا نہیں تھا۔

دو پہر کوشانی کے لمبے ریشمی بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے وہ بولی۔ ”شانی! میرا خیال ہے کہ تم کچھ دن کے لئے رنگ والی چلی جاؤ۔“

”لیکن وہ لے کر جائیں تو جاؤں نا۔“

”اگر وہ نہیں جاسکتا تو میں اور چاچا رشید تمہیں چھوڑ آئیں گے۔ چاچے رشید کو تو جانتی ہونا تم..... حویلی کا پرانا نشی ہے۔“

”لیکن..... وہ اجازت دے دیں گے؟“

”میں ابھی پوچھ لیتی ہوں اس سے..... میرا خیال ہے کہ وہ فارم سے آ گیا ہے۔“ بھاؤ اس کے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔

کچھ ہی دیر بعد بھاؤ نیچے چلی گئی۔ مٹاشانی کی گود میں اوگھر رہا تھا وہ اسے تھکتی رہی اور سوچتی رہی شاید اس کا چند دن کے لئے یہاں سے چلے جانا ہی بہتر تھا..... بلکہ یہ بہت ضروری تھا۔ شانی کو اپنے دل میں اٹھتی ہوئی کراہت اور گھٹن سے ڈر رہا تھا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن یہ ہو رہا تھا۔ خاص طور سے اس دوسری چپ کے بعد تو وہ اپنے آپ کو بالکل خالی اور بے محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ ایسی ہو گئی تھی جیسا ایک بیوی کو بالکل نہیں ہونا چاہئے..... اور وہ اس بات پر شرمندہ بھی تھی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سب کچھ بھول بھال کر بڑی نیک نیتی سے اپنا گھر بسانے آئی تھی لیکن یہ گھر تھا کہ اس سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔

بھاؤ کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی اس کی صورت دیکھ کر شانی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ناکام لوٹی ہے۔

بھاؤ نے بے دلی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”وہ کہتا ہے کہ میں اسے خود ہی چھوڑ کر آؤں گا لیکن ابھی فرصت نہیں ہے۔“

”فرصت کب ہوگی؟“

”کہتا ہے کہ گندم کی کٹائی سر پر ہے۔ پانچ چھ دن تو بہت مصروف ہوں۔ اس کے بعد کوئی وقت نکالتا ہوں۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ ٹال رہے ہیں۔“

”نہیں شانی! اس وقت واقعی کام سر پر چڑھا ہوا ہے اس نے جانا ضرور ہے شاید تمہارے ابا جی اور چاچا جی سے کوئی کاروباری بات بھی کرنی ہے۔“ بھاؤ دیر تک شانی کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ وہ اسے گھریلو زندگی کے حوالے سے سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی مثالیں دے دے کر بتا رہی تھی کہ اس نے شادی کے بعد شروع کے دنوں میں اپنے مسئلے مسائل پر کس طرح قابو پایا۔

باتوں باتوں میں شانی کا دھیان پرسوں رات والے واقعے کی طرف چلا گیا۔ شام کے بعد وہ فاخر کی پسندیدہ ساڑھی پہن کر چھت پر فاخر کے ہمراہ چہل قدمی کر رہی تھی تو اس کا دھیان نیچے مہرجی کی پھلواڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے یوں لگا تھا کہ مہرجی کا ملازم خاص اکبر از مین میں کوئی گوشت قسم کی شے دبا رہا ہے۔ مہرجی بھی چپیر پر پاس ہی موجود تھے۔

شانی نے اس بارے میں بھابھ سے پوچھا تو وہ ایک گہری اور بوجھل سانس لے کر رہ گئی، ذرا توقف سے بولی۔ ”بندہ جب اتنی عمر کا ہو جائے تو اس کی عقل مت کا بس اللہ ہی حافظ ہوتا ہے، مہر کی عمر بھی سو سال سے زیادہ ہے۔ اس کی کئی باتیں تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں اور تو اور اس کے بیٹے بھی سر پکڑ کر رہ جاتے ہوں گے۔ پچھلے بیس تیس سال سے یہ سنیا س کے چکر میں پڑا ہوا ہے، کبھی سپیرے اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہیں، کبھی جڑی بوٹیوں والے چلے آتے ہیں..... تمہیں یہ سن کر بڑی حیرانگی ہوگی کہ یہ پھلوری میں سانپ اگاتا ہے۔“

”سانپ اگاتا ہے؟“ شانی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔

”ہاں..... کہیں کسی کو بتانا نہیں جو کچھ میں تمہیں بتا رہی ہوں، میرا مطلب ہے کہ میرا نام نہیں لینا۔ کچھ دن بعد تمہیں خود ہی پتا چل جانا ہے پھر جس سے مرضی کہہ دیتا۔“

”ٹھیک ہے بھابھ! کہوں گی..... لیکن سانپ اگانے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”سانپ دراصل ایک چھوٹے سے بونے کا نام ہے۔ اس کے پتے پھنیر سانپ کے چھن جیسے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لال پھول بھی لگتے ہیں اس میں تو پھلوری کے پاس سے گزرے گی تو تجھے یہ لال پھولوں والا بونا نظر آئے گا اسے پنجابی میں ”سپ گندل“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پودا بہت ہی کم ملتا ہے، کہتے ہیں کہ اسے پالنا ہو تو اس کی جڑوں میں کھاد کی جگہ مردہ سانپ ڈالنا پڑتا ہے اور پانی کے ساتھ ساتھ اسے خون بھی دینا پڑتا ہے۔“

”اس پودے سے کیا ہوتا ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”اصل بات تو اوپر والا ہی جانتا ہے کہتے ہیں اگر کسی کو اصل ”سپ گندل“ مل جائے اور وہ اسے استعمال کرتا رہے تو اس کی عمر بڑی لمبی ہو جاتی ہے۔“

”تو مہرجی اس پودے کو استعمال کرتے ہیں؟“

”سنا ہے کہ اس پودے کے چند خاص خاص پتے ہی استعمال کرنے والے ہوتے ہیں، مہران پتوں کو جمع کرتا ہے پھر ان سے کوئی معجون وغیرہ بناتا ہے یہ اتنی کڑوی ہوتی ہے کہ ڈنگر کو کھلا دو تو وہ زمین پر لیٹنے لگے لیکن مہر بالکل وکھری ٹائپ کا شخص ہے جو بندہ سانپ کا لہو اور سانپ کے پتے کا پانی پی جائے اور سانپ کا گوشت کھا جائے وہ کیا نہیں کر سکتا۔“

”تمہارا مطلب ہے.....“ شانی نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں شانی! میں نے اپنی اکھیوں سے دیکھا ہے اُسے سانپ کے لہو میں سانپ کے پتے کا پانی ملا کر پیتے ہوئے۔“

شانی کا دل خراب ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنی ابا کی بمشکل روکی..... وہ دونوں کمرے میں بیٹھی تھیں، اچانک شانی کی نظر کھڑکی سے گزر کر نیچے حویلی کے مین گیٹ کی طرف چلی گئی۔ وہ بُری طرح چونک گئی۔ اسے نیلے ڈورے والی ایک سفید پگڑی نظر آئی۔ ایسی پگڑی ”رنگ والی“ کے جامع مسجد کے امام حاجی معصوم ہی پہنتے تھے، حاجی معصوم شانی کے دور کے رشتے دار بھی تھے۔ وہ انہیں بتایا کہہ کر بلاتی تھی۔ اسے لگا کہ یہ بتایا ہی ہیں چند لمحے بعد اس کی پوری تصدیق بھی ہوگئی۔ جب وہ تانگے میں بیٹھنے کے بعد مڑے تو ان کا چہرہ شانی کے سامنے آ گیا۔ وہ بتایا معصوم ہی تھے اور جا

بھی رہے تھے اس سے ملے بغیر۔ شانی کے جی میں آئی کہ وہ کھڑکی سے ہی انہیں پکارنا شروع کر دے لیکن فاصلہ زیادہ تھا کچھ ہی دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

”کون تھا یہ؟“ بھا بونے پوچھا۔

شانے نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔ بھا بونے حیران ہوئی کہ فاخر نے اس بارے میں شانی کو کیوں نہیں بتایا۔
شانے دیر تک سوچتی رہی کہ ایسی کیا مجبوری تھی کہ تایا معصوم اس سے ملے بغیر چلے گئے، کہیں ایسا تو نہیں کہ فاخر نے انہیں اس سے ملنے ہی نہ دیا ہو کچھ..... بعد از قیاس نہیں تھا۔ وہ کیوں آئے تھے؟ کوئی پیغام لائے تھے یا کوئی اور بات تھی؟ وہ خیالوں کے گورکھ دھندے میں کھوئی رہی اور پھر نیچے چلی گئی۔ سب گندل والی بات وہیں کی وہیں رہ گئی تھی۔ فاخر بیڈروم کے ساتھ والے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے دور جسر کھول رکھے تھے اور حساب کتاب میں مگم نظر آتا تھا۔ منشی رشید اس کام میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد منشی رشید اٹھ کر چلا گیا۔ شانی فاخر کے ارد گرد گھومتی رہی۔ پہلے اسے چائے دی پھر اس کی ہدایت پر سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر وغیرہ بیڈروم سے لے کر آئی پھر کمرے میں ادھر ادھر سامان ترتیب سے رکھتی رہی..... وہ چاہتی تھی کہ فاخر اس سے خود ہی تایا معصوم کے بارے میں بات کرے لیکن وہ تو جیسے اس بات کو بھول ہی گیا تھا۔ اس نے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں لیکن تایا کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔

شانے کو اندازہ ہوا کہ وہ اس سے تایا والی بات چھپانا چاہتا ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دل کے اندر کچھ اور بھی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ دکھ اور غصے کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی لیکن وہ برداشت کر گئی۔ رات گئے جب وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے شانی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں شوہر سے پوچھا۔ ”آج کوئی رنگ والی سے آیا تھا آپ کے پاس؟“

فاخر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر ذرا خشک لہجے میں بولا۔ ”کس کی بات کر رہی ہو؟“

”تایا معصوم کی۔ م..... میں نے انہیں حویلی کے پھانک سے نکلتے دیکھا تھا۔“

”اگر معلوم ہی ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟“ فاخر ایک دم بھڑک گیا۔

”وہ مجھ سے ملے بغیر چلے گئے، مجھے ان سے ملنا تو دور کی بات ہے آپ نے مجھے ان کے بارے میں بتایا تک نہیں۔“

”کوئی خاص بات نہیں تھی کہ میں تمہیں اس سے ملاتا میں نے کہہ دیا کہ وہ بیمار ہے آرام کر رہی ہے۔“

شانے چند لمحے شوہر کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر دبے لہجے میں بولی۔ ”کیا وہ یہ پوچھنے آئے تھے کہ میں رنگ والی کب آرہی ہوں؟“

”ہاں..... ہاں یہی پوچھنے آیا تھا۔“ فاخر بلند آواز میں بولا۔ ”اور میں نے کہہ دیا ہے ان سے کہ مجھ پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں

وہ لوگ..... مجھے جب آنا ہوگا خود لے کر آ جاؤں گا۔ میرا دماغ چائے اور مغز کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”ل..... لیکن۔“

”اور تم بھی کان کھول کر سن لو۔“ فاخر دھاڑتا چلا گیا۔ ”میں بھی تمہیں کہیں نہیں بھیج رہا۔ میں اپنے بیٹے میں پھنسا ہوا ہوں اس سے نکلوں گا

تو تمہاری سواری چھوڑ کر آؤں گا تمہارے ابا جی کے پاس۔ ابھی جانے کی بات کھوپڑی سے نکال دو۔“

شانی سن کھڑی تھی۔ شاید اس وقت اسے کانٹا جاتا تو جسم سے لہو کا قطرہ بھی نہ نکلتا۔

فاخر گرج کر بولا۔ ”جاؤ اب کام کرو اپنا۔“

شانی خود کو سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئی۔

صبح اُسے پتہ چلا کہ فاخر منہ اندھیرے اپنے دو دوستوں اور ایک وکیل کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے۔ لاہور سے انہیں اسلام آباد جانا تھا۔ اس کا اٹیچی کیس پہلے سے تیار پڑا تھا وہ ساتھ لے گیا تھا۔ شانی نے اس بارے میں منشی رشید سے پوچھا۔ حویلی کے اکثر لوگوں کی طرح منشی رشید بھی چند ہی دنوں میں شانی کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ اسے بیٹی بھی کہتا تھا اور اس کا ادب بھی کرتا تھا۔ منشی کی بیوی بھی حویلی ہی میں ملازم تھی وہ بھی آتے جاتے شانی کی بلائیں لیتی تھی اور دو دھوں نہانے پوتوں پھلنے کی دعا دیتی تھی۔ حالانکہ شانی ان لوگوں کو کچھ دیتی نہیں تھی بس میٹھا بول بولتی تھی اور ہمدردی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس کی یہ ادا حویلی کے ہر ملازم کے دل میں اُتر گئی تھی۔ شانی کی بات کے جواب میں منشی رشید نے کہا۔ ”بیٹی جی! مجھے ٹھیک سے پتا تو نہیں ہے پر میرا خیال ہے کہ یہ وہی فیکٹری کے ملازموں والا معاملہ ہے شاید چوہدری صاحب اسی معاملے کو سیدھا کرنے گئے ہیں۔“

”آپ کا کیا خیال ہے منشی چاچا وہ کب تک آجائیں گے؟“

”بیٹی جی! میرا اندازہ ہے کہ انہیں کچھ دن لگیں گے مجھے کچھ پیسے دے گئے ہیں کہ میں پہلی تاریخ کو ضروری تنخواہیں دے دوں۔“

شانی کا دل کچھ اور بھی بھج گیا۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ ابھی وہ آٹھ دس دن مزید رنگ والی نہیں جاسکے گی۔ اسے یقین تھا کہ رنگ والی سے تیا معصوم کو ابا جی نے ہی بھیجا ہوگا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ شانی کے آنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ تیا معصوم یہاں سے کیسا جواب لے کر گئے ہیں اور اس جواب کا اثر شانی کے گھر والوں پر کیا ہوا تھا۔ وہ جتنا سوچتی تھی اتنی ہی افسردہ ہوتی چلی جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا دل ڈوب رہا ہے۔

یہ تیسری رات کا واقعہ ہے۔ فاخر کے جانے کے بعد شانی بھابو کے کمرے میں سوئی تھی۔ ندیم اور منا بہت خوش تھے رات گئے تک شانی سے لپٹ کر کہانی سنتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دل میں دعا کرتے ہوں کہ چاچا فاخر دس بارہ دن کے بجائے دس بارہ ہفتوں بعد واپس آئیں۔ درحقیقت فاخر اس گھر کا مطلق العنان تھا۔ بڑا بھائی بشیر کویت میں تھا۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے دادا اپنے مزاج کا ایک علیحدہ ہی شخص تھا، کوئی شخص فاخر سے پوچھتا چھ کرنے والا نہیں تھا اور وہ ہر کسی سے پوچھتا چھ کر سکتا تھا۔ اس کی موجودگی میں ملازمین سے لے کر اہل خانہ تک سبھی سہمے رہتے تھے۔ اس رات بھی ندیم اور منا دیر تک شانی کے ساتھ جاگتے رہے۔ پھر دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ بھابو پہلے ہی سو چکی تھی۔ برا آمدے سے سیڑھیوں کی طرف کھٹنے والا دروازہ رات کو شانی ہی مقفل کرتی تھی۔ اسے وہم سا ہو رہا تھا کہ پتا نہیں اس نے دروازہ مقفل کیا ہے یا نہیں۔ اسی وہم کے سبب وہ اٹھی اور ننگے پاؤں زینے اُترتی ہوئی برا آمدے کے دروازے تک پہنچی اس کی یہ تھوڑی سی احتیاط کا رآمد ثابت ہوئی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شانی نے کنڈی لگا کر قفل چڑھایا اور چابی لے کر سیڑھیوں کی طرف مڑی۔ اچانک اسے لگا کہ سیڑھیوں کے نیچے موجود کمرے میں

آہٹ سی ہوئی ہے۔ وہ بُری طرح چونک گئی نازک بدن ہونے کے باوجود اس میں فطری دلیری اور جرأت موجود تھی۔ وہ ذرا سا آگے بڑھی اس کی چھٹی حس پکار کر آگاہ کرنے لگی کہ تاریک کمرے میں کوئی ہے۔

شانی کا ہاتھ سیرھیوں کے پاس لگے سوچ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے سوچ آن کیا تو باہر کی روشنی کمرے کے اندر تک گئی اچانک ایک منظر نے شانی کو سرتاپا لرزادیا۔ ایک شخص شدید زخمی حالت میں کمرے کے ایک گوشے میں گٹھڑی کی طرح سمٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ہی نہیں جسم بھی لہو لہان تھا۔ شانی نے پہلے تو شور مچانے اور سیرھیوں کی طرف بھاگنے کا ارادہ کیا..... غالباً اس ارادے سے اس نے منہ بھی کھولا تھا اور پیچھے کی طرف ایک قدم بھی اٹھایا تھا مگر پھر اجنبی کے چہرے پر اسے نہ جانے کیا چیز نظر آئی کہ وہ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی..... وہ شخص شدید زخمی تھا اور بے چارگی کی مکمل تصویر نظر آتا تھا۔ شانی نے سب سے پہلے تو یہ دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں یا اس کے آس پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے پھر اس نے ایک لرزتا ہوا قدم کمرے کی دہلیز کی طرف بڑھایا۔

یوں لگتا تھا کہ زخمی بس بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ اس کا چہرہ ہلدی تھا اور آنکھیں بند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ ایک التجا کے ساتھ شانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شانی چند لمحے سوچتی رہی پھر اجنبی کی طرف بڑھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھا اور ایک طرف کو کھسکتا چلا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بے جان شے کی طرح پختہ فرش پر گرنے والا ہے۔ ایسے میں اس کے سر کے ساتھ پختہ فرش کا تصادم بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایک اضطراری حرکت کے تحت شانی بے ساختہ آگے بڑھی..... اسے تب پتا چلا جب زخمی کا سر اس کی گود میں تھا واقعی اگر وہ بروقت آگے نہ بڑھتی تو اس کا سر بُرے طریقے سے فرش کے ساتھ ٹکراتا۔

وہ ایک یادو سینکڑ تک اضطراری کیفیت میں اس کا خون آلود چہرہ دیکھتی رہی پھر جلدی سے اس کا سر اپنی گود سے نکال کر فرش پر رکھ دیا۔ وہ ایک ستائیس اٹھائیس سالہ شخص ہوگا۔ اس کا جسم مضبوط اور بال لمبے تھے وہ سیاہ تہندہ اور اسی رنگ کے کُرتے میں تھا۔ یہ لباس بوسیدہ اور خون آلودہ تھا۔ اجنبی کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا تاہم اس کے خشک چھٹے ہوئے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بے ہوشی گہری نہیں ہے۔ شانی نے پریشانی کے عالم میں بھاؤ کو آواز دی لیکن محسوس ہوا کہ آواز بھابھو تک پہنچی نہیں بس سیرھیوں میں ہی گونج کر رہ گئی ہے۔ ویسے بھی بھابھو کی نیند بڑی کچی تھی۔ شانی کی سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا وہ قریب رکھے ہوئے واٹر کولر کی طرف بڑھی اور تھوڑا سا پانی گلاس میں ڈال لیا، اپنے لرزتے ہاتھوں سے یہ پانی اس نے تھوڑا تھوڑا اجنبی کے خشک ہونٹوں پر پٹکایا، پھر اپنی اوڑھنی کے پلو سے اسے ہوا دینے لگی۔ اس کی پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی اور وہ ہولے ہولے کرا بنے لگا۔

پہلے تو شانی کے جی میں آئی کہ تالا کھول کر ملازموں کو آوازیں دے لیکن پھر پتا نہیں کیوں اس نے ارادہ بدل لیا۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص کیوں اور کس خوف کے سبب یہاں آ کر چھپا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے اس بُری طرح زخمی کر کے یہاں پناہ لینے پر مجبور کرنے والے حویلی کے لوگ ہی ہوں۔ پتا نہیں کیوں اسے اجنبی بے حد قابلِ رحم نظر آ رہا تھا۔

اس نے غور سے اس کا سراپا دیکھا۔ اس کا ایک بازو ٹوٹ کر ٹک رہا تھا۔ جسم پر تیز دھار آلے کے درجنوں زخم تھے اور ایک دوزخم تو اتنے

گہرے تھے کہ ہڈی تک نظر آ رہی تھی خون بہہ رہا تھا اسے فوری مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ پنڈلیوں کے قریب دو تین زخم ایسے بھی تھے جو تیز دھار آلے کے نہیں تھے، انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی جانور کے کانٹے سے آئے ہیں۔ شاید کتے کے کانٹے سے۔ شانی کو کچھ اور تو نہیں سوچھا، اس نے الماری سے ایک پرانی چادر نکال کر اسے پیٹوں کی صورت میں پھاڑا، باورچی خانے کے چولہوں میں راکھ موجود تھی۔ وہ ایک تھالی میں بہت سی راکھ ڈال کر لے آئی۔ اجنبی کے وہ زخم جن پر سے کپڑا ہٹانے میں کوئی حرج نہیں تھا اس نے ننگے کئے اور ان پر راکھ ڈالتی گئی اور پٹیاں باندھتی گئی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا یہ کوئی بھلا آدمی ہے اور اسے مدد کی شدید ترین ضرورت ہے۔ وہ کس گاؤں کس قبیلے کا تھا؟ اس حویلی سے اور یہاں رہنے والوں سے اس کا کیا تعلق تھا؟ یہ باتیں بعد میں بھی سوچی جاسکتی تھیں۔ جب وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق زخمی کی مرہم پٹی کر رہی تھی اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ شانی کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

زخمی کا خون کسی حد تک بند ہو گیا تو شانی کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ وہ کم از کم بھابھو کو اس بارے میں ضرور بتا دے۔ وہ اس ارادے سے اٹھی تو اس کی نگاہ زخمی کے زرد چہرے پر پڑی شاید وہ اپنا سرفنی میں ہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اسے باہر جانے کے بارے میں دوسروں کو بتانے سے روک رہا ہو لیکن شانی اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی تھی اسے کم از کم بھابھو کو تو آگاہ کرنا ہی تھا۔ وہ ہانپتی ہوئی اوپر بھابھو کے پاس پہنچی اور اسے جگایا پہلے تو بھابھو اس کے خون آلود کپڑے دیکھ کر بُری طرح گھبرا گئی۔ پھر شانی نے اسے تسلی دی اور اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے ساری بات شروع سے آخر تک بھابھو کو بتائی۔

بھابھو نے شال اوڑھی اور شانی کے ساتھ نیچے میز ہیوں کے ساتھ والے کمرے میں پہنچی۔ دونوں گھبرائی ہوئی تھیں لیکن بھابھو کی گھبراہٹ نسبتاً زیادہ تھی، زخمی اسی طرح فرش پر لیٹا ہوا تھا، خون کے زیادہ اخراج کے سبب وہ شدید ترین نقاہت کے اثر میں تھا۔ رنگ بالکل ہلکی ہو رہا تھا۔ بھابھو نے اس کا سراپا دیکھا۔ پھر اس کی نگاہ زخمی کے ہاتھ کے کڑے پر پڑی وہ چونک سی گئی۔

چند لمحے بعد بھابھو شانی کو کمرے سے باہر لے آئی۔ سرگوشی میں بولی۔ ”شانی مجھے پکا یقین ہے یہ بندہ سیالوں کا ہے۔ نارپور کے چوہدری اور آسے پاس کے زمیندار سیالوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ تم نے ٹھیک ہی کیا ہے کہ ابھی کسی کو بتایا نہیں یہ بے چارہ تو پہلے ہی آدھا مرا ہوا ہے۔“

”اب کیا کیا جائے اس کا؟“ شانی نے پوچھا۔

”خون تو اس کا بند ہو گیا ہے ہو سکتا ہے کہ صبح تک اس کی حالت سنبھل جائے۔“ بھابھو نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”ہمیں اس چکر میں نہیں پڑنا چاہئے، دوی طریقے ہیں یا تو اس کے بارے میں مہر اور نشی رشید وغیرہ کو بتا دیا جائے یا اسے جلد سے جلد یہاں سے نکال دیا جائے۔“

”ابھی اس کی حالت تو ایسی نہیں لگتی کہ یہاں سے نکل سکے۔“ شانی فکر مندی سے بولی۔

”پر پھیلے لو کے ہم اپنے لئے کوئی مصیبت بھی تو کھڑی نہیں کر سکتے۔ اگر یہ بندہ کسی غلط نیت سے حویلی میں گھسا ہے یا اس کی ہمارے بندوں کے ساتھ کوئی دشمنی ہے تو پھر اس کی مدد کر کے ہم اپنے پیروں پر کھلنا ہی نہیں مار سکتے۔“

شانی نے کہا۔ ”میرے دماغ میں ایک اور بات آ رہی ہے، شام کے بعد جب آپ مہرجی کی مٹھی چانی کرنے گئی تھیں، بیلے کی طرف سے

فائرنگ کی آوازیں آئی تھیں۔“

”ہاں وہ آوازیں تو میں نے بھی سنی تھیں۔“ بھابو نے کہا۔

”میں نے بعد میں منشی چاچا سے پوچھا تھا اس نے بتایا کہ بیلے میں کچھ لوگوں کے درمیان لڑائی ہوئی ہے کوئی زمین وغیرہ کا معاملہ ہے۔“

لڑائی میں زخمی ہونے والے ایک بندے کو مرہم پٹی کے لئے یہاں نارپور میں بھی لایا گیا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ بندہ بھی بیلے کی لڑائی میں زخمی ہوا ہے۔“

”بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔“ شانی نے کہا۔

لگتا تھا شانی کی بات بھابو کے دل کو لگی ہے۔ وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر لمبی سانس لے کر کہنے لگی۔ ”تُو ایسا کر کہ دروازے کو باہر سے تالا لگا دے صبح سویرے ہم دونوں اس سے بات کریں گے۔ اگر تو یہ باہر کا بندہ ہے اور کسی باہر کی لڑائی میں ہی زخمی ہوا ہے تو پھر اس کی مرہم پٹی میں کوئی حرج نہیں اور اسے یہاں سے باہر نکلنے میں مدد دی جاسکتی ہے لیکن اگر اس کا چکر ہماری حویلی یا یہاں کے کسی بندے سے ہوا تو پھر ہمیں مہر اور منشی کو بتانا ہی پڑے گا۔“

رات کا بیشتر حصہ شانی نے جاگتے ہی گزارا۔ اجنبی کی بے چارگی اور اس کی دگرگوں حالت بار بار اس کے ذہن میں آ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب پانی تک رکھ کر نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کس حالت میں تھا کہیں بے ہوشی کی حالت میں ختم ہی نہ ہو گیا ہو۔ وہ خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر سوچ رہی تھی۔ صبح ابھی دور تھی۔ بھابو گہری نیند سو رہی تھی اچانک شانی کو لگا کہ سیڑھیوں کے نیچے بند کمرے میں زخمی دردناک انداز میں کراہ رہا ہے وہ آواز صاف طور پر نہیں سن رہی تھی لیکن محسوس یہی ہوتا تھا کہ رات کے سناٹے میں دھیرے دھیرے کراہنے کی آواز درود یوار میں سرسرا رہی ہے۔ اب پتا نہیں کہ یہ وہم تھا یا حقیقت اس کا دل لرزنے لگا۔ اس کی فطری ہمدردی اور خدا ترسی اسے جھنجھوٹنے لگی۔ وہ آہستہ سے اٹھی، تکیے کے نیچے سے چابی نکالی اور زینوں پر ننگے پاؤں ہولے ہولے چلتی نیچے آ گئی۔ اس نے دل کڑا کر کے قفل میں چابی گھمائی اور دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اجنبی واقعی کراہ رہا تھا مگر اس کی آواز اتنی مدہم تھی کہ بمشکل کمرے سے باہر نکلتی ہوگی۔ اس کا مطلب تھا کہ شانی نے جو کراہیں سنیں وہ خیالی تھیں۔ وہ اسی طرح فرش پر لیٹا تھا۔ اس کی ران کے زخم سے رسنے والا خون اس کے سیاہ تہبند کو گلیا کر رہا تھا۔ باقی زخموں سے رسنے والا خون تقریباً بند ہو چکا تھا۔ اجنبی درمیانی شکل و صورت کا تھا اس کا چہرہ فربہ نہیں تھا رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور اس کی جفاکشی کو ظاہر کرتی تھیں۔ مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹ سوکھ کر اکڑ رہے تھے۔ ”پپ..... پانی.....“ اس کے ہونٹوں سے سرگوشی کی سی آواز نکلی۔

شانسی نے کولر میں سے پانی نکالا اور اس کے سر ہانے آ بیٹھی۔ بائیں ہاتھ سے اس کا سرو اونچا کر کے وہ دائیں ہاتھ سے تھوڑا تھوڑا پانی اس کے ہونٹوں میں پکانے لگی۔ تب اس نے الماری سے صوفے کے دو کٹن ٹکالے اور انہیں تکیے کی جگہ زخمی کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ زخمی کو توانائی کی شدید ضرورت ہے۔ وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں گئی وہاں اس نے ایک منتقل گلاس میں تھوڑا سا دودھ نکالا دودھ میں دیسی گھی ملا دیا اور دوبارہ زخمی کے پاس آ گئی۔ اس نے کوشش کر کے تقریباً ایک تہائی گلاس اسے پلا دیا۔ ان ساری کارروائیوں کے دوران ایک دو بار اس کی نگاہ زخمی کے

چہرے کی طرف بھی گئی۔ ہر بار اس نے دیکھا کہ وہ ایک تک اس کی طرف دیکھتا چلا جا رہا ہے۔ زخمی کی نگاہوں میں کوئی عجیب سی بات تھی۔ روزمرہ کی زندگی میں ہوش سنبھالنے سے اب تک شانی نے بہت سے مردوں کی نگاہیں دیکھی تھیں۔ ان میں اجنبی بھی تھے اور اپنے عزیز بھی۔ زخمی رشتے دار بھی تھے اور پرانے بھی لیکن جو کیفیت وہ اس نگاہ میں دیکھ رہی تھی اس کا تجربہ اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک سردلہری اس کے اندر گہرائی تک دوڑ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس نگاہ میں سے ایک دودھیاروشی پھوٹ رہی ہے اور کسی بے نام خوشبو کے ساتھ مل کر یہ روشنی اس کے گرد ایک ہالہ سا بنا رہی ہے۔

اسے اجنبی کی نگاہوں سے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ وہ ایسے کیوں دیکھ رہا تھا۔ اس کا سارا دھیان تو اپنی شدید جسمانی تکلیف کی طرف ہونا چاہئے تھا اور وہ واقعی تکلیف میں تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ صرف اور صرف یہ تکلیف ہی تھی جس کے سبب شانی نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھا تھا اور اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔ جو چند پٹیاں زیادہ بھیگ گئی تھیں وہ اس نے زخمی کے جسم سے علیحدہ کیں اور زخموں پر تازہ راکھ رکھ کر نئی پٹیاں باندھ دیں۔ کمزوری کے سبب زخمی پر بار بار غنودگی طاری ہو جاتی تھی پھر تکلیف ہی کے سبب غنودگی ٹوٹ بھی جاتی تھی۔ جب غنودگی نہیں ہوتی تھی وہ کراہنے لگتا تھا۔ اس کا منہ اندر سے بھی گھائل تھا۔ شاید اسی لئے اسے بولنے میں زیادہ دشواری ہو رہی تھی۔

اس نے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کہے جن میں سے بس ایک لفظ ہی اس کی سمجھ میں آیا۔ ”مہربانی۔“

زیرو کے بلب کی مدھم روشنی میں شانی نے دھیان سے زخمی کا لباس دیکھا اس کے کپڑوں پر کچھ کے علاوہ سرکنڈوں کا بہت سا بور بھی چٹا ہوا تھا اور سرکنڈے یہاں صرف بیلے میں ہی تھے۔ کم از کم شانی نے تو بیلے میں ہی دیکھے تھے یہ قیافہ درست محسوس ہوتا تھا کہ یہ اجنبی شخص بیلے کی لڑائی میں ہی زخمی ہو کر یہاں پہنچا ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کا کیا کیا جائے ابھی اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے یہاں سے نکل جانے کو کہا جاتا۔ حویلی کے کسی دوسرے فرد کو اس بارے میں اطلاع دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ جیسا کہ بھابھو نے بتایا تھا کہ یہ سیالوں کا بندہ ہے اور سیالوں کو علاقے کے چوہدری اچھا نہیں سمجھتے۔

اجنبی کی حالت اب قدرے تسلی بخش تھی شانی نے سرگوشیوں میں اسے سمجھایا کہ وہ خاموشی سے یہاں پڑا رہے ورنہ مشکل میں پڑ سکتا ہے اس نے پانی کا گلاس اس کے نزدیک رکھا۔ دروازے کو باہر سے مقفل کیا اور اوپر بھابھو کے پاس چلی گئی۔

دن چڑھنے کے بعد شانی اور بھابھو مقبول سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے غیر دانستہ طور پر ایک ذمے داری اٹھائی تھی۔ اب چاہتی تھیں کہ جلد از جلد اس سے عہدہ برآ ہو جائیں وہ کسی مزید چکر میں الجھنا نہیں چاہتی تھیں اور مزید چکر سے بچنا اسی صورت میں ممکن تھا کہ اجنبی حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکل جاتا۔

دن میں اجنبی سے رابطہ کرنا آسان نہیں تھا۔ سیزھیوں اور برآمدے میں ملازموں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ صرف دوپہر کے وقت موقع مل سکتا تھا۔ اس وقت ذرا سکون ہوتا تھا اس روز بھابھو کے میکے سے چند مہمان بھی آ گئے۔ ان مہمانوں کے سبب سیزھیوں کے نیچے والے کمرے کی طرف جانا اور بھی مشکل ہو گیا۔

دوپہر دو بجے کے قریب شانی نے مشکل سے چند منٹ نکالے قفل کھول کر اندر گئی وہ ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس نے کمرے کے اندر سے ہی

تین چار چھوٹی لکڑیاں ڈھونڈی تھیں اور انہیں اپنے ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ جوڑ کر اوپر پٹی باندھ لی تھی۔ اس کا رنگ اب بھی لمبوں کی طرح زرد تھا اور اسے ہلے جلنے میں دشواری ہوتی تھی۔

شانی نے نیم گرم دودھ سے بھرا ہوا پیتل کا گلاس اس کے قریب رکھا اور بولی۔ ”تھوڑا تھوڑا کر کے پی لو۔“

”بہت مہربانی۔“ اس نے اپنے زخمی منہ کو بمشکل ہلایا، آنکھوں میں وہی عجیب سی کیفیت تھی۔ یہ رقت، احسان مندی اور عقیدت سے ملتی جلتی کوئی چیز تھی۔ شانی اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ یہاں کیسے پہنچا ہے لیکن اسی دوران میں مین گیٹ کی طرف گاڑی کے انجن کا شور سنائی دیا۔ یہ فاخر کی گاڑی تھی، کیا وہ واپس آ گیا تھا؟ اتنی جلدی واپس آ گیا تھا؟ خون شانی کی رگوں میں سنسناتا تھا اس نے افراتفری میں کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کیا اور سیڑھیاں چڑھ کر بھابھو کے پاس آ گئی۔ بھابھو بھی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔ یقیناً اس نے بھی حویلی سے باہر فاخر کی گاڑی کی آواز سن لی تھی۔ وہ اوپر کی ایک بالکونی سے نیچے احاطے میں دیکھنے لگیں۔ تاہم وہ اس طرح کھڑی تھیں کہ انہیں نیچے سے نہ دیکھا جاسکے۔ اگر واقعی فاخر آ گیا تھا تو پھر بڑی مصیبت پر دست تھی۔ حویلی میں ایک غیر شخص موجود تھا اور شانی اور بھابھو کے سوا اس کے متعلق کسی کو معلوم نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد بھابھو کے سینے سے اطمینان کی طویل سانس نکل گئی۔ یقیناً شانی کی پریشانی بھی ایک دم ناپید ہو گئی تھی۔ یہ گاڑی فاخر کو لے کر نہیں آئی تھی۔ جیسا کہ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا، فاخر اسلام آباد چلا گیا تھا۔ وہاں اس کے دوست کے پاس تین چار گاڑیاں موجود تھیں لہذا فاخر نے اس گاڑی کو قائلو سمجھتے ہوئے واپس بھیج دیا تھا۔

فاخر کا رعب آمیز خوف صرف بھابھو یا شانی تک ہی محدود نہیں تھا، حویلی میں موجود غالباً مہرجی کے سوا ہر ذی حس اس خوف میں مبتلا رہتا تھا۔ اس کی موجودگی میں ہر کسی کے اعصاب تنے رہتے تھے۔ لہجے مختاط اور حرکات و سکنات نپٹی تلی ہوتی تھیں۔ اس کی غیر موجودگی میں ہر شے اپنی اصل حالت میں آ جاتی تھی۔ دروہام میں زندگی کی لہر دوڑتی تھی اور ماحول کی کشیدگی ایک رواں دواں بے تکلفی میں ڈھل جاتی تھی۔

اب بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ جان کر کہ نیلی لینڈ کروزر پر فاخر کے بجائے اس کا ایک ملازم اور دو گارڈ آئے ہیں، بھابھو اور شانی کی اندرونی کشیدگی بھی ایک خوشگوار اطمینان میں ڈھل گئی۔ شانی نے بھابھو کو بتایا کہ زخمی اب پہلے سے بہتر نظر آتا ہے۔ اس کا منہ اندر سے بُری طرح زخمی ہے لیکن وہ کوشش کر کے ایک دولفظ ادا کر لیتا ہے۔ وہ دیر تک سر جوڑے بیٹھی رہیں اور کوئی ایسا طریقہ سوچتی رہیں جو زخمی کو حویلی سے نکالنے کے لئے محفوظ ترین ہو۔

بھابھو نے کہا۔ ”کم از کم آج کی رات تو ہمیں ایسا موقع نہیں مل سکتا۔“

”وہ کیوں؟“ شانی نے پوچھا۔

”کل ہفتہ ہے۔ ہفتے کی شام چار پانچ کارندے چھٹی پر چلے جاتے ہیں۔ پھانک پر تین پہرے داروں کے بجائے ایک یا دو پہرے دار ہوتے ہیں۔ حویلی کے پچھواڑے بھی پہرازم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی پچھواڑے والے پہرے دار دارو و شاربھی پی لیتے ہیں۔ میرے خیال میں تو کل کسی وقت اسے یہاں سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔“

سلطان باہر نکلا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور واسکٹ میں شاندار نظر آ رہا تھا۔ شانی نے نظروں ہی نظروں میں بھائی کو سر تا پا چوم لیا۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اور بھائی سے لپٹ گئی بھائی نے بھی بار بار اس کا ماتھا چوما پھر وہ دونوں اندر آ گئے۔

شانی کو لگ رہا تھا کہ اس نے برسوں بعد اپنے کسی شناسا کی صورت دیکھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ وہ ایک ایک کا حال پوچھنے لگی۔ اباجی، پھوپھی، آمنہ، چچی، نصرت، نگہت، تایا، معصوم۔ پھر اس نے گھر کے ہر ملازم اور ملازمہ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد سہیلیوں کی باری آئی۔ سیکینہ، صغرا، شمیم اور پتا نہیں کون کون؟

وہ ایک ہی سانس میں پوچھتی جا رہی تھی اور عادل سلطان مختصر اُبتا جا رہا تھا۔ آخر وہ تھک کر بولا۔ ”بھئی! مجھ سے بیٹھنے کو نہیں کہو گی۔“

جاسوی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا مقبول سلسلہ

دیوی

طاہر جاوید گل چھٹا حصہ ساتواں حصہ

”ہاں ہاں بیٹھو ناں بھائی۔“ وہ چونک کر بولی۔

”فاخر کہاں ہے.....؟ آج تو چھٹی ہے ناں؟“

”وہ..... وہ لاہور سے باہر ہیں۔“

”اوہو..... وہ ہوتا تو بہتر تھا۔“

”کیا مطلب بھائی؟“

”میں تمہیں لے جانے آیا ہوں.....“ عادل سلطان نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”کیوں..... خیریت تو ہے بھائی؟“ وہ ذرا چونک گئی۔

”ہاں خیریت ہی ہے بس..... اباجی ذرا بیمار ہیں۔“

”ہائے میں مر گئی..... کیا ہوا اباجی کو؟“ وہ سر تا پا لرز گئی رنگ زرد ہو گیا۔

”بس سینے میں ذرہ درد ہوا تھا، لاہور ہسپتال لے کر گئے تھے اب واپس آ گئے ہیں۔ کافی بہتر ہیں۔“

شانی سنائے کی سی کیفیت میں تھی۔ روہاسی آواز میں بولی۔ ”اتنا کچھ ہو گیا لیکن آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔“

”کوئی زیادہ پریشانی کی بات نہیں بھئی اب ٹھیک ہیں تمہیں یاد کر رہے تھے۔ میں نے کہا اچھا میں خود جا کر لے آتا ہوں۔“

”میں ابھی چلوں گی۔“ شانی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

ساتھ والے کمرے میں جا کر وہ جلدی جلدی اپنے چند کپڑے اٹپی کیس میں رکھنے لگی اسی دوران میں بھابھاس کے پاس آ گئی۔ اس نے

عادل اور شانی کے درمیان ہونے والی بات چیت سنی تھی اور جان گئی تھی کہ شانی کے اباجی کو دل کی تکلیف ہوئی ہے اور اب شانی فوری طور پر بھائی کے ساتھ رنگ والی جا رہی ہے۔

وہ کچھ دیر تک شانی کو اٹپی کیس تیار کرتے دیکھتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ ”اگر اباجی کی طبیعت اب ٹھیک ہے تو تھوڑا سا انتظار

کرو..... میرا مطلب ہے..... کہیں اس طرح ایک دم چلے جانے سے فاخر ناراض نہ ہو جائے۔“

شانی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ تیز سرگوشی میں بولی۔ ”بھابھوتم کیسی بات کرتی ہو۔ میرا باپ بستر پر پڑا ہے۔ مجھے بلارہا ہے اور میں یہاں بیٹھ کر فخر کا انتظار کرتی رہوں؟“

”اپنی جگہ تم بالکل ٹھیک ہو لیکن..... میں یہ بات اس لئے کہہ رہی ہوں کہ میں اس حویلی کو اور یہاں کے رہن سہن کو تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ فخر اور مہرجی کی اجازت کے بغیر جاؤ گی تو تمہارے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

”ہو جائے اگر مشکل ہوتی ہے تو۔“ شانی روتے ہوئے بولی۔

بھابھو کچھ دیر خاموش کھڑی رہی پھر بولی۔ ”اچھا میں مہرجی کے پاس جاتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں کہ وہ تمہیں جانے کی اجازت دے دیں۔“

شانی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بھابھو تیزی سے باہر نکل گئی۔ دیورانی جیٹھانی میں یہ گفتگو بڑے دھیمے لہجے میں ہوئی تھی ساتھ والے کمرے میں بیٹھے عادل تک آواز نہیں پہنچی تھی پھر بھی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ دس منٹ کے اندر شانی جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس دوران میں بھابھو نے عادل کے لئے چائے سکٹ وغیرہ بھجوا دیئے تھے۔ خود وہ شاید مہرجی کے پاس چلی گئی تھی۔ مہرجو کچھ بولتا تھا وہ کم از کم شانی کی سمجھ میں تو نہیں آتا تھا لیکن وہ لوگ جو اس حویلی میں اس کے ساتھ کافی عرصے سے رہ رہے تھے اس کی غوں غاں سمجھ لیتے تھے خاص طور سے اس کا پہلو ان نما ملازم اکبر اتو آنکھ کے اشارے تک پہچانتا تھا۔

بھابھو کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی اس کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مایوس لوٹی ہے۔ تب تک شانی چادر اوڑھ چکی تھی اور ملازم طفیل نے اٹیچی کیس تھام لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ بھابھو کچھ کہتی اکبر اندر داخل ہوا۔ اس نے جھک کر عادل کو سلام کیا اور بولا۔ ”چوہدری جی۔ چھوٹی مالکن آپ کے ساتھ جارہی ہیں؟“

”ہاں جارہی ہیں..... کیوں؟ کیا بات ہے؟“

”جناب! آپ ناراض نہ ہوں، مہرجی کہتے ہیں کہ چھوٹی مالکن چوہدری فخر صاحب سے اجازت لینے کے بعد جائیں۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ عادل گرجا۔ ”رنگ والی میں چوہدری ارشاد بیمار ہیں بیٹی کو پکار رہے ہیں میں اسے لینے آیا ہوں اور تم کہتے ہو کہ اس کے لئے اجازت نامہ درکار ہے۔“

”جناب! ہم تو ملازم لوگ ہیں آپ سرپر جو تیاں بھی مار لیں گے تو ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ مگر جو مالک کا آرڈر ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ چوہدری صاحب نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ اسلام آباد سے واپس آئیں گے تو خود چھوٹی مالکن کو رنگ والی لے کر جائیں گے۔“

عادل کا رنگ غصے سے انگارہ ہو گیا۔ دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھ کر بولا۔ ”اچھا تو تم کو چھوٹی مالکن پر نگران بٹھایا گیا ہے تاکہ وہ اس چار دیواری سے باہر قدم نہ نکال سکے۔“

”میری کیا حیثیت ہے جی۔ میں تو بس حکم کا بندہ ہوں۔“ اکبر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اگر میں چھوٹی مالکن کو لے جاؤں تو تم روکو گے مجھے؟“

”میں جانتا ہوں یہ بے ادبی ہے لیکن مالک کا آرڈر توڑنا بھی مشکل ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، ہم جارہے ہیں، تم نے جو کرنا ہے کرلو۔“ عادل کی آواز غضب سے لرز رہی تھی۔

بھابھو نے دیکھ لیا تھا کہ بات بگڑ رہی ہے۔ وہ تیزی سے آگے آتے ہوئے بولی۔ ”اکبرے! اپنا دماغ ٹھیک کرو یہ کوئی عام مہمان نہیں ہیں“ چھوٹی مالکن کے بھراہیں۔ ہمارے لئے عزت کی جگہ پر ہیں۔“

”میں کب کہہ رہا ہوں، عزت کی جگہ پر نہیں ہیں۔ میری کھال کھینچ کر فرش پر پچھالیں اُف نہیں کروں گا لیکن.....“

اکبرے کی ”لیکن“ پر عادل کا رنگ پھر گہرا سرخ ہو گیا۔ اس نے روتی ہوئی شانی کا ہاتھ تھاما اور دروازے کی طرف بڑھا۔ شانی کا خیال تھا کہ اکبر اراستے سے ہٹ جائے گا۔ مگر اس نے عادل کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ عادل جب اسے دھکیلتا ہوا احاطے کی طرف بڑھا تو اکبرے نے بے لحاظ لہجے میں اپنے کسی ساتھی نورے کو پکارا۔ ”نورے پھانک بند کر دے۔“

بھابھو نے چیخ کر کہا۔ ”اکبرے! یہ کیا کر رہا ہے تُو۔ تیرا دماغ تو خراب نہیں ہے نہ کرایے پیچھے ہٹ جا۔“

مگریوں لگ رہا تھا کہ زوردار دھکا کھانے کے بعد اکبرے کا میٹر بھی گھوم گیا ہے۔ وہ پھر گرج کر بولا۔ ”نورے! میں کہہ رہا ہوں پھانک بند کر دے۔“

دہرے جسم کا دروازہ قد نور اچھلتا ہوا پھانک کی طرف بڑھا۔ جب تک وہ پھانک کے دونوں حصوں کو حرکت دے کر ایک دوسرے کے قریب لاتا، عادل کا ملازم اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے نورے کو پھانک بند کرنے سے روک دیا۔ اس دوران میں عادل نے شانی کو جیب میں سوار کرادیا تھا۔ ڈرائیور نے جیب کو یوٹرن دیا اور پھانک کی طرف بڑھا۔ تب تک پھانک کے قریب پانچ چھ افراد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں بھابھو، منشی رشید اور اکبر بھی تھے۔ دراصل عادل کے رائلٹل بردار ملازم نے نورے کو زوردار تھپڑ جڑ دیا تھا اور اب اکبر ملازم کو بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا اور اسی پر چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھابھو ان دونوں کے درمیان آ رہی تھی اور ابھی تک اس کوشش میں تھی کہ معاملہ حد سے زیادہ بگڑنے نہ پائے۔ منشی رشید بھی اسی تگ و دو میں تھا۔ اچانک اکبر اچھٹکا رہا تھا عادل کے ملازم سے لپٹ گیا اور اسے بے دریغ پیٹنے لگا۔ اب عادل کے لئے ممکن نہیں تھا کہ تماشا شانی بنا رہتا۔ اس نے اکبرے کو زوردار تھپڑ رسید کئے اور پھر ٹھوکر مار کر دوڑ پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی قیصر کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ اکبر اٹھتا اور ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر عادل پر جھپٹ پڑتا، عادل نے اس کی ٹانگ پر فائر کر دیا۔ گولی اکبرے کی ران میں لگی اور وہ وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

عادل طیش میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ کڑک کر بولا۔ ”کون روکے گا مجھے..... اور کس جچھے نے بد معاشی دکھانی ہے؟“ کچھ دیر کے لئے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ عادل گرجا۔ ”بھاگ جاؤ یہاں سے..... بھاگ جاؤ حرام زادو!“ اس کے ساتھ ہی اس نے پستول سے فاخر کے کارندوں کی طرف فائر کئے۔ یہ فائر ڈرانے کے لئے تھے۔ گولیاں ان کے پاؤں کے قریب کچی زمین میں لگیں اور وہ تتر بتر

ہو گئے۔ بھاہ اور شانی نے آگے بڑھ کر عادل کو بڑی مشکل سے سنبھالا اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو عین ممکن تھا وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے اکبر کے کو ایک اور گولی مار دیتا۔

اکبر اڑھی ہونے کے باوجود چیخ چنگھاڑ رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا..... شانی جانتی تھی کہ اب کسی بھی وقت مہرجی بھی اپنی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے اور معاملہ مزید بگڑ جائے گا۔ غالباً بھاہ اور منشی رشید بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے عادل اور شانی کو دھکیل کر جیپ میں سوار کیا۔ منشی رشید نے خود آگے بڑھ کر پھانک کھولا، کچھ ہی دیر بعد عادل کی جیپ نارپور کی حویلی سے نکل کر اس کے راستے کی طرف بڑھ رہی تھی جو آگے جا کر پختہ سڑک سے جاملتا تھا۔



کاغذی قیامت

ہماری دنیا میں ایک ایسا کاغذ بھی موجود ہے جس کے گرد اس وقت پوری دنیا گھوم رہی ہے۔ اس کاغذ نے پوری دنیا کو پاگل بنا رکھا ہے۔ دیوانہ کر رکھا ہے۔ اس کاغذ کے لئے قتل ہوتے ہیں۔ عزتیں نیلام ہوتی ہیں۔ معصوم بچے دودھ کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ کاغذ ہے کرنسی نوٹ..... یہ ایسا کاغذ ہے جس پر حکومت کے اعتماد کی مہر لگی ہے۔ لیکن اگر یہ اعتماد ختم ہو جائے یا کر دیا جائے تو پھر کیا ہوگا؟ اس کاغذ کی اہمیت یلخت ختم ہو جائیگی اور یقین کیجئے پھر کاغذی قیامت برپا ہو جائے گی۔ جی ہاں! کاغذی قیامت..... اور اس بار مجرموں نے اس اعتماد کو ختم کرنے کا مشن اپنا لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کاغذی قیامت پوری دنیا پر برپا ہو گئی۔ اس قیامت نے کیا کیا رخ اختیار کیا۔ پوری دنیا کی حکومتوں اور افراد کا کیا حشر ہوا؟ اسے روکنے کے لئے کیا کیا حربے اختیار کیے گئے۔ کیا مجرم اپنے اس خوفناک مشن میں کامیاب ہو گئے..... یا.....؟

اس کہانی کی ہر ہر سطر میں خوفناک ایکشن اور اس کے لفظ لفظ میں اعصاب شکن سسپنس موجود ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو یقیناً اس سے پہلے صفحہ قرطاس پر نہیں ابھری۔ اس کہانی کا پلاٹ اس قدر منفرد ہے کہ پہلے دنیا بھر کے جاسوسی ادب میں کہیں نظر نہیں آیا۔ **عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس** نے اس کہانی میں کیا کردار ادا کیا ہے جہاں دنیا بھر کی حکومتیں اور سیکرٹ سروسز خوف و دہشت سے کانپ رہی ہوں جہاں موت کے بھیاں تک جبروں نے دنیا میں بسنے والے ہر فرد کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہو وہاں عمران اور سیکرٹ سروس کے جیالوں نے کیا رنگ دکھائے۔ یہ عمران کی زندگی کا وہ لافانی اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ جس پر آج بھی عمران کو فخر ہے اور کیوں نہ ہو، یہ کارنامہ ہے ہی ایسا.....

کاغذی قیامت کتاب گھر کے جاسوسی ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اباجی کو دیکھ کر شانی کا دل خون ہو گیا۔ وہ چند روز میں ہی برسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے، رخساروں پر زردی کھنڈی تھی، آنکھیں گہرائی میں اُتری ہوئی تھیں۔ شانی نے اپنا سر ان کے چوڑے سینے پر رکھ دیا اور سسکیاں لینے لگی۔ وہ اس کے سر پر مسلسل ہاتھ پھیرتے رہے، تسلی دی۔ ”میری کملی دھی! میں بالکل اچھا بھلا ہوں کچھ نہیں ہوا ہے مجھے..... جو تھوڑی بہت تکلیف تھی وہ بھی تجھے دیکھنے کے بعد دور ہو گئی ہے۔“

انہوں نے شانی کو بمشکل اپنے سینے سے اٹھایا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کی صورت دیکھنے لگے۔ شانی نے جلدی سے پلکیں جھکا لیں، جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کا باپ اس کی آنکھوں میں وہ ساری تکلیف، توہین اور پشیمانی پڑھ لے گا جو اسے اپنے سرال میں اٹھانا پڑ رہی تھی۔ اس کے باپ نے اس کے لئے سنہری خواب دیکھے تھے۔ اس کے لئے نیک تمنائیں کی تھیں، نیم شب کی بے شمار دعائیں اس کے نام کی تھیں۔ انہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ اپنی لاڈلی کو ایک اچھا گھر اور اچھا جیون ساتھی دے سکیں۔ اب جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کا مقدر تھا..... وہ اپنے علیل باپ کو اپنے مقدر کی جھلک دکھا کر مزید دکھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

راتے میں بہن بھائی کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ وہ نارپور میں پیش آنے والے واقعے کا اباجی سے ہرگز ذکر نہیں کریں گے۔ بہر حال اب دونوں بہن بھائی دیکھ رہے تھے کہ اباجی کی سوالیہ نظریں بار بار ان کے چہروں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ یہ جہاندیدہ نظریں اپنے بچوں کی آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ عادل تو تھوڑی ہی دیر میں باہر چلا گیا تاہم شانی کو وہیں بیٹھنا تھا۔ وہ اباجی سے باتیں کرنے لگی اور ساتھ ساتھ ان کے پاؤں دبانے لگی۔ ”فاخر نہیں آیا تمہارے ساتھ؟“ چوہدری ارشاد نے پوچھا۔

”نہیں اباجی، وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں ابھی چار پانچ دن میں آئیں گے۔“

”مہرجی سے پوچھ کر آئی ہو؟“

”نن..... نہیں..... جی ہاں۔“ شانی ہکلائی۔

”تم پریشان لگ رہی ہو شانی، مجھے لگتا ہے کہ سب ٹھیک نہیں ہے۔“

”سب ٹھیک ہے اباجی، فاخر بہت اچھے ہیں، مہرجی، بھابھو اور بچے سب بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ میں بہت خوش ہوں اباجی۔“

”فاخر نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد خود تمہیں لے کر آئے گا لیکن وہ نہیں آیا..... میں نے تمہارے تایا معصوم کو بھیجا تھا وہ بھی آنکھوں میں آنسو لے کر واپس آیا تھا۔ کہتا تھا شانی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... اور فاخر بھی فارغ نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے جب فارغ ہوگا تو خود شانی کو لے کر آئے گا۔“

”ہاں ایک دو دن کے لئے ذرا بخار ہو گیا تھا اباجی.....“ شانی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی مسکرانے کی کوشش کی مگر اسے لگا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں اور اس نے مسکرانے کی کوشش جاری رکھی تو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اباجی کے ہاتھ کی پشت پر گرنے لگیں گے۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ اسی دوران میں اسے اپنی سیٹلی سیکنہ کی صورت نظر آئی۔ موقع غنیمت جان کر وہ اٹھی اور سیکنہ کی طرف لپک گئی۔

کچھ ہی دیر بعد سیکنہ اور شانی کمرے میں بیٹھی تھیں۔ شانی نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی عزیز ترین سیٹلی کو بھی اپنے مصائب کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ اس نے اپنے آنسو حلق میں گرا لئے تھے اور چہرے پر بے بسی پیدا کر لی تھی۔ ”سب ٹھیک ہے نا؟“ سیکنہ نے اسے گدگداتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”میں نہ کہتی تھی تیرے حسن کا جلوہ دیکھے گا تو ساری اکڑ شا کڑ بھول جائے گا۔ تو چیز ہی ایسی ہے بھئی۔ ایمان سے کہتی ہوں جب سے تو گئی ہے سارا پنڈی ویران لگتا ہے..... نہ کوئی ہنسی مذاق نہ کوئی چھیڑ خانی اور تو اور صغراں کی مٹگنی پر بھی کوئی رنگ نہیں جم سکا۔ تیرا دل بھی ایسا لگا ہے وہاں کہ مٹگنی پر بھی واپس آنے کا نام نہیں لیا تو نے۔ ایمان سے آخری وقت تک ہم ساری تیری راہ نکلتی رہیں۔“

”بس انہوں نے آنے ہی نہیں دیا۔“ بے دھیانی میں شانی کے منہ سے نکل گیا۔

سیکنہ فوراً بات کو دوسری طرف لے گئی۔ ”آنے کیسے دیتا ہم نے بھی تو کوئی ایسی ویسی شے نہیں دی ہے اسے پورے رنگ والی کا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے اس کے ہاتھ پر۔ ساری عمر تیری غلامی نہ کرے تو میرا نام بدل دینا۔ بس ذرا اپنے حساب سے چلاتی جانا اسے نہ زیادہ تر سانا نہ زیادہ رتجھانا..... تھوڑی تھوڑی بھوک رہے، تھوڑی تھوڑی مٹی رہے۔“ سیکنہ کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

شانہ کی دل کا حال سیکنہ سے اوجھل تھا۔ وہ اوپر سے ہنس رہی تھی اندر سے رو رہی تھی۔

رات تک وہ اباجی کے بستر کے گرد ہی گھومتی رہی، کبھی انہیں پھل کاٹ کر دے رہی ہے، کبھی دو اکھلا رہی ہے، کبھی اخبار پڑھ کر سنار ہی ہے۔ اس نے اپنے بھاری بھر کم کپڑے اور زیوراتا ردیے تھے، ہلکی پھلکی شلوار قمیص پہن لی تھی اور بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھ لئے تھے۔ وہ ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے مچھلی ہو اور واپس پانی میں آگئی ہو۔ بہر حال اس کا دھیان مسلسل اپنے بھائی عادل کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ اسے حویلی میں چھوڑ کر کچھ ہی دیر بعد واپس چلا گیا تھا اور ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ نارپور میں کیا صورت حال ہے، مہرجی کے خاص ملازم کو گولی لگی تھی اور یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بات بہت زیادہ بڑھ بھی سکتی تھی، فاخر خود بھی نارپور میں موجود نہیں تھا۔ شانی کا دل اندر سے کانپ رہا تھا اور چوہدری ارشاد کی کھوجی نظریں بار بار بیٹی کے چہرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

عادل کی واپسی رات نو بجے کے بعد ہوئی۔ موقع ملتے ہی شانی نے اس سے بات کی۔ ”بھائی! کیا بنا؟“

”کچھ نہیں سب ٹھیک ہے۔“ عادل نے تسلی دی۔ ”اس کو ہسپتال نہیں لے جایا گیا۔ حویلی میں ہی ڈاکٹر منگوا کر گولی نکال لی گئی ہے۔“

”مہرجی کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“

”سنا ہے اس بڈھے نے کچھ شور مچایا تھا۔ وہ پولیس کو بلانا چاہتا تھا مگر تمہاری جیٹھانی مقبول نے معاملے کو سنبھال لیا ہے کم از کم وقتی طور پر تو

سنبھال ہی لیا ہے۔“

شانہ کے تاثرات سے محسوس ہوا کہ عادل کے منہ سے اپنے دادا سر کے لئے ”بڈھے“ کا لفظ سن کر اسے افسوس ہوا ہے۔ وہ رو ہانسی

آواز میں بولی۔ ”بھائی جو کچھ بھی ہے لیکن مہرجی میرے لئے عزت کی جگہ پر ہیں بلکہ ہم سب کے لئے.....“

”خدا کے لئے شانی“ چپ رہو۔“ عادل نے جھنجھلا کر شانی کی بات کاٹ دی۔ بھائی کا رویہ شانی کے لئے ناقابل فہم تھا۔ اس کی باتوں

سے تو یوں لگتا تھا کہ نارپور میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ عادل کے علم میں ہے۔

”بھائی یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟“

عادل سنی اُن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”شانی ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔۔۔۔۔“ اس کے لہجے میں انتہا درجے کا درد تھا۔

”کیا کہہ رہے ہیں بھائی؟“ شانی نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”اباجی! مجھے پوری بات نہیں بتا رہے، لیکن وہ جو کچھ بھی بتا رہے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمہارے سرالیوں نے ہمیں بیوقوف بنایا ہے۔ ہمیں اندھیرے میں رکھ کر ہم سے پرانی دشمنی چکانے کی کوشش کی گئی ہے۔“ عادل کے لہجے میں دکھ کی شدید لہر تھی۔

”پپ۔۔۔۔۔ پرانی دشمنی۔“ شانی کے ہونٹ لرزے۔

شانی کا دھیان ایک بار پھر خدا بخش کے کنوئیں پر پیش آنے والے واقعے کی طرف چلا گیا لیکن اس کے بارے میں عادل کو کیا پتا تھا اور پھر اس واقعے کو پرانی دشمنی بھی تو نہیں کہا جاسکتا تھا یہ تو صرف دو چار سال پہلے کی بات تھی۔۔۔۔۔ تو کیا اس کے علاوہ بھی کوئی وجہ دشمنی تھی۔ وہ بے دم سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ گرد و پیش نگاہوں میں چکرار ہے تھے۔ ”بھائی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ شانی کے ہونٹوں سے سہمی آواز نکلی۔

عادل کا چہرہ لال بھسوکا ہو رہا تھا، وہ بولا۔ ”رشتے کے موقع پر وہ خمیٹ بڑھا سامنے نہیں آیا۔ اسی وجہ سے ہم سب کو اتنا بڑا دھوکا ہوا۔ وہ اس سارے فساد کی جڑ ہے۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ قتل کئے جانے کے لائق ہے۔“

”بھائی! خدا کے لئے میرے سامنے ایسی باتیں نہ کریں، میرا دل بند ہو جائے گا۔“ شانی رو پڑی۔

”میں کیا باتیں کروں گا۔ مجھے تو ابھی خود بھی ساری بات کا پتا نہیں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں۔“ عادل نے بڑے کرب سے کہا۔ پھر ذرا توقف کر کے بولا۔ ”اباجی نے صرف اتنا بتایا ہے کہ ساٹھ ستر سال پہلے ہمارے دادا جی کا بیاہ اسی گاؤں میں ہوا تھا جہاں وہ بڑھا مہر جی رہتا ہے۔ یہ دشمنی اسی رشتے کی وجہ سے شروع ہوئی تھی۔“

”مم۔۔۔۔۔ مگر ساٹھ ستر سال پہلے کی باتوں کا مجھ سے اور فخر سے کیا تعلق ہے بھائی؟“

عادل کے چہرے کا کرب بڑھ گیا وہ بولا۔ ”میری بھولی بہن ٹو ساٹھ ستر سال کی بات کرتی ہے یہاں تو سات سو سال پہلے کی دشمنیاں بھی چکائی جاتی ہیں۔“

شاید بھائی بہن کے درمیان یہ تکلیف دہ گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں چوہدری ارشاد کو شدید کھانسی شروع ہو گئی۔ شانی نے اپنے آنسو پونچھے اور انہیں دوا کھلانے کے لئے ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اب اباجی کے دل کی تکلیف کی وجہ کچھ کچھ شانی کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اس کی شادی کے دوران میں یا شادی کے بعد ان پر کچھ اندوہناک انکشافات ہوئے تھے۔ اپنے نئے رشتے داروں کے حوالے سے کچھ ایسا ان کے علم میں آیا تھا جس نے ان کے دل و دماغ میں طوفان برپا کر دیا۔ اس طوفان کا زیادہ اثر ان کے دل پر ہوا تھا اور وہ ہسپتال کے شعبہ کارڈیالوجی میں جا پونچے تھے۔

اگلے روز شانی بہت سویرے اٹھ گئی۔ اس کے دل میں شاید یہ خواہش تھی کہ اس کے اباجی باغیچے کی گیلی گھاس پر ننگے پاؤں ٹہل رہے ہوں وہ انہیں دیکھے اور خود بھی ان کے ساتھ ٹہلنے لگے لیکن اباجی تو بستر پر تھے اور سو رہے تھے۔ ان کی صحت انہیں چہل قدمی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ شانی نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا اور اکیلی ہی باغیچے میں چلی گئی۔ ایک دم اسے لگا کہ ابھی کسی جھاڑی کی اوٹ سے اس کا دادا سر مہرجی برآمد ہوگا۔ اپنے خوفناک چہرے سے اسے دہشت زدہ کرے گا اور پھر اس پر ناقابل فہم الفاظ کی بوچھاڑ کر دے گا۔ اپنی اس خام خیالی پر وہ خود ہی مسکرا دی۔ وہ مہرجی کے باغیچے میں نہیں تھی، اپنے بابل کے آگن میں تھی یہاں کا ہر پھول پتا اور گھاس کا ہر تنکا اسے جانتا تھا، پہچانتا تھا۔ اس نے چہل اتار دی اور ٹھنڈی گھاس پر گھومنے لگی۔ حویلی کا ملازم بختاور کچھ لاٹھیاں لئے پچھواڑے کی طرف جا رہا تھا۔ ان لاٹھیوں پر پیمیکلی میخیں لگائی جاتی تھیں اور انہیں مضبوط رکھنے کے لئے سروس کے تیل میں ڈوبوایا جاتا تھا۔ یہاں حویلی کے پرانے ملازم لٹھ بازی کرتے تھے۔ جب شانی بچی تھی تو اس کے اباجی اور چاچا رئیس اور مشتاق بھی لٹھ چلانے کی مشق میں شامل ہوا کرتے تھے لیکن اب صرف عادل کا شوق ہی باقی رہ گیا تھا۔ وہ بھی روزانہ نہیں جاتا تھا، بس ہفتے میں ایک آدھ بار ہی اکھاڑے کا رخ کرتا تھا۔ لٹھ چلانے میں عادل کی مہارت کو سب مانتے تھے۔

بختاور اور اس کی بغل میں دبی لاٹھیوں کو دیکھ کر شانی کا دھیان اپنے شوہر کی طرف چلا گیا۔ اسے بھی تو یہ شوق لاحق تھا۔ حویلی میں قیام کے دوران اس نے خود اپنی آنکھوں سے اسے لاٹھی چلاتے دیکھا۔ بعد ازاں بھابھو سے بھی معلوم ہوا کہ فاخر کا یہ شوق بہت پرانا ہے۔ کوئی بھی ایسا شخص فاخر کے پاس ملازمت حاصل کر سکتا ہے جو اچھی لاٹھی چلانا جانتا ہو اور فاخر کے سامنے اپنی مہارت ثابت کر سکے۔ ابھی تک شانی اسے ایک اتفاق ہی سمجھ رہی تھی کہ اس کے بھائی اور اس کے شوہر کا شوق ایک ہی ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس حوالے سے اس پر ایک زبردست انکشاف ہونے والا ہے۔ اباجی اس کے سامنے ایک پرانی کہانی کے پیچ و خم سے پردہ اٹھانے والے ہیں۔

اباجی کو ناشتہ کروانے اور دو کھلانے کے بعد وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ چاچا مشتاق اور تایا معصوم بھی پاس ہی تھے دونوں چپ چپ نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر بعد اٹھ کر چلے گئے تو باپ بیٹی تنہا رہ گئے۔ اپنے بیاہ سے پہلے شانی نے ایک کتاب شروع کر رکھی تھی۔ روزانہ سونے سے پہلے وہ اباجی کو اس کتاب کے چند صفحات پڑھ کر سناتی تھی۔ یہ مغل دور میں لکھا گیا ایک دلچسپ سفر نامہ تھا۔ آج وہ پھر اس کتاب کو جھاڑ پونچھ کر لے آئی۔ چوہدری ارشاد بڑے عجیب سے موڈ میں تھے۔ انہوں نے کتاب شانی کے ہاتھ سے لے کر ایک طرف رکھ دی اور بولے۔ ”ہمیشہ تم سناتی ہو لیکن آج میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔“

”کیسی کہانی اباجی؟“ شانی نے پوچھا۔

”ایک ایسی کہانی جس کا تمہاری موجودہ اور آئندہ زندگی سے گہرا تعلق ہے شانی۔“ انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور بولے۔ ”یہ سب کچھ میں تمہیں اس لئے بتانا چاہ رہا ہوں شانی کہ تم ان حالات پر غور کر سکو اور اس سوچ بچار کے ذریعے اپنی آئندہ زندگی کی مشکلیں کم کر سکو۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے تم اپنی ماں ہی کی طرح سمجھ دار اور ہمت والی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا اکتنا بڑا دل ہے۔“

”میری ساری طاقت تو آپ ہی ہیں اباجی۔ اگر آپ میرے ساتھ ہیں اور مجھ سے خوش ہیں تو میں بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔“

”نہیں میری دھی رانی! میں کچھ نہیں ہوں میں تو سمجھتا ہوں کہ میری طاقت بھی تمہاری ماں ہی تھی۔ وہ عام انسان نہیں تھی شانی! اس کا مقام بڑا اونچا تھا۔ لوگ ایسے ہی تو اسے وڈی آپا نہیں کہتے اور تم نے دیکھا ہوگا جب وہ اسے وڈی آپا کہتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں کیسی محبت بھری چمک آ جاتی ہے! ان کے ماتھوں پر ایک طرح کی عقیدت لشکارے مارنے لگتی ہے! ہاں شانی میں سچ کہتا ہوں میں جو کچھ بھی ہوں! جس مقام تک بھی پہنچا ہوں اس میں زیادہ کردار تمہاری ماں کا ہی ہے۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے ہیں اس کی قدر و قیمت میرے دل میں بلکہ شاید ہم سب کے دلوں میں بڑھتی جا رہی ہے۔ کاش..... کاش میں اس کی زندگی میں اس کی قدر کر سکتا۔“

”اباجی! آپ نے سب کچھ کیا ہے۔ انہیں ہر طرح خوش رکھا ہے! ان کی بیماری میں آپ نے کیا نہیں کیا ان کے لئے اور ہم سب کے لئے۔ آپ ایسی باتیں مت سوچا کریں۔ آپ کا مقام بڑا بلند ہے ہم سب کی نظروں میں۔“

”لیکن میں کتنے پانی میں ہوں! اس کا پتا مجھے بہت اچھی طرح ہے۔ تمہاری ماں زندہ تھی تو ہر کام سیدھا پڑتا تھا۔ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا تو سونا ہو جاتی تھی..... اب سونا بھی مٹی ہو جاتا ہے ہر جگہ دھوکا کھاتا ہوں! ہر جگہ نقصان اٹھاتا ہوں..... اس سے بڑا نقصان کیا ہوگا کہ اپنی بیٹی کے بارے میں بھی صحیح فیصلہ نہ کر سکا۔ اسے بھی مشکلوں کے حوالے کر دیا..... باپوں پر بیٹیوں کا یہی تو ایک قرض ہوتا ہے وہ اپنی ساری محبتوں! خدمتوں اور حیاؤں کے بدلے اپنے باپ سے بس ایک ہی چیز مانگتی ہیں..... ایک اچھا بر..... ایک عزت دار اور محبت دینے والا جیون ساتھی! پندرہ بیس برس تک ان کی چوڑیوں کی چھن چھن اور پازیبوں کی کھن کھن باپ سے بس ایک ہی بات کہتی رہتی ہے..... مجھے اچھی طرح دیکھ بھال کر خود سے جدا کرنا۔ شانی میں بھی بیس برس تک تیری یہ خاموش آواز سنتا رہا! لیکن جب فیصلے کا وقت آیا تو دھوکا کھا گیا۔ میں تیرا حق ادا نہیں کر سکا میری بیٹی! میں تیرے سامنے بہت شرمندہ ہوں۔“

چوہدری ارشاد کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ شانی نے بے قرار ہو کر اپنی اوڑھنی سے ان کے آنسو پونچھے اور گلے سے لگ گئی۔ ”اباجی! آپ نے میرے لئے جو کچھ چنا! وہ مجھے دل و جان سے قبول ہے۔ اگر آپ کے اس فیصلے میں میرے لئے کوئی پریشانی ہے بھی تو وہ میرے سر آنکھوں پر! میں ہر پریشانی کا مقابلہ کر لوں گی۔ آپ ذرا سی بھی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گی۔“

یہ جذباتی کیفیت کچھ دیر برقرار رہی پھر اشک بار چوہدری ارشاد نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ گاؤں کے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جو کچھ ان کے علم میں آچکا ہے وہ اب شانی تک پہنچانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لئے ایسے الفاظ ڈھونڈ رہے ہیں جو ان کی لاڈلی بیٹی کو کم سے کم تکلیف دیں۔

کچھ دیر بعد انہوں نے شانی کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور کہنا شروع کیا۔ ”میں تمہیں شروع سے بتانا چاہ رہا ہوں تاکہ ساری بات تمہاری سمجھ میں آجائے۔ یہ آج سے کوئی ستر چھتر سال پہلے کی بات ہے۔ ضلع گجرات کے موضع آند پور میں چوہدری ملک نواب شاہ کی حویلی مشہور تھی! نواب شاہ کے سر پر پچاس دیہات کی پکڑی تھی وہ بڑا رعب و دبدبے والا زمیندار تھا۔ ان دنوں انگریز افسروں کی بڑی دہشت ہوتی تھی لیکن نواب شاہ کی علمداری میں انگریز افسر بھی سوچ سمجھ کر قدم رکھتے تھے۔ نواب شاہ کی کوئی زینہ اولاد نہیں تھی! بس ایک خوبصورت بیٹی تھی اس کا نام

دولت بی بی تھا۔ دولت بی بی جوان ہوئی تو وہی کچھ ہوا جو ہم اکثر کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔ نواب شاہ کو بیٹی کے رشتے کی فکر ہوئی، دولت بی بی خوبصورت تھی اس کو جہیز میں کئی مربع زمین بھی ملنے والی تھی علاقے کے کئی چوہدری اور بڑے زمیندار یہ خواہش کرنے لگے کہ نواب شاہ کے گھر آنے سے ان کا رشتہ جڑ جائے۔ ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ دولت بی بی کو مل سکتا تھا مگر ملک نواب شاہ کسی اور مزاج کا آدمی تھا وہ دلیر اور بہادر شخص تھا۔ اس نے ایک وقت میں انگریزوں کے خلاف لڑائی میں بھی حصہ لیا اور نام کمایا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا داماد بے شک لاکھوں کروڑوں کا مالک نہ ہو لیکن دلیر، جی دار اور غیرت مند ہو۔ جس دور کی یہ بات ہے اس دور میں سویمر اور سویمر رچانے کی رسمیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ لڑکی کے لئے شوہر ڈھونڈنے کے لئے اچھے گھرانوں کے نوجوان تلاش کئے جاتے تھے اور پھر ان کی دلیری اور ہمت پر کھنے کے لئے ان کے درمیان مقابلے وغیرہ کروائے جاتے تھے۔ خاص طور پر ہندوؤں میں یہ رواج عام تھا۔ نواب شاہ مسلمان تھا مگر وہ اور اس کے بزرگ جس ماحول میں رہ رہے تھے اس پر ہندوؤں کا اثر اور رنگ زیادہ تھا۔ ملک نواب شاہ نے بھی اپنی بیٹی دولت بی بی کے لئے بڑھونڈنے کے لئے سویمر کی طرح ایک مقابلہ کرایا۔ یہ لٹھ بازی کا مقابلہ تھا۔ اس میں علاقے کے گنے چنے بیس بچیس جوانوں نے حصہ لیا۔ اس لڑائی میں جو جوان پہلے نمبر پر آیا اس کا نام مہر داد خان تھا۔

رسم کے مطابق مہر داد خان کو دولت بی بی سے رشتے کے لئے قبول کر لیا گیا..... مہر داد بھی ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ان کی زمین تھی یہ لوگ باغوں کے ٹھیکے بھی لیتے تھے اور ان کے اپنے باغ بھی تھے۔ کھاتے پیتے لوگ تھے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شادی سے چند روز پہلے کی بات ہے ملک نواب شاہ کے والد کا ایک پرانا دوست نواب شاہ سے ملنے آیا۔ اس نے نواب شاہ پر انکشاف کیا کہ جس جوان کو اس نے اپنی بیٹی کے جیون ساتھی کے طور پر چنا ہے وہ ماہر لٹھ باز اور دلیر تو بے شک ہے لیکن ذات کا اصل نہیں ہے۔ اس نے نواب شاہ پر یہ ثابت کیا کہ مہر داد خان جدی پشتی زمیندار نہیں ہے۔ مہر داد کی ماں نے تیس سال کی عمر میں ایک سانسی (بلی مار) سے بیاہ رچایا تھا اور مہر داد اصل اسی سانسی کا بیٹا ہے۔

جب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تو نواب شاہ کے لئے کسی طور بھی یہ ممکن نہ رہا کہ بیٹی کا ہاتھ ایک ”بلی مار“ کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ اس نے اس شادی سے صاف انکار کر دیا۔ لوگ اکٹھے ہوئے، کئی پچاسیتیں بیٹھیں لیکن فیصلہ مہر داد خان کے حق میں نہ ہو سکا۔ نواب شاہ نے اعلان کیا کہ وہ رسم و رواج کی پابندی کرتے ہوئے بیٹی کا ہاتھ اس نوجوان کے ہاتھ میں تھمائے گا جو سویمر کے مقابلوں میں دوسرے نمبر پر آیا تھا..... تمہیں کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دوسرے نمبر پر کون آیا تھا؟“ چوہدری ارشاد نے شافی سے پوچھا۔

”ہمارے دادا۔“ شافی نے جواب دیا۔

”ہاں یہ ہمارے والد قادر بخش تھے۔ بچپن میں ہم یہ بات سنتے آئے ہیں کہ ہمارے والد کی شادی سویمر کے نتیجے میں ہوئی تھی اور وہ بہت بڑے لٹھ باز تھے۔ یہ بات میں نے تم کو بتائی تھی اور تم نے اپنے چاچاؤں سے بھی سنی ہوگی۔“ شافی نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہدری ارشاد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمہیں باقی باتوں کے بارے میں معلوم نہیں ہوگا۔ یہ باتیں ہم نے اپنے بچوں تک پہنچانا ضروری بھی نہیں سمجھا تھا۔ یہ بات صرف میرے اور تمہارے چاچاؤں تک ہی محدود ہے کہ تمہاری دادی دولت بی بی کی شادی پہلے مہر داد

نامی ایک ایسے شخص سے ہونے لگی تھی جو ”بلی ماروں“ کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس شادی کے نہ ہونے سے مہر داد خان اور تمہارے دادا قادر بخش میں دشمنی چلی تھی۔“

شانی نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ”بس ایک دفعہ چاچا مشتاق نے مجھے اور عادل بھائی کو اتنی بات بتائی تھی کہ آبائی گاؤں میں مہر داد نامی ایک بندے سے دادا کی پرانی دشمنی تھی اور دونوں میں کئی مرتبہ لڑائی چلی تھی۔“

”کئی مرتبہ تو نہیں بس دوبار ایسا واقعہ ہوا تھا۔ ایک بار تمہارے دادا قادر بخش کی شادی سے تین چار دن پہلے دوسری مرتبہ شادی کے دو تین مہینے بعد ایک میلے میں..... اس دوسری لڑائی میں تمہارے دادا کو کافی چوٹیں آئی تھیں، کہا جاتا ہے کہ وہ پھسل کر گر گئے تھے۔ اس دوسری لڑائی کے بعد ارد گرد کے سارے دیہات اور وہاں کے معزز لوگ مہر داد خان کے خلاف ہو گئے تھے۔ وہ سراسر زیادتی کر رہا تھا۔ شادی بیاہ تو رضامندی اور خوشی کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں ضد اور زور کی بات نہیں ہونا چاہئے لیکن مہر داد خان ایسا کر رہا تھا۔ اس لڑائی کے بعد ایک بڑی پنچایت بیٹھی تھی جس میں مہر داد خان اور اس کے بھائیوں کا حقہ پانی بند کر دیا گیا تھا۔ زمینداروں نے انہیں باغوں کے ٹھیکے وغیرہ بھی دینے چھوڑ دیئے تھے، قریبی گاؤں کی ایک جٹ برادری سے مہر داد خان کے جھگڑے بھی شروع ہو گئے۔ دو چار سال میں ہی وہ اتنا تنگ ہوا کہ زمین بیچ باج کر خاموشی سے اپنے پرانے علاقے ڈیرہ غازی خان کی طرف نکل گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک اس کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ آہستہ آہستہ علاقے کے لوگ اسے اور اس کے گھرانے کو بھول گئے۔“

”کہیں یہ مہرجی..... وہ مہر داد خان تو نہیں ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

چوہدری ارشاد نے بے پناہ کرب سے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ”یہ ہماری بد قسمتی ہے دھی رانی کہ یہ مہرجی وہی ہے۔“

چوہدری ارشاد کی بردبار آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ کچھ دیر تک وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے پھر بولے۔ ”مہر داد کے پوتے کو اپنا داماد بناتے ہوئے ہم دھوکا کھا گئے دھی رانی..... دراصل مہر داد نے دو شادیاں کی تھیں۔ اس کی دوسری شادی بالکل خفیہ تھی۔ اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اس دوسری بیوی سے مہر داد کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے بڑے بیٹے کا نام امانت علی ہے اور وہی تمہارا مرحوم سر ہے۔ جب تمہارے رشتے کی بات چلی اور ہم نے اپنی عقل سمجھ کے مطابق فاخر کے خاندان کی جانچ پرکھ کی تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس گھرانے کا تعلق مہر داد خان سے ہوگا۔ ان لوگوں نے بھی بڑی ہوشیاری سے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہونے دی جس سے ہمارا دھیان بھولے سے بھی ڈیرہ غازی خان یا آئند پور کی طرف جاتا۔ تمہاری شادی سے پہلے جب ہم تمہارے سرال نار پور جاتے تھے تو ایک مرتبہ وہ بڈھا مہرجی بھی حویلی میں ہی موجود تھا لیکن ہمیں اس کی بھٹک بھی نہیں پڑنے دی گئی۔ کاش ایسا نہ ہوتا شانی..... کاش ایسا نہ ہوتا۔“

چوہدری ارشاد نے اپنے بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا اور ان کے زرد رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ وہ روتے ہوئے شانی کی طرف بڑھے اور اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولے۔ ”میں تیرا گناہ گار ہوں بیٹی! میں نے تجھے اپنے ہاتھوں سے آگ میں جھونکا ہے، کتنا بد قسمت باپ ہوں میں..... کاش تیری ماں کی جگہ میں مرا ہوتا، وہ بختوں والی تھی اس کے ساتھ اللہ کی رحمت ہوتی تھی وہ ہوتی تو تیرے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوتا، کبھی نہ ہوتا۔“

شانی بھی رونے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ باپ کو تسلی دے رہی تھی۔ ”اباجی! آپ نے کچھ نہیں کیا جو کچھ میری قسمت میں لکھا تھا، وہ ہوا ہے لیکن میں اس مصیبت سے بھاگوں گی نہیں، میں اس کا سامنا کروں گی۔ میں سب کچھ ٹھیک کروں گی، آپ فکر نہ کریں۔ سب اچھا ہو جائے گا۔“

رات تک شانی کو اس حوالے سے کچھ اور باتوں کا پتا بھی چلا، یہ سب کچھ اباجی نے ہی اسے بتایا۔ جس روز شانی کی بارات آئی مہرجی بارات کے ساتھ موجود نہیں تھا لیکن بارات میں موجود ایک دو عمر رسیدہ چہروں کو دیکھ کر چوہدری ارشاد کا ماتھا ٹھکا..... بعد ازاں کئی باراتیوں کا رنگ ڈھنگ اور بولی ٹھولی دیکھنے کے بعد چوہدری ارشاد کا شبہ تقویت پکڑنے لگا۔ اپنی رخصتی کے موقع پر شانی نے اباجی کے چہرے پر جو گہرا اضطراب دیکھا تھا، اس کا تعلق اسی صورت حال سے تھا۔ شانی کی رخصتی کے بعد چوہدری ارشاد دو دن کمرے میں ہی بند رہے تھے۔ بعد ازاں وہ خود پر جبر کر کے ویسے کی تقریب میں گئے۔ اس تقریب میں سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا۔ مہرجی سے بھی چوہدری ارشاد کی ملاقات ہو گئی اور انہوں نے اپنے داماد کی آنکھوں میں بھی نفرت اور دشمنی کی لپک دیکھ لی۔ فاخر نے ویسے کے بعد شانی کو ان کے ساتھ بھیجے سے انکار کر دیا تھا اور بہانہ بنایا تھا کہ وہ چند روز تک خود اسے اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ تاہم چوہدری ارشاد سمجھ گئے تھے کہ ان کے داماد نے انہیں سزا دینے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ ویسے کی تقریب کے بعد وہ شانی کے بغیر رنگ والی واپس آئے اور اس بات کا ان کے دل پر بے حد بوجھ تھا۔ آخر ایک دن یہ بوجھ رنگ لایا اور وہ دل پکڑ کر ہسپتال پہنچ گئے۔

ابھی تک عادل کو یہ ساری باتیں معلوم نہیں تھیں لیکن اسے تا دیر اندھیرے میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ شانی کے آنے کے صرف اڑتالیس گھنٹے کے اندر عادل کو بھی وہ سب کچھ معلوم ہو گیا جو چوہدری ارشاد نے شانی کو بتایا تھا۔ عادل جو ان خون تھا۔ وہ بھڑک اٹھا۔ چوہدری ارشاد کی بیماری اس کے پیش نظر نہ ہوتی تو وہ ان کے سامنے ہی چیخنا چنگھاڑنا شروع کر دیتا۔ وہ چوہدری ارشاد کے سامنے تو چپ رہا لیکن چچا ریکس کے سامنے اس نے خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ اس نے کہا۔ ”چاچا! میں شانی کو کسی صورت واپس سرال نہیں جانے دوں گا۔ ان کے اور ہمارے درمیان ہر تعلق اب ختم ہو گیا۔“

چچا ریکس نے شانی کی طرف دیکھا، شانی کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ کچھ بولی نہیں لیکن اس کی آنکھیں بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھیں۔ ”بھائی یہ سب کچھ اتنی آسانی سے کیسے ختم ہو سکتا ہے، زندگی کے فیصلے پنسل کی لکیر تو نہیں ہوتے کہ جب جی چاہے مٹا دیئے جائیں۔“

چچا ریکس نے کہا۔ ”عادل! ہمیں اب جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے، ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا۔“

عادل نے چیخ کر کہا۔ ”چاچا! آپ کی ”سوچ سمجھ“ نے ہی تو سارا کام خراب کیا ہے۔ آپ کے سامنے تو بس اپنا کاروبار تھا اور اس کے سوا آپ کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آپ نے دن رات نار پور والوں کی تعریفیں کیں۔ اپنی باتوں سے ان میں دنیا بھر کی خوبیاں جمع کر دیں۔ اگر نار پور میں شانی کی بات پکی ہوئی تو اس میں سب سے زیادہ ہاتھ آپ کا تھا۔“

”میں اپنا گناہ مانتا ہوں عادل پتر..... یہ میری غلطی تھی کہ میں دشمنوں کی چال نہ سمجھ سکا۔ انہوں نے..... سب کچھ..... ایک منصوبے کے مطابق کیا۔ آہستہ آہستہ جال بچھایا، میرے یا بھائی ارشاد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پردے کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔ چلو میں تو چاچا ہوں، بھائی ارشاد تو باپ تھے ان پر تو تم شک نہیں کر سکتے ہو، انہوں نے بھی فاخر سے کاروبار کی بات کی۔ اپنی فصل فاخر کے کارخانے کو بیچی۔“

”وہ سب بھی آپ کی وجہ سے ہوا چاہا۔ آپ نے نارپور والوں کی تصویر ہی کچھ ایسی کھینچ رکھی تھی کہ اباجی بھی ان پر بھروسہ کرنے لگے۔“

چچا رئیس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ واقعی خود کو بے حد نادم محسوس کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔
”عادل پتر! جو ہو گیا وہ تو ہو گیا اب آگے کا سوچنا ہے بیٹی کا معاملہ ہے، ہمیں جو کچھ کرنا ہے بہت احتیاط سے کرنا ہوگا۔“

”میں کچھ نہیں جانتا میری بات بالکل صاف اور کھلی ہے۔ میں اپنی بہن کو واپس اس دوزخ میں نہیں بھیجوں گا۔ ہرگز نہیں بھیجوں گا۔“

شانی کا ردِ عمل جاننے کے لئے رئیس احمد نے بے ساختہ شانی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ شانی نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپایا اور سسکی لیتی ہوئی کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

نارپور میں مہرجی کے کارندے اکبرے کو گولی لگنے والی بات ابھی تک چوہدری ارشاد سے چھپائی گئی تھی مگر اسے تا دیر نہیں چھپایا جاسکتا تھا۔ تیسرے روز شانی جب چوہدری ارشاد کے سر ہانے بیٹھی ان کا سرد بار ہی تھی اس نے مناسب لفظوں میں سب کچھ چوہدری ارشاد کے گوش گزار کر دیا۔ شانی نے واقعے کی شدت کو بہت کم کر دیا تھا اور ایسے الفاظ استعمال کئے تھے جن سے چوہدری کو شک نہ پہنچے اس کے باوجود چوہدری ارشاد کا رنگ زرد ہو گیا اور ماتھے پر پسینہ چھپنے لگا۔ وہ لیٹ گئے اور کتنی ہی دیر گم صم رہے۔ دس پندرہ روز میں ہی وہ دائمی بیمار نظر آنے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ کراہتے ہوئے بولے۔ ”شانی تیرا بھائی غصے والا ہے اس کا غصہ کہیں اس معاملے کو اور بگاڑ نہ دے۔ اگر بات پولیس وغیرہ تک پہنچ گئی تو بڑی بدنامی ہوگی۔“

”اباجی! ابھی تک تو بات پولیس تک نہیں پہنچی اور اُمید ہے کہ اب پہنچے گی بھی نہیں۔ چار پانچ دن تو گزر چکے ہیں..... مم..... میرا خیال ہے کہ فاخر نے اس معاملے کو دبایا ہے۔“

”کیا اس واقعے کے بعد فاخر نے کوئی رابطہ کیا ہے؟“

”نہیں اباجی! رابطہ تو نہیں کیا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے اس واقعے کے بعد اس کا رویہ کیا ہوگا؟“

”بھابھو دل کی بڑی اچھی ہے سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ مجھے پکا یقین ہے وہ فاخر کو سمجھا بجھالے گی اور شاید اسی کے سمجھانے بجھانے کی وجہ سے بات ابھی تک پولیس میں نہیں پہنچی اور نہ ہی کوئی اور فساد ہوا ہے۔“

”مگر فاخر کو رابطہ تو کرنا چاہئے تھا۔“

”شاید وہ سوچ رہے ہوں کہ ہماری طرف سے رابطہ ہو۔“

چوہدری ارشاد چند سیکنڈ تک خاموش رہے پھر انہوں نے شانی سے لگا ہیں ملائے بغیر پوچھا۔ ”فاخر کا سلوک تیرے ساتھ کیسا ہے بیٹی؟“
”کچھ کچھ ضرور رہتے ہیں لیکن سلوک بُرا نہیں ہے ہاں مہرجی کا رویہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں مجھے ایک بار بھی رحم کی جھلک نظر نہیں آئی۔“ شانی شوہر کی کج روی پر جان بوجھ کر پردہ ڈال گئی۔

☆=====☆=====☆

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تمام کتب میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی عالمی شہرت یافتہ کتاب

داعی اسلام
(پیغام و نظام)

مترجم: پروفیسر خالد پرویز

تہمت 325 روپے

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں۔ ان کی تحریر کا حرف حرف تحقیق و تدقیق کی قوس قزح سے منور و متحرک ہے جبکہ لفظ لفظ اس امر کی تصدیق و توثیق کرتا ہے کہ ان کی حیات مستعار دنیا پسندار کالہ لوح خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات کے بیان کے لیے وقف رہا ہے۔

اُمّہ حدیث

$$\frac{1}{4} \times 100 = 25$$

ان برگزیدہ بندوں کا تذکرہ جنہوں نے اسلام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا

● حضرت خواجہ معین الدین چشتی ● حضرت جنید بغدادی ● حضرت بایزید بسطامی

اللہ والے

● حضرت نظام الدین اولیاءؒ

اولساء اللہ

$\frac{1}{2} \text{ i } d_1 = 30$ $\frac{1}{2} \text{ i } d_2 = 30$ $\frac{1}{2} \text{ i } d_3 = 30$

● حضرت عیسیٰ (ع) کی ولادت کا نام؟ ● حضرت عیسیٰ (ع) کی ولادت کا نام؟ ● حضرت عیسیٰ (ع) کی ولادت کا نام؟

● حضرت قوامیہ قلب الدین المختار کا کئی ● حضرت ماحولوں حسین ● حضرت سلطان مہار

● حضرت گلبر مست ● ● حضرت میر علی شاہ ● قیمت 250 روپے

ایک نیا

نہایت رشتہ چوک میں ہسپتال، لاہور © 3726741

111 6. 6. 2017 17: 26 6. 6. 2017 17: 26

Keywords: child sexual abuse; disclosure; social support

<http://kitaabghar.com>

67 / 307

ویوی (اول)

چار پانچ روز بعد کی بات ہے۔ صبح دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ حویلی میں چائی کی کسی لینے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی، شانی اپنے ہاتھ سے برتنوں میں لسی ڈال رہی تھی، کسی کسی کے برتن میں وہ لسی کے ساتھ تھوڑا سا مکھن بھی رکھ دیتی تھی۔ یہ اس کی مرحومہ ماں کی روایت تھی جو ابھی تک حویلی میں ہر روز نبھائی جاتی تھی روزانہ تقریباً آٹھ چائی لسی تقسیم کی جاتی تھی، بانٹتے بانٹتے شانی کی کردوہری ہو گئی اور نازک کلاسیاں دکھنے لگیں مگر اس طرح کی تکلیف اٹھا کر اسے ہمیشہ سے راحت ہوتی تھی، اچانک حویلی کے اندرونی حصے سے کچھ آوازیں شانی کے کانوں تک پہنچیں اور وہ چونک گئی۔ بھائی عادل کی ملازم پر برس رہا تھا۔ شانی نے اسٹیل کا جگ اپنے ہاتھ سے رکھا اور جلدی سے اندرونی حصے کی طرف گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ عادل غصے سے سُرخ ہے اور خادم حسین پاس کھڑا کانپ رہا ہے۔ عادل کے ہاتھ میں ایک چاک کیا ہوا لفافہ تھا اور لفافے میں سے نکلنے والا خط اس کے ہاتھ میں تھا۔

”کیا ہوا عادل بھائی؟“ شانی نے سہم کر پوچھا۔

”اتنا پرانا ملازم ہو کر بھی جھوٹ بولے تو دکھ ہوتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ اباجی کے کمرے سے نکلا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کمرے سے نکلنے کے بعد یہ کہیں روانہ ہو رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو بولا بھائی بیمار ہے اس کی خبر لینے گاؤں جا رہا ہوں۔ حالانکہ بھائی اچھا بھلا ہے تھوڑی دیر پہلے مجھے راستے میں ملا ہے، یہ جھوٹ بول رہا تھا۔ یہ دیکھو اس کی جیب سے اباجی کا لکھا ہوا خط نکلا ہے، یہ نار پور جا رہا تھا۔“

”لیکن بھائی! اس میں خادم حسین بے چارے کا تو کوئی قصور نہیں اباجی نے کہا ہو گا کہ کسی کو بتانا نہیں۔“

”ہم تو حکم کے غلام ہیں چھوٹی بی بی۔“ خادم حسین نے آبدیدہ لہجے میں کہا۔

”اچھا تم باہر جاؤ۔“ عادل غصیلے انداز میں بولا۔ ”لیکن ابھی اباجی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جو حکم چھوٹے مالک۔“ خادم حسین نے کہا اور باہر چلا گیا۔

عادل نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک تو مجھے اباجی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ جس کسی کے سامنے بچتے ہیں تو پھر بچتے چلے جاتے ہیں۔ ایک تو بلا سوچے سمجھے تمہاری شادی کرنے کی غلطی کی..... اب منت سماجت اور عاجزی کا رویہ اختیار کر کے اس غلطی کو مزید بڑھاوا دے رہے ہیں۔ دیکھو اس خط میں کیا لکھا ہے انہوں نے۔“ عادل نے پہلے خط پر سرسری نظر دوڑائی پھر پڑھنا شروع کیا۔ ”بیٹے فاخر ماضی میں جو کچھ ہوا اس میں قصور کس کا تھا؟ اس بحث میں پڑیں گے تو دکھ اور جگ ہنسائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ شانی کے بزرگوں کی طرف سے تمہارے بڑوں کے ساتھ زیادتی ہوئی یا تمہارے بزرگوں کی طرف سے شانی کے بڑوں کی دل آزاری ہوئی..... جو کچھ بھی ہوا یہ پرانے ماضی کا قصہ ہے۔ اگر ہم اس ورق کو پھاڑ دیں اور ہر وہ بات بھول جائیں جو آج سے پہلے ہوئی ہے تو ہم ایک نئی اور بہتر زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔“

جو کچھ بھی تھا فاخر لیکن اب تم میرے بیٹے ہو اور مجھے عادل اور اختر ہی کی طرح عزیز ہو۔ میں بڑا ہونے کے باوجود ہر اس زیادتی اور دل آزاری کے لئے تم سے معافی مانگتا ہوں جو تم سمجھتے ہو کہ ماضی میں ہوئی ہے۔ یہ معافی میری طرف سے ہی نہیں میرے بیٹوں اور بھائیوں کی طرف سے بھی ہے۔

اب میں چند دن پہلے کے واقعے کی طرف آتا ہوں۔ عادل ہرگز تمہاری غیر موجودگی میں شانی کو لینے نہ جاتا لیکن اس دن میری طبیعت بہت خراب تھی، میرے ہی اصرار پر وہ گیا تھا۔ وہاں جو کچھ ہوا اس پر عادل کو بھی بے حد افسوس ہے معمولی سی بات تھی جو بڑھ گئی۔ یہ تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی، تمہارے ملازم اکبرے کی طرف سے بھی کچھ زیادتی ہوئی، بہر حال جو کچھ بھی ہوا، اس میں مجھے اور عادل کو بے حد افسوس ہے۔ یہ تمہاری مہربانی اور بر خور داری ہے کہ تم نے فوری طور پر اسلام آباد سے واپس آ کر اس معاملے کو سمیٹ لیا۔

یقین کرو میں تندرست ہوتا تو خود چل کر تمہارے پاس آتا اور اس واقعے کے لئے تم سے اور مہرجی سے معذرت کرتا..... شانی شدت سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ میں بھی تمہاری صورت دیکھنے کو ترس رہا ہوں۔ ہفتے کی شام کو آ جاؤ اور ایک دو روز ہمارے ساتھ رہو۔

خیر اندیش و دعا گو ارشاد احمد۔“
خط کی آخری سطور تک پہنچتے پہنچتے عادل کا چہرہ انگارہ ہو چکا تھا۔ وہ پھٹکا کر بولا۔ ”اباجی سمجھتے ہیں کہ جیسے وہ خود نرم دل ہیں ایسے ہی ساری دنیا بھی ہے۔ اگر ان کا خیال ہے کہ یوں معافیاں مانگنے اور منتیں کرنے سے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ کتے کی دم کو سوسال بھی حقے کی ٹلی میں رکھو وہ میڑھی ہی رہتی ہے۔ جن لوگوں نے ستر اسی سال تک دشمنی کو پال پوس کر جوان کیا ہے وہ اسے اتنی جلدی کیسے ختم کر دیں گے۔ انہوں نے ہماری غیرت کو لاکار ہے شانی۔ ان کی ہر اینٹ کا جواب ہمیں پتھر سے دینا ہوگا۔“

”بھائی، دشمنی کو جتنا بڑھایا جائے بڑھتی جاتی ہے، ہمیں کوئی باعزت راستہ نکالنا ہوگا۔ میں ہرگز نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ اور اباجی کسی مصیبت کا شکار ہوں۔“

”تو کیسی باتیں کرتی ہے شانی؟ تیری اور ہماری مصیبت جدا نہیں ہے، اگر تو مشکل میں ہے تو ہم بھی مشکل میں ہیں اور ایک بات میں تجھے صاف بتا دوں میں تجھے کوئی قربانی نہیں دینے دوں گا۔ تو دشمنی کی اس آگ میں واپس نہیں جائے گی۔“ وہ پاؤں پختا ہوا ہانپتا ہوا بولتا تھا۔
شانی کی آنکھوں سے دو آنسو خاموشی سے گرے اور قالین میں جذب ہو گئے۔

شانی اور عادل نے اباجی سے یہ بات چھپائے رکھی کہ انہوں نے معذرت خواہی والا خط نار پور نہیں پہنچنے دیا، ملازم خادم حسین کو بھی تاکید کر دی گئی کہ وہ اباجی کی بیماری کے پیش نظر انہیں کوئی بات نہیں بتائے گا۔ نہ جانے کیوں شانی کے دل کی گہرائی میں کہیں یہ توقع موجود تھی کہ شاید فاخر رنگ والی آجائے اور اباجی کی عیادت کرے۔ اگر ایک بار وہ آجاتا تو یقیناً معاملات سدھرنے کی اُمید پیدا ہو جاتی۔

پانچ چھ روز اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک روز شام کو عادل گھر واپس آیا تو سخت بھنایا ہوا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی شانی سہم گئی۔ وہ چھوٹے ہی بولا۔ ”شانی تم سے کہا تھا نا کہ نار پور والوں سے ہمارا صرف دشمنی کا رشتہ ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ دیکھو کیا ہے؟“ عادل نے چند کاغذات شانی کی طرف بڑھا دیئے۔

شانی نے سرسری انداز میں دیکھا۔ ان کاغذات کا تعلق زرعی بینک سے تھا۔ عادل نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ یہ قرضے کے کاغذات ہیں۔ بچ، کھا داور پانی کے سلسلے میں چالیس لاکھ کا یہ قرضہ چوہدری ارشاد نے بینک سے حاصل کرنا تھا۔ اس قرضے کے لئے کوشش کرنے

کا مشورہ فاخر نے ہی چوہدری ارشاد کو دیا تھا اور پورا یقین دلا یا تھا کہ وہ اپنے تعلقات استعمال کر کے یہ قرضہ حاصل کر لے گا۔ اب یہ کاغذات انکار کی مہر کے ساتھ واپس آ گئے تھے۔ فصل کی بوائی سے پہلے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ عادل اور چاچا مشتاق کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ کاغذات اس لئے واپس ہوئے تھے کہ فاخر نے اس معاملے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

شانی نے کہا۔ ”بھائی! اب جی تو پہلے ہی بہت پریشان ہیں یہ خیران کے لئے بڑی تکلیف والی ہوگی۔“

”لیکن انہیں بتائے بغیر چارہ بھی تو نہیں۔ وہ کل بیج اور کھاد وغیرہ کے لئے ایڈوانس دینے والے ہیں۔ ڈیڑھ لاکھ کی زرعی دوا تو انہوں نے منگوا بھی لی ہے۔“

”بھائی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کہیں اور سے رقم مل جائے؟“

عادل کے چہرے پر شدید پریشانی اور سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”اس کا تو ایک ہی طریقہ ہے، بیلے کے ساتھ والی زمین بیج دی جائے۔۔۔۔۔ اس بارے میں چاچا مشتاق ہی کوئی بہتر مشورہ دے سکتا ہے۔ بہر حال یہ ساری تو بعد کی باتیں ہیں فی الحال سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ فاخر نے ہم پر اوچھا وار کیا ہے۔ ایسا گھٹیا بندہ بڑے سے بڑا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ۔۔۔۔۔“ عادل کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو بھائی؟“

”مجھے تو یہ ڈر ہے شانی کہ وہ تمہیں دھونس کے ساتھ یہاں سے لے جانے کی کوشش نہ کرے۔ خدا کی قسم اگر اس نے کوئی اس قسم کی حرکت کی تو میں اس کے اندر سے گزرجاؤں گا۔“

”ایسی باتیں کیوں کرتے ہو بھائی۔ جو بات ہے ہی نہیں تم اس کو سوچ سوچ کر حقیقت بنا رہے ہو۔“

”کیا یہ کاغذ حقیقت نہیں ہیں؟“ عادل نے بینک سے آنے والے کاغذات شانی کے سامنے پھڑپھڑائے۔ ”اگر یہ حقیقت ہیں تو اور بھی بہت کچھ حقیقت بن سکتا ہے۔“

شانی رات گئے تک اباجی کے پاس بیٹھی رہی۔ وہ ان سے باتیں کرتی رہی ان کی دلجوئی میں لگی رہی لیکن اس کے ساتھ اس کا ذہن آج کی غم ناک خبر میں بھی انکار رہا۔ ہمیشہ سے اس کی عادت تھی کہ وہ ہر حادثے یا غم ناک واقعے میں اپنی غلطی تلاش کرتی تھی۔ یہ کھوج لگاتی تھی کہ ایسے حالات پیدا کرنے میں اس نے کیا کردار ادا کیا ہے۔ اب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی اگر وہ عادل اباجی کا لکھا ہوا خط نار پور پہنچ جانے دیتے تو شاید نار پور والوں کی طرف سے یہ ردِ عمل ظاہر نہ ہوتا۔ سب کچھ سلجھ جاتا، اُمید کے نئے راستے کھل جاتے۔

اس رات عادل، چچا مشتاق اور چچا رئیس میں کافی دیر تک صلاح مشورہ ہوتا رہا۔ اگلے روز شام کو جب شانی حویلی کی چھت پر ٹہل رہی تھی عادل اس کے پاس آیا اور اس نے شانی کو ایک خوشخبری سنائی۔ وہ بولا۔ ”شانی میرا خیال ہے کہ اب ہم بینک کے قرضے اور فاخر کے تعاون پر لعنت بھیج سکتے ہیں، ہم نے بیلے کے ساتھ والے آٹھ مربے بیچنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس سے بڑی خبر یہ ہے کہ زمین کے لئے ایک اچھا گاہک بھی مل گیا ہے۔“

شانی نے کہا۔ ”یہ وہی جگہ ہے نا جو باجی نے پچھلے سے پچھلے سال بھی بیچنے کی کوشش کی تھی؟“

”ہاں..... وہی اس سے پہلے بھی دو تین بار ہم نے ٹرائی ماری تھی لیکن وہ جگہ کھری ہے۔ اس کا گاہک نہیں ملتا اور اگر کوئی ملتا ہے تو پورے پیسے نہیں دیتا۔ اب اللہ کا کرنا ہے کہ گاہک مل رہا ہے اور پیسے بھی ٹھیک دے گا۔ یہ سب چاچا مشتاق کی کوشش سے ہوا ہے ہم کل پٹواری کے پاس جا رہے ہیں۔ زمین کی فرویس وغیرہ نکلوائیں گے اُمید ہے کہ تین چار روز تک بیعنا نہ ہو جائے گا۔“

”باجی کو بتایا ہے۔“ شانی نے اپنی اندرونی خوشی سمیٹتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابھی تو نہیں بتایا لیکن میرا خیال ہے کہ اب بتادینا چاہئے۔ یہ بھی بتادینا چاہئے کہ بینک سے قرضے والے کاغذ واپس آ گئے ہیں۔“

اب یہ خبر دینے میں زیادہ حرج نہیں ہے۔“

”اور وہ خطر روکنے والی بات؟“ شانی نے پوچھا۔

”نہیں۔ اسے ابھی رہنے دو جب باجی کو پتہ چلے گا تو بات کر لیں گے۔“

رات کو باجی کے پاس بیٹھ کر عادل ٹی وی پر خبر نامہ دیکھتا رہا پھر اس نے سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ قرضے والی اطلاع نے چوہدری ارشاد کو بھی صدمہ پہنچا دیا۔ اپنے داماد کے لئے ان کے دل میں نرم گوشہ موجود تھا لیکن اس خبر کے بعد اس گوشے کی وسعت کچھ کم ہو گئی تھی۔ اگر عادل نے چوہدری ارشاد کو اس صدمے سے سنبھالنے کا انتظام نہ کر لیا ہوتا یعنی زمین کا گاہک نہ ڈھونڈ لیا ہوتا تو چوہدری ارشاد پر یقیناً قیامت گزر جاتی۔ کچھ دیر بعد چاچا رئیس اور مشتاق بھی وہاں آ گئے۔ اس نئی صورت حال پر وہ تادیر تبصرہ کرتے رہے۔ یوں لگتا تھا کہ کاروبار کی ڈھنسی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے یہ ان کے پاس آخری موقع ہے۔ اگر اس مرتبہ سارا رقبہ کاشت کیا جاتا اور خریف کی فصل بھی غیر معمولی ہوتی تب ہی وہ اپنے حالات کے شکنجے سے نکل سکتے تھے۔ زمین کی فروخت کی صورت پیدا ہوئی تھی تو انہیں اپنے کئی مسئلے حل ہوتے نظر آنے لگے تھے۔

شانی رات دیر تک جاگتی رہی اور سوچتی رہی کہ حالات اسے بہا کر کہاں سے کہاں لے جا رہے تھے۔ شادی سے چھ روز پہلے جب اس پر انکشاف ہوا تھا کہ اس کا ہونے والا شوہر وہی گھڑسوار ہے جس کے منہ پر اس کے طمانچے کا نشان پڑا تھا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی زندگی ایک بے ڈھنگی چال چلنے والی ہے لیکن اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ صبر اور فراست کے ساتھ اس چال کو درست کر لے گی اور اس نے دلیری کے ساتھ اس امتحان گاہ میں قدم رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کے سرد و گرم کو ہمت سے برداشت کیا تھا اور دل میں یہ اُمید کی تھی کہ جلد ہی وہ سب کچھ ٹھیک کر لے گی۔ ہر دل میں جگہ بنا لے گی اور اس دل کو بھی جیت لے گی جسے جیتنا اس کے لئے سب سے زیادہ آسان تھا لیکن اس کے بعد حالات کے سانپ نے اپنی کندلی کے کچھ اور بل کھولے تھے۔ شانی کے علم میں یہ بات آئی کہ بات صرف ایک اتفاق طمانچے کی نہیں تھی اس کے پیچھے ایک کہنہ سال کہانی سرسرا رہی تھی۔ ایک پون صدی پرانی کہانی جو روز و شب کی بھول بھلیوں میں ریگیتی ریگیتی اس تک پہنچی تھی اور عین جوانی کے سہانے دنوں میں اسے دبوچ بیٹھی تھی۔

اب تک جو حالات سامنے آئے تھے ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ خدا بخش کے کنوئیں پر پیش آنے والا طمانچہ کا واقعہ اتفاقی نہیں ہو گیا تھا وہ واقعہ نہ بھی ہوتا تو بھی شانی کے لئے صورت حال کم و بیش یہی ہوتی جواب تھی۔ وہ واقعہ نہ ہوتا تو کوئی اور ہو جاتا۔ فاخر خدا بخش کے کنوئیں پر

سر راہ شانی سے نہیں گمرایا تھا۔ وہ شانی کے پیچھے تھا۔ اس کے ارد گرد منڈلا رہا تھا۔ شانی اور سیکینہ نے پہلے بھی دو تین بار اسے رنگ والی میں گھومتے پھرتے دیکھا تھا، ہو سکتا ہے کہ وہ چچا رئیس سے ملنے کے بہانے آتا ہو مگر اس کا اصل ہدف شانی ہی تھی۔

بہر حال یہ سب باتیں اب تو ماضی کا حصہ بن گئی تھیں۔ حقیقت حال یہ تھی کہ اب شانی، فاخر کی منکوحہ بیوی تھی۔ فاخر، شانی کی زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد بن چکا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ اسے سونپ چکی تھی اور اب اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کم از کم اس کی ”مشرقی روح“ کے اندر سے تو یہی آواز آتی تھی کہ اب واپسی کی کوئی راہ نہیں۔ اب ایک طرف شوہر تھا اور دوسری طرف اس کے خونی رشتے، وہ خود کو دو انتہاؤں کے درمیان پھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی..... ”یا اللہ! دشمنی کی آگ میں سے محبت کا کوئی پھول کھلا دے، تو قادرِ مطلق ہے..... تو سب کچھ کر سکتا ہے تو نے میرے دل کو ”خانہ محبت“ بنایا ہے۔ اپنی ماں کی طرح میں بھی کسی سے نفرت نہیں کر سکتی۔ اس سے بھی نہیں جو میرے سینے میں خنجر گھونپنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ میں سراپا محبت ہوں تو پھر مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹا جا رہا ہے۔ میری مدد فرما میرے مالک! مجھے کانٹوں میں گھسیٹنے والے گناہ گار ہوں گے تو اس کا دکھ بھی مجھ کو ہی ہوگا۔ میری مدد فرما میرے مالک!“

اگلے ایک ہفتے میں شانی نے دن رات اباجی کی خدمت کی۔ وہ ان کی خوراک اور دوا کا خاص خیال رکھتی تھی۔ اباجی کی صحت پہلے سے بہتر ہو رہی تھی۔ اباجی سے پیار تو شانی کو پہلے بھی بہت تھا لیکن ان کی تکلیف نے یہ پیار دو گنا کر دیا تھا۔ وہ رات کو کھانتے بھی تھے تو شانی چونک کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ سوموار کے روز وہ لوگ اباجی کو لاہور میں چیک اپ کے لئے لے گئے۔ ان کی ایکوگرانی ہوئی، ورزش کا ٹیسٹ ہوا۔ ساری رپورٹیں اچھی آئیں۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام اور علاج جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

واپسی پر شانی خوش تھی، کئی دنوں بعد اس نے سکھ کی سانس لی تھی۔ وہ دیر تک اباجی کے پاس بیٹھی رہی ان سے باتیں کرتی رہی، لطیفے سناتی رہی۔ وہ اپنا اور اباجی کا دھیان اصل غم سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ اباجی کے پاس کافی دیر بیٹھ چکی تو پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ اسے امی جی کے پاس بھی بیٹھنا چاہئے۔ اس کے کمرے میں مرحومہ ماں کی تصویر لگی تھی اور وہ اس تصویر کے سامنے ایسے ہی بیٹھتی تھی جیسے ماں کی زندگی میں ان کے سامنے بیٹھا کرتی تھی اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ماں واقعی اس سے باتیں کرنے لگتی تھی۔

جب وہ ماں کے سامنے بیٹھنے کے لئے اپنے کمرے کا رخ کر رہی تھی کہ اچانک اسے گھن گرج کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں حویلی کے مردانے سے ابھری تھیں اس لئے شانی کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے کافی مدھم پڑ گئی تھیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ عادل کسی سے لڑ جھگڑ رہا ہے۔ شانی کا دل سینے میں چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا گیا۔ وہ تیزی سے مردانے کی طرف گئی۔ جاتے جاتے وہ راستے میں آنے والے سارے دروازے بند کرتی گئی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ یہ آوازیں اباجی کے کانوں تک پہنچیں۔ اس نے دیکھا کہ زنانے اور مردانے حصے کو ملانے والے کمرے میں چچا مشتاق اور عادل ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہیں۔ عادل کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اس کا چہرہ انگارے کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ چچا مشتاق اسے روکنے کے لئے پورا زور لگا رہے تھے۔ عادل دھاڑ رہا تھا۔ ”میں اسے سبق سکھا دوں گا۔ وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو اگر دشمنی ہے تو پھر دشمنی سہی۔ اب کھلے میدان میں مقابلہ ہوگا۔ اس کی بد معاشی ناک کے راستے نہ نکال دوں تو

عادل نام نہیں۔“

شانی کے ذہن میں خطرے کی کئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ عادل جو کچھ کہہ رہا ہے فخر کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ وہ چچا مشتاق کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ اسی دوران میں چچا مشتاق کی نظر شانی پر پڑ گئی، انہوں نے پکار کر کہا۔ ”شانی! اسے روکو یہ پاگل ہو رہا ہے۔“

شانی آگے بڑھی اور وہ بھی بھائی سے لپٹ گئی۔ روتے ہوئے بولی۔ ”بھائی ایسا مت کرو تم جانتے ہو اباجی کی حالت کیسی ہے۔ وہ کوئی صدمہ برداشت نہیں کر سکتے۔ خدا کے لئے بھائی، چھوڑو یہ رائفیل۔“

شانی اور چچا نے مل کر بمشکل عادل کے ہاتھ سے بھری ہوئی رائفیل چھڑائی۔ ہانپتا کانپتا ہوا خادم حسین بھی موقع پر پہنچ چکا تھا۔ چچا مشتاق نے رائفیل اسے تھمائی پھر پھرے ہوئے عادل کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا اور اسے دھکیلتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ کمرے کا دروازہ انہوں نے اندر سے بند کر لیا۔

چچا مشتاق نے پتہ نہیں کیسے اور کس طرح بھرے ہوئے عادل کو ٹھنڈا کیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ باہر آئے تو نڈھال نظر آتے تھے۔ ان کی کشادہ پیشانی پر پریشانی کی گہری لکیریں تھیں۔

”کیا ہوا چاچا؟ بھائی کیوں اتنے غصے میں آگئے ہیں؟“ شانی نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

چوہدری مشتاق ایک گہری اور مضطرب سانس لے کر بولے۔ ”شانی! عادل کا غصہ بھی بے جا نہیں ہے، نارپور والے ہمیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہے۔ انہوں نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں چچا؟“

”زمین کا سودا کینسل ہو گیا ہے اور اسے کینسل کرانے والا فخر ہے۔“

”اوہ خدایا..... یہ کیا ہو رہا ہے۔“

”تم جانتی ہی ہو یہ گاہک بڑی مشکل سے ہاتھ لگا تھا۔ میرے بچپن کا ایک دوست تھا۔ میں زمین کے لئے کافی عرصے سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے بات ”سودے“ تک پہنچی تھی۔ فخر کو اس بات کا پتہ چل گیا۔ اس نے اپنی ٹانگ اڑا کر سودا خراب کر دیا۔ ہمیں آج صبح ہی پتا چلا ہے کہ فخر نارپور کے قریب اپنی دس مربیع زمین ہمارے گاہک کو بہت سستے بھاؤ دے رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ یہ سب ہماری عداوت میں کر رہا ہے۔ اس نے سستی زمین دے کر نقصان برداشت کیا ہے لیکن ہماری زمین بکنے نہیں دی۔“

”آپ کو یہ سب کس نے بتایا ہے؟“

”نارپور کا نائب تحصیلدار آج سویرے خود میرے پاس آیا تھا۔ اس نے ساری حقیقت کھولی ہے۔ شک تو ہمیں تین چار روز سے تھا لیکن آج تو سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔“

شانی کے سینے میں جیسے کچھ چکناچور ہو کر بکھر گیا۔ پچھلے چند دنوں سے اباجی کے چہرے پر جو بشارت اور صحت مندی نظر آرہی تھی وہ ایک دم کافور ہونے والی تھی۔ وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔ ”پچھا! اس بات کا پتا اباجی کو چلے گا تو کیا ہوگا؟“

”یہی سوچ سوچ کر تو میں پریشان ہو رہا ہوں۔ ساری اُمیدیں زمین کے اس سودے سے ہی تھیں۔ تمہارے سسرال والوں نے بڑا سخت وار کیا ہے۔ اگر ہم نے کوئی صل نہ نکالا تو قرض خواہوں سے عزت بچانی مشکل ہو جائے گی۔“

”آخر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں وہ؟“ شانی نے کہا۔

”یہ بات تو وہی بتا سکتے ہیں۔ فاخر سے اب تک ہم میں سے کسی کی بات نہیں ہوئی ہے لیکن جو خبریں پہنچ رہی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عادل پر بہت خفا ہے۔ عادل تمہیں بغیر اجازت کے نارپور سے لے آیا تھا۔ اس کی گولی سے فاخر کا کارندہ زخمی بھی ہوا ہے۔ شاید اب فاخر چاہتا ہے کہ ان واقعات پر اس سے معافی مانگی جائے۔“

”لیکن چاچا! یہ ساری تو غیروں والی باتیں ہیں۔ وہاں نارپور میں سراسر زیادتی اس اکبر سے نامی ملازم کی تھی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ فاخر یہاں آجاتے، اباجی کی خیریت بھی پوچھ لیتے اور باقی معاملے بھی صاف ہو جاتے۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنی اکڑ تو ذکر یہاں آئے گا۔ شاید وہ چاہتا ہے کہ تم خود واپس آ جاؤ۔“

☆=====☆

کسی خواب کے یقین میں

ہما کوکب بخاری

قیمت: 250

گچی محبت کرنے والوں کے لیے سچے جذبوں کی سچی کہانی۔
موت اور محبت کے درمیان کشمکش کی دلگداز داستان۔
اس محبت کا قصہ جو دو چاہنے والوں کے لیے پل صراط بن گئی تھی۔
محبت کے اس مفہوم سے نا آشنا ایک دیوانی لڑکی کی کہانی۔
محبت اس پر عذاب بن کر اتری تھی۔
وہ محبت کے سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔
محبت صرف لینے کا نام نہیں ہے بلکہ دینے کا نام ہے۔

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میوہ ہسپتال، لاہور۔

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
Ph: 7247414

براہ راست
منگوانے
کا پتہ

حالات بہتر ہونے کے بجائے بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پون صدی سے دشمنی کی جو جنگاری دونوں خاندانوں کے اندر دہی ہوئی تھی، وہ بھڑک کر شعلہ بن گئی ہے۔ دونوں چھوٹے بھائیوں نے بڑی احتیاط اور نرم روی کے ساتھ بڑے بھائی چوہدری ارشاد کو اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ خیراتی سنگین تھی کہ ساری احتیاط کے باوجود اس کا اثر چوہدری ارشاد پر ہو رہا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا اور سینے میں ہلکا درد محسوس ہونے لگا۔

شانی اپنے ابا جی کی حالت دیکھ دیکھ کر نیم جان ہو رہی تھی۔ یہ خیال بار بار اس کے دل میں آتا کہ شاید فاخر کے لئے ابا جی کا خط روک کر انہوں نے غلطی کی ہے۔ اگر معذرت کا وہ خط فاخر اور مہرجی تک پہنچ جاتا تو ہو سکتا تھا کہ حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔ اگر شانی کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے پندار کی ذرہ بھر پرواہ کئے بغیر از خود نار پور پہنچ جاتی اور اپنے شوہر کی ہر کڑوی کیسلی بات سر جھکا کر سن لیتی لیکن ایسا کرنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اب دھیرے دھیرے یہ دو خاندانوں کی انا اور عزت کا مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ عادل تو اس قدر مشتعل تھا کہ شانی کی واپسی کی بات بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ سودا ختم ہونے والے واقعے کے بعد چچا مشتاق بھی عادل کے ہم خیال نظر آتے تھے۔ چچا رئیس ”درمیان درمیان“ محسوس ہوتے تھے۔ وہ کبھی ایک طرف کی بات کرنے لگتے تو کبھی دوسری طرف کی۔

یہ سوچ کر شانی کا دل پتے کی طرح کاٹنے لگتا تھا کہ کہیں مردوں کی دشمنی اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ خون خرابا شروع ہو جائے۔ اسے اپنے بھائی عادل کی تیز طبیعت سے بہت خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس روز تو چچا مشتاق کے ساتھ مل کر شانی نے کسی نہ کسی طرح عادل کو روک لیا تھا لیکن اس کے اشتعال پر کب تک پہرا بٹھایا جاسکتا تھا۔ چچا رئیس اسے مسلسل سمجھانے بھگانے میں لگے ہوئے تھے۔ وہ اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا رہے تھے کہ جو کچھ بھی ہے اب شانی اس گھر کی بہو ہے۔ اگر کسی بڑے جھگڑے کی وجہ سے شانی کی زندگی پر اثر پڑے گا تو ہم سب گناہ گار ہوں گے۔ ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔

دوسرے روز صبح سویرے شانی کی آنکھ کھلی۔ ابا جی کو دیکھنے کے بعد وہ صحن کی طرف جا رہی تھی جب اس نے دیکھا کہ ملازم شفیع محمد بہت سی لائیں لے کر حویلی کے پچھواڑے جا رہا ہے۔ وہ جانتی تھی یہ لائیں کہاں استعمال ہوں گی۔ حویلی کے پچھواڑے ایک بڑا اکھاڑا تھا یہاں کشتی، کبڈی اور لٹھ بازی وغیرہ ہوتی تھی۔ لٹھ بازی کے لئے عموماً اتوار کا دن چنا جاتا تھا۔ اتوار کے دن عادل بھی بڑے اہتمام سے اکھاڑے میں پہنچتا تھا۔ لٹھ بازی کے مقابلے دیکھتا تھا اور اکثر خود بھی ان مقابلوں میں حصہ لیتا تھا، لیکن آج تو اتوار نہیں تھا۔ پرسوں بھی اتوار نہیں تھا، پرسوں بھی شانی نے صبح سویرے عادل کو اکھاڑے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ شفیع محمد کے علاوہ رنگ والی کا مشہور لٹھ باز شاہو پہلوان بھی اس کے ساتھ تھے۔ شانی دے پاؤں بھائی کے کمرے کی طرف گئی شانی کی توقع کے عین مطابق عادل کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اکھاڑے میں ہے۔

صبح نو بجے کے قریب شانی نے عادل کو دوبارہ دیکھا۔ اس وقت شانی اور ابا جی ناشتہ وغیرہ کر چکے تھے۔ عادل پسینے میں شرابور تھا اور اس کا چہرہ متمایا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے اکھاڑے میں خاصی کسرت کی ہے۔ ایسی حالت میں وہ ان دنوں نظر آیا کرتا تھا جب رنگ والی کے نواح میں ”بڑا میلہ“ لگتا تھا۔ اس میلے میں لٹھ بازی کے مقابلے ہوتے تھے۔ عادل جوش و خروش سے ان مقابلوں میں حصہ لیتا تھا اور مقابلوں کی تیاری کے

لئے خوب کسرت کرتا تھا لیکن آج کل تو کوئی میلہ نہیں تھا پھر وہ کیوں ایسے ہلکان ہو رہا تھا۔

وہ دیر تک اس بارے میں سوچتی رہی اور اس کے ذہن میں انجانے اندیشے سر اٹھاتے رہے۔

شام کو اسے ایک نئی بات کا پتا چلا۔ وہ زنانے کے صحن میں بیٹھی تھی اور دو ملازماؤں کو تندور میں روٹیاں لگاتے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں بچا مشتاق آئے اور موڑھا گھسیٹ کر اس کے پاس آ بیٹھے۔ ان کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ شانی سے پوچھنے لگے۔ ”کیا عادل نے تم سے کوئی بات کی ہے؟“

”کیسی بات چا چا؟“ شانی نے الجھن سے پوچھا۔

”کوئی بھی بات؟“ شانی نے نفی میں سر ہلایا تو وہ پُرسوج لہجے میں بولے۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ہمارے منع کرنے کے باوجود عادل فائے سے ملا ہے اور شاید دونوں میں ”سردی گرمی“ بھی ہوئی ہے۔“

شانی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس کے اپنے دل میں بھی بار بار یہ بات آرہی تھی کہ عادل چپکا نہیں بیٹھا رہے گا کچھ نہ کچھ کرے گا ضرور۔ ”آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا ہے چا چا؟“ شانی نے پوچھا۔

”بس کسی بندے نے مجھے بتایا ہے اس نے سوموار کے روز عادل کی جیب کو نار پور کے راستے پر دیکھا تھا فاصلہ زیادہ تھا وہ عادل کو تو نہیں دیکھ سکا لیکن اس کا خیال ہے کہ جیب یہی تھی۔“

شانی خاموش رہی۔ چچا مشتاق نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ کہیں اندر رہی اندر یہ دونوں لڑکے معاملہ مزید خراب نہ کر لیں۔ تم عادل سے ٹوہ لینے کی کوشش کرو کہ وہ نار پور گیا تھا یا نہیں۔“

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان لمحوں میں پتا نہیں کیوں اس کا ذہن خود بخود صبح والے واقعے کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اکھاڑے سے واپسی پر عادل کا چہرہ کس طرح پسینے میں شرابور تھا اور آنکھوں میں آگ روشن تھی۔ شانی کو یہ بھی پتا تھا کہ اس کا شوہر فاخر بھی لٹھ بازی کا شوق رکھتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ پون صدی پہلے جو کہانی اس کی دادی دولت بی بی کے بیاہ سے شروع ہوئی تھی اس میں بھی لٹھ بازی کا عمل دخل تھا۔ کہیں یہ ”لٹھ بازی“ پھر سے تو اس کہانی میں داخل نہیں ہو گئی تھی۔ وہ سوچتی رہی اور اندر رہی اندر ایک مہیب اندیشہ اس کے وجود میں سرسرا رہا۔ ”کیا سوچ رہی ہو شانی؟“ چچا کی آواز نے اسے خیالوں کی دنیا سے چونکا دیا۔

”کک..... کچھ نہیں چچا..... میں سوچ رہی ہوں کہ بھائی عادل آج کل روزانہ صبح سویرے اکھاڑے میں جا رہے ہیں۔ شاہو پہلوان اور شفیع محمد بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ کہیں یہ کسی..... لڑائی وغیرہ کی تیاری تو نہیں ہے۔ م..... میرا مطلب ہے، کہیں فاخر اور عادل میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہونے والا؟“

”یہی ڈرتو مجھے ہے۔ میرے خیال میں تم طریقے سے پوچھو گی تو عادل کچھ نہ کچھ ضرور بتائے گا۔“

شانی نے چچا مشتاق سے وعدہ کیا کہ وہ کل صبح عادل سے ٹوہ لینے کی کوشش کرے گی۔

لیکن اگلی صبح شانی پر انکشاف ہوا کہ عادل کو فوری طور پر راولپنڈی جانا پڑ گیا ہے۔ دراصل فصل کی بوائی سر پر ہے۔ اخراجات کے لئے نقد رقم کی شدید ضرورت تھی لیکن رقم کا دور دور پتا نہیں تھا۔ قرض خواہ علیحدہ تنگ کر رہے تھے۔ راولپنڈی میں ایک پارٹی سے چوہدری ارشاد کے دیرینہ کاروباری مراسم تھے۔ چوہدری ارشاد نے ہی عادل کو راولپنڈی بھیجا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ چاہے سخت شرائط پر ہی ملے لیکن کچھ قرضہ مل سکے۔

عادل سے تو شانی کی ملاقات نہیں ہو سکی لیکن جو کچھ وہ عادل سے معلوم کرنا چاہتی تھی وہ اسے کسی اور سے معلوم ہو گیا۔ یہ اس کی جان سے پیاری سہیلی سیکنہ تھی۔ سیکنہ گاؤں ہی کے ایک لڑکے منظور سے پیار کرتی تھی۔ منظور جٹ نامی یہ لڑکا نارپور بھی آتا جاتا رہتا تھا۔ اسے نارپور کے اکثر حالات کا پتا ہوتا تھا۔ اس نے سیکنہ کو بتایا تھا کہ نارپور کی بیٹھک (دائرے) میں عادل اور فاخر میں سخت جھگڑا ہوا ہے۔ نوبت ہاتھ پائی تک پہنچنے پہنچنے رہی۔ لائٹھیاں اور پستول نکل آئے تھے لیکن بڑوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ فاخر نے عادل کو طعنہ دیا کہ اس کے دادا نے لائٹھیاں مار مار کر عادل کے دادا کا کچھ مر نکال دیا تھا۔ لوگ اسے اکھاڑے سے چار پائی پر ڈال کر باہر لے گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ ملی بھگت سے دولت بی بی کا دلوہا بن گیا تھا۔ فاخر نے عادل سے کہا تم بھی اسی بھگوڑے خاندان سے ہو۔ اس خاندان کے سورمے اکھاڑے میں زمین چاٹتے ہیں اور اکھاڑے سے باہر بے غیرتی سے گردن اکڑاتے ہیں۔ فاخر کی اس بات کا عادل نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ چند بڑوں نے بیچ بچاؤ کر لیا اور فیصلہ کیا کہ اگر وہ دونوں طاقت آزمایاں چاہتے ہیں تو پھر اکھاڑے میں آزمائیں۔ نارپور کے بڑوں کی طرف سے عادل کو چیلنج کیا گیا جو اس نے فوراً قبول کر لیا۔ طے ہوا کہ دونوں جوان چاند کی پہلی تاریخ کو شاہ مراد کے عرس پر آپس میں مقابلہ کریں گے۔ لٹھ بازی کے اس مقابلے کا فیصلہ لٹھ بازی کے مشہور استاد بابا نور دین نے کرنا تھا اور مقابلے کے لئے انہیں خاص طور سے گجرات سے بلایا گیا تھا۔

یہ ساری تفصیلات شانی کے لئے حیران کن تو تھیں لیکن غیر متوقع نہیں تھیں۔ وہی کچھ ہو رہا تھا جس کے اندیشے وہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔ یہ صورت حال کر بناک تھی کہ اس کا شوہر اور بھائی تصادم کے راستے پر چل نکلے ہیں۔

دفعتاً وہ بڑی طرح چونک گئی۔ اسے ایک جیب کے انجن کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ آواز اس نے پہلے بھی سنی تھی۔ نارپور کی حویلی میں یہ آواز کئی بار اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی اور جب بھی ٹکرائی تھی اس کے دل و دماغ کو ایک طرح کی کپکپی سے دوچار کر گئی تھی۔ یہ فاخر کی جیب تھی۔ خون شانی کی رگوں میں سنسناتا تھا۔ خوف، شرم، خوشی، پریشانی، ایک ساتھ کئی طرح کی کیفیتیں اس نے محسوس کیں۔ وہ تیزی سے کھڑکی کی طرف گئی۔ اس نے دیکھا فاخر اپنے دو محافظوں کے ساتھ سیاہ جیب سے اتر رہا ہے۔ کھڑکھڑتی سفید شلوار قمیص، پاؤں میں اونچی نوک کا کھسہ، واسٹ اور ہاتھوں میں چمکتی ہوئی انگشتیاں۔

شانی یہ سوچ کر کانپ گئی کہ اگر اس وقت عادل گھر میں ہوتا تو کیا ہوتا..... یقیناً وہ فاخر کو حویلی میں قدم نہ رکھنے دیتا۔ شاید فاخر آیا ہی اس لئے تھا کہ اسے عادل کے موجود نہ ہونے کی خبر تھی۔

سیکنہ نے شانی کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ”لے آ گیا تیرا جوگی۔ مجھے پتا تھا وہ تیرے بغیر زیادہ دیر نہیں رہ سکے گا۔“

شانی اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کی سانسوں کی لے تیز ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اباجی کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ ملازمہ نے شانی کو بتایا کہ چوہدری صاحب (فاخر) بھی وہیں موجود ہیں۔

شانہ کچھ دیر تک اپنے حواس پر قابو پاتی رہی پھر اس نے بالوں میں کنگھی پھیری، لباس درست کیا، اوزھنی لی اور لرزاں قدموں سے اباجی کے کمرے میں چلی گئی۔ ”السلام علیکم!“ اس نے فاخر کو سلام کیا۔

بھاری بھر کم آواز میں جواب ملا اور تیز و تند نگاہوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہی جسم اور روح کو چھیدتی ہوئی اجنبی نگاہیں۔ وہ پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

فاخر سی لہجے میں چوہدری ارشاد کی خیر خیریت دریافت کر رہا تھا۔ چوہدری ارشاد کی آنکھوں میں نمی چکنے لگی۔ شاید داماد کی طرف سے کی جانے والی اس مزاح پر کسی کو وہ بہت بڑی مہربانی سمجھ رہے تھے۔

شانہ جانتی تھی کہ اب اباجی نار پور میں پیش آنے والے واقعے پر معذرت کا اظہار شروع کر دیں گے اور اس بات پر تاسف کا اظہار کریں گے کہ عادل کے ہاتھوں سے مہرجی کے چہیتے ملازم کو گولی لگ گئی۔ ایسا ہی ہوا اباجی نے نادم لہجے میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو انہوں نے خط میں لکھا تھا۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی پشیمانی کے کئی فقرے ان کی زبان سے ادا ہوئے۔ فاخر ایک مہیب خاموشی کے ساتھ سنتا رہا اور بس دو تین بار سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ شکر کا مقام تھا کہ اباجی نے خط کی بات نہیں کی۔

تھوڑی دیر بعد چچا رئیس اور پچھو آمنہ بھی آ گئے۔ سب فاخر سے دبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ چائے بھی تناؤ کے ماحول میں ہی پی گئی۔ ادھر ادھر کی رمی باتیں ہوتی رہیں۔ فاخر کے چہرے پر سفر کی گرد تھی۔ وہ قدرے تھکا ہوا بھی نظر آتا تھا۔ چوہدری ارشاد نے کہا۔ ”بیٹا جاؤ تھوڑی دیر آرام کرو پھر نہادھو لینا اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔“

شانہ فاخر کو لے کر کمرے میں آ گئی۔ اس کا دل سینے میں چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے وہ سارے ناگوار لمحے یاد آ گئے تھے جن کا تعلق فاخر کی قربت سے تھا۔ بوجھل سانس، رخساروں پر چہیتے ہوئے کانٹے اور ایک بالوں بھرا جسم جس کی نسبت ایک ناگوار وزن سے تھی۔ روندنا اور پکھلتا ہوا وزن۔ دل میں کراہت سی جا گئے لگی جسے شانہ نے بمشکل دبایا۔

”کیسا حال ہے تمہارا؟“ فاخر نے پوچھا۔

”بس ٹھیک ہوں۔ پچھلے دنوں اباجی کی وجہ سے بہت پریشان رہی ہوں۔“

”یہ تو ظاہری سی بات ہے۔“ فاخر نے کہا۔ لہجے میں طنز کی ہلکی سی چھین بھی تھی۔

شانہ اس چھین کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا آپ مجھے لے جانے کے لئے آئے ہیں؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ تم جانا چاہتی ہو؟“

”مجھے تو جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ لال..... لیکن.....“

”لیکن تمہیں عادل کا ڈر ہے۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا ایسا ہی ہوگا۔ بہر حال تم گھبراؤ مت۔ میں بھی تمہیں ایسے نہیں لے جاؤں گا۔ اس

وقت لے جاؤں گا جب یہ لوگ خود تمہیں میرے پاس بھیجیں گے۔“ فاخر کا لہجہ بظاہر نرم تھا مگر اس کی تہہ میں چھپی ہوئی دھمکی آمیز حرارت محسوس کی جاسکتی تھی۔

”آپ بات کو بڑھانے کی کوشش نہ کریں۔ عادل آپ کے لئے اچھے خیالات رکھتا ہے۔“

”وہ رکھے گا۔ اسے رکھنا پڑیں گے۔ ابھی اس کے سر میں دو چار کیڑے ریگ رہے ہیں۔ یہ کیڑے جھڑ جائیں گے تو ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اور میرے خیال میں اس کا ایک کیڑا تو اسی ہفتے میں جھڑے گا۔“

شانی سمجھ گئی کہ فاخر لٹھ بازی کے مقابلے کی بات کر رہا ہے۔

”فاخر! میں جو باتیں سن رہی ہوں وہ مجھے پشیمان کر رہی ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ شاہ مراد کے عرس پر لٹھ بازی کے مقابلے ہوں گے اور ان میں آپ اور عادل بھی لڑیں گے۔“

”اس لڑائی کی دعوت میں نے نہیں، اس نے دی تھی۔ پورے نار پور کے سامنے اس نے دعویٰ کیا ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں توڑ کر چار پائی پر ڈالے گا۔“

”خدا کے لئے فاخر! خدا کے لئے ایسی باتیں مت کریں۔ یہ بڑی اگلیا باتیں ہیں۔ اس طرح تو ہم خود اپنے آپ کو متا شایا بنیں گے۔ اس تما شے کو شروع ہونے سے پہلے روک دیں۔“

”تماشا تو بہت سال پہلے شروع ہو گیا تھا۔“ فاخر نے زہر خند لہجے میں کہا اور تیز قدموں سے ہاتھ روم کی طرف چلا گیا۔

جب تک فاخر ہاتھ روم میں نہاتا رہا، شانی بے قراری سے کمرے میں ٹہکتی رہی۔ اسے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا تھا کہ کہیں عادل واپس نہ آجائے۔ اس کے آنے کا امکان نہیں تھا پھر بھی اندیشہ آنا گھمبیر تھا کہ وہ اسے اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پاری تھی۔ وہ آجاتا اور فاخر کو اس حویلی کے داماد کی حیثیت سے یہاں دندنا تے پاتا تو یقیناً اپنے غضب پر قابو نہ رکھ سکتا۔

فاخر قریباً تین گھنٹے تک حویلی میں موجود رہا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی شانی اور چوہدری ارشاد کے ساتھ کھایا، پھر وہ رخصت ہو گیا۔ اس نے شانی کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات نہیں کی تھی اور یہ ایک طرح سے ان کے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ اگر وہ شانی کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کرتا تو شانی کے والد دونوں چچا اور پھوپھو سخت غمخیز ہو جاتے۔ شانی کو اپنے ساتھ لے جانے والا معاملہ اب اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ ماہ و سال کا پردہ چاک ہو گیا تھا اور اس کے عقب میں چھپا ہوا دشمنی کا عفریت کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ فاخر ایک داماد کی حیثیت سے اس حویلی میں آیا ہوتا تو وہ یہاں کے ذرے ذرے کو اپنے استقبال پر مائل دیکھتا لیکن وہ داماد سے زیادہ ایک دشمن کی حیثیت سے یہاں آیا تھا۔ شانی کو یہ بتانے آیا تھا کہ وہ اس کے بھائی کی اکڑ اور اس کے گھمنڈ کو خاک میں ملائے گا۔ وہ نہ صرف جسمانی نقصان کی بات کر رہا تھا بلکہ مالی لحاظ سے بھی عادل اور پوری فیملی کو دھچکے پہنچا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے دادا کی دیرینہ تمنا پوری کرتے ہوئے وہ چوہدری ارشاد کی فیملی سے دشمنی چکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔

اگلے روز عادل واپس آ گیا۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ فاخر کی حویلی میں آمد اس سے چھپی نہ رہ سکے گی۔ شانی نے سوچا کہ وہ خود ہی مناسب

طریقے سے اسے بتادے۔ اباجی سوئے ہوئے تھے۔ شانی بھائی کو حویلی کی چھت پر لے گئی اور سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔ حسب توقع عادل کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔ ”شانی! وہ یہاں داماد کی حیثیت سے نہیں دشمن کی حیثیت سے آیا تھا اور اگر آئندہ بھی آیا تو اسی حیثیت سے آئے گا۔ میں اسے اس حیثیت سے یہاں نہیں آنے دوں گا۔ خود مر جاؤں گا..... یا.....“

”خدا کے لئے بھائی۔ ایسی باتیں مت کرو۔“ شانی نے اپنے ہاتھ سے عادل کے ہونٹوں کو بند کیا اور پھر سکنے لگی۔

☆=====☆=====☆

شانی نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ بس پھپھو آمنہ کے بے حد اصرار پر کچن کی روٹی کے دو لقمے لے کر ذرا سی لسی پی لی تھی۔ اس کا سینہ غم اور پریشانی سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی تکیلے بچوں والا جانور جیسے اندر ہی اندر اس کے دل کو زخمی کر رہا تھا۔ دو روز بعد چاند کی پہلی تاریخ تھی۔ شاہ مراد کے عرس پر لانچی کے مقابلے ہونے تھے۔ سب سے اہم مقابلہ دو جوان چوہدریوں کے درمیان تھا۔ نارپور کا چھوٹا چوہدری فاخر عرف فاخا اور رنگ والی کا چھوٹا چوہدری عادل۔ اس مقابلے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ دونوں چوہدری آپس میں سالہا بہنوئی بھی تھے۔ ایک طرف رشتے داری تھی۔ دوسری طرف دشمنی کی باتیں تھیں۔ لوگ الجھن کا شکار تھے کہ یہ کیسی رشتے داری اور کیسی دشمنی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ دشمنی پہلے تھی رشتے داری بعد میں ہوئی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ رشتے داری کے بعد دشمنی پیدا ہوئی ہے۔ رنگ والی اور نارپور کے لوگوں میں اس مقابلے کے حوالے سے خصوصی جوش پایا جاتا تھا۔ اپنے اپنے چوہدری کے بارے میں بلند و بانگ دعوے کئے جا رہے تھے اور نیک تمنائیں پالی جا رہی تھیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جب شانی اپنی پرانی ملازمتوں اور اس کی عیادت کر کے حویلی واپس آ رہی تھی اس نے فیضو حلوائی کی دکان کے پاس لوگوں کو باتیں کرتے سنا تھا۔ موضوع شاہ مراد کے عرس پر ہونے والا مقابلہ ہی تھا۔ بس دو چار اڑتے اڑتے فقرے ہی شانی کے کانوں میں پڑے تھے۔

فیضو حلوائی کہہ رہا تھا۔ ”کوئی مذاق نہیں ہے۔ پندرہ پنڈوں کی پگ ہے چوہدری عادل کے سر پر۔ مجھے تو پکا یقین ہے۔ یہ مقابلہ دو چار منٹ سے زیادہ نہیں چلے گا۔ چوہدری عادل کا ایک بھی سیدھا ہاتھ پڑ گیا تو فاخا صاحب زمین چاٹتے نظر آئیں گے۔“

کرامت تیلی نے کہا۔ ”تم دو چار منٹ کی بات کرتے ہو مجھے تو لگتا ہے پہلے ہلے میں ہی چوہدری فاخے کا سر کھلے گا۔ سنا ہے چوہدری فاخے کا کھبا ہتھ زیادہ چلتا ہے..... اور کچھ ہتھ والے کو تو اپنا چوہدری دو سیکنڈ میں تارے دکھاتا ہے۔“

شو کے پرچون والے نے مداخلت کرتے ہوئے رائے پیش کی۔ ”پریارو! اک بات سوچنے والی بھی ہے اور یہ بات تم کو بھی ماننا پڑے گی۔ ڈیل ڈول کے حساب سے چوہدری فاخا اپنے چوہدری پر بھاری ہے۔“

فیضو حلوائی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”شو کے ٹو بھی نراسائیں ہے۔ اوئے باگڑ بلے! یہ کوئی کشتی کا مقابلہ نہیں ہے۔ لٹھ بازی میں ڈیل ڈول سے زیادہ پھرتی کی لوڑ ہوتی ہے۔ ہتھ میں کرامات ہو تو عام سا بندہ بھی بھولو پہلوان کی بھنیریاں گھما سکتا ہے۔ ٹو دیکھ لینا پہلے ہلے میں نارپور کا پھنے خان لہولہان نظر آئے گا.....“

چادر میں لپیٹی ہوئی شانی اپنی پھپھو کے ساتھ آگے نکل گئی تھی۔ فیضو حلوائی کی دکان سے بلند ہونے والی آوازیں آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں۔

لوگ ہڈیاں ٹوٹنے اور لہولہان ہونے کی باتیں کر رہے تھے اور جن دو افراد کے بارے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں وہ دونوں اس کے اپنے تھے ایک پیارا بھائی تھا ایک سرکاسائیں تھا۔

اب وہ حویلی کے برآمدے میں ٹہل رہی تھی اور دو روز بعد عرس پر ہونے والی لڑائی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ لمبے ہو رہے تھے۔ دوپہر کی گرمی بتدریج چھاؤں اور ٹھنڈک میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ صحن میں ایک طرف گھاس کا قطعہ تھا۔ اس گھاس کی پرلی طرف سفید زرد اور سُرخ گلاب کے پھول تھے۔ ان پھولوں کو شانی نے بڑی محبت اور توجہ سے پالا تھا۔ شانی نے ملازمہ مختاری سے باسی روٹی منگوائی پھر وہ برآمدے کے گول ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چڑیوں کی طرف پھینکنے لگی۔ چھپھاتی چڑیوں کا روٹی کے ٹکڑوں پر جھپٹنا اور پھد کنا اسے بڑا اچھا لگتا تھا۔

کبھی وہ اپنی ماں کے ساتھ مل کر یہ نظارہ دیکھا کرتی تھی لیکن اب وہ اکیلی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی جب وہ پریشان ہوتی تھی اس طرح کے کاموں میں اسے بہت سکون ملتا تھا۔ چڑیوں کی طرف روٹی کے ٹکڑے پھینکنا بھی ایک معمولی سا عمل تھا لیکن اسے راحت محسوس ہو رہی تھی۔ پریشان کن خیالات کی طرف سے اس کا دھیان ہٹ رہا تھا۔ اچانک وہ بُری طرح چونک گئی۔ اس کی نگاہ دور گلاب کے پودوں کی طرف گئی۔ اسے ایک شخص نظر آیا۔ وہ بظاہر مالی دکھائی دیتا تھا۔ تہ بند اور قمیص پہنے وہ پاؤں کے بل پودوں کے پاس بیٹھا تھا اور کھرپے سے زمین کی گوڈی کر رہا تھا۔ شانی نے اس کا چہرہ دیکھا اور جسم سننا کر رہ گیا۔ یہ شخص اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ چند ہفتے پہلے وہ اس سے ملاقات کر چکی تھی۔

☆=====☆=====☆

ہنسپتالی شاعری

ہنسپتالی شاعری ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے پہلے انکی مزاحیہ شاعری کے تین کتابیں مظہر عام پر اچکی ہیں جس میں ”ہوئے ڈاکٹری میں رسوا، دوا بیچتے ہیں، گڑ بڑ گھوٹالہ“ شامل ہیں۔ ڈاکٹر مظہر عباس رضوی پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور انھوں نے اپنی شاعری میں ڈاکٹری سے وابستہ تجربات اور مشاہدات کو بہت خوبصورتی سے مزاح کے قالب میں ڈھالا ہے۔ **ہنسپتالی شاعری** کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **شاعری کے طنز و مزاح** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

لی کی وہ رات ابھی بھولی نہیں تھی۔ دروازے کا قفل دیکھنے کے لئے وہ بیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھی۔ بیڑھیوں کے نیچے والے کمرے میں اسے ایک اہولہان شخص نظر آیا تھا۔ وہ بس بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ شانی بے ساختہ آگے بڑھی تھی اور اس نے زخمی کو گرنے سے بچانے کے لئے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا تھا۔ یہ سارا واقعہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں شانی کے ذہن میں کوند گیا۔ آج کئی ہفتے بعد یہ شخص مختلف حلیے میں یہاں رنگ والی میں موجود تھا اور ملازم کی حیثیت سے حویلی میں نظر آ رہا تھا۔

شانی نے نگاہیں سیکڑ کر ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ اس کی نگاہ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ یہ وہی تھا..... یہ وہی تھا..... پھر اس نے گھر پا چلا تے چلا تے اپنا سر اٹھایا۔ چند لمحوں کے لئے دونوں کی نگاہ ٹکرائی۔ شانی جھرجھری لے کر رہ گئی۔ ہاں یہ وہی تھا..... اور یہ نگاہ بھی وہی تھی جس نے نارپور کی حویلی میں شانی کو سر تا پا دہلا دیا تھا۔ ایک جوگی کی سی نگاہ..... اپنے اندر بے پناہ گہرائی اور پوشیدہ راز سمیٹے ہوئے۔

شانی کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس شخص نے پھر سے سر جھکایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ قطعی لا تعلق اور بیگانہ نظر آنے لگا۔ شانی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ہتھیلی پر جمع ہو جانے والی روٹی کے بہت سے ٹکڑے چڑیوں کی طرف پھینکے اور کمرے کی طرف لپکی۔ وہ کچھ دیر تک اپنے آپ کو سنبھالنے اور نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے ملازمہ مختاری کو بلایا۔ وہ چولہے میں آگ جھونکتے ہوئے آئی تھی۔ اس کی آنکھیں دھوکے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ شانی نے اس سے پوچھا۔ ”وہ..... باہر جو بندہ گلاب میں گوڈی کر رہا ہے اسے جانتی ہو؟“

مختاری نے کہا۔ ”وہی خاکی دھوٹی والا جس کے بال لمبے لمبے ہیں؟“

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

مختاری بولی۔ ”وہ نیا ملازم ہوا ہے جی..... بابے فخری نے رکھا ہے اسے۔“

”کب ہوا ہے ملازم؟“

”ڈیڑھ دو ہفتے ہو گئے ہیں جی..... اچھا بندہ ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہے، مخنتی بھی بڑا ہے۔ پرسوں اس نے صرف ایک دن میں پچھواڑے کی ساری گھاس کاٹی ہے اور جمعے والے دن اکیلے ہی ڈیرے کی باغی صاف کی ہے۔ وہ پچھلا مالی ”ماجھو“ تو ایک غنڈا تھا جی..... اس کی آنکھ میں سؤر کا بال تھا۔ خبیث کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ یہ اچھا بندہ ہے نماز بھی پڑھتا ہے۔“

شانی نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا نام ہے اس کا؟“

”واحدی..... واحدی کہتے ہیں جی اسے“ میں نے ایک دن پوچھا تھا تو کہتا تھا رام پور سے آیا ہوں ویسا بولتا بہت کم ہے۔ دو چار دن تو میں بھی سمجھتی رہی کہ گوڈا ہے۔“ مختاری نے چند لمحوں تک وقف کیا پھر بولی۔ ”اگر آپ نے بات کرنی ہے تو میں اسے بلاؤں یہاں؟“

”نہن..... نہیں..... کوئی ضرورت نہیں۔“ شانی نے کہا۔

مختاری کے جانے کے بعد شانی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں پلپل سی مچ گئی تھی۔ یہ ہرگز اتفاق نہیں تھا کہ نارپور کے بعد یہ بندہ

یہاں حویلی میں نظر آیا تھا۔ شانی ایک حساس اور زیرک لڑکی تھی وہ اپنی طرف اٹھنے والی ہر نگاہ کا ہر زاویہ بھانپ سکتی تھی اسے وہ لمحے یاد تھے جب وہ نارپور کی حویلی میں اس شخص کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ وہ اپنی شدید تکلیف سے قطعی بے خبر دیوانوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ شانی کو اس کی نگاہ سے شدید جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی تھی لیکن یہ جھنجھلاہٹ اس درجے تک نہیں پہنچی تھی کہ طیش میں ڈھل جاتی..... آج بھی وہ جھنجھلائی ہوئی تھی مگر یہ کیفیت طیش یا شدید پریشانی میں نہیں ڈھلی..... پتا نہیں کیوں شانی کو لگ رہا تھا کہ یہ بندہ بے ضرر ہے کم از کم اسے اس بندے سے کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں تھا کہ وہ اس معاملے کو نظر انداز کر دیتی۔ اگر یہ شخص دانستہ طور پر اس حویلی میں داخل ہوا تھا اور ایک مالی کے روپ میں یہاں موجود تھا (وہ شکل و صورت سے ہرگز مالی نہیں لگتا تھا) تو پھر اس کا نوٹس لیا جانا ضروری تھا اور یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔

اسی دوران میں عادل آگیا۔ شانی کی توجہ عادل کی طرف مبذول ہو گئی۔ عادل کی ٹھوڑی پر نیل کا نشان دکھائی دے رہا تھا۔ شانی سمجھ گئی کہ اسے یہ چوٹ شاہو پہلوان کے ساتھ لٹھ بازی کی مشق کرتے لگی ہوگی۔ ”کہاں سے آرہے ہو بھائی؟“ شانی نے پوچھا۔

”شاہ مراد کے مزار سے، تایا معصوم ساتھ لے کر گئے تھے کہتے تھے وہاں منت مانی جاتی ہے۔ گاؤں کے کئی لوگ بھی ساتھ چل پڑے اچھا خاصا جلوس بن گیا۔“

”کیا منت مانی آپ نے؟“

”یہی کہ پرسوں مقابلے میں کامیابی ملے میں وہ برسوں پرانا قرض چکا سکوں جو ہمارے خاندان کے سر پر ہے اور جس کا طعنہ نارپور میں سننا پڑا تھا۔“

”اباجی کو تو ابھی کچھ نہیں بتایا؟“

”نہیں اور ابھی بتانا بھی نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کے دل پر کسی طرح کا بوجھ پڑے۔“

”اگر واقعی آپ ایسا کرنا چاہتے ہیں تو پھر یہ سب کچھ ختم کیوں نہیں کر دیتے؟ کیوں بات کو اتنا بڑھا رہے ہیں، کبھی لڑائیوں اور مقابلوں سے بھی کسی کا فیصلہ ہوا ہے؟“

”جو لوگ صرف لڑائی کی زبان سمجھتے ہیں، ان پر کوئی اور زبان اثر نہیں کرتی۔“

”اباجی کی طبیعت آج پھر گری ہوئی ہے۔ بلند پریش بھی بڑھا ہوا ہے۔“ شانی نے کہا۔

”اچھا میں دیکھتا ہوں ان کو..... تم جا کر ذرا بابے فخری کو سمجھا دو کہ اباجی سے ابھی مقابلے وغیرہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ میں نے بھی اسے تاکید کی تھی لیکن تمہیں پتا ہی ہے اباجی کے سامنے وہ سب کچھ فر فر بول دیتا ہے۔“

”اچھا میں ابھی بات کرتی ہوں اس سے۔“ شانی نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

عادل، چوہدری ارشاد کے کمرے کی طرف بڑھا تو شانی بابے فخری کو دیکھنے کے لئے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ وہ خود بھی بابے فخری

سے ملنا چاہتی تھی اور اس سے واحدی نامی شخص کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتی تھی۔ اسے اپنی حویلی میں دیکھنے کے بعد اس کا خیال ایک لمحے کے لئے بھی شانی کے ذہن سے نکلا نہیں تھا لیکن جب وہ بابے فخری کو ڈھونڈنے نکلے تو اسے پتا چلا کہ وہ تو ظہر کے بعد فوری طور پر اپنے گاؤں واقع کھاریاں چلا گیا تھا۔ وہاں اس کا بھائی شدید بیمار ہے۔

شانی رات بھر پریشان رہی۔ حالات تو پہلے بھی پریشان کن تھے لیکن اب ان میں ایک اور پریشانی بھی شامل ہو گئی تھی۔ اس کا تعلق اس شخص سے تھا جس کا نام ملازمہ نے واحدی بتایا تھا۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ کس لئے تھا؟ وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ کیا اسے اس بارے میں عادل یا چاچا مشتاق کو بتانا چاہئے؟ لیکن اس سے پہلے وہ بابے فخری سے تفصیل سے بات کرنا چاہتی تھی۔

امید تھی کہ بابا فخری شام سے پہلے پہنچ جائے گا لیکن فخری شام تک نہیں آیا۔ فخری کے بجائے ایک خبر پہنچ گئی، فخری کا بھائی فوت ہو گیا تھا۔ اگلے روز شاہ مراد کا عرس تھا۔ شاہ مراد کا مزار رنگ والی گاؤں سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کے باوجود علاقے کے بہت سے لوگ بسوں، ٹرالیوں اور موٹر سائیکلوں کے ذریعے عرس میں پہنچے تھے۔ اس دفعہ لوگوں میں اضافی جوش و خروش تھا اور اس کی وجہ وہ مقابلہ تھا جو نار پور اور رنگ والی کے دو جوان چوہدریوں کے درمیان ہونا تھا۔ عادل کے پُر زور اصرار پر چوہدری ارشاد سے یہ خبر ابھی تک چھپائی گئی تھی۔ وہ چونکہ بیماری کی وجہ سے اپنے کمرے تک محدود تھے اس لئے گھر والوں کو خبر چھپانے میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی اور پھر عرس کا دن پہنچ گیا۔ شانی صبح سے ہی گھبراہٹ سوار تھی۔ وہ اکھاڑے کی طرف سے آنے والی پُرشور آوازیں سن رہی تھی۔ عادل اور اس کے ساتھی آج منہ اندھیرے سے ہی لٹھ بازی کی مشق میں مصروف تھے۔ گاہے بگاہے بلند نعروں کی آواز بھی شانی کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اباجی کے کمرے کی طرف بھی نہیں گئی۔ اگر اباجی ان نعروں اور شور وغیرہ کے بارے میں پوچھتے تو جواب میں اسے جھوٹ بولنا پڑتا اور اباجی کے سامنے وہ جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

صبح آٹھ بجے کے قریب بس اور ٹرالیاں شاہ مراد کے مزار کی طرف روانہ ہو گئیں لیکن ابھی اس قافلے کو روانہ ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے موسم کے تیور بدل گئے۔ پہلے طوفانی آندھی آئی اس کے بعد گہرے تاریک بادلوں کے ساتھ تاربز توڑ بارش ہونے لگی۔ بارش کا سلسلہ ایک بار شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ شانی کو یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں امید کی کرن پیدا ہو رہی تھی۔ اس خراب موسم میں عرس کے انتظامات یقیناً درہم برہم ہو جانے تھے۔ ایسے میں لٹھ بازی کے مقابلے ہونے بھی بہت مشکل تھے۔

بارش سہ پہر تک جاری رہی اور پھر ایک معمولی سے وقفے کے بعد پھر شروع ہو گئی۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے عرس پر جانے والے زائرین اور تماشاگر واپس آنا شروع ہو گئے۔ عادل بھی واپس آ گیا۔ شانی کی بے تاب نگاہوں نے بھائی کے چہرے کا طواف کیا۔ عادل بالکل صحیح سلامت اور ٹھیک ٹھاک تھا۔ شانی کو معلوم ہوا کہ خراب موسم کی وجہ سے شاہ مراد کے عرس پر لٹھ بازی اور کبڑی وغیرہ کے مقابلے نہیں ہو سکے۔ اس کے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہو گئی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا یہ اطمینان عارضی ہے۔

اگلے روز ناشتے کے بعد شانی نے اپنے گلابوں کو پانی دیا اور پھر کمرے میں جا کر تھوڑی دیر کے لئے سو گئی۔ اسے ملازمہ مختاری نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ ”اٹھو بی بی..... اٹھو..... دیکھو باہر کیا ہوا ہے۔“

”کیا ہو رہا ہے؟“ شانی نے ہڑبڑا کر پوچھا اور سینے پر اوڑھنی کو درست کیا۔

”چوہدری فاخا صاحب آئے ہیں۔ ساتھ میں بہت سے لوگ ہیں پانچ چھ جھپیں ہیں، دوڑک بھی بندوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جوڑائی کل عرس میں نہیں ہو سکی تھی وہ آج یہاں حویلی کے سامنے میدان میں ہوگی۔“

شانے نے غور کیا تو اسے بھی باہر سے ہلکا شور سنائی دیا۔ نعروں کی آوازیں آرہی تھیں۔

”بھائی عادل کہاں ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”انہوں نے چوہدری فاخا کی بات مان لی ہے، وہ کہتے ہیں ٹھیک ہے کل بارش کی وجہ سے جو مقابلہ نہیں ہو سکا وہ آج ہوگا۔“

”اباجی کہاں ہیں؟“

”وہ کمرے میں سوئے ہوئے ہیں۔“

”تم سارے دروازے بند کرو۔ اب تک کوئی آواز نہیں جانی چاہئے۔“ مختاری اندرونی حصے کی طرف لپک گئی۔ اتنے میں شانی کو عادل کی جھلک نظر آئی۔ وہ ریوالور میں گولیاں بھرتا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ شانی تڑپ کر اس کے سامنے آگئی۔ ”کیا کر رہے ہیں بھائی؟“ وہ روہا نسی آواز میں بولی۔

”کچھ نہیں، بس اس خبیث سے دودو ہاتھ کرنے ہیں۔“

”لعل..... لیکن آپ تو گولیاں بھر رہے ہیں۔“

”یہ تو احتیاط کے طور پر ہے پاگلے!“

”خدا کے لئے بھائی! یہ تماشا نہ بنائیں۔“

”تماشا تو وہ بنا رہا ہے۔ اب اس تماشے کا انجام بھی بھگتنا پڑے گا اسے۔“ عادل شانی کو پیچھے ہٹاتا ہوا تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

شانے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھپھو آمنہ بھی ایک دم پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ اتنے میں حویلی کا پرانا ملازم خادم حسین آگے بڑھا۔ اس نے شانی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹی بی بی! آپ دل ہولانہ کریں یہ کوئی لڑائی تو نہیں ہے، جوانوں کا کھڈ ہے ابھی تھوڑی دیر میں فیصلہ ہو جائے گا۔“

شانے اسے کیسے بتاتی یہ تو وہ کھڈ ہے جس کا فیصلہ پچھلی پون صدی میں نہیں ہو سکا۔ اب یہ کھڈ خون کی کھڈ بن چکی ہے۔

دس پندرہ منٹ مزید گزرے پھر حویلی کے سامنے میدان سے بلند ہونے والے نعروں کی آواز واشگاف ہو گئی۔ شانی کا دل پھڑپھڑا رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کا شوہر ایک عقاب ہے اور اس کا بھائی ایک چکور کی طرح اس کے پنجوں میں جکڑا جانے والا ہے۔

شور بلند ہو گیا تو شانی پھپھو آمنہ، صغرا اور مختاری وغیرہ دوڑ کر حویلی کی چھت پر چلی گئیں۔ یہاں سے نیچے میدان کا منظر ہیجان خیز تھا۔ ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں سینکڑوں لوگ جمع تھے اور ان کے درمیان دونوں چوہدری چمکدار لٹائیاں سونٹے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے

تھے۔ ان کے چہرے متمارہ تھے اور آنکھوں میں شعلوں کی لپکتھی۔ دونوں نے پاؤں کھولے ہوئے تھے۔ ان کے کندھے آگے کی طرف جھکے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے پر پہلا وار کرنے کے لئے موقع کے منتظر تھے۔

دو ڈھولچوں نے اندھا دھند ڈھول بجانا شروع کر دیے۔ ڈھولوں کی دھمک دلوں کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر قیامت خیز ہو گئی۔ پہلا وار عادل نے ہی کیا تھا۔ فائے نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر یہ وار اپنی ترجیحی لائھی پر لیا۔ پھر دوسرا وار بھی اس نے اسی طرح روکا، تیسرا وار اس نے جھک کر بچایا۔ لائھی اس کے توانا کندھے سے پھسل کر زمین پر لگی۔ اس کے ساتھ ہی فائے نے جوابی حملہ کیا۔ لائھیاں ٹکرانے کی آواز دور دور تک گونجی۔ فائے کے حملے میں بے حد شدت تھی۔ چند لمحوں کے لئے تو عادل ڈگمگا تا محسوس ہوا مگر جلد ہی وہ سنسنبھل گیا۔ تماشائیوں نے حوصلہ افزائی کے لئے نعرے بلند کئے۔ شانی کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ اس کا بھائی فاخر کے لئے ترنوالہ نہیں ہے۔ مہارت اور طاقت میں وہ شاید فاخر سے تھوڑا سا کم ہو مگر حوصلے اور جذبے میں وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اگلے تین چار منٹ میں رنگ والی اور نار پور کے سینکڑوں تماشائیوں نے لٹھ بازی کا یادگار مظاہرہ دیکھا۔ بڑھکوں، نعروں اور للکاروں کے شور میں دونوں چوہدری ڈٹ کر ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ذرا سی کمزوری دکھانے کو تیار نہیں تھا۔ عادل کے جبرے اور سر پر چوٹ آئی تھی۔ سر سے خون رسنے لگا تھا۔ چوہدری فائے کے منہ پر لائھی لگی تھی۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ایک آدھ دانت بھی ٹوٹ گیا ہے۔ شانی ایک طرف اپنے بھائی کے لئے ہمدردی محسوس کر رہی تھی اور دوسری طرف اپنے شوہر کے لئے لیکن یہ بات واضح تھی کہ بھائی کی ہمدردی میں شدت ہے۔ وہ اسے ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ کیونکہ اس کی ہار کے ساتھ اس کے ابا جی، اس کے چچاؤں اور اس کے خاندان کی ہارتھی۔ اچانک شانی کی نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ ہجوم کے درمیان وہ سب سے جدا نظر آ رہا تھا کیونکہ وہ لڑائی کے ان نازک ترین لمحات میں بھی لڑائی کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ شانی کی طرف متوجہ تھا۔ وہ منہ اٹھا کر یک نکل چھت کی منڈیر کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں شانی دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھی..... یہ وہی تھا جس نے کئی روز سے اسے الجھن میں ڈال رکھا تھا۔ اندیشوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس کا نام مختاری نے واحدی بتایا تھا۔ وہ آج کل مالی کی حیثیت سے اس حویلی میں موجود تھا۔

ایک ناگوار احساس کے ساتھ شانی نے اس کی طرف سے توجہ ہٹائی۔ میدان کے بیچوں بیچ اب فیصلہ کن مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ فاخر کے حملوں میں شدت آگئی تھی اور عادل پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اچانک شانی کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے واضح طور پر محسوس ہوا کہ عادل تھکا ہوا نظر آ رہا ہے۔ فاخر کے حامیوں کے نعرے فلک شکاف ہو رہے تھے۔ ”یا اللہ میرے بچے کی مدد کر۔“ چھو آ منہ کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

کچھ ایسی ہی دعا اپنے بھائی کے لئے شانی کے ہونٹوں سے بھی نکل رہی تھی..... رنگ والی کے تماشائی دم بخود نظر آنے لگے تھے۔ ڈھولچوں کے ہاتھ ڈھول پر ڈھیلے پڑنے لگے۔ اچانک عادل کے ہاتھ سے لائھی نکل گئی۔ چند کارشاموں اور ککوں والی لائھی ایک لمحے کے لئے فضا میں تیرتی ہوئی نظر آئی پھر میدان کے وسط میں جا گری۔ نار پور کے تماشائیوں نے فلک شکاف نعرہ بلند کیا۔ ایک سیکنڈ کے لئے تو یوں محسوس ہوا کہ لڑائی کا فیصلہ ہو گیا ہے مگر رنگ والی کے چوہدری نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ اس نے دو تین قدم بھاگ کر چھت کی طرح جست بھری اور اپنی لائھی کے

اوپر گرا۔ اس سے پہلے کہ حریف کی لاشی اس کے سر کو چھوتی، وہ ایک بار پھر لاشی سمیت اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ رنگ والی کے سینکڑوں تماشاویوں میں ایک بار پھر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ عادل چوکھی لڑائی کے انداز میں لاشی کو چاروں طرف گھماتا ہوا چوہدری فائے پر حملہ آور ہوا۔ چوہدری فائے کو ایک دوخت چوٹیں لگیں اور وہ لڑکھڑا گیا۔ رنگ والی کے تماشائی خوشی سے ناچنے لگے۔ تاہم اسی دوران میں چوہدری فائے نے ایک وار کیا۔ یہ چوٹ عادل کے دائیں کندھے پر لگی۔ اس کے بعد عادل سے سنبھلا نہیں گیا۔ مزاحمت کی ہر کوشش بھرے ہوئے چوہدری فائے نے ناکام کر دی۔ عادل پیچھے ہٹا گیا۔ پھر فائے نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر ایک ایسا زوردار وار کیا کہ عادل کی لاشی نہ صرف درمیان سے دو ٹکڑے ہو گئی بلکہ وہ خود بھی گر گیا۔

رنگ والی کے تماشاویوں کو سانپ سونگھ گیا۔ نارپور کے لوگ فلک شکاف لاکاریں بلند کرنے لگے۔ فاخا غصے میں نیم پاگل ہو رہا تھا۔ وہ گرے ہوئے چوہدری عادل پر بے رحمی سے وار کر رہا تھا۔ ان چوٹوں سے بچنے کے لئے عادل مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا لیکن امان کہیں نہیں تھی۔ ایک دو بار اس نے فائے کی بے رحم لاشی پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن بری طرح ناکام رہا۔ گاؤں والوں کے لئے یہ منظر بڑا دردناک تھا۔ غالباً ان میں سے ہر ایک کی خواہش اب یہ تھی کہ مقابلہ روک دیا جائے اور اصولی طور پر اب مقابلہ روک دیا جانا چاہئے تھا لیکن طیش میں دیوانہ چوہدری فاخا..... اپنے مفتوح کولہولہان کرتا چلا جا رہا تھا۔

”ہائے کوئی ہے جو اس کو روکے۔“ پھپھو آمنے نے چیخ کر کہا۔

”بھائی بھائی۔“ شانی بھی چیخ پڑی۔

چھت پر موجود دیگر رشتے دار خواتین اور ملازمائیں بھی واویلا کرنے لگیں۔ اچانک شانی نے کسی کو تیر کی طرح فاخا اور عادل کی طرف جھپٹے دیکھا۔ یہ کوئی اور نہیں وہی پراسرار شخص تھا جو واحدی کے نام سے اس حویلی میں موجود تھا۔ وہ عادل اور فاخر کے درمیان آ گیا۔ فاخر کی بے رحم لاشی کے دو تین وار اس نے اپنے ہاتھوں پر روکے۔ اسی دوران میں کئی اور لوگوں کا سکتہ بھی ٹوٹ گیا۔ ان میں چچا مشتاق اور خادم حسین وغیرہ بھی تھے۔ یہ لوگ فاخر کو عادل سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

نارپور والوں نے اس مداخلت کو غلط معنوں میں لیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید چوہدری فائے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ چوہدری فائے کا دفاع کرنے کے لئے اس کی طرف جھپٹے۔ چند سیکنڈ کے اندر چالیس پچاس افراد میں گھسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ لاشیاں اور کلباڑیاں چلنے لگیں جو کمزور دل تھے وہ چیخنے ہوئے تتر بتر ہونے لگے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ لوگوں کے بھاگتے قدموں سے گرد کے بادل اٹھنے لگے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ عادل کہاں ہے اور فاخا کہاں۔

دفعہ شانی کی نگاہ اپنے بائیں طرف اٹھی اور وہ سکتے میں رہ گئی۔ ابا جی نیچے بالکونی میں کھڑے تھے اور ایک ٹک میدان کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کا زرد چہرہ دیکھ کر ہی شانی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کئی منٹ سے یہاں موجود ہیں اور انہوں نے فاخر کے ساتھ عادل کی لڑائی اور شکست کا سارا منظر دیکھ لیا ہے۔ وہ چھت سے نیچے اتری اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتی ہوئی بالکونی میں پہنچ گئی۔

اسے لگا کہ اباجی بس گرنے ہی والے ہیں اس نے انہیں سہارا دیا۔ اباجی کا سارا وجود لرز رہا تھا وہ انہیں اندر کمرے میں لے آئی اور بستر پر لٹا دیا۔ میدان سے اُبھرنے والی چیخ و پکار کی آوازیں حویلی کے در و دیوار کو لرزاتی تھیں۔ اسی دوران میں میگا فون پر ایک بھاری بھر کم آواز گونجی۔ ”خبردار..... سب اپنے ہتھیار پھینک دیں خبردار پیچھے ہٹ جائیں سب لوگ۔“

شانی سمجھ گئی کہ پولیس حرکت میں آگئی ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہوائی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً فائرنگ بھی پولیس کی طرف سے تھی۔ اباجی کی حالت بگڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ شانی ان کی دیکھ بھال میں لگی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ دو منٹ بعد ملازمہ انوری بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ اس سے پہلے کہ شانی اسے کوئی بُری خبر دینے سے روکتی وہ چلا کر بولی۔ ”بی بی جی..... چھوٹے مالک کو چھری لگ گئی ہے وہ لہو لہان ہو گئے ہیں۔“

چھوٹے مالک کا خطاب شانی کے چہیتے چچا مشتاق کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ شانی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کبھی وہ ہانپتے کا پنتے اباجی کی طرف دیکھتی تھی کبھی ملازمہ انوری کی طرف۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ احمق انوری کو دھکے دے کر کمرے سے نکال دے اور سارے دروازے کھڑکیاں بند کر دے۔ کچھ ایسا کرے کہ باہر کی کوئی آواز اس کمرے تک نہ آ سکے لیکن شاید ملازمہ انوری بھی اتنی قصور وار نہیں تھی حالات ہی ایسے تھے کہ سب اپنی سُد بدکھو بیٹھے تھے۔

اباجی کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ شانی نے جلدی سے انہیں زبان کے نیچے رکھنے والی گولی دی اور ان کی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ تب وہ پھپھو آ منہ کو آوازیں دینے لگی پھپھو آ منہ کمرے میں پہنچیں تو وہ انہیں اباجی کے پاس چھوڑ کر حویلی کے صدر دروازے کی طرف لپکی۔ وہ اپنے بھائی کو دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے چاچا مشتاق کو..... اور اپنے چاچا رئیس کو..... اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کس حال میں ہیں.....

نگلے سر بھاگتی ہوئی وہ ابھی صدر دروازے سے پندرہ بیس قدم دور ہی تھی کہ اسے چاچا رئیس نظر آئے۔ ان کے ساتھ دو مسلح پولیس والے بھی تھے۔ چاچا رئیس نے شانی کو ہانپوں میں روک لیا۔ ”نہیں بیٹی..... ابھی باہر نہیں جانا۔“

شانی رو رو کر ان سے بھائی عادل اور چاچا مشتاق کے بارے میں پوچھتی رہی۔ چاچا رئیس اسے سنبھالتے رہے اور بتاتے رہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا..... رنگ والی کے تھانیدار میاں مظفر کی ہدایت پر پولیس والوں نے حویلی کا صدر دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد شانی کو پتا چلا کہ چاچا مشتاق کو چھری کا کاری زخم لگا ہے۔ انہیں شدید زخمی حالت میں ہسپتال روانہ کر دیا گیا ہے۔ اس بلوے میں کم از کم دس افراد مزید زخمی ہوئے تھے کچھ کولائیٹوں کے اور کچھ کو تیز دھار آلوں کے زخم آئے تھے۔ عادل کو بھی سخت چوٹیں آئی تھیں لیکن وہ گاؤں میں ہی تھا۔

چوہدری ارشاد سیکھے پر سر رکھے گم صم لیٹے تھے۔ ان کی حالت ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ دل کے ایک اور دورے سے بچ گئے تھے۔ آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر بڑی خاموشی کے ساتھ ان کے کانوں کی طرف بہہ رہے تھے۔ شانی ان کے پاس بیٹھی آہستہ آہستہ

ان کی ہتھیلی سہلارہی تھی۔ چوہدری ارشاد نے دُکھی لہجے اور نہایت مدہم آواز میں کہا۔ ”کتنا اچھا تھا کہ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا، میں نے عادل کو کتنا منع کیا لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ اس نے نافرمانی کی۔“

شانی بس اتنا کہہ سکی۔ ”اباجی! آپ بالکل نہ بولیں۔ آپ کے دل پر بوجھ پڑے گا۔“

وہ سنی اُن سنی کرتے ہوئے بولتے رہے۔ ”مجھے سب پتا ہے میں جانتا ہوں۔ اس نے میرا لکھا ہوا خط بھی نار پور پہنچنے نہیں دیا۔ اس نے تمہیں بھی زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ غصے کو غصے سے ختم نہیں کیا جاسکتا..... دشمنی کو دشمنی سے مٹایا نہیں جاسکتا۔“

چوہدری ارشاد بار بار اپنے بھائی چوہدری مشتاق کی حالت کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ان کی حالت کے بارے میں شانی کو خود پتا نہیں تھا وہ انہیں کیا بتاتی۔ وہ لاہور کے میوہسپتال میں تھے۔ چاچا رئیس بھی وہیں تھے اپنی مرہم پئی کروا کے عادل بھی ان کے پیچھے لاہور روانہ ہو گیا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے با بے فخری نے شانی کو بتایا تھا کہ جس بندے نے لڑائی کے دوران میں چاچا مشتاق پر چھری سے وار کئے اسے پولیس نے موقع پر ہی گرفتار کر لیا تھا۔ اب وہ رنگ والی تھانے کی حوالات میں تھا۔ اس کے علاوہ بھی پولیس نے دونوں طرف کے کم از کم بیس بندے گرفتار کئے تھے۔

☆=====☆=====☆

کسی دایار نہ وچھڑے

قیمت: 200

رُخ چوہدری

داسی ڈھولن پار دی

قیمت: 400

فائزہ افتخار

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

کہانی پوچھو تم

قیمت: 225

فرزانہ آغا

اک عمر کے طلسم میں

قیمت: 200

ہما کو ب بخاری

اسی طرح چار پانچ دن مزید گزر گئے۔ یہ چار پانچ دن شانی اور اس کے اہل خانہ نے کرب کے دریا میں بہتے ہوئے گزارے۔ چاچا مشتاق بدستور ہسپتال میں تھے ان کے پیٹ کا ایک آپریشن بھی ہو چکا تھا۔ تقریباً ایک درجن بوتل خون انہیں دیا جا چکا تھا۔ ان کی حالت بظاہر خطرے سے باہر تھی لیکن ڈاکٹر ابھی پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔

بادی النظر میں یہ واقعہ فوری اشتعال کا لگتا تھا بلوے کے دوران جب آزادانہ کلباڑیاں اور چاقو چل رہے تھے نار پور کے ایک شخص نے چوہدری مشتاق کے پیٹ میں چھر اگھونپ دیا تھا۔ اس مہلک وار نے ان کی کئی انتڑیاں کاٹ ڈالی تھیں اور اندرونی اعضا زخمی کئے تھے۔ حملہ آور کو فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا تھا۔

چوہدری فاخر نے اعلان کیا کہ حملہ آور سے اس کا اور اس کے کسی عزیز کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ پولیس نے پوچھ گچھ کے بعد چوہدری فاخر اور اس کے دو ساتھیوں کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ شانی کو معلوم ہوا تھا کہ کل رات فاخر ہسپتال میں چاچا مشتاق کی عیادت کے لئے بھی گیا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا گرمی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی نے لان کی پتلی سی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ اوڑھنی کو اچھی طرح اپنے جسم پر درست کرتے ہوئے بالائی منزل کی طرف گئی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کام کرنے والی نے صفائی ستھرائی ٹھیک طرح سے کی ہے یا نہیں۔ بالائی منزل کے جھروکے سے اچانک اس کی نگاہ نیچے صحن کی طرف گئی۔ اسے واحدی نظر آیا۔ پچھلے چار پانچ دن سے حالات اتنے اترتے تھے کہ وہ اس شخص کو بالکل بھولی ہوئی تھی اسے یہ خیال بھی نہیں رہا تھا کہ وہ بابے فخری سے اس شخص کے بارے میں کچھ پوچھے۔ آج اسے مردانے حصے کے صحن میں دیکھ کر شانی کو بہت سی باتیں یاد آ گئیں۔ اسے یاد آیا کہ جب فاخر غصے اور جوش سے دیوانہ ہو رہا تھا اور نیچے گرے ہوئے عادل پر تار بڑ توڑ لائٹھیاں برس رہا تھا تو یہ واحدی نامی شخص ہی فاخر کے سامنے آیا تھا اور عادل کے جسم پر پڑنے والی لائٹھیاں اپنے ہاتھوں پر روکی تھیں۔

شانی نے جھروکے میں سے دیکھا وہ امرود کے پیڑ کے پاس بیٹھا کچھ کر رہا تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ شانی ٹھیک سے دیکھ نہیں پاری تھی چند سیکنڈ بعد جب وہ اٹھا تو شانی کو پتا چلا کہ وہ وضو کر رہا تھا۔ اس کے بازو کہنیوں تک بھیکے ہوئے تھے۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور لمبے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ وہ شانی کو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ پودوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا مگر ابھی پوری طرح اوجھل نہیں ہوا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ حویلی کے صدر دروازے سے باہر شور سنائی دیا تھا۔ دراصل گلی میں دوڑ کے جھگڑ پڑے تھے۔ ایک لڑکا دوسرے پر مکے برس رہا تھا اور غصے سے چیخ رہا تھا۔ شانی نے غور سے دیکھا تو وہ اس کا بھتیجا سفیان تھا۔ وہ اس کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا۔ عمر یہی کوئی بارہ سال رہی ہوگی۔ جھگڑے کی آوازیں سن کر واحدی گلی کی طرف لپکا۔ ایک اور ملازم بھی اس کے ساتھ تھا۔ گلی میں پہنچ کر واحدی نے دونوں لڑکوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔ سفیان اب بھی چلا رہا تھا اور لڑکے کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

شانی نے مختاری کو آوازیں دیں اور اسے کہا کہ وہ سفیان کو اوپر لے آئے۔

چند منٹ بعد لال بھبھو کا سفیان اس کے سامنے تھا۔ ”کیا ہوا تھا سفیان؟“ شانی نے ناراض لہجے میں پوچھا۔

سفیان بولا۔ ”وہی پٹواری کا لڑکا قادر تھا۔ خواہ مخواہ بکواس کر رہا تھا۔ کہتا تھا تمہارے چاچے عادل کی وجہ سے سارے گاؤں کی ناک کٹ

گئی ہے۔ چاچا عادل کوئی ہار تھوڑی تھا، وہ ٹھوکر لگنے کی وجہ سے گر پڑا تھا۔ اس کو کوئی ہارنا کہتے ہیں۔“

معصوم سفیان کے استدلال پر شانی کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اپنے چاچا کی ہار کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا اور یہ کیفیت..... صرف سفیان کی نہیں تھی وہ سب کے سب اس تکلیف دہ صورتِ حال کے لئے کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ رہے تھے۔

کسی کا خیال تھا کہ عادل ٹھوکر لگنے سے گرا۔ کوئی کہتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے لٹھی پھسل گئی۔ کسی کی سمجھ کے مطابق مخالف متاشائیوں میں سے کسی نے اسے دھکا دیا تھا، بہر حال یہ بڑی کمزور دلیلیں تھیں اور صرف دل کو سہارا دینے کے لئے تھیں۔ اصل اور سچی بات تو یہی تھی کہ عادل یہ لڑائی ہار گیا تھا۔ اس نے بھرپور مقابلہ کیا تھا مگر مقابلے میں بہر صورت کسی ایک کو تو شکست ہونا ہوتی ہے۔

ابھی ہار کا زخم تازہ تھا، کئی دن گزر چکے تھے پھر بھی شانی کو اس مقابلے کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا تھا یقیناً سفیان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کی بات برداشت نہیں کر سکا تھا اور اس سے الجھ پڑا تھا۔ شانی نے غمزہ سفیان کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور دلاسادیئے لگی۔ اسی دوران میں سکیئر اندر آ گئی۔ وہ بھی بہت افسردہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بیگی بیگی تھیں۔

کہنے لگی۔ ”ہمارے حصے میں رونا آیا ہے اور ان کے حصے میں ہاسے آئے ہیں۔ سنا ہے کہ نار پورو والوں نے اپنے جیتنے کی خوشی منائی ہے۔“

ناج گانا ہوا ہے..... اور ادھر شاہ مراد کے مزار پر چادریں چڑھائی گئی ہیں۔“

”تجھے کس نے بتایا ہے؟“

”اسی نے۔ وہ کل شام آیا ہوا تھا۔“ سکیئر نے ذرا دبے لہجے میں کہا۔

شانی سمجھ گئی کہ وہ منظور جٹ کی بات کر رہی ہے۔ منظور کے ساتھ سکیئر کا لپکا یا رنہ تھا۔ وہ ہر چھٹے ساتویں دن نار پور سے آ کر سکیئر سے مل جاتا تھا۔

جشن کی بات نے شانی کو مزید اداس کر دیا۔

چاچا مشتاق کی حالت بدستور خراب تھی۔ کسی وقت ہوش آ جاتا تھا اور لگتا تھا کہ وہ بہتر ہو جائیں گے لیکن مختصر افاقے کے بعد تکلیف پھر شدت اختیار کر جاتی تھی۔ اباجی کی بیماری کے پیشِ نظر ان سے چاچا مشتاق کی حالت چھپائی جا رہی تھی۔ اگلے روز شانی چاچا رئیس اور پچھو آمنہ کے ساتھ چاچا کی عیادت کے لئے لاہور پہنچی۔ وہ میوہ ہسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں تھے۔ جب شانی ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی تو اس نے بھائی عادل کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ دوائیں تھیں اور وہ زرد چہرے کے ساتھ بھاگا ہوا ہسپتال کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ چاچا رئیس نے اسے آوازیں بھی دیں لیکن وہ اتنا بدحواس تھا کہ اس نے کچھ سنا نہیں۔

عادل کو اس کیفیت میں دیکھ کر ہی پچھو آمنہ نے رونا شروع کر دیا۔ شانی کو بھی یوں لگا کہ اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ہے۔ گاڑی سے اتر کر وہ لوگ چاچا مشتاق کے کمرے کی طرف بھاگے۔ راستے میں جو بھی جان پہچان والا ملا اس کے چہرے پر ایک اندوہناک خبر کی سیاہ پرچھائیاں نظر آئیں۔ شانی کا دل چاہا کہ وہ وہیں رک جائے۔ آگے نہ بڑھے..... اگر وہ آگے بڑھی تو اس کی سماعت کو اور اس کی نگاہوں کو کسی قیامت سے

دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کے پاؤں منوں وزنی ہو گئے۔ وہ ہانپ کر رک گئی لیکن رکنے سے وقت تو نہیں رکتا، آنکھیں بند کر لینے سے اندوہناک خبریں تو تحلیل نہیں ہوتیں..... شانی کے پیارے چاچا مشتاق مر گئے۔ ہسپتال کا طویل برآمدہ درد بھری چیخوں اور آہ و بکا سے گونج اٹھا۔ جانے والا چلا گیا۔ آئی سی یو میں اس کا جسدِ خاکی مشینوں اور ٹالیوں میں جکڑا رہ گیا۔ اس کی روح نیلے آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔ اس کے عزیز ہسپتال کے فرش پر بچھاڑیں کھا کھا کر گر گئے۔

☆=====☆=====☆

شانی کے پیارے چاچا مشتاق کی موت شانی پر قیامت کی طرح گزر گئی۔ وہ کئی دن تک دن رات روتی رہی۔ تاہم پھر اسے خود کو سنبھالنا پڑا۔ اگر وہ خود کو نہ سنبھالتی تو اس کے ابا جی کو کون سنبھالتا۔ ابا جی کی حالت ٹھیک نہیں تھی، چھوٹے بھائی کی ناگہانی موت نے انہیں نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ دو دن کے لئے ”دل ہسپتال“ کا چکر بھی لگا آئے تھے۔

فاخر دو تین بار چوہدری ارشاد کی عیادت کو آچکا تھا۔ جب وہ آخری بار آیا تو اتفاقاً عادل بھی گھر میں ہی تھا۔ جب عادل نے سنا کہ فاخر آیا ہے تو وہ ایک دم آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ شانی سے مخاطب ہوا اور پھنکا کر بولا۔ ”چاچا کا اصل قاتل یہی ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا، یہاں سے اس کی لاش نار پور واپس جائے گی۔“

شانی نے بھائی کے پاؤں میں گر کر اسے روک لیا تھا۔ اپنی مری ماں کا واسطہ سننے کے بعد عادل کے پاؤں حرکت نہیں کر سکے تھے۔ شاید اس روز فاخر نے بھی صورت حال بھانپ لی تھی۔ وہ دوبارہ چوہدری ارشاد کی عیادت کو نہیں آیا تھا۔ عادل کا غیظ و غضب دیکھ کر اس روز شانی بہت غمزدہ ہوئی تھی۔ عادل کا یہ حد سے بڑھا ہوا غیظ و غضب ہی تھا جس کے سبب حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ ابا جی اور چاچا رئیس اور خود شانی نے عادل کو کتنا منع کیا تھا مگر وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے فارمولے پر عمل پیرا تھا۔ جہاں تک شانی کا اپنا خیال تھا وہ فاخر کو چاچا مشتاق والے معاملے میں زیادہ قصور وار نہیں سمجھتی تھی۔ لٹھ بازی کے مقابلے کے بعد اچانک ہی بلوے کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ تیس چالیس افراد تھے جو اندھاؤندہ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ اسی ہنگامے میں چاچا مشتاق کو چھری لگی تھی۔

اس حوالے سے ابا جی بھی شانی کے ہم خیال تھے۔ وہ قاتل کو سخت ترین سزا تو دلوانا چاہتے تھے لیکن اس حق میں نہیں تھے کہ قتل کے اس کیس میں فاخر یا اس کے اہل خانہ میں سے کسی کو نامزد کیا جائے..... چاچا رئیس کا بھی یہی خیال تھا۔ عادل کی رائے یکسر مختلف تھی۔ وہ اس کیس میں فاخر کو ملزم کی حیثیت سے نامزد کرنا چاہتا تھا۔ گھر کے اندر ہونے والی یہ کشمکش گھر سے باہر ہونے والی کشمکش کے علاوہ تھی۔

وہ ایک تاریک رات تھی۔ ایک ڈیڑھ بجے کا عمل ہوگا، ہر طرف سناٹا تھا۔ بس دور کہیں کھیتوں میں ٹریکٹر چلنے کی آواز آتی تھی یا گاؤں کے نواح میں آوارہ کتے شور مچاتے تھے۔ شانی ابھی جاگ رہی تھی پتا نہیں کیوں وہ ابا جی کی طرف سے ہر گھڑی فکر مند رہتی تھی۔ اب بھی وہ سونے سے پہلے ایک بار پھر ابا جی کے کمرے میں جھانکنا چاہتی تھی۔ لیپ کی روشنی میں ان کے سینے کا زیروم دیکھ کر اسے اطمینان ہو جاتا تھا۔

وہ پلنگ سے اٹھی، چکنے فرش پر ہنگے پاؤں چلتی ہوئی ابا جی کے کمرے کی طرف بڑھی، راہداری کے سرے پر موڑ مڑتے ہوئے اسے دہلی دہلی

آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں ڈرائنگ روم سے آرہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کا ایک بلب بھی روشن تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ عادل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں کوئی موجود ہے۔ شانی نے زنا نے مردانے حصے کی درمیانی حد پار کی اور اس کے قدم بے ساختہ ڈرائنگ روم کی طرف اٹھ گئے۔ رات کے اس پہر عادل کا ڈرائنگ روم میں موجود ہونا اس کے لئے سخت تجسس کا باعث تھا۔ اس نے ایک ادھ کھلی کھڑکی سے کان لگائے۔ اندر سے کھسر پھسرنائی دے رہی تھی۔ عادل اور شاہو پہلوان کی آواز وہ صاف پہچان گئی۔ گفتگو کے انداز نے شانی کو مزید چوکنا کر دیا۔ وہ ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر دائیں جانب والی کھڑکیوں کے پاس پہنچی۔ یہاں بھی اسے ایک ادھ کھلی کھڑکی مل گئی۔ اس نے کھڑکی سے کان لگائے۔ آوازیں واضح سنائی دیے لگیں۔

شاہو پہلوان کہہ رہا تھا۔ ”نمبردار امجد کل ہی سیالکوٹ سے آیا ہے ہو سکتا ہے کہ اس دفعہ شکار کا پروگرام نہ بنے۔“ ایک دوسرے شخص نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ میں بکواس کر رہا ہوں۔ یہ میں اپنے کانوں سے سن کر آ رہا ہوں کہ کل کا پروگرام پکا ہے“ چوہدری فاخاشام چھ سات بجے تک کٹھولی پہنچ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے وہ پہنچ جائے گا تو ہم بھی پہنچ جائیں گے۔“ عادل کی آواز آئی، لہجے میں عجیب سا زہر تھا۔
عادل کے ایک دوست کا لوملتانی کی آواز سنائی دی۔ ”اندازاً کتنے بندے ہوں گے“ ”نمبردار کے ڈیرے پر؟“
”یہی تو مزے کی بات ہے۔“ نامعلوم شخص نے کہا۔ ”نمبردار امجد کے علاوہ صرف اس کا دوست مستانہ ہوگا اور شاید ایک دو کارندے ہوں۔“

”ٹھیک ہے بھون دیں گے ان حرامزادوں کو بھی ساتھ ہی۔“ شاہو پہلوان نے اُجڑے لہجے میں کہا۔
”تُو زیادہ بر شیر بننے کی کوشش نہ کر۔“ نامعلوم شخص نے بے زاری سے کہا۔ ”ہمارا نشانہ بس نار پور کا بلی مار ہوگا..... ہاں اگر کوئی ہمارے رستے میں آئے گا تو دیکھ لیں گے۔“

کا لوملتانی کی آواز آئی۔ ”دوسری اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ عادل کو ہمارے ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔ تو عے کے وقت وہ کسی ایسی جگہ ہو جہاں سے گواہی مل سکے۔“
”کیسی گواہی؟“ شاہو نے پوچھا۔

”یہ گواہی کہ جس وقت خون ہوا عادل موقع پر موجود نہیں تھا وہ کسی اور جگہ اور لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔“
شانی سنائے کی کیفیت میں یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس کا دل سینے میں بے پناہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔
اگلے دو تین منٹ میں اس پر سب کچھ واضح ہو گیا۔ یہ اس کے ”سر کے سائیں“ کے قتل کا منصوبہ بن رہا تھا۔ شانی ہر روز اپنے بھائی عادل کی آنکھوں میں جو آگ بھڑکتے ہوئے دیکھتی تھی، اب وہ جوالا کھی بن گئی تھی اور کسی کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتی تھی۔ عادل اور اس کے دوست اس بند کمرے میں سگریٹ پھونک رہے تھے سرگوشیاں کر رہے تھے اور ایک خونی واردات کی تفصیلات طے کر رہے تھے۔ شانی کو لگا کہ وہ کچھ دیر مزید یہاں کھڑی رہی تو بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ وہ پلٹی اور لڑکھڑاتی ہوئی سی اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

رات گزر گئی۔ وہ اگلے روز دوپہر تک انگاروں پر لٹتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ عادل کو سمجھانا بھانا فضول تھا وہ جس راستے پر چل نکلا تھا اس سے واپسی بہت مشکل تھی۔ اگر وہ اباجی کو بتاتی تو وہ بھی کچھ نہ کر سکتے۔ النان کے بیمار دل کو مزید باؤ اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان کی بیماری ایسی تھی کہ ان کے لئے کسی طرح کا رسک نہیں لیا جاسکتا تھا۔ چاچا رئیس سے بات ہو سکتی تھی مگر شانی جانتی تھی کہ وہ بھی عادل کے سامنے بے بس ثابت ہوں گے۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ بدترین لمحات قریب تر آرہے تھے۔ دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔ جب شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے تیزی سے ایک فیصلہ کیا۔ اس نے سکیزنہ کو اپنے ساتھ لیا۔ دونوں نے بوسکی کی لمبی چادریں اوڑھیں اور حویلی سے نکل پڑیں۔ بظاہر وہ ہل کے طرف روانہ ہوئی تھیں۔ ہل پر ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں رنگ والی کی اکثر عورتیں خریداری کے لئے جاتی تھیں۔ بازار کے ساتھ جھنڈے شاہ کا مزار بھی تھا۔ یہاں دعائیں مانگی جاتی تھیں اور نوافل وغیرہ ادا کئے جاتے تھے۔

ہل پر پہنچنے کے بعد دونوں سہیلیاں لوکل بس پر سوار ہو گئیں۔ شانی نے سکیزنہ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ دونوں کٹھولی گاؤں جا رہی تھیں۔ کٹھولی گاؤں رنگ والی سے صرف دس بارہ کلومیٹر دور پڑتا تھا۔ بس زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے میں انہیں وہاں پہنچا سکتی تھی۔ وہ جس وقت رنگ والی سے روانہ ہوئی تھیں آسمان پر بادل موجود تھے لیکن یہ بادل ایسے نہیں تھے کہ بارش کا امکان ہوتا۔ شانی کا خیال بھی یہی تھا کہ موسم خراب ہونے کا کوئی امکان نہیں مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر گہری تاریکی چھا گئی اور گھن گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ آدھے گھنٹے کا سفر انہوں نے پون گھنٹے میں طے کیا۔ سڑک کٹھولی گاؤں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ وہ بس سے اتریں اور ایک دکان کے چھجے تلے کھڑی ہو کر بارش کم ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔ راہ گیر حسب معمول ان دونوں کو تفتیشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سکیزنہ نے کسمسا کر کہا۔ ”شانی میرا تو دل ہول رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

”کیسی گڑبڑ؟“ شانی نے پوچھا۔

”کچھ بھی ہو سکتا ہے، ویسے بھی اندھیرا پھیلنے لگا ہے شام ہو گئی تو گھر جانا مشکل ہو جائے گا۔“

شانی نے چادر کے اندر ہی اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولی۔ ”ابھی صرف ساڑھے تین بجے ہیں بادلوں کی وجہ سے اندھیرا لگ رہا ہے۔“

”پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔“

”جتنی دیر ہوگی اتنا ہی ڈر بڑھتا جائے گا۔ چلو چلتے ہیں نمبردار کے ڈیرے کی طرف۔“

”مگر بارش؟“

”یہ بارش رکنے والی نہیں ہے۔“ شانی نے کہا اور سکیزنہ کا بازو کھینچ کر اسے گلی میں لے آئی۔

دونوں بارش کی بوچھاڑوں سے بچتی بچاتی ڈیرے کی طرف بڑھنے لگیں۔ ڈیرا گاؤں سے باہر امرود اور جامن کے درختوں کے درمیان

واقع تھا۔ دس فٹ اونچی کچی دیواریں تھیں اس کے اندر کمرے بنے ہوئے تھے ویران سی جگہ تھی۔ بیرونی دروازے کے باہر چھوٹی داڑھی والا ایک چوکیدار نما شخص ٹہل رہا تھا۔ بارش میں بھیگی ہوئی دولڑکیوں کو آتا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ پروگرام کے مطابق سیکنہ آگے بڑھی اور اس نے چوکیدار نما شخص سے کہا۔ ”میں نمبر دار امجد سے ملنا چاہتی ہوں۔“

چوکیدار نے سر تا پا سیکنہ کو گھورا۔ اس کا چہرہ چادر کے گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ چوکیدار بولا۔ ”امجد صاحب تو نہیں ہیں لیکن تمہیں کیا کام ہے ان سے؟“

”بہت ضروری کام ہے اگر وہ نہیں ہیں تو ان کے دوست متانے صاحب کو بلا دیں۔“

”اچھا..... میں دیکھتا ہوں۔“ چوکیدار نے کہا اور اندر چلا گیا۔ دو چار منٹ بعد متانہ ان کے سامنے تھا۔ اپنے نام کے برعکس وہ شکل و صورت سے سنجیدہ اور معتبر نظر آتا تھا۔ اس کی مونچھیں گھنی تھیں اور اس نے بارش سے بچنے کے لئے سر پر چھتری تان رکھی تھی۔ وہ پہلے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

سیکنہ نے گھونگھٹ کی اوٹ سے کہا۔ ”میں آپ سے ایک بے حد ضروری بات کرنے آئی ہوں۔ یہ بات سراسر آپ کے فائدے میں ہے لیکن آپ مجھ سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ کہاں سے آئی ہوں اور کون ہوں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ آپ کا دوست چوہدری فاخر میرے لئے بھائی کی حیثیت رکھتا ہے۔“

”کیا تم چوہدری فاخر کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ اس مرتبہ متانہ کا لہجہ نرم تھا۔ سیکنہ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ”مجھے پتا ہے کہ بھائی فاخر آج شام یہاں ڈیرے پر آرہے ہیں۔ آپ انہیں یہ تاکید کر دیں کہ وہ آج رات یہاں نہ گزریں۔ ان کی زندگی کو بڑا سخت خطرہ ہے۔“

”کیسا خطرہ ہے؟“ متانہ چونک گیا۔

”بس یہ سمجھ لیں کہ کچھ لوگ ان کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ جس طرح میں آپ کو اطلاع دے رہی ہوں اسی طرح مجھے بھی ایک گمنام اطلاع ملی ہے۔ قسم کھا کر مجھے بتایا گیا ہے کہ آج رات ڈیرے پر بھائی فاخر کی جان لینے کی کوشش کی جائے گی۔ میں..... آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ آج بھائی کو یہاں نہ رہنے دیں۔“

”لیکن.....“

”میں آپ کو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی۔ میں گھر سے بتائے بغیر نکلی ہوں اب مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ اچھا خدا حافظ!“

متانہ تذبذب میں کھڑا تھا۔ بہر حال اس کے تاثرات سے ایک بات واضح تھی۔ وہ سیکنہ کی اطلاع کو بے حد سنجیدگی سے لے رہا تھا۔

بادلوں کی وجہ سے تاریکی ایک بار پھر گہری ہو رہی تھی۔ وہ دونوں واپس مڑیں اور پختہ سڑک کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بارش چند منٹ تھمنے کے بعد پھر زور و شور سے شروع ہو گئی تھی۔ موٹی موٹی بوندیں گر رہی تھیں۔ وہ دونوں شرابور ہو گئی تھیں۔ پانچ چھ منٹ کے اندر وہ نمبر دار امجد کے

ڈیرے سے کافی آگے نکل آئیں۔ بہر حال ابھی وہ پختہ سڑک سے نصف فرلانگ دور تھیں۔ اچانک شانی نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”سکینہ! مجھے لگ رہا ہے، کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہے لیکن..... تم پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔“

”ہائے میں مر گئی۔ کیا سچ کچ کوئی آ رہا ہے۔“ سکینہ نے سراپیمہ آواز میں کہا۔

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں ڈری سبھی اور سکڑی سمٹی چلتی رہیں۔ چند سیکنڈ بعد سکینہ نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا شانی! کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ وہ لوگ ہمارا اتنا پتا ضرور پوچھیں گے۔“

”اچھا تو دعا کر بس“ جلدی سے آجائے۔“

”بس کا بھی کیا پتا۔ اتنی تیز بارش ہو رہی ہے۔“

دونوں سڑک کنارے پینپل کے ایک درخت تلے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ سڑک پر پانی جمع ہو رہا تھا۔ آس پاس کی دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ ایک ریڑھے کا گھوڑا اچھینے اڑاتا ہوا ان کے پاس سے گزر گیا۔ ریڑھے پر چار پانچ کھیت مزدور ننگے سر بیٹھے تھے اور بارش کا مزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے بارش سے لت پت دو اکیلی لڑکیوں کو لپٹائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ اتنے میں شلوار قمیص والے دو بندے ان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے، وہ کن انکھیوں سے شانی اور سکینہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہ دونوں نمبردار کے ڈیرے سے ہی ان کے پیچھے آئے ہیں۔

اتنے میں ایک ادھیڑ عمر شخص سر پر چارے کا گٹھار کھے ان کے پاس سے گزرا۔ شانی نے اسے روکتے ہوئے پوچھا۔ ”چاچا! آخری بس کتنے بجے نکلتی ہے؟“

وہ گردن گھما کر بولا۔ ”دھیے! ابھی تھوڑی دیر میں بیج بجے والا ٹائم آئے گا۔ اس کے بعد آخری بس آئے گی چھ بجے۔ پر اب یہ دونوں بسیں ادھر نہیں آئیں گی۔ یہاں تو پانی کھڑا ہو گیا ہے۔ سڑک کا یہ ٹونا (ٹکڑا) بڑا ڈھونگا (نیچے) ہے۔ اب بس بچھلی چھوٹی سڑک سے گزرے گی۔“

ادھیڑ عمر شخص نے اپنی بائیں طرف جنت اور یکسر کے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چھوٹی سڑک درختوں کے پیچھے ہے۔

”بہت شکریہ چاچا۔“ شانی نے کہا اس کے بعد چادر کے اندر ہی اندر اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے میں دس پندرہ منٹ ہی رہ گئے تھے۔

شانی نے چند لمحے سوچا، پھر سکینہ کو ساتھ لیا اور درختوں کی طرف بڑھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے ارد گرد خطرہ منڈلا رہا ہے مگر ہمت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بارش ذرا ہلکی ہو گئی تھی لیکن بادل گہرے ہو گئے تھے۔ گہری شام کا سا منظر نظر آنے لگا تھا۔ دور مشرق کی طرف رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور گھڑ گھڑاہٹ سے قرب و جوار لرزے لگتے تھے۔ وہ چھوٹی سڑک تک پہنچنے کے لئے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئیں تو انہیں پتا چلا کہ یہ ایک قبرستان ہے۔ یقیناً یہ بہت پرانا قبرستان تھا۔ قبریں ٹوٹی پھوٹی تھیں اور ہر طرف ویرانی نظر آتی تھی۔ راستہ تنگ اور کچا تھا۔ وہ کچھ دیر میں پھسل پھسل جاری تھیں۔

”یا اللہ! یہ کس مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔“ سیکنہ نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

”حوصلہ کر سیکنہ۔ اللہ مدد کرے گا۔“ شانی نے ہما ہما کر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

”ہائے میں مر گئی۔ وہ پیچھے آرہے ہیں۔“ چند سیکنڈ بعد سیکنہ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

شانسی نے بھی گردن گھما کر دیکھا۔ ناگوں میں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ وہ دونوں بندے پیچھے آرہے تھے۔ شانی اور سیکنہ کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی۔ شانی کے ذہن میں ابھی تک امید کی کرن موجود تھی۔ وہ سوچ رہی تھی شاید وہ دونوں غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ دونوں بندے عام راہ گیر ہوں۔ ان ہی کی طرح بس میں سوار ہونے کے لئے چھوٹی سڑک کی طرف جارہے ہوں۔

بہر حال اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں شانی کی ہر خوش فہمی دور ہو گئی۔ وہ دونوں افراد تیزی سے چلتے ہوئے شانی اور سیکنہ کے قریب آ گئے پھر ان میں سے ایک نے بھاری بھر کم آواز میں کہا۔ ”بات سنو، کوئی یو!“

شانسی اور سیکنہ پہلے ہی بہت تیز چل رہی تھیں اب وہ بھاگ کھڑی ہوئیں۔ آس پاس کوئی تنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کسی کو مدد کے لئے پکارنا بے معنی محسوس ہوتا تھا۔ شانی اور سیکنہ کے بھاگتے ہی وہ دونوں بھی بھاگ پڑے۔ سیکنہ بے ساختہ چلا اٹھی۔ شانی نے اپنی خوف زدہ چیخ کو بے مشکل روک رکھا تھا۔ ابھی وہ پندرہ بیس قدم ہی بھاگی تھیں کہ سیکنہ پھسل کر گر گئی۔

شانسی چند قدم آگے گئی پھر ہلٹی اور سیکنہ کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ پیچھے آنے والوں کے لئے اتنا وقت کافی تھا، وہ اس کے سر پر پہنچ گئے۔ گرنے سے بوکی کی چادر سیکنہ کے سر سے پھسل گئی تھی اور اس کے بالوں کا بوڑا کھل گیا تھا۔ ایک شخص نے بے رحمی سے سیکنہ کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لئے۔ دوسرے نے عقب سے شانی کو اپنے جیسے میں لے لیا۔ وہ دونوں خوف زدہ انداز میں چیخیں۔ ”چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔ چھوڑ دو!“ شانی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، لیکن پکڑنے والے کی گرفت بہت سخت تھی۔

”کون ہو تم؟“ پہلے شخص نے سیکنہ کو اس کے بالوں سے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

اس دوران میں شانی خود کو کسی حد تک سنبھال چکی تھی۔ ایک چوہدرائے کا حوصلہ اس کے اندر کام کر رہا تھا۔ اس نے خود کو دبوچنے والے شخص کی کلائی پر اپنے دانتوں سے کاٹا۔ دبوچنے والے کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو وہ پھلکی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ درد سے بُری طرح بھنا کر اس شخص نے شانی کو بالوں سے پکڑنا چاہا تو شانی نے اس کا منہ نوچ لیا۔ وہ شخص غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکلی اور وہ وحشیانہ انداز میں شانی پر پل پڑا۔ شانی پھسل کر گر پڑی۔ پانی میں شرا ہو تو وہ پہلے ہی تھی اب کچھ میں لت پت بھی ہو گئی۔ وہ شخص اس کے اوپر گرا اور ہوسناک انداز میں اسے نوچنے کھسوٹنے لگا۔ دوسری طرف سیکنہ کی کرناک چیخیں بھی شانی کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ بھی اسی سلوک کا شکار تھی۔ دوسرے شخص نے اسے دبوچ لیا تھا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ اچانک ایک ڈرامائی تبدیلی رونما ہوئی۔ شانی کے جسم پر پڑا ہوا غلیظ دنا گوار بوجھ ایک دم ہٹ گیا۔

وہ انھی تو اس نے دیکھا کہ اس کے اوپر گرنے والا شخص ایک دوسرے شخص سے جھگمگاتا ہے پھر اسے ایک دردناک کراہ سنائی دی۔ اس کے

اوپر گرنے والا شخص بڑی شدت کے ساتھ ایک پختہ قبر کے کتبے سے ٹکرایا اور کئے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو گیا۔

شانی اور سیکینہ کی مدد کے لئے آنے والے شخص نے اپنی چادر کے اندر سے سیاہ ریوالبور نکالا اور اس کی نال دوسرے حملہ آور کی طرف سیدھی کی۔ وہ سیکینہ سے لپٹا ہوا تھا۔ اس نے ریوالبور کی جھلک دیکھی اور ریوالبور والے کا خطرناک انداز دیکھا تو یکایک سیکینہ کو چھوڑ کر واپس گاؤں کی طرف بھاگا۔

شانی نے دھیان سے اپنے مددگار کو دیکھا اور چند لمحے کے لئے سکتے کی کیفیت میں رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے سامنے حویلی میں چکرانے والا وہی اجنبی ملازم تھا جس کا نام مختاری نے واحدی بتایا تھا۔

”بی بی! جلدی آؤ۔“ وہ شانی سے مخاطب ہو کر بولا۔

شانی کا سکتہ ٹوٹا اور وہ پھر بغیر کچھ پوچھے کہے واحدی کی طرف بڑھی۔ سیکینہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

”کہاں لے جا رہے ہو؟“ چند قدم چلنے کے بعد شانی نے ہانپتی آواز میں پوچھا۔

”یہاں تھوڑا آگے میرے ایک جاننے والے کا گھر ہے۔ وہاں تک پہنچ جائیں تو ان لوگوں سے بچ سکتے ہیں۔“

وہ تینوں تیزی سے چلتے رہے۔ قبروں کے درمیان راستے پر بے حد پھسلن تھی۔ دن میں بھی رات کا سماں ہو رہا تھا۔ ایک بار شانی کا پاؤں پھسلنے لگا تو واحدی نے بے ساختہ اسے سہارا دیا لیکن اگلے ہی لمحے جب وہ سنبھل گئی تو اس نے اپنے ہاتھ یوں پیچھے ہٹائے جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

واحدی کے اس انداز نے شانی کو چونکا دیا۔

وہ تینوں بھاگنے والے انداز میں چل رہے تھے اور بار بار مڑ کر پیچھے بھی دیکھ رہے تھے۔ قریباً ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد واحدی انہیں ایک بنگلی راستے پر لے آیا۔ یہاں بارش کا پانی کھڑا تھا جو ان کی پنڈلیوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس پانی کا ایک فائدہ ضرور تھا۔ ان کے قدموں کے نشانات کا پیچھا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ راستے میں کھیت مزدوروں کے کچے مکانات نظر آ رہے تھے۔ ان کی چھتیں نیچی تھیں اور بارش کی بو چھاڑیں گارے کی دیواروں کو چاٹ رہی تھیں۔ واحدی چلتے چلتے اچانک ایک گلی میں مڑا اور پھر اس نے پھرتی کے ساتھ ایک گھر کی پانچ فٹ اونچی دیوار پھاندی اور صحن میں جا کر اندر سے دروازے کی کنڈی کھول دی۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ تینوں ایک کمرے میں موجود تھے۔ یہاں لائین روشن تھی اور ایک عورت کمرے کے اندر ہی چولہے پر بھنڈی توری کا سالن پکا رہی تھی۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا وہ ایک اونچا لمبا گبرو تھا۔ اس کی گردن میں چمڑے کا موٹا تعویذ تھا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ واحدی کا دوست ہے اور شہر میں کسی سرکاری افسر کا ڈرائیور ہے۔

اس کی بیوی قبول صورت تھی لیکن عمر میں اس سے بڑی لگتی تھی۔ اس کا نام حاجرہ تھا۔ حاجرہ نے شانی اور سیکینہ کو اپنے سوکھے کپڑے اور اوڑھنے کے لئے سوئی چادریں دیں۔ اس دوران میں واحدی اور اس کے دوست میں کھسر پھسر ہوتی رہی۔ کچھ دیر بعد واحدی کا دوست گھر سے باہر چلا گیا۔

شانی نے واحدی سے کہا۔ ”شام ہو گئی ہے۔ اگر ہم جلدی واپس گاؤں نہ پہنچے تو تلاش شروع ہو جائے گی۔“

”آپ فکر نہ کریں بی بی! مصطفیٰ ٹریکٹر ٹرائل لینے گیا ہے۔ بس پانچ منٹ میں واپس آ جاتا ہے۔“ بات کرتے ہوئے واحدی کی نگاہیں

زمین میں گڑی تھیں۔ شانی نے کہا۔ ”تمہاری گردن سے خون رس رہا ہے۔ یہاں پٹی وغیرہ کرلو۔“

”جی بی بی۔“ اس نے احترام سے اثبات میں سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔

چند ہی منٹ بعد گھر کے دروازے کے سامنے ٹریکٹر کے انجن کی آواز آئی۔ واحدی نے شانی اور سیکینہ کو لیا اور باہر آ گیا۔ ٹرائی کے نیچے پرانی پچھی تھی اور اوپر ایک بڑی ترپال رکھی ہوئی تھی۔ واحدی نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ ”بی بی آپ دونوں ترپال کے نیچے لیٹ جائیں اور جب تک میں نہ کہوں باہر نہ آئیں۔“

شانہ اور سیکینہ نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ واحدی نے پہلے سیکینہ کو سہارا دے کر ٹرائی پر چڑھایا پھر چڑھنے میں شانی کی مدد کی۔ جب اس کا ہاتھ شانی کے جسم سے چھوا ایک بار پھر اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت نمودار ہوئی۔ جیسے اس نے جسم کے بجائے برقی رُو کو چھوا ہوا اور اس کے پورے بدن میں تھر تھراہٹ دوڑ گئی ہو۔ شانی کو ٹرائی پر چڑھاتے ہوئے ایک لحظہ کے لئے واحدی کی نگاہیں شانی کی نگاہوں سے ملیں۔ ایک بار پھر شانی کو ان نگاہوں کے انوکھے پن کا احساس ہوا۔ ایک ایسا انوکھا پن جس میں پرستش، عبادت، محبت، تڑپ بہت کچھ یکجا نظر آتا تھا۔ یہ نگاہیں نہیں تھیں شاید..... کوئی طلسم تھا۔ شانی جھرجھری لے کر رہ گئی۔

وہ دونوں ترپال کے نیچے گھس کر بے حرکت لیٹ گئیں۔ ٹرائی حرکت میں آگئی اور بارش میں پچکولے کھاتی آگے بڑھنے لگی۔ قریباً پندرہ منٹ بعد واحدی کی باادب آواز سنائی دی۔ ”بی بی! اب کوئی خطرہ نہیں آپ اٹھ کر بیٹھ جائیں۔“

شانہ اور سیکینہ اٹھ کر بیٹھ گئیں، بہر حال ترپال بدستور ان کے سروں پر رہی۔ چند منٹ کے فاصلے پر واحدی بھی ترپال کا ایک ٹکڑا اوڑھے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے بال بھیگ کر پیشانی سے چپکے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی میں بارش کے قطرے چمک رہے تھے۔ شانی کا خیال تھا کہ شاید وہ کوئی سوال کرے گا۔ ان سے پوچھے گا کہ وہ دونوں اس طوفانی موسم میں ”رنگ والی“ سے اتنی دور کیسے پائی جا رہی ہیں یا اس قسم کا کوئی اور سوال لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا۔ نگاہیں جھکائے ہوئے۔ جیسے وہ کوئی بے دام غلام ہو۔ شانی سے کچھ پوچھنا اس کا حق نہ ہو۔ وہ بس جواب دینے کا حق رکھتا ہو۔

آخر شانی کو ہی بولنا پڑا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تمہارا یہاں پایا جانا اور عین وقت پر ہماری مدد کرنا ایک اتفاق ہے۔“

”جی۔“ مختصر جواب ملا۔

”جی..... سے کیا مطلب.....“ شانی نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔ ”تم یہاں کیسے پہنچے ہو؟“

”مجھے ڈر ہے کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔“

شانہ نے گہری سانس لی پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”اچھا نہیں ہوتی ناراض۔“

اس نے اپنی بڑی بڑی جادو اثر نظروں سے ایک لمحے کے لئے شانی کو دیکھا اور بولا۔ ”بی بی! میں نے آپ دونوں کا پیچھا کیا تھا۔ میں نے آپ کو پریشانی کی حالت میں جھنڈے شاہ کے مزار کے پاس سے گزرتے دیکھا تھا پھر آپ بس میں سوار ہو گئیں۔ میں بھی پچھلے دروازے سے بس

میں سوار ہو گیا۔ کٹھولی میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے رہا۔ خدا گواہ ہے کہ میرے دماغ میں کوئی اور بات نہیں تھی۔ مجھے صرف یہ ڈرتا تھا کہ آپ اس طوفانی موسم میں کسی مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔“

”اور تمہارا ڈر ٹھیک ثابت ہوا۔“ سیکینے نے جھر جھری لے کر کہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے یقیناً ابھی تک قبرستان کے مناظر گھوم رہے تھے۔ شانی نے خیال کیا کہ شاید اب واحدی ان سے پوچھے گا کہ وہ یہاں کیونکر آئیں مگر وہ خاموش رہا۔ جیسے اسے کچھ پوچھنے کی حاجت ہی نہ ہو۔ شانی کو اس کی یہ خاموشی اچھی لگی۔

وہ رات شانی کے لئے شدید پریشانی اور گھبراہٹ لے کر آئی۔ سارا گھر سوراہا تھا اور وہ کانٹوں کے بستر پر تھی۔ اس ابراہیم اور رات میں خون کی بو تھی اور اینڈیشوں کے سانپ پھنکارتے تھے۔ آج رات عادل کے بیچھے ہوئے چند ہرکارے نمبردار امجد کے ڈیرے پر دھاوا بولنے والے تھے۔ ان کا نشانہ فاخر تھا۔ شانی کی جان دونوں طرف سے شکنے میں تھی۔ ایک طرف شوہر تھا دوسری طرف بھائی۔ اس نے اپنی طرف سے شوہر کو خبردار تو کر دیا تھا لیکن اب ڈر بھی رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ اب کٹھولی میں عادل کے بیچھے ہوئے کارندے مشکل کا شکار ہوں گے۔

رات دس بجے کے قریب شانی کی ملاقات عادل سے ہوئی۔ وہ تیار ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ ”کہیں جا رہے ہو بھائی؟“ شانی نے پوچھا۔ ”انسپکٹر میاں مظفر کی طرف!“ عادل نے مختصر جواب دیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے گھر تین بیٹیوں کے بعد بیٹا ہوا ہے۔ سوچا مبارک باد دے آؤں۔“

شانہ سمجھ گئی کہ عادل نے پروگرام کے مطابق قوے سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنے کا انتظام کیا ہے۔ رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ اگلے روز نوبے کے قریب شانی کو خادم حسین کی زبانی معلوم ہوا کہ رات کٹھولی میں نمبردار امجد کے ڈیرے پر سخت لڑائی ہوئی ہے۔ گولیاں چلی ہیں۔ نمبردار امجد ہلاک ہو گیا ہے۔ دونوں طرف سے کئی لوگ زخمی ہوئے ہیں۔ ”یہاں تک بتا کر خادم حسین رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ اور تشویش کی پرچھائیاں تھیں۔

”کیا بات ہے خادم حسین تم چپ ہو گئے ہو؟“ شانی نے پوچھا۔ وہ دبے لہجے میں بولا۔ ”چھوٹی مالکن! نمبردار امجد کے وارثوں نے جو پرچہ کٹوایا ہے اس میں سب سے اوپر ہمارے چھوٹے چوہدری (عادل) کا نام ہے۔“

”ہائے میں مر گئی..... یہ کیسے ہو گیا؟“

”چھوٹے چوہدری صبح کے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس چھوٹے چوہدری کو پکڑنے حویلی آ رہی ہے۔“

شانہ کو اپنی ناگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ دشمنی کی آگ تیزی سے پھیل رہی تھی اور اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو چاٹ رہی تھی۔ شانی کا دھیان سب سے پہلے اپنے ابا جی کی طرف گیا۔ ان کا دل پہلے ہی ہوا میں رکھے ہوئے چراغ کی طرح تھا۔ آندھی کا یہ نیا جھونکا پتا نہیں ان

کے دل کے ساتھ کیا کرنے والا تھا۔

اور پھر وہی سب کچھ ہوا جس کے اندیشے تھے۔ بارہ بجے کے قریب پولیس کی بھاری نفری نے حویلی پر چھاپہ مارا۔ اس چھاپے کی قیادت خود ایس پی صاحب کر رہے تھے۔ عادل حویلی میں نہیں تھا۔ اگر کسی عام شخص کا گھر ہوتا تو پولیس ملزم کی جگہ اس کے والد چاچا یا عورتوں کو بھی تھانے لے جانے سے نہ چوکتی لیکن یہ چوہدری ارشاد کی حویلی تھی۔ پورے علاقے میں اس حویلی کی عزت تھی اور اس نام کا اثر و رسوخ تھا۔ قریب دو گھنٹے بعد پولیس واپس چلی گئی۔ تاہم جانے سے پہلے ایس پی رندھاوا نے چوہدری ارشاد اور رئیس کو تاحکید کی کہ ایک دو روز کے اندر ملزم کو پیش کر دیں بصورت دیگر ضروری کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

یہ سب کچھ ہوا اور پھر وہ بھی ہوا جس کا اندیشہ شانی کے ذہن میں کل سے کلبلا رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے اباجی کو دل کا شدید دورہ پڑا۔ انہیں افرا تفری میں ابتدائی طبی امداد دی گئی اس کے بعد لاہور پہنچا دیا گیا۔ ان کی حالت مخدوش تھی رورو کر شانی کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے کئی ٹیسٹ کئے اور پھر چوہدری ارشاد کے لواحقین کو بتایا گیا کہ ان کے دل کے تین والو بند ہیں۔ انہیں اوپن ہارٹ سرجری کی ضرورت ہے۔ چوہدری ارشاد گُل چھ دن ہسپتال میں رہے۔ یہ لاہور کا ایک مہنگا پرائیویٹ کلینک تھا۔ چھ سات روز کا بل ڈھائی لاکھ سے زیادہ بنا۔ کیش کی صورت میں بینک کے اندر فقط 80 ہزار روپیہ تھا۔ چاچا رئیس نے اپنے ایک دوست سے قرض حاصل کیا اور ہسپتال کا بل چکا کر چوہدری ارشاد کو واپس رنگ والی لائے۔

حالات بڑی تیزی سے شانی اور اس کے گھر والوں کا گھیراؤ کر رہے تھے۔ بویائی کا وقت گزرتا جا رہا تھا، کھیت ویران نظر آ رہے تھے۔ قرض خواہوں کے تقاضے بڑھ رہے تھے۔ دوسری طرف عادل ابھی تک لاپتا تھا۔ پولیس اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ ہر دوسرے روز حویلی کے صدر دروازے پر پولیس جیپ کے انجن کی منحوس آواز سنائی دے جاتی تھی۔ عادل کو نمبر دار امجد کے قتل میں بڑے ملزم کی حیثیت سے نامزد کیا گیا تھا۔ شاہو پہلوان کا نام بھی پرچے میں شامل تھا۔ شاہو کے علاوہ حویلی کے دو اور ملازموں کو بھی پولیس گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اب ان ملازمین کا بال بچہ ہر روز سرتاپا فریاد ہو کر حویلی پہنچ جاتا تھا۔ انہیں مالی اور قانونی ہر طرح کی مدد کی ضرورت تھی۔

ایک روز شام کو چاچا رئیس گھر آئے تو معمول سے زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ وہ شانی کو علیحدہ کمرے میں لے گئے اور بولے۔ ”دھی رانی! اب پانی سر سے گزر رہا ہے۔ روپوں کی سخت ضرورت ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں۔ آج سویرے لاہور سے ایک بندہ عادل کا پیغام لے کر آیا ہے۔ عادل نے فوری طور پر دو لاکھ روپے منگوائے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اگلے تین چار دن میں چار لاکھ کا مزید انتظام کر دیا جائے۔“

”بھائی نے اتنے روپوں کا کیا کرنا ہے؟“

”اس کے کسی جاننے والے نے ایس پی رندھاوا سے رابطہ کیا ہے۔ سنا ہے کہ رندھاوا نے کیس کمزور کرنے کے لئے اور فوری طور پر عادل پر ہاتھ نہ ڈالنے کے لئے چھ لاکھ کی ڈیمانڈ کی ہے۔“

شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ چاچا رئیس نے کہا۔ ”زیادہ زمین تو پہلے ہی گروی پڑی ہوئی ہے۔ جو تھوڑی بہت باقی ہے اسے

بچیں گے تو ناک کئے گی..... اب آجاکے تمہاری چاچی کے زیورہ جاتے ہیں۔“

”نن نہیں..... چاچا جی..... بھائی عادل کے لئے چاچی کے زیورہ نہیں بکس گے۔ میرے پاس کچھ رقم ہے۔ اباجی کی الماری میں بھی کچھ کیش اور بانڈ وغیرہ ہیں۔ میں دیکھتی ہوں سب ملا کر کتنے ہوتے ہیں۔“

رقم کے سلسلے میں شانی نے چاچا ریکس سے جھوٹ ہی بولا تھا۔ اس کے پاس فقط چند سو روپے تھے۔ اس رات اس نے الماری سے امی جی کے زیورات نکالے۔ یہ زیورات امی اسے سوئپ کر گئی تھیں۔ اب تک یہ سب کچھ ایک مقدس امانت کی طرح اس کے پاس تھا۔ یہ قریباً دو سیر سونا تو ہوگا۔ کچھ چیزیں جڑاؤ تھیں۔ یہ سب کچھ شانی کے لئے بے حد قیمتی تھا مگر بھائی عادل کی سلامتی اور اباجی کی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو چومتی رہی۔ اس پر اپنے آنسو گراتی رہی اور ماں کی تصویر کو دیکھتی رہی پھر اس نے یہ سب کچھ ایک چرمی تھیلے میں بند کیا اور ایک عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

تایا معصوم یہ کام کر سکتے تھے۔ لاہور میں ایک جیولر تایا معصوم کے بچپن کا دوست تھا۔ وہ اکثر اس کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ اباجی اور مرحومہ والدہ نے بھی جیولری کے سلسلے میں کوئی کام کروانا ہوتا تو تایا معصوم ہی کی ذمہ داری لگائی جاتی تھی۔ شانی نے تایا معصوم کو بلوایا اور بڑی رازداری سے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔ حویلی کے پرانے زیورات کی فروخت کا تایا معصوم کو بھی دکھ ہوا مگر وہ بھی حالات کی ستم ظریفی کو سمجھ رہے تھے۔ قرض خواہوں کا گھیراؤ تنگ ہو رہا تھا، مقدمے اور بیماری کے لئے رقم کی اشد ضرورت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اس موقع پر قربانی کی ضرورت ہے اور یہ قربانی شانی دے رہی تھی۔ اپنی ماں کی نشانیاں جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھیں، وہ فروخت کر رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

ابن انشاء کے مضامین

کتاب ابن انشاء کے مضامین بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں مشہور مداح نگار ابن انشاء کے مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔ ذرافون کرلوں، جنتی نئے سال کی، آؤ حسن یار کی باتیں کریں، سوامی جی لندن میں، کیلے کیلے کا خدا حافظ، دانت کا درد، آغاز تاریخ انگلستان کا، بیمار کا حال اچھا ہے، نظر ثانی کے بعد، جرمنی، افغانستان، اردو کی آخری کتاب، درد مشترک، بیٹے کا عشق۔ آخری دو مضامین انگریزی ادب سے ترجمہ ہیں۔

ابن انشاء کے یہ خوبصورت مضامین کتاب گھر کے **مضامین** سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

وہ ایک سہانی شام تھی۔ بارش کے بعد ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ابا جی کی طبیعت بھی آج کچھ بہتر محسوس ہوتی تھی۔ شانی نے چا چائیں کو بتایا تھا کہ کیش اور پرائز بانڈ وغیرہ ملا کر آٹھ دس لاکھ کا انتظام ہو جائے گا۔ چا چائیں قدرے مطمئن نظر آنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیاں کچھ کمٹی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ انہوں نے لاہور میں عادل کو پیغام بھجوایا تھا کہ کل تک وہ اسے رقم پہنچانے کا انتظام کر دیں گے۔

شام کو شانی ابا جی کی وہیل چیئر بالکونی میں لے آئی۔ وہ اب چاہتی تھی کہ لاہور یا کراچی کے کسی اچھے ہسپتال میں جلد از جلد ان کی سرجری ہو جائے۔ زیورات کی فروخت سے انہیں اتنی رقم ضرور حاصل ہو جاتی تھی جس سے عادل کی مصیبت ٹل جاتی اور ابا جی کی بیماری کا سدباب بھی ہو جاتا۔ اس نے قربانی ضرور دی تھی لیکن اس قربانی کے بعد وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اب اسے تایا معصوم کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہ اپنے ایک منہ بولے بھائی ثناء اللہ کو اپنے ساتھ لے کر گئے ہوئے تھے۔ امید تھی کہ کل دوپہر تک ان کی واپسی ہو جائے گی۔

اچانک ابا جی کی آواز نے شانی کو چونکایا۔ ”وہ کیا ہے شانی؟“ انہوں نے بالکونی سے نیچے حویلی کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شانہ نے آنکھیں سیڑ کر دیکھا۔ اسے واحدی نظر آیا۔ اس کے کندھے پر کوئی شخص تھا جو چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ سخت بیمار ہے یا بے ہوش ہے۔ واحدی اسے لے کر برآمدے میں داخل ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ شانی خود نیچے جاتی اور صورت حال معلوم کرتی، ابا جی نے ایک ادھیڑ عمر ملازم کو آواز دی اور اسے کہا کہ وہ اس بندے کو اوپر بلائے۔ بندے سے ابا جی کی مراد واحدی تھا۔

دو چار منٹ بعد واحدی سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر آ گیا۔ اس کے لمبے سیاہ بال شانے اور چہرے پر لہرا رہے تھے۔ ماتھے پر مشقت کی وجہ سے پسینے کی چمک تھی۔ چوہدری ارشاد نے نحیف آواز میں پوچھا۔ ”یہ کس کو کندھے پر لا کر لائے ہو؟“

واحدی نے نظریں جھکا رکھی تھیں۔ شانی کی موجودگی میں وہ جیسے نگاہیں اٹھانا بھول ہی جاتا تھا۔ وہ اسی انداز میں بولا۔ ”بڑے مالک! میں چارے کے کھیت کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وہاں یہ بے ہوش پڑا تھا۔ نارووال سے کھیت مزدوری کے لئے آیا ہے۔ نیا نیا ہے شاید گرمی کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔“

”جاؤ جاؤ۔ اسے ہوش میں لاؤ۔ اگر ضرورت ہو تو ڈاکٹر شہزاد کو بلا لاؤ۔“ چوہدری ارشاد بے تابی سے بولے۔ شاید انہیں اپنی مرحومہ بیوی کی بات یاد آگئی تھی۔ مرحومہ کہا کرتی تھیں جب ہمارے کھیتوں میں کام کرنے والے کسی بندے کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی چوٹ سیدھی میرے کلیجے پر لگتی ہے۔

واحدی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”مالک! اسے ننھے کے نیچے رکھا ہے۔ لگتا ہے جلدی آنکھیں کھول دے گا۔“

چوہدری ارشاد نے بے تاب لہجے میں کہا۔ ”شانہ! جاؤ تم خود دیکھ کر آؤ۔ اگر ضرورت ہو تو ڈاکٹر کو بلا لو۔“

شانہ، واحدی کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔ برآمدے میں پہنچ کر واحدی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”بی بی! ایک منٹ رکھئے۔“

شانی رک گئی۔ اس نے اپنا سر اور سینہ اچھی طرح اوڑھنی سے ڈھانپ رکھا تھا۔ واحدی نے نگاہیں جھکائے جھکائے شانی پر انکشاف کیا۔ ”بی بی! میں نے بڑے مالک کے سامنے سچ نہیں کہا۔ مجھے پتا ہے ان کی طبیعت خراب ہے۔“

”تو سچ کیا ہے؟“ شانی نے لرز کر پوچھا۔

واحدی گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”یہ ثناء اللہ صاحب ہیں۔ میں نہروالی مسجد میں جا رہا تھا۔ یہ بیلے کے کھیت کے پاس بے ہوش پڑے تھے۔ سر پر گہرا زخم ہے۔ شاید راکفل کے بٹ سے آیا ہے۔“

شانی سنائے میں رہ گئی۔ ثناء اللہ تو آج صبح تایا معصوم کے ساتھ لاہور گیا تھا۔ اس کے پاس سوزو کی ایف ایکس تھی۔ وہ دونوں اسی گاڑی میں گئے تھے۔

”تایا معصوم کہاں ہیں؟“ شانی نے کراہ کر پوچھا۔

”ان کا کچھ پتا نہیں۔ ثناء اللہ صاحب کی گاڑی بھی غائب ہے۔“

شانی کو لگا کہ اس نے کسی چیز کا سہارا نہ لیا تو ڈمگا کر گر جائے گی۔ وہ پاس رکھے موڑھے پر بیٹھ گئی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ قریب دو گھنٹے کے اندر اندر سب کچھ واضح ہو گیا۔ تایا معصوم بھی حویلی واپس آ گئے۔ ان کے چہرے اور سر پر گہری چوٹیں تھیں۔ لباس بھی تار تار ہو چکا تھا۔ ان کی گاڑی کو بیلے کے قریب روکا گیا تھا۔ چار مسلح افراد ان کے سامنے آئے تھے جنہوں نے ڈھائے باندھ رکھے تھے۔ ثناء اللہ نے مزاحمت کی۔ جواباً اسے بے ہوش کر کے چارے کے کھیت میں پھینک دیا گیا۔ تایا معصوم کو گن پوائنٹ پر گاڑی کے اندر ہی ریغمال بنایا گیا۔ رنگ والی سے قریب 20 کلومیٹر آگے جانے کے بعد انہیں گاڑی سے اتار دیا گیا۔ زیورات اور گاڑی سمیت ڈاکو فرار ہو گئے۔

کہتے ہیں مصیبت تنہا نہیں آتی۔ شانی کے گھرانے پر بھی مصیبتوں نے یلغار کر دی تھی۔ ایک کے بعد دوسری آفت ان کی زندگی کو تہہ وبالا کر رہی تھی۔ شانی نے اپنی مرحومہ ماں کے زیورات کو خود سے جدا کر کے ایک بڑی قربانی دی تھی لیکن یہ قربانی بھی کسی کام نہیں آ سکی تھی۔ یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ سب کچھ تہہ وبالا ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ حسب سابق شانی اور چاچا رئیس نے اس لیے کو بھی چوہدری ارشاد سے چھپانے کی کوشش کی تھی اور اس مرتبہ انہوں نے واقعی چھپا لیا تھا۔

شانی کئی روز تک غم و یاس کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبی رہی۔ یہ دو ہر غم تھا۔ پیاری ماں نے یہ پیاری پیاری نشانیاں بے حد چاہت سے اسے سونپی تھیں۔ اپنی بیماری کے آخری دنوں میں انہوں نے ایک ایک زیور اپنے ہاتھوں سے شانی کو پہنایا تھا اور دکھایا تھا۔ یہ ساری نشانیاں شانی سے جدا ہوئی تھیں اور ستم بالا ستم یہ تھا کہ ان نشانوں کو جدا کرنے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہو پایا تھا۔

چوہدری ارشاد کے علم میں لائے بغیر چاچا رئیس نے پولیس میں اس ڈاکے کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔ ظاہر ہے کہ شانی کو چاچا رئیس کے علم میں سب کچھ لانا پڑا تھا۔ شانی نے اعتراف کیا تھا کہ کیش اور پرائز بانڈ وغیرہ کے سلسلے میں اس نے جھوٹ بولا تھا۔ تایا معصوم کے منہ بولے بھائی ثناء اللہ کی کاروروز بعد جی ٹی روڈ کی طرف جانے والی پختہ سڑک کے کنارے کھڑی مل گئی تھی۔

شانی کے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ تایا معصوم اور شاء اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ایف ایکس کار میں قیمتی زیورات لاہور لے جائے جا رہے ہیں پھر اس سلسلے میں مخبری کہاں سے ہوئی۔ وہ جتنا سوچتی تھی اس کا ذہن الجھتا چلا جاتا تھا۔ غم کی یورش میں یہ پریشانی ایک اضافی اذیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس حوالے سے سوچتے ہوئے ایک اور خیال بار بار اس کے ذہن پر حملہ آور ہوتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس ڈاکے کا تعلق بھی نار پور اور نار پور والوں کے انتقام سے ہو۔ ان پریشانیوں کے علاوہ ایک اور الجھن بھی تھی جو شانی کی سوچ کو دن رات بھٹکائے رکھتی تھی۔ اس الجھن کا تعلق واحدی سے تھا۔ اس کی حویلی میں موجودگی شانی کو ہر وقت کھٹکتی تھی۔ پتا نہیں کیوں شانی کو لگتا تھا کہ وہ کوئی عام شخص نہیں ہے۔ وہ جس حیثیت سے یہاں حویلی میں کام کر رہا ہے وہ حیثیت اس کی اصل حیثیت سے کہیں کم ہے۔ اس کا ایک ثبوت شانی کو چند روز پہلے مل بھی گیا تھا۔ قبرستان میں پیش آنے والے واقعے میں واحدی نے ایک ایسا کردار ادا کیا تھا جسے تا دیر بھلایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے شانی اور سکیونہ کی جان دو خطرناک غنڈوں سے چھڑائی تھی اور پھر اس سے پہلے بھی وہ ایک موقع پر جرأت رندانہ کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ شانی کو یاد تھا۔ عادل اور فاخر کی لڑائی میں واحدی نے بھرے ہوئے فاخر کے وار اپنے ہاتھوں پر روکے تھے۔ اس کی یہ کارکردگی اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ اسے انعام و اکرام سے نوازا جاتا اور اسے ”ترقی“ دی جاتی لیکن شانی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو اس کے الٹ سوچ رہی تھی۔ وہ اس شخص کو حویلی سے نکال دینا چاہتی تھی۔ یہ اس لئے تھا کہ وہ ایک عورت تھی اور عورت اپنی طرف اٹھنے والی ہر نگاہ کی ہر خاصیت بھانپ لیتی ہے۔ واحدی کی نگاہ میں شانی کو وہ کچھ نظر آتا تھا جو اسے سر تا پا لرزادیتا تھا۔ شانی کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی نگاہ کا تصور کرنا بھی اس کے لئے بہت بڑا گناہ ہے۔

پچھلے دو تین روز کی سوچ بچار کے بعد شانی نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ واحدی کی چھٹی کرا دے گی۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ بے فخری کے ذریعے یہ کام کرے گی لیکن بابا ایک بار پھر گھروں گیا ہوا تھا۔ شانی نے اپنی موٹی اوڑھنی اوڑھی اور ان کو ارٹروں کی طرف چل دی جہاں ملازمین رہتے تھے۔ وہ کو ارٹروں کے پاس پہنچی تو دو تین ملازموں نے اسے جھک کر سلام کیا۔ واحدی اسے اپنے کو ارٹر سے باہر ہی مل گیا۔ وہ گھاس پر جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شانی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اس کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ اتنے خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہا تھا کہ اسے شانی کی آمد اور موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ نماز ختم کرنے کے بعد اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور دیر تک اپنے ہاتھوں کے پیالے پر سر کو جھکائے رکھا۔ شانی خاموشی سے تنک رہی۔

دعا سے فارغ ہو کر وہ اپنی تربت آکھیں پونچھ رہا تھا جب پہلی بار اس کی نگاہ اپنے عقب میں شانی پر پڑی۔ وہ چونکا۔ ایک بار پھر اس کی نگاہوں میں وہی خوبصورت چمک آئی جس میں عقیدت، محبت، پرستش اور پتا نہیں کیا کچھ ایک ساتھ لہریں لیتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ کسی معمول کے انداز میں اٹھا۔ جائے نماز تہہ کر کے ایک طرف رکھا اور شانی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ شانی کے دل میں غصہ تھا اور ایک عجیب طرح کی اپنائیت بھی تھی۔ وہ حسب معمول نگاہیں جھکائے ہوئے بولا۔ ”بی بی! میری دعا قبول ہوگئی ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔“

”کیوں ملنا چاہتے تھے؟“ شانی نے ماتھے پر تیوری ڈال کر پوچھا۔

وہ اس کی تیوری سے بے خبر رہا اور حسب سابق پر عقیدت لہجے میں بولا۔ ”آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی تھی بی بی۔“

”کہو!“ شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

واحدی نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک قدم چل کر تھوڑا سا اور نزدیک آ گیا۔ اس کے ہاتھ ناف پر بندھے ہوئے تھے اور نگاہیں ہمیشہ کی طرح زمین پر تھیں۔ بولا ”بی بی! میری یہ اوقات تو نہیں کہ اس بارے میں بات کروں لیکن چپ رہنا بھی مشکل ہے۔ میں آپ سے چھوٹے مالک عادل کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”کیا بات ہے؟“ شانی نے کہا اور تھوڑا سا چوٹ گئی۔

واحدی نے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ دو تین ملازمین موجود تھے لیکن کافی فاصلے پر تھے۔ واحدی نے کہا۔ ”بی بی! میں کل لاہور میں داتا دربار گیا تھا۔ واپسی پر شانی مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا کہ راستے میں میں نے ایک کالے شیشوں والی کار دیکھی۔ مجھے شک ہوا کہ کار کی پچھلی سیٹ پر چھوٹے مالک بیٹھے ہیں۔ کار ٹی کی طرف گئی اور ایک گلی میں داخل ہو گئی۔ میں پیدل ہی کار کے پیچھے گیا۔ مجھے دکھ کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ میں نے مالک کو نشے کی حالت میں کار سے اترتے دیکھا۔ ان کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے ایک طوائف کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ میں اس حویلی کا نمک خوار ہوں بی بی۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے چھوٹے مالک کے بارے میں جاننے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ چھوٹے مالک کے ساتھ جو بندے کالے شیشوں والی کار سے اترے تھے ان میں میرا ایک پرانا جاننے والا افضل ساہی بھی تھا۔ وہ پراپرٹی ڈیلر کا کام کرتا تھا۔ تقریباً تین گھنٹے بعد چھوٹے مالک اور ان کے ساتھی طوائف کے کوٹھے سے اترے اور واپس چلے گئے۔ رات دو بجے کے لگ بھگ میں افضل ساہی کے گھر معنی روڈ پہنچا۔ وہ بھی ابھی ابھی گھر آیا تھا۔ میں نے بڑی دیر تک اس سے مغز ماری کی اور اس سے کافی کچھ پوچھ لیا۔“

واحدی بڑی روانی سے بول رہا تھا۔ شانی اس کی نگاہوں میں نہیں جھانک سکتی تھی۔ کیونکہ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں؛ بہر حال اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”بی بی! چھوٹے مالک بہت زیادہ مایوس ہیں۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔ پولیس ان کے پیچھے ہے۔ انہیں پتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی گرفتار ہو سکتے ہیں اس کے باوجود وہ گھوم پھر رہے ہیں۔ شاید اب انہوں نے سوچ لیا ہے کہ جو بھی ہونا ہے وہ ہو جائے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ شانی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”بی بی! اڈرنا ہوں کہ آپ کو میری بات بُری نہ لگے..... لیکن..... سچ یہی ہے کہ چھوٹے مالک کو آپ سے شکایت پیدا ہو گئی ہے۔“

”کیسی شکایت؟“

”چھوٹے مالک کو شکوہ ہے کہ بڑے مالک، مالک رئیس اور آپ نے مشکل وقت میں انہیں اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ ان کو رقم کی سخت ضرورت تھی لیکن انہیں رقم نہیں بھجوائی گئی۔ ان کا خیال ہے کہ اگر انہیں بروقت رقم مل جاتی تو وہ پولیس سے اپنی جان چھڑا لیتے اور ہو سکتا تھا کہ قتل کے پرچے سے بھی ان کا نام نکل جاتا۔ وہ پچھلے دنوں بہت سخت پریشان رہے ہیں۔ مصیبت میں اگر اچھے دوستوں کا ساتھ نہ ہو تو مصیبت اور بڑھ جاتی ہے۔“

شاید چھوٹے مالک کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ان کے پاس جو تھوڑی بہت رقم ہے وہ شراب اور کوٹھے پر خرچ ہو رہی ہے۔“

شانی سنائے کی کیفیت میں یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ سینے کے اندر اس کا دل رورہا تھا۔ اپنے ”ماں جائے“ کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی اور اس ساری صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے واحدی سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

بھائی عادل کو ڈاکے کی واردات کا پتا نہیں ہے؟“

”ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ”تم میرا ایک کام کرو۔ کسی طرح بھائی عادل تک میرا پیغام پہنچا دو۔ انہیں بتاؤ کہ ان کے یہاں سے جانے کے بعد کیا ہوا ہے۔ کس طرح کئی لاکھ کے زیورات ڈاکے کی واردات میں گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب انہیں اس بات کا پتا چلے گا تو وہ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

واحدی نے ادب سے کہا۔ ”بی بی! آپ جو حکم دیں گی میں اسے پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔“

کبھی کبھی واحدی کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ بہر حال اس کے طور اطوار سے اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کبھی وہ ایک عام شخص نظر آتا تھا لیکن کبھی لگتا تھا کہ وہ عام نہیں ہے وہ غیر معمولی ہے۔ اس کے عام روپ کے اندر ایک دہنگ شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ شانی نے ابھی تک اس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ نہ ہی کبھی شانی نے نارپور کی اس رات کا ذکر کیا تھا جب وہ شدید زخمی حالت میں نارپور کی حویلی میں داخل ہوا تھا اور ایک کمرے میں چھپ گیا تھا۔ لیکن آج شانی اس کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔ شانی نے اس سے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ!“

وہ بڑی سادگی سے وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔

”نہیں وہ موڑھا پکڑو۔“ شانی نے کچھ فاصلے پر رکھے موڑھوں کی طرح اشارہ کیا۔

وہ چند لمحوں تک تذبذب میں رہا پھر موڑھا پکڑ لیا اور شانی کی کرسی سے کافی فاصلے پر رکھ کر مؤدب بیٹھ گیا۔ ”تمہیں بابے فخری نے ملازم رکھا تھا؟“ شانی نے پوچھا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”جی بی بی!“ وہ بولا۔

”بابے فخری نے بتایا ہے کہ تم سیال ہو اور نارووال کے قریب ایک پنڈ کے رہنے والے ہو۔ وہاں کھیتی باڑی کرتے تھے لیکن دشمنی چل نکلی اور تم علاقہ چھوڑ کر مزدوری کے لئے یہاں آ گئے۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”جی بی بی!“ وہ بولا۔

”لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ غلط بیانی کر رہے ہو۔“

”آپ بتائیں۔ میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں بی بی۔“ اس نے کہا۔ نگاہیں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا ”بی بی“ کہنے کا انداز بھی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اپنی مثال آپ تھا۔

شانی نے کہا۔ ”اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ اس رات تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا جب زخمی حالت میں ہمارے گھر آ کر چھپے تھے۔“

”وہ رات..... وہ رات میں کبھی بھول نہیں سکوں گا بی بی۔ آپ نے میری جان بچائی۔ اس احسان کے بدلے..... آپ میری کھال کی

<http://kitaabghar.com>

جوتیاں بنا کر پاؤں میں پہنیں تو بھی میری طرف سے حق ادا نہیں ہوگا۔“

”خیر اس بات کو چھوڑو!“ شانی نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں نے جو کچھ کیا، انسانی فرض سمجھ کر کیا، تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو میں ایسا ہی

کرتی۔ تم یہ بتاؤ کہ اس رات تم آئے کہاں سے تھے؟“

وہ چند لمحے خاموش رہا، تب گہری سانس لے کر بولا۔ ”آپ نے رستم سیال کا نام سنا ہوا ہے؟ قانون کے کاغذوں میں وہ بہت بڑا ڈکیت

سمجھا جاتا ہے۔“

<http://kitaabghar.com>

”ہاں..... نام تو شاید سنا ہوا ہے لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق ہے۔“

”میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں بی بی۔ مگر میں یہ بات مانتا ہوں کہ رستم ہماری برادری کا ہے۔ اس میں لاکھ برائیاں سہی لیکن ایک

بات سب مانتے ہیں رستم سیال قانون کے ان مجرموں میں سے ہے جو غریب کے ہمدرد بھی ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ خود غریبی کی

پیداوار ہوتے ہیں۔ انہوں نے حیاتی کے سب سے سخت دکھ جھیلے ہوتے ہیں.....“

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ تم اپنی بات مختصر کر کے بتاؤ۔ تم نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے رستم سیال کا نام کیوں لیا ہے؟“

”میں اسی طرف آرہا ہوں بی بی! آپ کو یاد ہوگا جس رات میں نارپور کی حویلی میں گھسا اس رات پاس کے نیلے میں دو پارٹیوں کے

درمیان زوردار لڑائی ہوئی تھی۔ اس میں دو تین بندے مارے گئے تھے اور کچھ زخمی بھی ہوئے تھے۔“

شانی نے اثبات میں سر ہلا کر واحدی کی بات کی تائید کی۔ وہ بیان جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ لڑائی زمین کے ایک ٹکڑے کی وجہ سے

ہوئی تھی۔ یہ سیالوں کی ایک بیوہ عورت اور اس کی دو بچیوں کی زمین تھی۔ مخالف پارٹی نے پہلے بیوہ کی بچیوں پر نظر رکھی اور ایک بچی کو اغوا کر کے اس

سے زبردستی نکاح پڑھوا دیا پھر زمین کے پیچھے پڑ گئے۔ بات بڑھتے بڑھتے بہت بڑھ گئی۔ ہماری طرف سے رستم سیال آگے آیا اور اس نے مخالف

پارٹی کے چوہدری سے بات کر کے مسئلہ کا حل نکالنے کی کوشش کی مگر بات کرتے کرتے نوبت مارکٹائی تک آ گئی۔ چوہدریوں نے نیلے کے اندر پہلے

سے بہت سے بندے اکٹھے کر رکھے تھے۔ اسلحہ کی دو گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ شکاری کتے بھی تھے۔ رستم سیال کے ساتھ بس برادری کے دس پندرہ

بندے تھے اور وہ بھی لڑائی کے لئے نہیں آئے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہم پر ایک دم ہلہ بول دیا گیا۔ میں کلہاڑیوں اور فائرنگ سے زخمی ہوا

اور جان بچانے کے لئے بھاگا۔ بس قسمت اچھی تھی کہ حویلی کی پناہ مل گئی اور اس سے بھی اچھا یہ ہوا کہ آپ نے مجھے دیکھ لیا۔“ آخری الفاظ ادا کرتے

<http://kitaabghar.com>

وقت واحدی نے ایک لمحہ کے لئے شانی کی طرف دیکھا اور اس کی جگر پاش نظروں نے شانی کو اندر تک جھنجھوڑ ڈالا۔

شانی نے اپنے لہجے میں قدرے سختی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم اس حویلی میں کیسے آ گئے؟“

”دائے دانے پر مہر ہوتی ہے بی بی۔“ وہ عجیب لہجے میں بولا۔

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ایسا اتفاق ہوا ہے؟“

”جی بی بی۔“ اس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

کسی شخص کے دل کا حال جاننے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکنا پڑتا ہے لیکن شانی کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس شخص کی آنکھوں میں ایسی نگاہ کوندتی تھی جو اسے لرزہ بر اندام کر دیتی تھی لیکن شاید اگر وہ اس کی آنکھوں میں جھانک بھی لیتی تو بھی اس کے دل کا حال نہ جان سکتی۔ وہ بہت گہرا تھا۔ شانی کے دل میں آئی کہ اس شخص سے وہ بات کہہ ڈالے جو کہنے کے لئے وہ یہاں آئی ہے۔ اس خطرناک شخص کو بتادے کہ وہ اس حویلی کی ملازمت سے فارغ ہے، کل سے اسے یہاں نظر نہیں آنا چاہئے مگر پھر وہ یہ بات فوراً اپنی زبان پر نہیں لاسکی۔ اس شخص نے یہاں آکر کم از کم ایک کام ایسا ضرور کیا تھا جو اسے تھوڑی بہت رعایت کا مستحق بناتا تھا۔ طوفانی شام میں قبرستان میں پیش آنے والا واقعہ ابھی شانی کے ذہن میں تازہ تھا۔ واحدی کی بروقت اور ڈرامائی آمد نے شانی اور سیکرٹ کو ایک بہت بڑی مصیبت سے بچایا تھا اور اب..... اب ایک نئی وجہ بھی پیدا ہو گئی تھی۔ شانی چاہتی تھی کہ واحدی اس کا پیغام لے کر اس کے بھائی کے پاس جائے..... مگر کیا ایسا کرنا مناسب تھا۔ وہ الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کا جان سے پیارا بھائی مصیبت میں تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھی اور جلد سے جلد کرنا چاہتی تھی۔

وہ کافی دیر تک سوچ میں گم رہی۔ واحدی کسی عقیدت مند کی طرح اس کے سامنے خاموش بیٹھا رہا۔ آخر شانی نے ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ تمہیں عادل بھائی کے پاس بھیجنے کے بجائے میں خود ان سے ملوں۔ جس طرح میں ان سے بات کر سکتی ہوں شاید تم نہ کر سکو۔ وہ پولیس سے بھاگ کر اپنا کیس خراب کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے میرے کہنے پر وہ اپنے لئے قانونی لڑائی لڑنے پر تیار ہو جائیں گے۔“

”آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے بی بی..... مگر..... کہیں آپ کا چھوٹے مالک سے ملنا ان کے لئے کوئی مشکل کھڑی نہ کر دے۔ پولیس ان کی یوگھتی پھر رہی ہے۔ کیا پتا حویلی کے ارد گرد بھی منجر موجود ہوں۔ اگر آپ چھوٹے مالک سے ملنے لاہور جائیں تو آپ کے ساتھ ہی پولیس بھی ان کے پاس پہنچ جائے۔“

شانہ چند لمحے سوچ میں غرق رہنے کے بعد بولی۔ ”پھر تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہئے؟“

”اگر آپ خود ہی ان سے ملنا چاہتی ہیں تو پھر آپ کو دو چار دن انتظار کرنا چاہئے۔ اسی دوران میں حالات کی خبر رکھتا ہوں۔ پولیس کی چوکی ذرا کم نظر آئی تو میں آپ کو بتا دوں گا۔“

شانہ کو واحدی کی بات میں وزن محسوس ہوا۔

☆=====☆=====☆

پانچ چھ روز مزید اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن شام کو واحدی اس سے ملا۔

اس نے کہا۔ ”بی بی! کل شب برات ہے۔ اتفاق سے سرکاری چھٹی بھی ہے۔ ایسے دنوں میں پولیس کی نگرانی اور چوکی کم ہو جاتی ہے۔“

میرے خیال میں لاہور جانے کے لئے کل کا دن بڑا مناسب رہے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اور سکیڈنہ صبح نو بجے تک مزار پر پہنچ جائیں گے۔ ہم جس بس میں سوار ہوں گے تم بھی اسی میں چڑھ جانا۔ آگے جا کر ہم لاہور جانے والی بس یا ٹیکسی پکڑ لیں گے۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”جو آپ کا حکم!“ واحدی نے سر جھکا کر کہا۔

شانی کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ بھائی کو ملنے کے لئے اس کا دل بڑی طرح تڑپ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں ان دنوں شانی کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ بھائی سے بہت محبت کرتی ہے۔ یہ محبت یقیناً ہمیشہ سے اس کے دل میں موجود تھی لیکن کبھی کھل کر سامنے نہیں آئی تھی۔ اب بھائی سے جدا ہو کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھائی کے کتنے قریب ہے۔ بڑے بھائی تو زیادہ تر لاہور میں رہے تھے۔ صرف چھٹیوں میں حویلی آتے تھے اب بھی وہ عرصے سے بیرون ملک مقیم تھے۔ ویسے بھی وہ شانی سے کافی بڑے تھے۔ عادل سلطان اور شانی کی عمروں میں بہت تھوڑا فرق تھا۔ وہ بچپن سے ہم جو لیوں کی طرح تھے۔ نوعمری کی ان گنت یادیں ان کے دلوں پر نقش تھیں۔ شانی رات گئے تک پرانی تصویروں کے البم دیکھتی رہی۔ ان تصویروں میں یادوں کے خزانے تھے۔ زیادہ تر تصویریں عادل اور شانی ہی کی تھیں۔ کہیں وہ تین پیہوں والی سائیکلیں چلا رہے ہیں، کہیں جاگلیا پیٹے نہا رہے ہیں، کہیں امی ابو کے کندھوں پر سواری کر رہے ہیں۔ یادوں کی ایک کہکشاں تھی جو ماضی کے آسمان پر بچپن سے لڑکپن اور جوانی تک پھیلی ہوئی تھی۔ چند تصویریں دیکھ کر شانی چونکی۔ یہ شبِ برات کی تصویریں تھیں۔ دس بارہ برس پہلے کی کوئی شبِ برات تھی۔ ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں، پھلجڑیاں چمک رہی تھیں، پٹانے چل رہے تھے۔ شانی اور عادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے، چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ امی ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھیں۔ آہ..... کہاں گئے وہ سنہری دن؟ کہاں گئے وہ جگمگاتے ماہِ وسال؟ شانی کا دل رقت سے بھر گیا۔ وہ کل یہ تصویریں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ کل بھی تو شبِ برات تھی۔ کل بھی گلی کوچوں میں ویسے ہی مناظر بکھرتا تھا جو ان تصویروں میں نظر آ رہے تھے۔ اسے یقین تھا یہ تصویریں دیکھ کر عادل کا دل بھی درد اور محبت سے بھر جائے گا۔ وہ اپنے ساتھ اور بھی بہت کچھ لے جا رہی تھی۔ اپنی ماں کی دعائیں۔ اپنے ابا جی کی بیماری کا احوال، اپنی ویران حویلی کی کہانی۔ وہ عادل کو اپنے حالات سے آگاہ کر کے اور اپنی محبت کا واسطہ دے کر اپنے ساتھ لانا چاہتی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ کامیاب رہے گی۔

اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ شانی اور سکیڈنہ کاموکی جانے والی بس میں بیٹھیں۔ واحدی بھی اسی بس میں سوار ہو گیا۔ دو بیس بدل کر اور پھر ایک ٹیکسی پکڑ کر وہ لوگ ایک بجے کے قریب لاہور کی ایک رہائشی آبادی مصطفیٰ آباد میں پہنچے۔ واحدی کی معلومات کے مطابق عادل اپنے ایک دوست افضل سانی کے ساتھ اسی آبادی کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھا۔ پروگرام کے مطابق واحدی نے گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی ٹیکسی رکوا دی اور شانی کو مکان کا نمبر وغیرہ بتا دیا۔

شانی کا دل جیسے اس کی کپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آئندہ دس پندرہ منٹ میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ رنگ والی سے یہاں تک آتے ہوئے شانی، سکیڈنہ اور واحدی نے پورا خیال رکھا تھا کہ ان کا تعاقب نہ کیا جائے۔ وہ پوری تسلی کر کے ہی یہاں تک پہنچے تھے پھر بھی شانی کو ڈر تھا کہ عادل حسبِ عادت بھڑک اٹھے گا۔ خدشہ تھا کہ وہ شانی کو اس بات پر ڈانٹنے لگے کہ وہ اس کے پیچھے یہاں کیوں چلی آئی ہے۔

ہوسکتا تھا کہ ان میں لڑائی ہو جاتی لیکن یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ بہت جلد مان بھی جائے گا۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ وہ ایک دو بے کے بغیر زیادہ دیر رہی نہیں سکتے تھے۔

شانی اپنی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی گلی میں داخل ہوئی، سیکنہ اس کے پیچھے تھی۔ مطلوبہ مکان کا نیلا گیٹ کچھ ہی فاصلے پر نظر آ رہا تھا مگر مکان کے سامنے کا منظر دیکھ کر شانی اور سیکنہ بے طرح چونک گئیں۔ یہاں دروازے پر ایک ایسبولینس کھڑی تھی۔ ارد گرد غم زدہ چہروں کا جھوم نظر آ رہا تھا۔ ایسبولینس کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔ اسٹریچر پر ایک لاش رکھی تھی۔ لاش پر چادر تھی۔ فقط ننگے پاؤں نظر آرہے تھے۔ شانی نے پاؤں دیکھے اور دنیا سے اپنی نگاہوں کے سامنے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ چند لمحے کے لئے جیسے پورا جسم برف کی سل بن گیا تھا پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی ایسبولینس کی طرف بڑھی۔ نگاہیں پاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ پاؤں..... یہ پاؤں اس کے پہچانے ہوئے تھے۔ ان کی ہر پور ہر نشیب و فراز اس کا دیکھا ہوا تھا۔ کاش اس کی آنکھیں دھوکا کھا رہی ہوں۔ کاش وہ کوئی بھینک سپنا دیکھ رہی ہو۔ کاش وہ فاقہ راز قاتل ہو اور اس کا دماغ درست کام نہ کر رہا ہو۔ کاش..... کاش۔ وہ تڑپتی ہوئی پاؤں تک گئی۔ انہیں اپنے سرد ہاتھوں سے چھوا پھر اس کے سینے کی گہرائی سے ایک درد بھری چیخ نکلی۔ آنکھوں کے سامنے ایک خون رنگ دھند پھیل گئی۔ وہ لپک کر لاش کے سر ہانے لگی اور چہرے سے کپڑا کھینچ لیا۔ اس کا مُردہ بھائی اس کے سامنے تھا۔ جو بچپن سے اب تک اس کے ساتھ رہا تھا۔ کچھ دیر کے لئے بھی اس سے جدا نہیں ہوا تھا جو مسکراتا تھا تو زندگی مسکراتی تھی۔ جو اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ شانی کی زندگی کا اٹوٹ حصہ تھا۔ وہ اس سے جدا ہو گیا تھا..... ہمیشہ کے لئے۔

وہ دھاڑیں مارتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ اس کا چہرہ اپنے سینے کے اندر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ”اٹھ جاؤ بھائی..... آنکھیں کھول دو۔ میرے ساتھ ایسا مذاق نہ کرو۔ اٹھ جاؤ بھائی.....“

وہ اسے جھنجھوڑنے لگی۔ دیوانگی کے عالم میں اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مُردہ بھائی کے زخموں سے خون رسنے لگا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں اپنی بہن کو بتا دیا کہ وہ اب نہیں اٹھ سکتا۔ اب روزِ محشر سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔ شانی کی آہ و بکا بلند ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ایسی آہ و بکا تھی جو ارد گرد موجود انسانوں کو بھی نہیں بے جان اشیاء کو بھی دہلا رہی تھی۔

”کیا ہوا میرے بھائی کو..... مجھے بتاؤ کیا ہوا؟“ شانی پکار رہی تھی۔ ارد گرد موجود سب جھکے ہوئے تھے۔

☆=====☆=====☆

عادل کے دوست افضل سانی اور قیصر وغیرہ سے پتہ چلا کہ وہ ان کے بہت منع کرنے کے باوجود گاڑی لے کر اسلام آباد روانہ ہو گیا تھا۔ دراصل وہ ذہنی طور پر سخت پریشان تھا۔ ایک تو اسے ہر وقت پولیس کا خوف تھا لیکن اس سے بھی بڑی پریشانی اور الجھن ایک اور تھی۔ فاخر سے مقابلے میں ہارنے کے بعد وہ سخت دل برداشتہ تھا۔ جب سے اس نے یہ سنا تھا کہ نار پورا اور اس کے گرد و نواح میں اس کی ہار پر جشن منایا گیا ہے اور رنگ والی میں سوگواری کی کیفیت ہے، وہ بہت چپ رہتا تھا۔ شراب پی کر کسی وقت بلند آواز میں فاخر کو لاکارتا تھا اور کہتا تھا۔ ”میں ابھی ہارا نہیں۔ میں ابھی لڑ رہا ہوں۔ آ میرے سامنے آ..... کہاں بھاگ گیا ہے تُو.....!“

پھر خود ہی رونے لگتا تھا اور وہی تباہی بولتا تھا۔

حادثے کے روز بھی وہ اسی ذہنی انتشار کی حالت میں گھر سے نکلتا تھا۔ اس کی گاڑی میں شراب کی بوتل بھی تھی۔ وہ ابھی شاہدرہ سے تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ ہلکی بارش میں پھسلن زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بھی ہلکی بارش تھی۔ راستے میں وہ ایک پولیس نا کے پرزے کے بغیر آگے بڑھ گیا۔ پولیس کی گاڑی پیچھے لگی تو وہ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ ایک موٹر پر گاڑی پھسل کر کنارے کھڑے ایک ٹریکٹر سے ٹکرائی اور الٹ کر نشیب میں چلی گئی۔ عادل کے سر اور سینے پر شدید چوٹیں آئیں۔ اسے واپس لاہور لے جایا جا رہا تھا مگر ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

بھائی کی المناک موت نے شانی کو بنیادوں تک ہلا دیا۔ چوہدری ارشاد کی حالت پہلے ہی دگرگوں تھی۔ اس واقعے کے بعد انہیں حقیقی معنوں میں جان کے لالے پڑ گئے لیکن شاید یہ ان کی استقامت اور سخت جانی ہی تھی جس نے ان کی سانسوں کی ڈور برقرار رکھی ہوئی تھی۔ عادل کی اس اچانک موت پر رنگ والی اور گردنواح کے دیہات میں کئی روز تک سوگ منایا گیا۔ یہ علاقہ اپنے مستقبل کے چوہدری سے محروم ہو گیا تھا۔ چھوٹے چوہدری عادل کے سر پر پندرہ پنڈوں کی پگ تھی۔ یہ سرائی تمام گلوں سمیت قبر کی مٹی میں دفن ہو گیا تھا۔ رنگ والی کے جوان چوہدری کی کہانی کتنی جلدی شروع ہو کر کتنی جلدی ختم ہو گئی تھی۔ ابھی صرف چند ہفتے پہلے وہ بڑے طمطراق سے چوہدری فائے کے خلاف میدان میں اُتر تھا۔ اسے سینکڑوں پُر جوش مداحوں نے اپنے کندھوں پر سوار کر کے اکھاڑے تک پہنچایا تھا۔ بعد میں سب کچھ کتنی جلدی ہو گیا تھا۔ لڑائی..... شکست..... مایوسی..... موت سارے مرحلے کتنی جلدی طے ہوئے تھے۔

رنگ والی کی پُر شکوہ حویلی اپنی بنیادوں تک ہل چکی تھی۔ چوہدری ارشاد اپنی ساری شان و شوکت کھو کر بستر سے لگے ہوئے تھے۔ چوہدری مشتاق ہنگامے میں مہلک چاقو کا شکار ہو کر رانی عدم ہو گئے تھے اور اب چھوٹا چوہدری بھی اچانک زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ ان تین سرکردہ افراد کے بعد کھیت اجڑ رہے تھے۔ باغ ویران ہو رہے تھے اور قرض خواہوں کا گھیر حویلی کے گرد جنگ سے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

عادل کی آخری رسومات میں فاخر کے علاوہ مہرجی اور بھابو نے بھی شرکت کی تھی۔ بھابو بڑی دیر تک شانی کے گلے لگ کر روتی رہی۔ اس کے آنسو جیسے تھمنے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ وہ سسک کر بولی۔ ”شانی! ہم نارپور والے تیرے لئے کتنے منحوس ثابت ہوئے ہیں۔ پہلے تیرے چاچا گئے، اب پیارا بھائی بھی ساتھ چھوڑ گیا۔ باپ علیحدہ..... بستر پر پڑا ہوا ہے۔ ایمان سے شانی! میرے بس میں ہوتا تو میں تیرے سارے دکھ لے لیتی۔ اگر میری زندگی کی کوئی خوشی ہے تو میں رب سے دعا کرتی ہوں کہ اے مالک میری یہ خوشی شانی کو اور اس کے گھر والوں کو دے دے۔“

بھابو دیر تک شانی کے پاس بیٹھی رہی۔ اس سے باتیں کرتی رہی۔ اس کی ہمت بڑھاتی رہی اور پھر باتوں کے دوران میں اس نے بڑے درد اور بڑے اخلاص سے کہا۔ ”شانی! تیرے بعد بڑی اُداس رہتی ہوں۔ بچے بھی ہر وقت تیرا نام لیتے ہیں اور حویلی کے ملازم تو اٹھتے بیٹھتے تیرے نام کی مالا جپتے ہیں لیکن..... سچ پوچھو تو میرا دل چاہتا ہے کہ تو کبھی اس حویلی میں نہ آئے۔ وہ حویلی نہیں قید خانہ ہے اور اس قید خانے کا داروغہ فاخر ہے۔ مہرجی کو تو بڑا داروغہ کہہ سکتی ہے۔ یہ دونوں ظالم داروغہ مل کر قیدیوں کو ہر وقت سولی پر لٹکائے رکھتے ہیں۔ تو اس حویلی کی دوہٹی بن کر وہاں گئی تھی۔ پر تو حویلی کی دوہٹی نہیں تھی، تو تو قید خانے کی دوہٹی تھی۔ میں تیرے آنے والے دنوں کا سوچتی ہوں تو میرا دل رونے لگتا ہے۔ پتا نہیں..... پتا

نہیں اس فافے نے کیا کرنا ہے تیرے ساتھ۔ وہ اتنی آسانی کے ساتھ اپنا رستہ تجھ سے علیحدہ نہیں کرے گا۔“

”بھابو! کیا کہنا چاہتی ہے تُو؟“

”میں کچھ کہنا نہیں چاہتی..... لیکن..... میرا دل تیرے لئے ڈرتا رہتا ہے۔ تُو بڑی اچھی ہے شانی۔ بالکل پھول کیوں کی طرح ہے۔ اس زمانے کی ہوا بڑی گرم اور زہریلی ہے۔ یہ تو پتھروں کو بھی جلا کر کوئلہ کر دیتی ہے۔“

”مہرجی کا کیا حال ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”وہی تو سارے فساد کی جڑ ہے۔“ بھابو نے بے حد تنگی سے کہا۔ ”بزرگ ہے اس کے بارے میں اس طرح بات کرنے کو دل نہیں چاہتا لیکن اس کے کرتوتوں پر نظر جاتی ہے تو پھر دل میں کوئی لحاظ باقی نہیں رہتا۔ سچ ذات کا بندہ بڑی کرسی پر بیٹھ جائے تو پھر بھی اس کا چھوٹا پن نظر آتا رہتا ہے۔ مہرجی کے اندر دشمنی کی آگ جل رہی ہے۔ یہ آگ تجھ تک پہنچنا چاہتی ہے۔ تیری حیاتی کو برباد کرنا چاہتی ہے۔“ بھابو کی سیاہ آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ڈر ہے کہ یہ آگ تجھ تک پہنچ جائے گی۔ اس لئے کہ تجھے بچانے والے ہتھ کمزور پڑ رہے ہیں۔ آجاکے تیرے ابا جی رہ گئے ہیں۔ وہ بیمار پڑے ہیں۔ آمدن ختم ہو گئی ہے قرضے چڑھتے جا رہے ہیں۔ میرے خیال میں آٹھ دس لاکھ کا قرضہ تو فاکر کا ہی ہوگا۔ وہ کسی بھی وقت اپنی رقم مانگ سکتا ہے۔“

بھابو اور شانی دیر تک اپنے دُکھڑے سناپی رہیں اور پھر ڈھیر ساری نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ بھابو نارپور واپس چلی گئی۔

یہ تین دن بعد کا واقعہ ہے۔ شانی صبح سویرے اپنے گلاب کے پھولوں کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ پھولوں کی پتیوں پر شبنم کے قطرے تھے۔ شاید شانی کے پھول بھی شانی کی طرح آبدیدہ تھے۔ کچھ دیر بعد واحدی سر جھکائے پھولوں کے پاس پہنچا اور شانی سے قریب آدس فٹ کی دوری پر بیٹھ کر پودوں کو گود ڈی دینے لگا۔

اس کے ہاتھ کھرپے پر حرکت کر رہے تھے مگر لگتا تھا کہ ذہن پورے کا پورا شانی کی طرف متوجہ ہے۔ واحدی کے لمبے چمکیلے بال رخساروں پر جھول رہے تھے اور آنکھیں سرخ اور متورم نظر آتی تھیں۔

اچانک واحدی نے دھیمی اور نہایت گھمبیر آواز میں ایک فقرہ کہا۔ اس عجیب فقرے نے شانی کو سرتا پا ہلا دیا۔ واحدی نے کہا تھا۔ ”بی بی! میں مہرجی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔“

شانی نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو واحدی؟ تم ہوش میں تو ہو؟“

”ہاں بی بی! میں ہوش میں ہوں اور سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔“ واحدی کی آواز بدستور دھیمی اور گھمبیر تھی۔ ”میں مہرجی کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ کاش یہ شخص آپ کے شوہر کا باپ نہ ہوتا۔ میں آپ کو بتاتا کہ اس بندے کے لئے میرے دل میں کتنی نفرت ہے یہ..... بہت کمینہ آدمی ہے بی بی!“

”واحدی!“ شانی نے پھنکار کر کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔

”م..... میں معافی چاہتا ہوں بی بی! مجھے پتا ہے میں اپنے منہ سے بڑی بات کہہ رہا ہوں لیکن بی بی! دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ سچ ہے۔ مجھے مہر کے بارے میں کچھ ایسی باتوں کا پتا ہے جو شاید اس کے گھر والوں کو بھی نہ ہو۔ کیا آپ اس بات پر یقین کر سکتی ہیں کہ مہر سانپ کا لہو اور سانپ کے پتے کا پانی پی جاتا ہے.....“

شانی کچھ بول نہ سکی۔ اس کے ہونٹ بس لرز کر رہ گئے۔ اسے کچھ عرصہ پہلے کی وہ باتیں یاد آ گئی تھیں جو اسے بھابھو نے بتائی تھیں۔ بھابھو نے بھی شانی پر کچھ اسی طرح کا انکشاف کیا تھا۔ واحدی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایسی بات کرتے ہوئے شرم آرہی ہے لیکن سچ یہی ہے کہ مہر کی عمر سو سال کے لگ بھگ ہے اس کے باوجود وہ عورتوں کو..... میلی نظر سے دیکھتا ہے۔ نارپور حویلی کی اکثر جوان نوکرانیاں اکیلے میں مہر کے پاس جاتے ہوئے گھبراتی ہیں۔ وہ بڑا عجیب اور گندہ بندہ ہے بی بی۔“

شانی کا چہرہ غصے کی زیادتی سے لال بھسوکا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے لہجے کو قابو میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”واحدی! تم واقعی اپنے منہ سے بڑی بات کر رہے ہو۔ تم نے میرے سامنے میرے گھر کے ایک فرد کو قتل کرنے کی بات کی ہے۔ تمہیں شرم آنی چاہئے۔ میں اس بارے میں مزید کچھ سننا نہیں چاہتی، تم جاؤ یہاں سے۔“

واحدی کا سر مسلسل جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ بظاہر گھر پے پر حرکت کر رہے تھے لیکن ذہن پوری طرح شانی کی طرف تھا۔ وہ دبی آواز میں بولا۔ ”بی بی! جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ کی ہمدردی میں کہہ رہا ہوں۔ آپ کا نمک خوار ہوں چپ نہیں رہ سکتا۔ بس آج میری بات سن لیں، پھر کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔“

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ شانی کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے مزید بات کرنے کا اذن مل گیا ہے۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ دور برآمدے میں دونو نوکرانیاں مولی والے پراٹھے پکانے کے لئے مولیاں کدو کھس کر رہی تھیں۔ مین گیٹ کے پاس تین چار مزارعے ایک آڑیل نیل کو کھینچنا کر باہر لے جا رہے تھے۔ خادم حسین دودھ سے بھرے ہوئے برتن اپنی نگرانی میں اندر لا رہا تھا۔ ہر کوئی اپنے کام میں مگن نظر آتا تھا۔ واحدی نے کہا۔ ”میں واقعی اپنے منہ سے بڑی باتیں کر رہا ہوں بی بی لیکن کیا کروں۔ جو میرے دل میں ہے آپ سے کہہ دینا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ ناراض ہوں لیکن..... لیکن سچ وہی ہے جو آپ سے کہہ رہا ہوں۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”بی بی! ایک شخص ایسا ہے جو آپ کے گھر کا بندہ ہے۔ آپ کے بہت قریب بھی ہے لیکن..... وہ اصل میں آپ کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ آپ کو دھوکے میں رکھ رہا ہے۔ اس کی وجہ سے آپ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

اس ساری گفتگو میں واحدی نے دوسری مرتبہ سر اٹھایا۔ ایک لمحہ کے لئے شانی کی آنکھوں میں دیکھا پھر سر کو دوبارہ جھکا کر بولا۔ ”بی بی..... آپ کے چاچا رچیس!“

شانی کی رگوں میں خون کی جگہ آگ دوڑ گئی۔ ایک لمحے کے لئے اسے یوں لگا کہ آنکھوں کے سامنے سُرخ دھند پھیل گئی ہے۔ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے لئے غصے کی ایک بلند لہر شانی کے سینے میں اٹھی۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ گھوما اور چٹاخ کی زوردار آواز سے واحدی کے رخسار پر پڑا۔ شانی کی کئی چوڑیاں ٹوٹ کر اس کی نازک کلائی میں کھب گئیں۔ طمانچے کے زور سے واحدی کے لمبے سیاہ بال اچھل کر رہ گئے۔ وہ بیٹھا بیٹھا ہی ذرا سا ڈگر لگا گیا۔ اس کی حیرت زدہ نگاہ ایک ثانیے کے لئے شانی کی نگاہ سے ٹکرائی اور پھر جھک گئی۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے..... دفع ہو جاؤ!“ شانی ادھر ادھر دیکھ کر پھنکارتی ہوئی بولی۔

شکر کا مقام تھا کہ کسی کی نظر بھی گلاب کے پودوں کے اس پار اس ڈرامائی منظر پر نہیں پڑی تھی۔ نہ ہی شاید طمانچے کی آواز نے کسی کے کان تک رسائی حاصل کی تھی۔ واحدی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شانی کی دائیں کلائی لمحوں میں لہو لہان ہو گئی تھی۔ دوسری طرف واحدی کے رخسار پر بھی طمانچے کا سُرخ نشان دکھائی دینے لگا تھا۔ نشان کا زیادہ تر حصہ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی میں چھپ کر رہ گیا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے واحدی کی نظر شانی کی لہو لہان کلائی پر پڑی اور وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر رہ گیا۔ یوں لگا جیسے وہ اپنے رخسار پر لگنے والا طمانچہ بھول گیا ہے اور اس کی ساری توجہ شانی کی رنگین کلائی کی طرف چلی گئی ہے۔

شانی نے شدید غصے کے عالم میں رُخ پھیر اور برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ واحدی بھی سستے ہوئے قدموں سے احاطے کی طرف چلا گیا تھا۔ ٹوٹنے والی دو چوڑیوں نے شانی کی کلائی پر تقریباً دو انچ لمبا زخم لگایا تھا۔ خون مسلسل نکل رہا تھا۔ وہ اندر گئی تو پچھو آ منہ بُری طرح چونک گئیں۔ ”ہائے میں مر گئی۔ یہ کیا ہوا؟“

”کک..... کچھ نہیں پھوپھی! میڑھی پر پاؤں پھسل گیا ہے۔“

”پاگلے! تُو نے تو بانہہ کا ستیاناس کر لیا ہے۔“ پچھو نے کہا پھر وہ انوری اور مختاری وغیرہ کو آوازیں دینے لگیں۔

ذرا سی دیر میں شانی کے گرد جمگھٹا لگ گیا۔ جھتیا سفیان جلدی سے نکلے اور دوائی لے آیا۔ ایک صاف اور زہنی سے لمبی پٹی پھاڑی گئی۔ روئی وغیرہ رکھ کر خون بند کیا گیا اور پٹی باندھ دی گئی لیکن ہوا یہ کہ دو ہی منٹ بعد ساری پٹی پھر خون سے بھیگ گئی۔ پٹی کھول کر دوبارہ کی گئی وہ بھی ذرا سی دیر میں تر ہر ہو گئی۔ بابا فخری بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی نازک ٹکٹ گئی ہے۔ ڈاکٹر کو بلا نا پڑے گا۔“

سب لوگ پریشان نظر آنے لگے تھے۔ پچھو نے شانی کا ہاتھ اونچا کر کے پکڑ رکھا تھا تاکہ دباؤ کی وجہ سے خون زیادہ نہ نکلنے لگے۔ دس پندرہ منٹ بعد رنگ والی کا اکلوتا ڈاکٹر شہزاد بھی بھاگا ہوا پہنچ گیا۔ اسی دوران میں شانی کے ”میڑھی پر پھسلنے“ اور زخمی ہونے کی خبر پوری حویلی میں پھیل چکی تھی۔ ڈاکٹر شہزاد نے پہلی پٹی کھول کر زخم کو برف کے پانی سے لگا تار دھویا پھر اچھی طرح اینٹی بائیوٹک پاؤڈر لگا کر پٹی کر دی۔ پٹی کی حالت سے ظاہر تھا کہ خون رکنا شروع ہو گیا ہے۔

کچھ فرصت ملی تو شانی کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ واحدی نے جو کچھ کہا تھا اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کے کانوں میں گرم سیسہ اٹھایا گیا ہے..... لیکن اب جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا وہ واحدی کے الفاظ پر غور کرنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ جو سوچیں اس

کے دماغ میں آرہی تھیں وہ اس کے لئے بہت ناپسندیدہ تھیں۔ وہ اپنے چاچا کے بارے میں اس قسم کا گمان کرنا بھی گناہ سمجھتی تھی۔ وہ بڑے کرب کے ساتھ بار بار اپنے خیالات کو جھکنے کی کوشش کر رہی تھی مگر پوری طرح کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔

ایک کے بعد ایک بات اس کے ذہن میں آرہی تھی اور ہر نئی بات کے ساتھ ایک ناپسندیدہ شبہ اس کے اندر پروان چڑھ رہا تھا۔ چاچا رئیس کے ساتھ فاخر کا گہرا کاروباری تعلق تھا۔ چاچا کے مفاد فاخر سے وابستہ تھے۔ شانی کے ابا جی کو فاخر کے قریب لانے والے بھی چاچا رئیس ہی تھے۔ شانی کے رشتے میں بھی سب سے زیادہ کردار چاچا رئیس نے ہی ادا کیا تھا۔ بعد ازاں جب ہنگامے میں شانی کے چھوٹے چاچا مشتاق کی جان گئی اور بہت سے لوگوں نے کہا کہ اس قتل کے لئے نارپور کے چوہدریوں پر مقدمہ درج ہونا چاہئے تو یہ چاچا رئیس ہی تھے جنہوں نے مختلف دلیلیں دے کر اس رائے کو غلط ثابت کیا۔ شانی سوچتی رہی اور نئی باتیں اس کے سامنے آتی رہیں پھر ایک اور واقعہ اس کے ذہن میں آیا اور وہ بری طرح چونک گئی۔ چند ہفتے پہلے شانی اور اس کے ابا جی کو ایک بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس نقصان نے ان کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی تھی اور شاید یہی نقصان عادل کی بے وقت موت کا سبب بھی بنا تھا۔ وہ لاکھوں کے زیورات جو شانی نے تایا معصوم کے سپرد کئے تھے راستے میں نامعلوم افراد نے لوٹ لئے تھے۔ ان زیورات کی لاہور روانگی کے بارے میں شانی اور تایا معصوم کے سوا صرف چاچا رئیس کو معلوم تھا۔

”نہیں..... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ چاچا رئیس اس حد تک نہیں گر سکتے۔“ شانی نے ٹپ کر سوچا۔

”یقیناً..... وہ شبہ کا شکار ہو رہی ہے۔ ایک اجنبی کی باتوں میں آکر اپنے چاچا کے بارے میں غلط سوچ اختیار کر رہی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

وہ اپنی سوچ کا رخ بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک بار وہ کامیاب ہو جاتی تھی دوسری بار ناکام..... اور جب وہ ناکام ہوتی تھی تو اس کے پردہ تصور میں آپوں آپ واحدی کی شبیہ ابھر آتی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور رخسار پر تھپڑ کا نشان تھا۔ اگر..... واحدی نے غلط نہیں کہا تھا تو پھر شانی نے کتنا غلط کیا تھا۔ اس نے اسے مارا تھا۔

وہ کمرے میں بند رہی اور دن دھیرے دھیرے شام کی طرف بڑھتا رہا۔ شانی نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا اب بھی بھوک اس سے کوسوں دور تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا شانی کے دل و دماغ میں وہ ناپسندیدہ شک مضبوط ہو رہا تھا جس کا تعلق اس کے چاچا رئیس سے تھا۔ چاچا رئیس کے حوالے سے بے شمار سوال اس کے ذہن میں پیدا ہو گئے تھے اور وہ ان کا جواب چاہتی تھی۔

پچھواور سیکنڈ کے بے حد اصرار پر شانی نے رات کو کئی کی روٹی کے چند لقمے لئے اور تھوڑا سا دودھ پیا۔ وہ اپنے کمرے میں بستر پر چٹ لیٹی تھی اور ابتدائی راتوں کا چاند مغربی کھڑکی میں اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ ذہن پریشان تھا اس لئے منتشر خیالوں کے گھوڑے مختلف اطراف میں دوڑ رہے تھے۔ زندگی میں کم ہی موقع ایسے آئے تھے جب وہ مشغول ہوئی تھی اور اس کا ہاتھ کسی پر اٹھا تھا۔ اب تک کی زندگی میں بمشکل چار پانچ ایسے موقع اسے یاد تھے۔ ان میں سے دو موقع اہم تھے۔ ایک وہ جب خدا بخش کے کنوئیں پر اس نے فاخر کو طمانچہ مارا تھا اور دوسرا آج جب

واحدی کے رخسار پر اس کا ہاتھ پڑا تھا۔ یہ دو ٹماٹھے تھے لیکن دونوں ٹمانچوں کے اثرات کتنے مختلف تھے۔ فاخر نے ٹمانچہ کھانے کے بعد شانی کو ایسی نظروں سے دیکھا تھا جو اسے آج بھی یاد تھیں۔ ان نظروں میں بلا کی حرارت اور عداوت تھی۔

آج یہی صورت حال واحدی کے ساتھ پیش آئی تھی لیکن اس کی نگاہوں میں کچھ اور ہی نقشہ ابھرا تھا۔ ایک بے بسی ایک غم زدہ حیرت ایک

<http://kitaabghar.com>

ندامت..... ہاں کتنے مختلف نتائج تھے ان دونوں حادثات کے۔

شانی نے فاخر کی شعلہ برساتی نگاہیں یاد کیں تو اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔ وہ سب کچھ جو رخصتی کے بعد نار پور کی حویلی میں اس پر بیتا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی ”خواہش“ کو اپنی دوشیزگی سوئپ کر محبت پانا چاہتی تھی لیکن اس سے نفرت کی گئی تھی۔ اسے تذلیل کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اسے وہ سب راتیں یاد تھیں جب اس نے دل کی گہرائی سے اپنا تن من اپنے مجازی خدا پر نچھاور کرنا چاہا تھا۔ ایسی راتوں میں اس سے تو بین آ میز بے رخی اختیار کی گئی تھی اور اسے وہ راتیں بھی یاد تھیں جب وہ اپنے آپ سے دور تھی کسی غم کے سمندر میں غوطہ زن تھی لیکن اس کے شوہر نے اسے اپنی کرخت ہانہوں میں سمانے پر مجبور کیا تھا۔ کیا ایسے بھی محبت ہوتی ہے؟ کیا ایسے بھی زندگی میں پھول کھلائے جاتے ہیں؟ وہ جب ایسے موقعوں کا تصور کرتی تھی تو فاخر کے کانٹوں بھرے چہرے اور بالوں بھرے جسم کے لئے ایک شدید گریز اس کے اندر جنم لیتا تھا۔ وہ بڑی گھبراہٹ سے سوچتی تھی کیا زندگی میں پھر ایسے شب و روز آئیں گے جب نار پور کی حویلی میں وہ فاخر کے رحم و کرم پر ہوگی؟ اور اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ اس صورت حال سے کس طرح عہدہ برآ ہوگی۔

چاند کھڑکی کے عین وسط میں آ گیا تھا۔ کہیں کسی کتاب میں پڑھا ہوا لوک گیت لفظ لفظ شانی کے ذہن میں اُترنے لگا۔ مفہوم کچھ اس طرح تھا۔ وہ مجھے چھمکوں سے مار کر میری سست رگی چوڑیاں توڑ دے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

مجھے کانٹوں پر گھسیٹے اور مجھے بھوکا رکھے۔

وہ پوہ ماگھ کی سردی میں مجھے ملل کے کپڑے پہنائے اور

میرے سر کو چھت بھی نہ دے

لیکن مجھ سے پیرا تو کرے

میں پیار کی بھوکی میں کملی میں جھلی

<http://kitaabghar.com>

میرے اندر عشق نے اودھم مچایا ہے

میں ٹوٹ کر پیار کرنا چاہتی ہوں

کسی کے لئے مرجانا چاہتی ہوں

اور چاہتی ہوں کہ کوئی میرے لئے مرجانے کا حوصلہ رکھے۔

<http://kitaabghar.com>

میں کملی میں جھلی۔

..... رنگ والی کی بھیدوں بھری رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ شانی کے خیالات مختلف اطراف میں سفر کر رہے تھے۔ واحدی نے

جو کچھ مہرجی کے بارے میں بتایا تھا وہ شانی کے ذہن کے نازک تاروں پر ایک بھاری بوجھ کی طرح رکھا ہوا تھا۔ جیسے کوئی بھاری بھر کم سانپ کندلی مارے بیٹھا ہو اور دھیرے دھیرے پھنکار رہا ہو۔ مہرجی کے بارے میں ایسی ہی باتیں وہ پہلے بھابو سے بھی سن چکی تھی اور خود بھی بہت کچھ محسوس کر چکی تھی۔ جونہی مہرجی کا تصور شانی کے ذہن میں آتا تھا ایک طرح کا پراسرار ڈر بھی سانس لینے لگتا تھا۔

شانی نے اس تصور کو ذہن سے جھٹکا اور کھڑکی میں دیکھنے لگی۔ چاند کھڑکی کے دائیں کنارے کو چھونے لگا۔

خوشگوار ہوانے حویلی کے مینوں کو دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا تھا۔ بس مین گیٹ کی طرف سے رات کے چوکیداروں کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ شانی کے حساس دل میں واحدی کے لئے ہمدردی کی ایک بلند لہر اٹھ رہی تھی۔ یہ خالص ہمدردی تھی۔ اس میں کوئی اور جذبہ شامل نہیں تھا۔ یہ وہی ہمدردی تھی جو چند ماہ پہلے واحدی کو زخمی حالت میں دیکھ کر شانی کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ اب یہ ہمدردی ایک لہر کی طرح شانی کے کول جسم سے نکل رہی تھی۔ اس کے سینے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی اور اس کی جان کو بے قرار کر رہی تھی۔ اس کا دل اسے ملامت کر رہا تھا۔ ”شانی! تجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس شخص کا تجھ پر اور سیکنہ پر ایک بہت بڑا احسان بھی ہے۔ کم از کم اس احسان کے بدلے ہی تو اس کی خطا کو معاف کر دیتی۔“

ایک بار پھر شانی کے تصور میں وہ ”دردناک حیرت“ ابھر آئی جو نائے کا تھپڑ کھانے کے بعد واحدی کی مغموم آنکھوں میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ بے چین ہو کر اپنے بستر سے اٹھ گئی۔ اس نے دیوار سے موٹی شال اتاری اور چپل پہن کر برآمدے کی طرف چلی آئی۔ ملازمین کے کوارٹر احاطے کے پرلی طرف شمالی گوشے میں نظر آ رہے تھے۔ رات کے اس پہر یہ کوارٹر بھی مکمل سکوت کے گھیرے میں تھے۔ ایک دو کمروں میں ہی مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ شانی دیوار کے ساتھ چلتی ان کوارٹروں کی طرف بڑھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بند کمرے کے سامنے تھی۔ دروازے کی درزوں سے ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ واحدی اسی کمرے میں رہتا تھا۔ رات کے سنائے میں شانی کو اندر سے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ کوئی ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان آنسو بہا رہا تھا۔ یہ واحدی ہی ہو سکتا تھا۔ وہ بے چین ہو گئی۔ اس نے دروازے کی درزوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ ”تجسس“ جیسے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کوارٹر کے عقب میں لے گیا۔ یہاں خود روگھاس تھی اور جھانک جھانک تھا لیکن یہاں کا ایک ایک چپا چپا شانی کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ ایک کھڑکی کی درز میں سے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گئی۔ بلب کی زرد روشنی میں اسے ایک چونکا دینے والا منظر دکھائی دیا۔ واحدی کھجور کی ایک چٹائی پر بیٹھا تھا۔ اس کی دائیں کلائی لہو لہان نظر آ رہی تھی۔ ایک دو جگہ سے تو گوشت کٹ کر نیچے لٹک گیا تھا۔ جس خون آلود پیچ کس سے کلائی پر زخم لگائے گئے تھے وہ بھی قریب ہی پڑا تھا۔ یہ زخم واحدی نے غالباً پانچ دس منٹ قبل خود ہی لگائے تھے۔ اب خون رسنا کم ہو گیا تھا۔ واحدی نے ایک میلی سی پٹی لی اور اسے بے پرواہی سے کلائی پر لپیٹ کر گرہ باندھ لی پھر وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ اب اس کی ہچکیاں تو سنائی نہیں دے رہی تھیں مگر آنکھیں اب بھی اشک بار تھیں۔

شانی کے دل نے گواہی دی کہ واحدی نے اپنے جسم پر یہ زخم صبح والے واقعے کے نتیجے میں لگائے ہیں۔ شانی کی زخمی کلائی کے بدلے میں اس نے اپنی کلائی زخم زخم کر لی ہے۔ اس نے کیوں ایسا کیا ہے؟ کیا شانی کے بدترین خدشات درست ہیں؟ کیا واحدی کے دل میں شانی کے لئے

کوئی ایسا جذبہ پیدا ہو چکا ہے جسے ہرگز ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ جس کے پیدا ہونے کے بارے میں سوچنا بھی شانی کے لئے گناہِ عظیم تھا۔ وہ اندر سے لرز کر رہ گئی پھر شانی کی نگاہ ایک اور شے پر پڑی اور اس کے رہے سبے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

اس نے اپنی آنکھ کھڑکی سے چپکا کر مزید غور سے دیکھا۔

ہاں..... یہ اس کی اپنی ہی تصویر تھی۔ مڑی مڑی سی یہ تصویر واحدی کے عین سامنے جستی ٹرک کے اوپر رکھی تھی۔ کارڈ ساز کی اس تصویر کو ایک ٹائم پیس کے ساتھ یوں لٹکایا گیا تھا کہ وہ عمودی رخ پر کھڑی ہو گئی تھی۔ واحدی..... اپنا سر گھٹنوں میں دیئے ہوئے اسی تصویر کے سامنے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے شانی کے دل میں واحدی کے لئے ہمدردی اور ترحم کے جو جذبات پیدا ہوئے تھے وہ ایک دم کا فور ہو گئے۔ اس کی جگہ ایک طرح کے خوف اور طیش نے لے لی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور سانس سینے میں سانس نہیں رہی تھی۔ ایک اضطرابی حرکت کے ساتھ وہ تیزی سے مڑی اور گھوم کر کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ نے کمرے کے دروازے پر مدھم لیکن طیش بھری دستک دی۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔ شانی کو واحدی کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے اپنی سرخ اور متورم آنکھیں پونچھ لی تھیں۔

”جی بی بی؟“ اس نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسے تقریباً دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ ان لمحوں میں اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر کوئی رات کے اس پہر اسے ایک ملازم کے کمرے میں دیکھ لے تو کیا ہو۔

پہلے اس نے واحدی کے ہاتھوں کی طرف نگاہ دوڑائی، پھر تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ تصویر اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ ”تصویر کہاں ہے؟“ وہ پھنکار کر بولی۔

واحدی کا رنگ زرد ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، شانی کی نگاہ ٹائم پیس کے نیچے تصویر کے سفید کنارے پر پڑ گئی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے واحدی نے تصویر ٹائم پیس کے نیچے دبا دی تھی۔ شانی نے جھپٹ کر تصویر نکالی اور اس پر ایک نگاہ ڈالے بغیر اس کے ٹکڑے کر دیئے۔ واحدی ساکت کھڑا تھا۔

شانی نے ٹرک اور ایک چرمی بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی ہے تمہارا سامان؟“

”جج..... جی.....“

”یہ سامان اٹھاؤ اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہ جویلی چھوڑ دو۔ اگر آدھے گھنٹے کے بعد تم یہاں نظر آئے، تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“ شانی کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔ طیش کے سبب اس کا وجود لرز رہا تھا۔ پھٹی ہوئی تصویر کے ٹکڑے مضبوطی سے اس کی مٹھی میں دبے ہوئے تھے۔

”کک..... کیا میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟“ واحدی کی پھنسی پھنسی آواز ابھری۔

”تم..... ایک لفظ نہیں بول سکتے ہو۔ بس میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ اسی وقت اور آئندہ میں کبھی تمہاری صورت نہ دیکھوں۔“ شانی کا لہجہ بے چلک تھا۔

واحدی نے بس ایک نگاہ شانی پر ڈالی اور پھر ”تسلیم“ کے انداز میں سر جھکا دیا۔ واحدی کی اس آخری نگاہ میں کرب کی فلک بوس لہریں تھیں اور شکووں کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا مگر یہ سب کچھ تسلیم و رضا کے دوشگاف آنسوؤں میں چھپ گیا تھا۔ شانی ہوا کے ایک تیز جھونکے کی طرح اس کے کمرے سے نکل آئی۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ چاند کی روشنی میں مین گیٹ کا منظر دکھائی دیا۔ ایک تانگا حویلی کے دروازے سے نیم پختہ راستے کی طرف جا رہا تھا۔ جسے حویلی چھوڑنے کا اور کبھی شکل نہ دکھانے کا حکم ملا تھا، وہ حویلی چھوڑ رہا تھا، اپنی شکل چھپا رہا تھا۔ وہ دیر تک کھڑکی میں کھڑی رہی۔ کھیتوں کے درمیان بل کھاتے اور اونچے نیچے راستے پر تانگے کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ کیکر اور شیشم کے درخت تانگے کے ہیولے کو دھیرے دھیرے چھپاتے چلے جا رہے تھے۔ ہیولا پر چھائیوں میں گڈمڈ ہو رہا تھا، پھر وہ مکمل طور پر شانی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بس ایک زردی چاندنی نشیب و فراز پر چمکتی رہ گئی۔ تانگے کے اوجھل ہونے کے بعد بھی شانی دیر تک کمرے کی محرابی کھڑکی میں کھڑی رہی پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا دل بھر آیا۔ وہ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ آنسو ایک دم اس کی آنکھوں سے ابل پڑے۔ وہ رونے لگی۔

عجیب صورت حال تھی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ سوچ رہی تھی کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے۔ اسے واحدی کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بے شک وہ غلط راستے پر تھا۔ اس کی سوچ کسی طور پر بھی قابل قبول نہیں تھی لیکن یہ اس کی سوچ تھی۔ ممکن تھا کہ اپنی سوچ پر واحدی کو مکمل اختیار نہ ہو۔ وہ اپنے خیالات کے سامنے بے بس ہو گیا ہو۔ وہ جتنا سوچتی گئی اسے یقین ہوتا گیا کہ ایسا ہی ہے۔ اس نے کئی بار واحدی کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور ان آنکھوں میں ہر بار اسے ایک ایسا منہ زور جذبہ نظر آتا تھا جس کے سامنے ہر مزاحم شے جڑوں سے اکھڑتی محسوس ہوتی تھی۔ اس جذبے کی موجودگی کا احساس شانی کو اندر تک لرزاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ واحدی نامی اس شخص کو جلد از جلد اپنی نظروں سے دور کرنا چاہتی تھی..... اور اب تو اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ واحدی نے شانی کو کسی اور نگاہ سے دیکھا ہے۔ ایک ایسی نگاہ جس کے بارے میں سوچنا بھی شانی کے لئے گناہِ عظیم ہے۔

”تم نے ٹھیک ہی کیا جو اسے نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اس کی موجودگی تمہارے لئے کسی بہت بڑے طوفان کا باعث بن سکتی تھی۔“ شانی کے اندر سے آواز ابھری۔

لیکن پھر فوراً ہی ایک دوسری مخالف آواز نے پہلی آواز کو دبا لیا۔ اس آواز نے کہا۔ ”جو کچھ بھی تھا“ اس کے دل کے اندر تھا۔ سینے کی اتھاہ گہرائی میں چھپا ہوا تھا۔ تمہیں اور تمہاری زندگی کو اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تم مانویا نہ مانو لیکن اس سے تمہارا ایک تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ ایک ذہنی ربط تھا۔ بے شک اس ربط میں کسی طرح کی اخلاقی کج روی نہیں تھی مگر اس ربط کی حقیقت سے تم انکار نہیں کر سکتی ہو۔ واحدی کی موجودگی تمہارے لئے تقویت کا باعث تھی۔ اس کا اخلاص..... نامساعد حالات میں تمہارے لئے سہارا بن سکتا تھا۔ اسے یوں حویلی سے نکال کر تم ایک ہمدرد اور غم گسار سے محروم ہو گئی ہو۔“

پہلی آواز نے مخالفت کی۔ ”جو غم گساری کے بعد غم اور بدنامی کا باعث بنے، اس سے محروم رہنا ہی بہتر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ واحدی کے

دل میں جو کچھ بھی تھا، وہ اس کے دل کے اندر تھا..... لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ اندر ہی رہے گا۔ ایسے جذبے چھپتے نہیں ہیں۔ وہ جلد یا بدیر اپنا آپ ظاہر کرتے ہیں پھر جگ ہنسائی اور ذلت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ واحدی کی آنکھیں گواہ تھیں کہ اس کے اندر جو کچھ بھی ہے، وہ بہت گہرا..... اور خطرناک ہے۔ وہ نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔“

”پھر تو تمہیں اور بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔“ دوسری آواز نے نکتہ آفرینی کی۔ ”تمہیں سوچنا چاہئے تھا کہ یہ منہ زور جذبہ کہیں واحدی کو ہی کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ تم نے صرف اپنی زندگی کے بارے میں سوچا کسی اور کی زندگی کے بارے میں نہیں سوچا۔ آخر وہ بھی تو کسی کا بیٹا ہوگا، کسی کا بھائی ہوگا۔ کچھ لوگوں کے لئے اس کی زندگی بھی تو نہایت قیمتی ہوگی۔ تم نے جس گہرے اور خطرناک جذبے کا ذکر کیا ہے وہ خود واحدی کی زندگی کو بھی تو برباد کر سکتا ہے۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہاری ذہنی اور اخلاقی سطح واحدی سے بہت بلند ہے تو پھر تمہیں بڑے پن کا ثبوت دینا چاہئے تھا۔ ایک دانا ناصح کی طرح واحدی کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اس کی ذہنی گتھی کو سلجھانے کا کام جتنی خوبی سے تم کر سکتی تھیں، کوئی اور نہیں کر سکتا تھا..... لیکن تم نے ایک نادان جلد بازی کی طرح کانٹوں میں الجھے ہوئے نازک کپڑے کو جھٹکے سے چھڑانے کی کوشش کی ہے۔“

شانی کے دل و دماغ میں دیر تک یہ کشمکش جاری رہی۔ چاندنی رات رنگ والی گلی کو چوں میں سرسراتی رہی اور شانی بستر پر لوٹی رہی۔ اس کے ذہن میں بار بار وہ منظر ابھرتا تھا جو اس نے آج رات پچھلے پہر واحدی کے کوارٹر میں دیکھا تھا۔ وہ کسی ”عبادت گزار“ کی طرح شانی کی تصویر کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوتی تھیں۔ اس منظر کا خیال آتے ہی ایک ”کرب آمیز شرم“ کی بلند لہریں شانی کے جسم میں سرایت کر جاتی تھیں۔

☆=====☆=====☆

گرمی عروج پر تھی۔ دوپہر سے ہی سخت جس محسوس ہو رہا تھا۔ پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ سہ پہر کے فوراً بعد آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائیں اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ یوں لگا کہ ہر جاندار اور بے جان شے جھوم اٹھی ہے۔ حویلی کے زنانے حصے میں ملازما مکس صحن میں نکل آئیں اور کپڑوں سمیت نہانے لگیں۔ ان میں نو عمر..... جوان..... اور درمیانی عمر کی سب ہی شامل تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ ہاتھ پائی کر رہی تھیں۔ ان کے جسم پھل رہے تھے، ذول رہے تھے پھر مختاری اندر سے آموں کا ٹوکرا لے آئی۔ آموں کے پیچھے ہی بارش میں نہانے کا مزہ دو بالا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی چھیڑ چھاڑ اور دھینکا مٹتی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ دونوں لڑکیاں جامن کے پیڑ پر چڑھ گئیں اور جھولا ڈالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ انسانی زندگی بڑی عجیب شے ہے۔ ہر حال میں آگے بڑھنے کا راستہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ ماضی قریب میں یہ حویلی دو تین نہایت سنگین حادثوں سے دوچار ہو چکی تھی۔ کئی ہفتوں تک یہاں کی ہر شے غم اور سوگ میں ڈوبی رہی تھی لیکن اب پھر رفتہ رفتہ حالات معمول پر آتے چلے جا رہے تھے۔ تاہم یہ صورت حال صرف ملازمین تک محدود تھی۔ شانی کا دل تو اب بھی غم میں ڈوبا ہوا تھا بلکہ اس سہانے موسم میں زخم کچھ اور بھی ہرے ہو گئے تھے۔ اسے یاد آنے لگا ایسے موسم میں عادل کا موڈ کتنا اچھا ہو جاتا تھا۔ وہ چھٹی کر کے گھر میں بیٹھ جاتا تھا۔ دونوں بہن بھائی خوب انجوائے کرتے تھے۔ عادل اکثر بیسن کے حلوے کی فرمائش کر دیتا تھا اور اس کی شرط یہ ہوتی تھی کہ شانی اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلائے گی۔ جواب میں شانی اور

چاچا مشتاق چونسے آموں کی فرمائش کر دیتے تھے پھر یہ آم جہاں سے بھی ملتے عادل کو منگوانے ہی پڑتے تھے۔

چاچا مشتاق تو قلمی آموں کے دیوانے تھے۔ وہ پٹی اٹھا کر حویلی کی چھت پر چلے جاتے تھے۔ تابڑ توڑ بارش میں چھت کے عین درمیان آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے تھے اور عادل کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیتے تھے۔ سفیان ان کی دُم بٹا رہتا تھا۔ شانی برسائی کے چھجے تلے بیٹھ کر ان کی خرمستیاں دیکھتی تھی۔ آج وہی بارش تھی۔ وہی درود یوار تھے مگر شانی کا پیار ابھائی نہیں تھا۔ اس کے چہیتے چاچا مشتاق نہیں تھے اور ان دونوں کے وہ زندگی سے بھرپور قہقہے بھی نہیں تھے جو بادلوں کی گھن گرج سے ہم آہنگ ہو کر ماحول کو حسین تر بناتے تھے۔

مختاری اور انوری وغیرہ کی خواہش تھی کہ شانی بھی صحن میں آجائے اور نہانے میں ان کے ساتھ شریک ہو جائے..... مگر شانی تو کہیں بہت دور تھی۔ پچھلے موسموں کی بھول بھلیوں میں گھوم رہی تھی۔ ایک برسات حویلی کے صحن میں تھی اور ایک اس کے سینے کے اندر جل تھل کر رہی تھی۔

اتنے میں بابا فخری کالے رنگ کی چوڑی چھتری سر پر تانے ہوئے زنانے میں داخل ہوا۔ صحن میں اودھم مچاتی عورتیں بابے فخری کے احترام میں ایک طرف سمٹ گئیں۔ ان میں سے کچھ اپنے تر بتر جسم اپنی بیگنی اور ہڈیوں میں چھپانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ان شوخ عورتوں پر ایک ناراض نگاہ ڈالنے کے بعد بابے فخری نے اپنی توجہ شانی پر مرکوز کر دی۔ بابے فخری کے ہاتھ میں براؤن رنگ کا ایک بڑا لفافہ تھا۔ اس پر ڈاک کے ٹکٹ اور مہرے وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔

”چھوٹی بی بی! رجسٹری والا ڈاک کیا یہ لفافہ دے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کوئی نوٹس وغیرہ ہے۔“ بابے فخری نے ادب سے کہا۔

شانی کا دل انجانے خدشات سے دھڑک اٹھا۔ لفافہ دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی عدالتی حکم وغیرہ ہے۔ حالات ایسے تھے کہ اب کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ وہ جلدی سے کمرے میں چلی گئی۔ لفافے پر اباجی کا نام تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا..... اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔ یہ قرتی کا نوٹس تھا۔ قرض خواہوں کی دادری کے لئے اعلیٰ عدالت نے رنگ والی کی حویلی اور اس سے ملحقہ زمین قرق کرنے کی کارروائی شروع کر دی تھی۔

شانی نے مکمل حکم نامہ پڑھا اور پھر بے دم سی ہو کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اوہ خدا یا یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا چرخ کج ادا کی طرف سے وارد ہونے والے سارے ستم اسی حویلی کے لئے رہ گئے ہیں؟ کیا ہر دنیاوی آفت کا رخ انہی درود یوار کی جانب ہے؟

وہ رات تک غم و اندوہ کے گہرے سمندر میں ڈوبی رہی۔ اس کی نازک جان جیسے کسی آہنی شکنجے میں کستی چلی جا رہی تھی۔ کوئی بھی تو ہمدرد نہیں تھا۔ کسی بھی نمگساری کا آسرا نہیں تھا۔ وہ اباجی کی حالت کو بھی بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ ان کی زندگی تیز ہوا میں رکھے ہوئے چراغ جیسی ہو گئی۔ شانی کو ہر گھڑی کسی بے رحم جھونکے کا دھڑکا رہتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اباجی تک یہ خبر پہنچائے گی۔

”میں کیا کروں؟ میں کہاں جاؤں؟“ اس نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔

آنکھوں کے سامنے پانی کی چادر سی تن گئی۔ کیا یہ درود یوار ان سے چھین لئے جائیں گے۔ کیا پُرکھوں کی امانت یہ حویلی ان سے جدا ہو جائے گی؟ نہیں..... نہیں یہ ستم ناقابلِ برداشت ہوگا۔ اس حویلی کی ایک ایک اینٹ میں بچھڑنے والوں کی آوازیں محفوظ ہیں۔ ایک ایک گوشے

میں یادوں کے خزانے دفن ہیں۔ یہاں تہوار منائے گئے ہیں، یہاں ساگرہ ہوئی ہیں، یہاں خوش رنگ موسموں کو خوش آمدید کہا گیا ہے۔ اس حویلی کے ذروں میں ماں کا پیار رچا ہوا ہے۔ بھائی کی محبت، چاچا مشتاق کی شفقت اور پتا نہیں کن کن اٹوٹ رشتوں کی خوشبو اس حویلی میں بسیرا رکھتی ہے۔ اس حویلی کو خود سے کیسے جدا کیا جاسکتا ہے۔ شانی کو لگا کہ اس کا پیارا بھائی اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ وہ بھی ڈبڈبائی آنکھوں سے قرقی کے ان کاغذات کو دیکھ رہا ہے اور سرد آہیں بھر رہا ہے۔

دفن و دفن ہو چنک گئی۔ اسے اپنے عین پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ ابا جی بڑے نحیف انداز میں چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ شانی نے عدالتی کاغذات جلدی سے تکیے کے نیچے گھسید دیے۔ ابا جی ہولے ہولے چلتے سامنے بید کی کرسی پر آ بیٹھے۔ ان کی نگاہیں تکیے ہی کی طرف تھیں۔ ان کے زرد ہونٹوں پر ایک پھکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ”ہماری بیٹی شاید ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”نن..... نہیں ابا جی۔“ شانی نے پوری جان سے لرز کر کہا۔

”میں جانتا ہوں شانی! تم کیا چھپا رہی ہو۔ مجھے چند دن پہلے ہی پتا چل گیا تھا۔“ وہ اطمینان سے بولے۔

شانی ہکا بکا ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید ابا جی کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اس نے سوچا۔ ایسی اندوہناک خبر سننے کے بعد ابا جی کا ردِ عمل یہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔

چوہدری ارشاد نے اطمینان سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”شاید تم میرے اطمینان پر حیران ہو رہی ہو۔ یہ اطمینان بلاوجہ نہیں ہے۔ چند دن پہلے تک میں بھی سخت پریشان رہا ہوں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب اس اندھیرے سے نکلنے کا ایک راستہ نظر آ گیا ہے۔“

”کک..... کیسا راستہ ابا جی؟“

انہوں نے اپنا استخوانی ہاتھ بڑی محبت سے شانی کے کندھے پر رکھا اور بولے۔ ”پوری امید ہے شانی! کہ اب یہ گھر نیلام ہونے کی نوبت نہیں آئے گی..... اور یہ سب کچھ تمہارے چاچا رئیس کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔“

”چاچا رئیس؟“ شانی نے حیرانی سے کہا اور اس کے ساتھ اس کے ذہن میں وہ سب کچھ ابھر آیا جو چاچا کے بارے میں واحدی نے کہا تھا۔ ایک نئی طرح کی بے چینی شانی کے ذہن میں سر اٹھانے لگی۔ وہ ذرا تھکا لپچے میں بولی۔ ”چاچا رئیس کیا کریں گے اس سلسلے میں؟“

”تمہیں پتا ہی ہے لندن میں رئیس کی ایک شاپ ہے۔ یہ مضافاتی علاقہ اب کافی گنجان ہو گیا ہے۔ اس شاپ کی قیمت بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ رئیس نے وہ دکان بیچنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ دکان کتنے کی بک رہی ہے؟“

”کتنے کی؟“ شانی نے پوچھا۔

”کوئی ڈھائی لاکھ پاؤنڈ کی۔ اگر رئیس دو تین سال مزید اس دکان کو نہ بیچے تو وہ دگنی گنی قیمت تک جاسکتی ہے لیکن وہ قربانی دے رہا ہے۔ میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ پرسوں لندن جا رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دو ہفتے کے اندر رقم پاکستان پہنچ جائے گی۔“

”کیا واقعی ایسا ہو جائے گا اباجی؟“

”ضرور ہوگا دھی رانی! جب اندھیرا بہت بڑھ جاتا ہے ناں تو پھر کہیں نہ کہیں سے روشنی کی شکل ضرور نظر آتی ہے۔ وہ اوپر والا سب کچھ دیکھتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو آزماتا ضرور ہے لیکن اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اسی لئے کہتے ہیں ناں کہ اس کے گھر میں دیر بے اندھیر نہیں۔“

اباجی بول رہے تھے مگر شانی کے ذہن میں دُھند سی بھری ہوئی تھی۔ اس کے سامنے کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ ہر منظر دُھندلا دکھائی دیتا تھا۔ یہ تشویش ناک دھندلاہٹ تھی مگر وہ اس دُھندلاہٹ سے اباجی کو آگاہ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔

وہ سارا دن اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہی۔ چا چارنکس سے ملاقات ہوئے آٹھ دس روز ہو چکے تھے۔ یوں تو وہ حویلی میں کم کم ہی نظر آتے تھے مگر پچھلے آٹھ دس روز سے تو بالکل ہی غائب تھے۔ شانی کو پتا چلا تھا کہ کسی کام سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ویزے وغیرہ کے سلسلے میں مصروف رہے ہوں گے۔ چا چارنکس کا بڑا بیٹا ڈیشان انگلینڈ میں ہی پلا بڑھا تھا اور وہیں پریسٹل تھا۔ چا چا کی ایک بیٹی لندن جا چکی تھی۔ کبھی کبھار شانی کے لئے اس کا خط آ جاتا تھا۔

دوسرے روز رات دس بجے کے لگ بھگ شانی پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا۔ چا چارنکس حویلی کے دائیں جانب والے پورشن میں رہتے تھے۔ اس پورشن میں شانی کو ایک نامانوس سی ہلچل محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے پتا چلا کہ چا چا اہل وعیال سمیت جا رہے تھے۔

شاننی نے اس خبر کی تصدیق کی اور یہ خبر درست ثابت ہوئی۔ وہ حیرانی کے عالم میں اباجی کے پاس پہنچی۔ انہیں بتایا کہ صرف چا چارنکس ہی نہیں چاچی بھی جا رہی ہیں۔ شانی کی توقع کے عین مطابق اباجی اس اہم اطلاع سے بے خبر تھے۔ ابھی شانی اور اباجی ایک دوسرے پر اپنی حیرت کا اظہار ہی کر رہے تھے کہ چا چارنکس اور چاچی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے ادب کے ساتھ چوہدری ارشاد کو سلام کیا اور ایک طرف رکھے صوفے پر بیٹھ گئے۔ چوہدری ارشاد نے گاؤں کے سہارے بمشکل اٹھتے ہوئے کہا۔ ”رئیس! میں یہ کیساں رہا ہوں۔ تم سب لندن جا رہے ہو؟“

”ہاں بھاجی! بس ایک دم ہی پروگرام بنا ہے۔ میں کل بھی آپ کو بتانے کے لئے آیا تھا لیکن آپ سو رہے تھے۔ بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دراصل نصرت کے گوڈے کی تکلیف کافی بڑھی ہوئی ہے۔ اب تو اٹھنا بیٹھنا بھی اس کے لئے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ہفتے کے روز اسلام آباد میں ہی ڈیشان کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ امی کو ساتھ ہی لے آئیں۔ وہاں جوڑوں کے بڑے بڑے اچھے ڈاکٹر موجود ہیں۔ اگر آپریشن بھی کرنا پڑا تو آسانی سے ہو جائے گا۔ امید تو نہیں تھی کہ اتنے تھوڑے ٹائم میں کاغذات بھی بن جائیں گے لیکن شکر ہے کہ بن گئے ہیں۔“

”یعنی..... تم سب جا رہے ہو؟“ چوہدری ارشاد نے کمزور لہجے میں پوچھا۔

”ہاں بھاجی! پر آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا اور پیسے تو میں بس چندرہ دن کے اندر ہی بھیج دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

چوہدری ارشاد کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ وہ اگر بولتے تو کیا کہتے۔ شاید وہ کہتے۔ ”رئیس! میں نے ساری زندگی تم سب کی خدمت کی ہے۔ اب مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ بس تھوڑے سے سہارے کی..... تم دیکھ ہی

رہے ہو میں اس وقت بالکل بے آسرا ہوں۔ تمہاری رقم سے بھی زیادہ مجھے اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ میرے بھائی! مجھے اور شانی کو اس وقت تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ۔“

لیکن وہ کچھ بولے ہی نہیں۔ ساری زندگی چپ رہنے والا اور دکھ سننے والا شخص اب کیونکر بول سکتا تھا۔ کیونکر ٹوٹ سکتا تھا۔

شانہی چا چا رئیس کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا دل رور ہا تھا۔ چا چا کے مہربان چہرے اور ہمدرد لہجے کے پیچھے اسے ایک اور انسان نظر آ رہا تھا۔ ایک اجنبی اور قطعی ناقابل فہم شخص۔ اس شخص کے ہونٹوں پر پھول اور دل میں شاید انگارے تھے۔

شانہی کی نگاہیں چا چا کے چہرے پر تھیں۔ اس نے خاموشی کی زبان میں پکار کر کہا۔ ”چا چا مجھے نہیں لگتا کہ تم واپس آؤ گے۔ تم جا رہے ہو شاید ہمیشہ کے لئے۔ اپنے بڑے بھائی کو بیچ منجھدار میں چھوڑ کر تم بڑی بے رحمی کے ساتھ ایک نئی دنیا کی طرف اڑان بھر رہے ہو۔ تم شاید اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکے ہو کہ یہ حویلی ایک تیزی سے ڈوبتا ہوا جہاز ہے۔ تم نے اپنا اسباب سمیٹ کر اس جہاز کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

یہ خاموشی کی زبان تھی اس لئے چا چا رئیس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ شانہی کے پردرد الفاظ بس اس کے سینے میں ہی گونج رہے تھے۔ جو کچھ بھی تھا وہ اس کے بڑے تھے وہ ان کے سامنے بول نہیں سکتی تھی۔ وہ اباجی کو بھی کچھ بتانے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ اسے ہر گھڑی بس یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا کوئی لفظ ہوا کے دوش پر رکھے چراغ کے لئے آخری جھونکا ثابت نہ ہو۔

وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ کچھ نہ بول سکی۔ وہ اجنبی شخص جو اس کا چا چا تھا اپنے اہل و عیال سمیت لندن چلا گیا۔

اور پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جس کی ہولناک جھلک شانہی کئی دن پہلے دیکھ چکی تھی۔ بستر علالت پر چوہدری ارشاد کی آنکھیں منتظر رہیں۔ لندن سے کوئی ڈرافٹ نہیں آیا۔ ڈرافٹ تو دور کی بات ہے کوئی خط، کوئی پیغام، کوئی فون، کچھ موصول نہیں ہوا۔ پندرہ دن گزرے، بیس دن گزرے پھر مہینہ گزر گیا۔ دھیرے دھیرے اصل حالات کی پرتیں کھلتی چلی گئیں۔ چا چا رئیس نہ جانے کب سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ چپکے چپکے انہوں نے اپنا ”بہت کچھ“ پاکستان سے سمیٹ لیا تھا۔ لاہور میں ایک مکان فروخت ہو چکا تھا۔ بینک بیننس اور بینک لاکرز کا سامان لندن منتقل ہو چکا تھا اور کئی کام بھی نمنائے جا چکے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور اندوہناک خبر بھی شانہی کو اباجی کے وکیل کی زبانی ملی۔ نیلے والی غیر آباد زمین جو کاغذات میں چا چا رئیس کے نام تھی، اونے پونے داموں فروخت ہو چکی تھی۔ دوسرے لفظوں میں چا چا رئیس نے حویلی میں اپنا جو حصہ چھوڑا تھا وہ نیلے والی زمین کی قیمت سے پورا کر لیا تھا۔ یہ بڑے سفاک اور مہلک حقائق تھے۔ یہ حقائق چوہدری ارشاد تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن شانہی ان کے سامنے دیوار بنی ہوئی تھی۔ ان حقائق کے سارے دھچکے اپنے سینے پر سہہ رہی تھی..... لیکن ایسا کب تک ہو سکتا تھا۔ آخر تو یہ سب کچھ چوہدری ارشاد تک پہنچنا تھا۔

اور پھر دھیرے دھیرے صورت حال چوہدری ارشاد پر واضح ہونے لگی۔ ان کا خزاں رسیدہ چہرہ مزید زرد ہونے لگا۔ ان کے خشک ہونٹوں کی چوڑیاں مزید سخت ہوتی گئیں۔ اعصاب کو سکون دینے والی دواؤں میں اضافہ کرنا پڑا۔ ایک دن وکیل شاہ نواز صاحب آئے تو خاصے پریشان تھے۔ انہوں نے شانہی کو بتایا کہ قرقی کی آفت کو اب مزید نہیں ٹالا جاسکتا۔ شانہی نے شاہ نواز صاحب کو اباجی کے ساتھ بات کرنے سے روک دیا لیکن خود آگہی کی افیت سے تڑپنے لگی۔ یہ بڑے سخت دن تھے۔ تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ یہ مقولہ اس حویلی کے مکینوں سے زیادہ اور کس پر صادق آسکتا تھا۔ حوادث یکے بعد دیگرے حملہ آور ہو رہے تھے اور پھر ایک دن ایک اور حادثہ دکھ اور پریشانی کا طوفان لے کر رو برو آ گیا۔

نارپور سے فاخر کا منشی رشید لاہور والے کارخانے کے منیجر الطاف کے ساتھ حویلی پہنچا۔ اتفاقاً شانی اس وقت ایک قریبی گھر میں فوتگی پر گئی ہوئی تھی۔ وہ واپس آئی تو اس نے منشی رشید اور منیجر الطاف کو اباجی کے کمرے میں سے نکلتے دیکھا۔ ان دونوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ ایک طویل اور سنجیدہ گفتگو کے بعد باہر نکلے ہیں۔ ان کے جاتے ہی شانی اباجی کے کمرے کی طرف لپکی۔ وہ بستر پر درازم صم لیٹے تھے۔ ماتھے پر پسینے کی نمی تھی۔ جب سے دل کی تکلیف نے شدت پکڑی تھی یہ ان کا انداز ہو گیا تھا کہ گھمبیر بات چیت کے وقت بیٹھنے کے بجائے نیم دراز ہونے کو ترجیح دیتے تھے۔ شاید اس طرح انہیں اپنے دل پر کم بوجھ محسوس ہوتا تھا۔

شانی نے اس موقع پر کوئی بھی بات کرنا مناسب سمجھا اور انہیں دوا کھلانے کے بعد آرام کرنے کو کہا۔ باہر آ کر اس نے بابے فخری سے دریافت کیا۔ بابے فخری نے جو جواب دیا وہ شانی کے خدشات کے عین مطابق تھا۔ بابے فخری نے بتایا کہ فاخر کے ملازمین نے قرضے کی واپسی کے بارے میں بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کارخانے میں کام کا سیزن شروع ہونے والا ہے۔ انہیں ہر صورت پندرہ بیس روز کے اندر قرضے کی رقم واپس چاہئے۔

شانی ایک طویل..... دکھ بھری سانس لے کر رہ گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ”گردش ایام“ انتہا کی طرف مائل ہے۔ تقدیر اپنے ترکش کا کوئی تیرپچا کر رکھنا نہیں چاہتی۔

رات کو شانی پر ایک اور انکشاف ہوا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اباجی کے کمرے میں گئی اور ان سے منشی رشید وغیرہ کی آمد کے بارے میں پوچھا۔ اباجی نے نحیف و نزار لہجے میں وہی کچھ بتایا جو بابے فخری نے بتایا تھا۔ چوہدری فاضل نے اپنے اقدام سے گرتی ہوئی دیوار کو ایک اور دھکا دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنے قرضے کی واپسی کے لئے پندرہ بیس روز کا آخری نوٹس دیا تھا لیکن بات اس کے علاوہ اور بھی تھی اور اس بات کا پتا صرف چوہدری ارشاد کو تھا۔

چوہدری ارشاد چند سیکنڈ تک بے حد خاموش لگا ہوں سے بیٹی کا چہرہ نکلتے رہے پھر بولے ”منشی رشید نے مجھ سے اکیلے میں بات کی ہے۔“

وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ”منشی رشید! مہرجی کا دور کارشتے دار بھی ہے۔ اس کی عمر کی وجہ سے فاخر اس کا نام بھی عزت سے لیتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف ملازم ہی نہیں۔ اس کی کبھی ہوئی بات میں وزن ہے۔“

”اس نے کیا بات کہی ہے؟“ شانی نے بے تابانی سے پوچھا۔

”کہا تو اس نے بہت کچھ ہے شانی..... لیکن اس کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی غلطی مان کر تمہیں از خود نارپور واپس بھیج دیں تو فاخر تمہیں بسانے کو تیار ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو حالات بڑی جلدی سدھر سکتے ہیں۔ منشی رشید کا کہنا ہے کہ اس طرح نہ صرف تمہارا گھر بچ سکتا ہے

بلکہ ہماری پریشانیاں بھی دور ہو سکتی ہیں۔“

شانی کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان پلکوں کے پیچھے دکھ کا طوفان اُٹا آیا تھا۔ چوہدری ارشاد خاموشی سے اپنی من موٹی بیٹی کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کئی سینڈاسی طرح گزر گئے۔ آخر چوہدری ارشاد کی نحیف آواز ابھری۔ ”تمہارا کیا خیال ہے دھی رانی؟“

”آپ کا کیا خیال ہے اباجی؟“ شانی نے الٹا سوال کیا۔

جواب دینے سے پہلے چوہدری ارشاد نے چند لمحے سکوت کیا۔ ان کا چہرہ ساٹ تھا۔ تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ فاخر کے لئے چوہدری ارشاد کا رویہ ہمیشہ مفاہمت کا ہی رہا تھا۔ وہ اپنے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ شاید وہ آج بھی کوئی نرم بات کہنے والے تھے۔ شانی کے کان منتظر رہے۔ آخر چوہدری ارشاد بولے لیکن آج ان کی آواز مفاہمت کی نہیں تھی۔ آج ان کی آواز اس باپ کی آواز تھی جو اپنی مصیبت زدہ اولاد کے دفاع میں سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ آج ان کی آواز میں بے پناہ کمزوری کے باوجود بدبہ اور مزاحمت تھی۔ وہ بولے۔

”نہیں شانی! میں تمہیں نار پور نہیں بھیجوں گا۔“

”لیکن.....“

”بس شانی!“ وہ اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر بولے۔ ”جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ تم اس گھر میں نہیں جاؤ گی۔“

شانی کی پلکوں کے پیچھے چھپے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے وہ باپ کے کندھے سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔ اگلے روز صبح سویرے وہ اباجی کو جگانے ان کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ آج خلاف معمول صوفے پر لیٹے تھے۔ چادر سر تک تانی ہوئی تھی۔ ان کا نحیف و کمزور جسم صوفے کے فوم میں دبا دبا سا تھا۔

”اباجی۔“ اس نے سر ہانے کھڑے ہو کر ملائمت سے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوسری اور پھر تیسری آواز دی۔ تیسری آواز میں شدید اضطراب اور غلٹ تھی۔ اباجی کے جسم میں حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ان گنت خوفناک اندیشے چنگھاڑتے ہوئے اس کے ذہن میں گھس آئے..... وہ تڑپ کر اباجی کے سر ہانے پہنچی اور چادر ان کے چہرے سے کھینچ لی۔ اباجی کا کمزور لیکن محبوب چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے اباجی کو جھنجھوڑ کر اور درد سے چیخ کر پکارا۔ اباجی نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں پھر شانی کے ہاتھ کا سہارا لے کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شانی کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

”کیا ہوا؟“ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ شانی ان کو چھو کر اور ناک سے سوس سوس کی آواز نکال کر بولی۔

وہ چند سینڈ تک بیٹی کا چہرہ دیکھنے کے بعد بولے۔ ”شاید تم میرے لئے ڈر گئی ہو۔ تم نے سوچا ہوگا کہیں کچھ ہوئی نہ گیا ہو۔ نہیں دھی رانی..... مجھے یقین ہے میں تجھے اس منجھار میں چھوڑ کر نہیں مروں گا۔ اگر مر گیا تو شاید قیامت تک میری روح بھٹکتی رہے.....“

”اباجی! ایسی باتیں مت کیا کریں۔“ وہ روپائی ہو کر بولی۔

”اب ایسی ہی باتیں کرنے کا وقت ہے شانی۔ تم دیکھ ہی رہی ہو۔ اب میں زیادہ دیر جیوں گا نہیں لیکن اب جتنے دن بھی جیوں گا تیرے لئے جیوں گا۔ اپنی دھی رانی کے لئے..... اپنی جان کے لئے۔“ جذبات کے بوجھ سے چوہدری ارشاد کی آواز کانپ رہی تھی۔

”اباجی..... آپ زیادہ باتیں نہ کریں۔ آپ لیٹ جائیں۔“ وہ التجا سے بولی۔

”نہیں پتر! یہ لیٹنے کا نہیں اٹھنے کا وقت ہے۔“ انہوں نے کہا اور سچ مچ کھڑے ہو گئے۔ ان کا استخوانی سیدہ تنا ہوا تھا اور بیمار آنکھوں میں نئے عزم کی چمک تھی۔ انہوں نے کھونٹی سے اپنی سفید بے داغ پگڑی اتاری اور اس کے بل درست کرتے ہوئے بولے۔ ”معصوم بھائی کہاں ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ ابھی مسجد سے نہیں آئے ہوں گے۔“ شانی نے کہا۔

”میں نے اسے کہا ہے کہ آج وکیل شاہ نواز اور بڑے وکیل عبداللہ کو بلائے۔ عبداللہ دیوانی مقدموں میں بڑا تجربہ کار ہے۔ میں اب مہر اور فاخر کے ساتھ قانونی لڑائی لڑوں گا۔ ہر جگہ پوری طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ کروں گا۔ میری بیٹی کوئی گارمولی ہے کہ وہ اکھاڑ کر لے جائیں گے۔ میں انہیں بتا دوں گا کہ ایک باپ جب اپنی بیٹی کا تحفظ کرنے پر آتا ہے تو کہاں تک جاسکتا ہے۔“

چوہدری ارشاد کے سوکھے گلے کی رگیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں آگ روشن تھی۔ شانی کو لگا کہ وقت دس پندرہ سال پیچھے چلا گیا ہے۔ جب اس کے اباجی کی پچائیت میں بڑے بڑے سرکاری افسر آکر بیٹھے تھے۔ جب رنگ والی کا چوہدری بولتا تھا اور ایک زمانہ سنتا تھا، لیکن کیا وقت واقعی دس پندرہ سال پیچھے چلا گیا تھا؟ نہیں..... وقت اپنی ”موجودہ جگہ“ پر ہی تھا۔ تھوڑا سا بولنے سے ہی چوہدری ارشاد کا سانس پھولنے لگا تھا۔ ان کے ہونٹوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بولتے، شانی نے آہستگی سے کہا۔ ”اباجی! مجھے کچھ سوچنے کے لئے تھوڑی سی مہلت دیجئے..... بس تھوڑی سی مہلت!“

چوہدری ارشاد نے قدرے حیرت سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے دوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔

اس رات شانی بڑی دیر تک بند کمرے میں ماں کی تصویر کے سامنے بیٹھی رہی۔ خاموشی کی زبان میں ماں سے باتیں کرتی رہی۔ بیٹی کی طرح ماں بھی خاموشی کی زبان میں بول رہی تھی۔ وہ ماں جو صبر و استقامت اور ہمت کی مثال تھی۔ جس کے حسنِ اخلاق اور نیکی کا ایک زمانہ معترف تھا۔ علاقے کے لوگ اسے کسی روحانی شخصیت کی طرح اپنی مصیبتوں میں یاد کرتے تھے اور جب وہ اسے عقیدت بھرے لہجے میں وڈی آپا کہتے تھے تو ان کے ہونٹوں سے محبت کا امرت ٹپکتا تھا۔ وڈی آپا کو دانائی اور فہم و فراست کے اعلیٰ درجات پر فائز کیا جاتا تھا۔ اہم سے اہم معاملات میں وڈی آپا کے مشورے کو بلا چون و چرا مانا جاتا تھا اور یہ مشورے ماننے والوں میں خود چوہدری ارشاد بھی شامل تھا۔ آگے بڑھنے کا مشورہ..... ہمت نہ ہارنے کا مشورہ..... بدترین حالات کے باوجود کوشش جاری رکھنے کا مشورہ۔ ایثار کا مشورہ۔

اگلے دن صبح سویرے گلاب کے پودوں کے قریب..... شبنم آلود گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلتے ٹہلتے شانی نے بڑی ہی آہستگی اور نرمی کے ساتھ چوہدری ارشاد کے شانے سے سر نکایا اور بے حد مضبوط اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ”اباجی! میں..... نار پور واپس جانا چاہتی ہوں۔“

چوہدری ارشاد نے یک لخت چونک کر شانی کی طرف دیکھا۔ ”کک..... کیا کہہ رہی ہو شانی؟“

وہ چند لمبے چپ رہی پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ”میں اپنا گھر بچانے کی ایک آخری کوشش کرنا چاہتی ہوں۔“
چوہدری ارشاد کی آنکھوں میں حیرت اور آنسوؤں کی نمی ساتھ ساتھ اٹھ آئی۔

☆=====☆

قریباً پندرہ دن بعد کی بات ہے۔ شانی اپنے شوہر کے ساتھ سرال واپس جا رہی تھی۔ پچھلے پندرہ سولہ دنوں میں جو کچھ ہوا تھا بہت تیزی سے ہوا تھا۔ یہ سب کچھ جتنا حیران کن تھا اتنا ہی تیز رفتار بھی تھا۔ علاقے کے لوگوں نے ہرگز توقع نہیں کی تھی کہ حالات یوں پلٹا کھائیں گے۔ یہ خبر ہر ایک کے لئے حیران کن تھی کہ دونوں چوہدری خاندانوں میں صلح ہو گئی ہے اور وڈی آپا کی دھی رانی شانی اپنے سرال واپس جا رہی ہے۔

شانہی کے سوا شاید ہی کسی کو ٹھیک طرح سے معلوم ہو کہ صلح کس قیمت پر اور کس طرح ہوئی ہے۔ شانی کی عزیز سہیلی سیکینہ تھوڑا بہت جانتی تھی لیکن اسے بھی سب معلوم نہیں تھا۔ وہ بھی کیسے کہتا تھا۔ وہ اس درد اور اندوہ کا ادراک کیسے کر سکتی تھی جس کے سیلاب سے شانی گزری تھی اور ہر گھڑی تڑپتی تھی۔

یہ صرف شانی کا درد تھا۔ وہی محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے پورے آٹھ پہر تک خود کو سوچ کی سولی پر لٹکایا تھا اور اس معاملے کی ہر پہلو پر عرق ریزی کی تھی۔ وہ جانتی تھی اگر اس کے اباجی نے فاخر اور مہرجی کی مزاحمت کا فیصلہ کر لیا تو وہ مزاحمت کا حق ادا کر دیں گے۔ اپنی تمام تر توانائیوں اور مجبوریوں کے باوجود وہ نارپور والوں کے ارادوں کے سامنے اپنی دیوار بن جائیں گے پھر اس دیوار کے ساتھ ٹکرا کر بہت کچھ پاش پاش ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ یہ دیوار بھی پاش پاش ہو جائے۔ وہ اپنے اباجی کی جسمانی حالت سے بہت اچھی طرح آگاہ تھی۔ اسے پتا تھا جو دیوار وہ مہر اور فاخر کے سامنے کھڑی کرنے والے ہیں اس کی تعمیر میں ان کی رہی سہی جسمانی طاقت بھی ختم ہو جائے گی۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کو اور اپنے مصیبت زدہ لواحقین کو اپنی ذات اور ان کی خاطر کسی اور امتحان میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ اور یہی فیصلہ ایک روز پہلے ماں کی تصویر نے بھی دیا تھا۔ خاموشی کی زبان میں۔

اباجی کو اپنے سرال واپس جانے کا فیصلہ سنانے کے ایک روز بعد شانی سیکینہ کے ساتھ جھنڈے شاہ کے مزار پر پہنچی تھی۔ وہاں سے دونوں نے پانچ میل تک بس کا سفر کیا تھا اور پھر وہ ایک ایسے جزل سٹور تک پہنچی تھیں جہاں سے وہ رازداری کے ساتھ لاہور فون کر سکتی تھیں۔ شانی نے لاہور میں ٹیکسٹائل کارخانے کے نمبر پر فاخر سے بات کی تھی۔ فون پر شانی کی آواز سن کر فاخر چوٹکا تھا۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد شانی جلد ہی اصل موضوع پر آگئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

”فاخر! میں گھر واپس آنا چاہتی ہوں۔“

”بڑی جلدی خیال آگیا گھر کا۔“ فاخر کا لہجہ استہزاء سیہ تھا۔

”آپ کو بھی تو مجھے گھر بلانے کا خیال نہیں آیا۔“ شانی نے کہا۔

”میرے خیال کرنے سے کیا ہوتا تھا۔ جو اپنی مرضی سے جاتا ہے وہ مرضی سے ہی آتا ہے۔“

وہ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ”تو ٹھیک ہے میں آنا چاہتی ہوں۔“

”تو آ جاؤ۔“

”لیکن..... میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے لے کر جائیں۔ اباجی کو بسکی محسوس نہ ہو۔ میرا بھی مان رہ جائے۔“

”تمہارا مطلب ہے میں تمہارے لئے جھولی پھیلاؤں؟“ فاخر کے لہجے میں شدید کٹ تھی۔

”ایسا کرنے کے لئے آپ سے کون کہہ رہا ہے۔ میں جانتی ہوں میری اتنی حیثیت اور اہمیت نہیں ہے۔ آپ صرف اباجی کی مزاج پُرسی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کے لئے آجائیں۔ میں خود آپ کے ساتھ آ جاؤں گی۔“

دوسری طرف چند لمحے تک ایک فاتحانہ خاموشی طاری رہی..... پھر فاخر نے کہا۔ ”میں ایک بات تمہیں صاف بتا دوں۔ میں تمہارے ابا

جی کے حضور کسی طرح کی گزارش نہیں کروں گا اور انہیں یہ بھی سمجھا دینا کہ اگر انہوں نے میرے سامنے تلقین شاہ بننے کی کوشش کی تو میں فوراً سے پہلے

اٹھ کر چلا آؤں گا۔“ فاخر کے لہجے میں پیش اور جھنجھلاہٹ تھی۔

”نہیں..... ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ شانی نے کمزور آواز میں کہا۔

..... اور اب یہ سارے مرحلے طے ہو چکے تھے۔ شانی اپنے شوہر کے ساتھ سسرال واپس جا رہی تھی۔ بظاہر تو وہ اسی طرح جا رہی تھی جس

طرح بیویاں شوہروں کے ساتھ جاتی ہیں لیکن وہ جانتی تھی اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں نہ نظر آنے والی زنجیریں ہیں۔ یہ زنجیریں ابتر حالات ذاتی

مجبوریوں اور معاشی تنگ دستیوں کی کڑیوں سے مل کر بنی تھیں۔ نارپور نے شانی سے بہت کچھ لیا تھا۔ اس کی دوشیزگی..... دوشیزگی کی شویاں، ہنستی

مسکراتی سہیلیاں..... جانی پہچانی مہربان گلیاں..... اور پھر اس کے چاچا مشتاق اس کا جان سے پیارا بھائی..... لیکن یہ سب کچھ لے کر بھی نارپور

اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، اسے واپس اپنے پاس لے جا رہا تھا۔

چوہدری ارشاد نے ہمیشہ بیٹی کی بات مانی تھی۔ وہ آج بھی مان رہے تھے۔ جس طرح وہ بیٹی کی ماں کے سامنے بحث نہیں کر سکتے تھے اسی

طرح بیٹی کے سامنے بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اسے دیر تک اپنے مدقوق سینے سے لگا کر بچھنے رکھا تھا پھر فاخر کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔ وہ

دونوں لینڈ کروزر جیپ میں ڈرائیور کے پیچھے بیٹھے تو حویلی کے ملازمین نے دونوں پر گلاب کی ڈھیروں پٹیاں نچھاور کیں۔

جواب میں چوڑے نازوں والی جیپ دھول اڑاتی نیم پختہ راستے کی طرف بڑھ گئی۔

☆=====☆=====☆

نارپور کی حویلی میں داخل ہوتے ہی شانی کے ذہن میں بے شمار ناخوشگوار یادیں تازہ ہو گئیں۔ سینے میں گھٹن سی بھرنے لگی لیکن جب اس

نے بھابھو کا محبت بھرا ہاتھ اپنے سر پر محسوس کیا۔ مَنا اور ندیم کے مسکراتے چہرے دیکھے تو دل کو قدرے حوصلہ ہوا۔ اسے یاد آیا کہ حویلی میں سب نگاہیں

نامہربان ہی نہیں تھیں، کچھ آنکھوں میں مہر و محبت کی جھلک بھی تھی۔

فاخر سب سے پہلے شانی کو اس کے دادا سر کے پاس لے کر گیا۔ وہ حسب معمول اپنے نیم تاریک کمرے میں لیٹے تھے۔ جہازی سائز

کے پلنگ کے پاس ڈبل چیئر موجود تھی اور بہت لمبی نال کا منتش حقہ پڑا تھا۔ دیواروں پر کلبھاریاں، برچھیاں، رائفلیں اور پتا نہیں کیا کچھ آویزاں تھا۔

مہرجی نیم دراز تھے اور گھٹنوں تک چادر کھنٹی ہوئی تھی۔ اکلوتی آنکھ لٹکارے مار رہی تھی اور اس میں شانی کے لئے بیگانگی اور نفرت کے سوا اور کچھ نہیں

تھا۔ شانی نے عاجزی سے جھک کر سلام کیا اور پانکٹی کی طرف بیٹھ گئی۔

مہر کے منہ سے وہی ناقابل فہم آوازیں نکلیں جو شانی پر دہشت آمیز گھبراہٹ طاری کرتی تھیں۔ غرغراں..... گھر گھر..... غوں غاں۔ وہ سہمی ہوئی کسی مجرم کی طرح بیٹھی تھی۔ بھاہو اور فاخر وغیرہ خاموش تھے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس موقع پر کیا کرنا چاہئے۔ جب وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تو اس نے مہرجی کی ٹانگیں دبانے کے لئے ان کی پمپلی پنڈلیوں کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ جونہی اس کے ہاتھ عاجزانہ انداز میں دادا سر کی پنڈلیوں سے چھوئے ان کے فالج زدہ چہرے پر شدید ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے ٹانگ کے ایک غصیلے جھٹکے سے شانی کو پیچھے ہٹا دیا۔ یہ بڑی واضح توہین تھی لیکن شانی اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ وہ بہت کچھ برداشت کرنے کا عزم لے کر اس چار دیواری میں داخل ہوئی تھی۔

رات کو شانی اور فاخر کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ جب وہ کروٹ بدل کر سو گیا اور خواب گاہ میں اس کی بھاری سانسیں گونجنے لگیں تو شانی کی آنکھیں چپکے چپکے آنسو بہانے لگیں۔ مہرجی کی ٹانگ کا غصیلہ جھٹکا بار بار اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ آنسو تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ ان کی گرمی شانی کے کوئل رخساروں پر ریگ رہی تھی۔ کبھی کبھی ہونٹوں سے ایک مدھم سی سسکی بھی نکل جاتی تھی۔ وہ روتی رہی۔ اس کے دل کے کسی گہرے گوشے سے یہ خیال اٹھتا رہا۔ کیسا ہوا اگر اس کی کوئی فریادی سسکی فاخر کے کانوں تک پہنچ جائے۔ وہ شانی کے اشک بارغم کو محسوس کرے پھر وہ ہولے سے کروٹ بدلے۔ اس کا ہاتھ نرمی سے شانی کے کندھے پر آئے۔ یہ ہاتھ اسے اپنی طرف کھینچ کر کروٹ بدلنے پر مجبور کر دے پھر شانی سسک کر اپنے شوہر کے سینے سے لگ جائے۔ فاخر اس کا سر چومے..... پھر اس کے دکھ سنے۔ شانی کی غم گساری کرتے ہوئے وہ کہے۔ تمہارے پیارے چاچا کی موت کا مجھے بھی دکھ ہوا۔ تمہارے لاڈلے بھائی کی جدائی کا غم میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا وہ افسوس ناک تھا۔ اب یہ سب کچھ بھلانا ہوگا۔ تم سارے شکوے بھول کر اور اپنی انا کو ایک طرف رکھ کر واپس آ گئی ہو۔ تمہاری یہ پیش رفت مجھے بھی پیش رفت پر مجبور کر رہی ہے۔ میں تمہارے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کر رہا ہوں۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ اب ہم ماضی کی ساری کدورتوں اور تلخیوں کو بھول جائیں.....“

وہ سوچتی رہی، خواہش کرتی رہی لیکن خواہشیں اتنی آسانی سے کب پوری ہوتی ہیں۔ شانی کے کندھے پر کوئی ہاتھ نہیں آیا۔ بالوں بھرے بھاری جسم والا فاخر کروٹ لے کر سویا رہا اور اس کے سینے سے بھاری سانس خارج ہوتی رہی۔

یوں تو حویلی کا ہر فرد شانی سے پیار کرتا تھا مگر منہ اور ندیم تو اس کے دیوانے تھے۔ دونوں ہر وقت شانی سے چپے رہتے تھے۔ کبھی کندھوں پر سوار ہیں، کبھی گردن سے جھول رہے ہیں۔ بھاہو انہیں ہر وقت روکتی روکتی رہتی تھی لیکن یہ دونوں بچے تو شانی کی واپسی سے نہال ہو گئے تھے۔ یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے، شانی باہر گراؤنڈ میں بیٹھی تھی۔ سہ پہر تین چار بجے کا وقت تھا۔ بادل چھائے تھے اور ساون کی نم ہوا چل رہی تھی۔ شانی کا دل ہمیشہ سے زیادہ اداس تھا۔ ابا جی کی یاد ستا رہی تھی۔ ہمیشہ کے لئے بھٹک جانے والے بھائی کا چہرہ نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ اتنے میں منہ وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی پتنگ تھی۔ وہ شانی سے اصرار کرنے لگا کہ وہ پتنگ اڑانے میں اس کی مدد کرے۔ شانی ٹال مٹول کرتی رہی۔ وہ

پتنگ ایک طرف رکھ کر شانی سے کشتی کرنے لگا۔ وہ اسے گدگدہا رہا تھا اور ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہنسی گدگدی میں نہیں ہوتی، ہنسی تو دل میں ہوتی ہے اور روح میں ہوتی ہے اور شانی کے اندر یہ دونوں چیزیں ویران تھیں۔ مٹا کی مستی حد سے بڑھی تو شانی اس سے جان چھڑانے کے لئے ایک دم اندر کی طرف بھاگ گئی۔ مٹا اس کے پیچھے لپکا، لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی شانی کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مٹا کچھ دیر دروازہ کھٹکھٹاتا رہا اور ”چچی دروازہ کھولو۔۔۔۔۔ دروازہ کھولو“ پکارتا رہا پھر خاموشی چھا گئی۔ شانی نے سمجھا کہ وہ چلا گیا ہے۔ وہ اپنے جہازی ساز بستر کے ایک کنارے پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔

چند منٹ بعد چیخنے کی آواز سنائی دی اور ملازموں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ شانی تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ وہ ننگے پاؤں برآمدے میں آئی۔ اس نے دیکھا، منشی رشید اور دوسرے ملازموں نے کم سن مٹا کو ہاتھوں پر اٹھایا ہوا ہے، اس کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ شانی نے بے قرار ہو کر مٹا کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اس کے ہونٹ بھی خون آلود تھے۔

ملازم راشد نے بتایا۔ ”مٹا اوپر روشن دان سے گرا ہے۔“

”روشن دان سے؟ وہاں کیا کر رہا تھا؟“ شانی نے چلا کر پوچھا۔

پھر جواب اپنے آپ ہی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ سمجھی تھی کہ مٹا چلا گیا ہے مگر وہ کمرے کے سامنے ہی تھا۔ وہ سیڑھیوں کے ذریعے کھڑکی کے شیڈ پر چڑھا تھا۔ وہاں سے وہ روشن دان میں جھانک کر شانی کو آواز دینا چاہتا تھا لیکن پھسل کر نیچے چسپم کے پختہ فرش پر گرا تھا۔ شانی نے اسے سینے سے چمٹا لیا اور اس کا منہ سر چومنے لگی۔ مٹے کی آنکھیں بند تھیں اور گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ لرزتے چلے جا رہے تھے۔

دس منٹ کے اندر ڈاکٹر حویلی میں پہنچ گیا۔ مٹے کے سر میں چار ٹانکے لگے۔ نچلے ہونٹ پر بھی اندر کی طرف زخم آیا تھا۔ بھابھو بھی پریشان تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ شانی تھی۔ وہ مٹے کو سینے سے لگا کر بچھینے ہوئے بولی۔ ”مجھے معاف کر دو مٹے! یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔“

”نہیں ایسا نہیں کہتے۔“ بھابھو نے اسے تسلی دی۔ ”جو تکلیف قسمت میں ہوتی ہے وہ مل جاتی ہے۔ شکر ہے کہ ہاتھ پاؤں بچ گئے ہیں۔“

”اب تو میرے ساتھ پتنگ اڑائیں گی ناں؟“ مٹے نے کراہتے ہوئے کہا۔

”ضرور اڑاؤں گی۔ ضرور اڑاؤں گی! اب تم تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ۔“

شرانی اسے اپنے ہی کمرے میں لے آئی۔ وہ اس سے لپٹ کر سو گیا۔ رات تک مٹے کو ہلکا بخار ہو گیا اور سارا جسم تپنے لگا تھا۔ شانی سخت پریشان تھی۔ نو بجے کے لگ بھگ اس نے پھر ڈاکٹر کو بلا لیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کر کے تسلی دی اور کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ایک دو روز میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

فاخر ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا تھا۔ کالی گھٹائیں تو سہ پہر سے ہی چھائی ہوئی تھیں۔ نو بجے تک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ کھڑکیوں پر پانی کی بوچھاڑیں پڑنے لگیں اور گرج چمک نے ماحول کو رومانوی کر دیا۔ فاخر ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ واپس لوٹا۔ آج اس کا موڈ قدرے خوشگوار لگ رہا تھا۔ وہ ہلکی سی ترنگ میں بھی تھا۔ غالباً موسم کی رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ایک دو پیگ لگا رکھے تھے۔ شانی

نے اس کا چہرہ دیکھا اور پہچان گئی۔ آج فاخر کے چہرے پر وہی جانی پہچانی چمک تھی جو اس کے جذباتی موڈ کی نشان دہی کرتی تھی۔ اس موڈ سے دو دفعہ پہلے بھی شانی کا سابقہ پڑ چکا تھا۔

فاخر خواب گاہ میں داخل ہوا تو مٹنے کو پلنگ پر سوتے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس بات کی خبر تو اسے کارخانے میں ہی ہو گئی تھی کہ مٹنے کے سر پر چوٹ آئی ہے، کمرے میں آکر اس کے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ مٹا اس کے پلنگ پر سو رہا تھا۔

”اسے یہاں کیوں لٹایا ہوا ہے؟“ فاخر نے پوچھا۔

”کہہ رہا ہے، میں آج یہیں سوؤں گا۔ بے چارے کو بخار بھی ہو گیا ہے۔“ شانی نے پریشانی سے کہا۔

اتنے میں مٹنے نے بھی نجیف آواز میں کہا۔ ”ہاں چاچو..... میں آج یہیں سوؤں گا چچی کے پاس.....“

فاخر کے چہرے پر ناگواری کی شکن نمودار ہوئی اور وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ ایک لختے میں ہی شانی سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ اندر سے روہانسی ہو گئی۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے؟ اس نے بڑے درد سے سوچا۔ فاخر کی ”طلب“ اسے اس وقت ہی کیوں پکارتی ہے جب وہ کسی دکھ کے نرغے میں ہوتی ہے۔ آج مٹنے کی چوٹ نے اسے ہلان کر رکھا تھا اور آج ہی فاخر کی خواہش کی ”حرارت“ نظر آئی تھی۔

وہ فاخر کے پیچھے پیچھے باہر آئی۔ وہ نشست گاہ میں بیٹھ کر سرگریٹ پھونکنے لگا تھا۔ ”کھانا لگو آؤں؟“ شانی نے پوچھا۔

”نہیں ابھی بھوک نہیں!“ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”جاؤ..... تم سو جاؤ جا کر۔“ اس کے لہجے میں شدید کٹ تھی۔

شانی ایک لفظ کہے بغیر واپس مڑ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ آج پھر اسے اپنے آپ پر جبر کرنا ہوگا۔ خاموشی کی زبان میں یہی اس کے شوہر کا حکم تھا۔ وہ کمرے میں جا کر مٹنے کے پاس لیٹ گئی۔ اسے تھپک تھپک کر سنانے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ اگر مٹا سو جائے تو وہ اسے آہستہ سے اٹھا کر اوپر بھاہو کے پاس چھوڑ آئے لیکن وہ تو سونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بار بار پھل کر خود کو شانی کی بانہوں میں گھسا دیتا تھا۔ آخر شانی کو کہنا پڑا۔ ”مٹنے..... چلو آؤ“ میں تمہیں امی کے پاس چھوڑ آؤں۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ ایک دم پوری طرح بیدار ہو کر بولا۔ ”میں آپ کے پاس سوؤں گا۔“ اس نے اپنی ٹانگ شانی کے پیٹ پر چڑھائی اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی لپٹ گیا۔

شانی کچھ دیر تک اسے پیار اور حکمت سے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ناکام ہوئی۔ آخر وہ روہانسی ہو گئی۔ اس کا لہجہ خود بخود سخت ہو گیا۔ شانی کی اس اچانک بے رخئی نے مٹنے کو رونے پر مجبور کر دیا۔ شانی نے دل پر بھاری پتھر رکھ کر مٹنے کو اٹھایا اور اس کے رونے کی پرواہ کئے بغیر اسے اوپر بھاہو کے پاس چھوڑ آئی۔

کمرے میں آکر خود کو سنبھالنے میں اسے دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ اپنے اشک بار چہرے کو اچھی طرح ٹھنڈے پانی سے دھونے کے بعد اور بال سنوار کر وہ نشست گاہ میں آ گئی۔

فاخر نے ٹیلی ویژن کھول رکھا تھا اور الکل سے شغل کر رہا تھا۔

”آجائے..... منا اوپر چلا گیا ہے۔“ شانی نے نظر جھکائے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر تک اس کے سراپا کو گھورتا رہا۔ کائن کی گلابی پھول دار قیص پر ہلکی ہلکی شکنیں تھیں۔ قیص سے اوپر شفاف گردن ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دک رہی تھی۔ ریشمی بال کانوں کو ڈھانپ رہے تھے اور ہموار کندھوں کے پیچھے اوچھل ہو رہے تھے۔ کھڑکیوں سے باہر بادل زور سے گرجا اور فاخر اٹھ کر خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ انداز ایسا تھا جیسے شانی پر احسان کر رہا ہو۔

وہی ماحول تھا..... وہی گھٹن تھی..... شانی کے اندر وہی بے حسی تھی۔ وہ جو جو کہتا گیا، وہ مشینی انداز میں اس پر عمل کرتی گئی۔ ناگوار سانس شانی کے چہرے سے نکلنے لگیں۔ رخساروں پر کانٹے سے چبھنے لگے۔ وہ آج کسی طرح کے گریز یا کسی طرح کی مزاحمت کا ارادہ نہیں رکھتی تھی اور..... اسے آئندہ بھی ایسا ہی کرنا تھا۔

اگلے آٹھ دس ہفتے اسی انداز میں گزرے۔ اس کی ازدواجی زندگی نے سہاگ رات سے جو ڈگر اختیار کی تھی، اسی ڈگر پر چلتی رہی۔ یہ سخت ناموزون ناقابل یقین اور ٹیڑھا راستہ تھا۔ ہر چوتھے پانچویں روز اچانک اسے پتا چلتا تھا کہ اسے اپنے شوہر سے ”محبت“ کرنی ہے۔ یہ ایک ایسا ازدواجی فریضہ تھا جو کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اچانک اس پر عائد ہو سکتا تھا۔ شانی کے اندر محبت کرنے کی حس تو جانے کب سے مرچکی تھی وہ تو بس ایک کٹھ پتلی تھی۔ یہ کٹھ پتلی کسی دوسرے کے اشارے پر ناچتی تھی۔ اس کی ہر حرکت کسی دوسرے کے ہاتھوں کی حرکات کے تابع تھی۔ وہ سب کچھ خاموشی اور صبر سے سہہ رہی تھی۔ اس کی خوبصورت پیشانی پر شکن تک پیدا نہیں ہوتی تھی، بے شک دل شکنوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ خود کو سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رکھتی تھی۔ بھابھ اور ملازموں کے منع کرنے کے باوجود وہ ہر جگہ ہاتھ بٹاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ کبھی سبزی بنانے میں مدد کر رہی ہے۔ کبھی کسی ملازمہ کے ساتھ مل کر گلہ سٹے بنا رہی ہے۔ کبھی بھابھ کے ساتھ مل کر پودوں کو پانی دے رہی ہے۔ اسے یوں کام کر کے خوشی ملتی تھی اور اس کے کام سے جن کی مدد ہو جاتی تھی وہ بھی اپنی جگہ خوش ہوتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے ہر دل میں اپنے لئے جگہ بنائی تھی۔ ہر کوئی اس کے نام کی مالا جپتا نظر آتا تھا۔ شاید یہ رنگ والی کی وڈی آپا کا عکس تھا جو اب نارپور کی چھوٹی بیگم میں جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ اگر اس چار دیواری میں کوئی اس سے ناخوش تھا تو وہ یہاں کے دونوں ”داروغے“ تھے۔ یعنی داروغہ مہرجی اور چھوٹے داروغہ چوہدری فاخر۔ خاص طور سے فاخر کو تو شانی کی ”ہر دل عزیز“، ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی شانی کی مقبولیت کا کوئی منظر دیکھتا تھا، اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے۔ ایک بار تو اس نے ایک بوڑھی ملازمہ حمیدن کو شانی کی بلائیں لیتے دیکھ کر اس بُری طرح جھڑکا اور دھمکایا تھا کہ کمزور عورت کا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔

دادا سر مہرجی کا رویہ بھی شانی سے جوں کا توں تھا۔ وہ آج کل کچھ بیمار تھا۔ بھابھ سے شانی کو معلوم ہوا تھا کہ وہ آج کل سب گندل کا پودا بھی کم کاشت کر رہا ہے۔ اس پودے کو وہ ”آب حیات“ جیسی اہمیت دیتا تھا۔ ایک روز شانی نے چھت پر سے ایک عجیب منظر دیکھا۔ مہراپنی وہیل چیئر پر پھلواری کے قریب موجود تھا۔ لمبے مہندی لگے بالوں والا ایک ادھیڑ عمر شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ شانی نے دیکھا کہ پھلواری میں ایک سیاہ کوبرا گھوم رہا ہے۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ سانپ کی دم میں ایک سوراخ تھا اور اس میں سے ایک سی گزر رہی تھی۔ سی میں بے شمار چھوٹی چھوٹی سپیاں پروٹی گئی تھیں۔ اگلے روز شانی نے خوف زدہ لہجے میں بھابھ سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ سانپ آج کل پھلواری میں ہی رہتا

ہے۔ اکبر کہتا ہے کہ سانپ کا پیشاب فضلہ اور اس کے سانپوں کی ہواؤں سپ گندل کے بوٹوں کے لئے کھاد کا کام دیتے ہیں۔ سانپ پھلکاری میں کھلا پھرتا ہے پر اس کو اس طرح باندھا گیا ہے کہ وہ باہر نہیں نکل سکتا۔

شانی نے یہ بات خوف اور کراہت کی کیفیت میں سنی، لیکن اب وہ نارپور میں ایسی باتوں کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔

مہر چونکہ آج کل بیمار تھا اور بستر پر پڑا ہوا تھا اسی لئے شانی کو اس سے نسبتاً کم خوف محسوس ہوتا تھا۔ یہاں کے دستور کے مطابق شانی کو ہر دوسرے تیسرے روز مہر کے کمرے میں جا کر اس کی پبلی پنڈلیاں دبانا پڑتی تھیں۔ دباتے دباتے اس کے ہاتھ دکھنے لگتے تھے۔ مہر کی بدبودار سانپوں سے بچنے کے لئے وہ رک رک کر سانس لیتی تھی مگر سانس لئے بغیر گزارہ بھی تو نہیں۔ سانس تو لینا ہی پڑتا ہے چاہے ہواؤں میں زہر لگھا ہو۔ جب اس کی کلائیوں بے جان ہو جاتی تھیں اور وہ کوشش کے باوجود مہر کی ٹانگوں پر دباؤ نہیں ڈال سکتی تھی تو مہر کے چہرے پر بے زاری نظر آنے لگتی تھی اور وہ کروٹ بدل لیتا تھا۔ یہ اس امر کا اشارہ ہوتا تھا کہ وہ اب جاسکتی ہے۔ وہ مہر کے کمرے سے یوں نکلتی تھی جیسے کوئی اس کے پیچھے لگا ہو۔ باہر آ کر وہ دیر تک باغیچے میں ٹہلتی تھی اور اپنے اندر گھس آنے والی بو باس کو تازہ ہوا میں تحلیل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایک روز وہ ایسے ہی مہر کے کمرے سے نکل کر ٹہلتی ہوئی ذرا آگے تک نکل گئی۔ باغیچے کی دیوار اس اکھاڑے کی دیوار سے ملی ہوئی تھی جہاں فاخر اور اس کے ساتھی کسرت کرتے تھے۔ شانی دیوار کے پاس پہنچی تو اسے دوسری طرف سے لاشیوں کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ وہ مخصوص نعرے اور بڑھکیں بھی سنائی دے رہی تھیں جو لٹھ بازی کا حصہ ہوتی ہیں۔

پتا نہیں کیا بات تھی۔ لٹھ بازی کا خیال ذہن میں آتے ہی شانی کے دل میں غم کا تیر سا اتر جاتا تھا۔ اس کے تصور میں اپنے من موہنے بھائی عادل سلطان کا چہرہ آتا اور آنکھوں کے سامنے دھند پھیل جاتی۔ ابھی کوئی اس کے مرنے کی عمر تھوڑی تھی۔ وہ جوانی کے جوش میں آگ کے اندر ہاتھ ڈال بیٹھا۔ کیا تھا اگر وہ یوں فاخر سے مقابلے بازی نہ پر اترتا..... اور اگر اترتا تھا تو اس سے ہارتانہ..... اور اگر ہار گیا تھا تو اس ہار کو دل کا روگ نہ بناتا۔ زندگی میں ہار جیت تو ہوتی ہے۔ ہار نہ ہوتا تو پھر جیت کا وجود کیونکر ہو۔

وہ خیالوں میں گم چلی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں اس نے دیکھا کہ فاخر پسینے میں بھیگا ہوا اکھاڑے کی طرف سے آرہا ہے۔ اس نے دھوتی کو لنگوٹی کی شکل میں کسا ہوا تھا۔ پورے جسم پر گھنے بال تھے۔ شانی کی طرف آتے ہوئے اس کے لنگوٹ نے پھر دھوتی کی شکل اختیار کر لی۔ فاخر کے سانولے چہرے پر پسینے کی بوندیں اور اس کی چڑھی ہوئی سانس دیکھ کر پتا نہیں کیوں شانی کا دم گھٹ سا جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے فاخر نے ابھی ابھی عادل سے لٹھ بازی کی ہے۔ جیسے عادل زخمی حالت میں زمین پر گر پڑا ہے اور فاخر فاتحانہ انداز میں اس کے سر پر کھڑا ہے۔ وہ تمام کا تمام دلدوز منظر شانی کے ذہن میں تازہ ہو جاتا تھا۔

”ادھر کیا کر رہی ہو؟“ فاخر نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔ آج اس کا لہجہ کچھ نرم تھا۔

”کچھ نہیں۔ یونہی ہوا خوری کو دل چاہ رہا تھا۔“

”لگتا ہے کہ ہوا خوری تمہیں پسند ہے۔“ وہ رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

”کبھی کبھی۔“

”تو ٹھیک ہے۔ پرسوں تمہیں ہوا خوری کرائیں گے۔“

”کہاں!“ شانی نے چہرے پر خوشی کے تاثرات سجائے۔

”تمہیں تمہارے ابا جی سے ملا کر لائیں گے۔“

شانسی کھل اٹھی۔ پورے دو مہینے ہو چلے تھے ابا جی کی صورت دیکھے ہوئے۔ رنگ والی اور رنگ والی کے سارے رنگ اسے بے طرح یاد آ رہے تھے۔ صغرا کی شادی بھی اس کی غیر موجودگی میں ہو گئی تھی اور بھی پتا نہیں کیا کچھ شانی نے کھویا تھا۔ وہ اپنی خوشی پر بمشکل قابو پاسکی۔

پتا نہیں کیوں آج اسے محسوس ہوتا تھا کہ فاخر کے رویے میں حاکمیت کے علاوہ بھی کچھ شامل ہو رہا ہے۔ وہ موجودہ صورت حال سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ جسم اور خود سپردگی کے علاوہ بھی شانی سے کچھ چاہتا ہے اور جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ صرف حکم سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کیا چاہتا تھا؟ شاید یہ خود اسے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔

دور روز شانی نے بے حد مشکل سے کاٹے۔ تیسرے روز اتوار تھا۔ علی الصبح شانی اور فاخر بذریعہ جیپ ”رنگ والی“ کی طرف روانہ ہو گئے۔ شانی نے ڈرتے ڈرتے مئے کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی تھی۔ تھوڑے سے تردد کے بعد فاخر نے اجازت دے دی تھی۔ جیپ میں ڈرائیور کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دو گارڈز تھے۔ ڈرائیور بھی اسلحہ شناس تھی اور ہر وقت مسلح رہتا تھا۔ مہرجی کا چہیتا گارڈ اکبر آج کل حویلی میں موجود نہیں تھا۔ وہ کسی کام سے عارضی طور پر لاہور میں مقیم تھا۔

موسم خوشگوار تھا۔ ان لوگوں نے آٹھ دس میل تک ہموار پختہ سڑک پر سفر کیا۔ اب انہیں گوجرانوالہ جانے والی سڑک پر پہنچنا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے وہ اکثر ایک شارٹ کٹ استعمال کرتے تھے۔ چار پانچ میل کا نیم پختہ راستہ تھا اور جنرل کیکر وغیرہ کے گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ اس راستے پر کبھی کبھار ہی کوئی ٹریکٹر ٹرائی یا بیل گاڑی نظر آتی تھی۔ کھیت راستے سے کافی ہٹ کر تھے۔

ان کی جیپ اس شارٹ کٹ پر دوڑھائی میل آگے گئی ہوگی کہ ایک سیاہ کار نے عقب سے ہارن دینا شروع کر دیا۔ سیاہ کار کی رفتار کافی تیز تھی۔ وہ جیپ سے آگے نکلنا چاہتی تھی۔ فاخر کے ڈرائیور نے سیاہ کار کو راستہ دینے میں تھوڑی سی تاخیر کی تو کار کا ہارن مسلسل سنائی دینے لگا۔ کار جیپ کے بالکل قریب چلی آئی اور پھر کار والے نے بڑے بڑے ڈھنگے طریقے سے اوور ٹیک کرنے کی کوشش کی۔ کار کی سائیڈ بڑی طرح جیپ کی سائیڈ سے ٹکرائی۔ جیپ کی پچھلی کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا اور وہ خطرناک طریقے سے لہرا گئی۔ بائیں طرف کے دونوں پیسے کچھ دیر کے لئے کچے میں اتر گئے تھے اس لئے گرد کا ایک دبیز بادل فضا میں بلند ہوا۔

یہ بے حد طیش دلانے والی حرکت تھی۔ اس علاقے میں فاخر کی جانی بچپانی گاڑی کے ساتھ اس طرح کا سلوک کون کر سکتا تھا۔ ایک سیکنڈ میں فاخر کا چہرہ لال بھسوکا ہو گیا۔ گارڈ کی مونچھیں بھی پھڑکنے لگی تھیں۔ ”روکو اس حرام زادے کو!“ فاخر نے گرج کر کہا۔

کار ابھی تک عقب میں ہی تھی۔ فاخر کے ڈرائیور نے جیپ کو راستے کے عین درمیان میں لاتے ہوئے رفتار اس طرح آہستہ آہستہ کم کی کہ راستہ بلاک ہو گیا۔ جیپ کھڑی ہو گئی اور پرانے ماڈل کی سیاہ شیور لیٹ کا اس کے عقب میں رک گئی۔ گھنٹی مونچھوں والا گارڈ اور ڈرائیور چھلانگیں

مارکر جیپ سے اترے۔ انہوں نے ایک نظر میں جیپ کے نقصان کا جائزہ لیا اور پھر سیاہ کار کی طرف لپکے۔ سیاہ کار قریباً پچاس فٹ پیچھے کھڑی تھی۔ فاخر کا گندمی چہرہ خون کے دباؤ سے نیم تاریک نظر آنے لگا تھا۔ وہ شانی اور مٹنے کی پرواہ کئے بغیر مسلسل کار والوں کی ماں بہن ایک کر رہا تھا۔ (وہ ابھی تک جیپ کے اندر ہی تھا)

شانی نے مڑ کر دیکھا۔ گارڈز کے پہنچنے ہی کا روالے بھی باہر نکل آئے تھے۔ یہ دو افراد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف سے جو شخص برآمد ہوا اسے دیکھ کر شانی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ اس شخص کو جانتی تھی۔ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ گزر جانے والے تین چار ماہ میں اس شخص کا چہرہ شانی کے تصور میں آیا تھا اور ہر بار اسے عجیب و غریب کیفیت سے دوچار کر گیا تھا۔ وہ اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ خوشی نہ غم نہ اداسی۔ نہ وابستگی۔ پتا نہیں یہ کیا کیفیت تھی؟ جو اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں پر عمل کرتی تھی اور درد کی لہر رگ و پے میں جگاتی تھی۔ ہاں یہ اس کا جانا پہچانا شخص تھا۔ یہ واحدی تھا۔ وہ گرے شلوار قمیص میں تھا۔ کندھوں پر ایک پھول دار چادر تھی جو دونوں پہلوؤں پر جھول رہی تھی۔ اس کی داڑھی پہلے سے زیادہ گھنی اور بال پہلے سے بڑھ کر لمبے ہو چکے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے تلخ چہرے کا دو تہائی حصہ ان بالوں سے چھپا ہوا ہے۔ واحدی کو فاخر کے کرخت محافظوں کے روبرو دیکھ کر شانی کے دل میں ٹیس سی جاگی۔ ذہن میں ایک ساتھ کئی سوال اٹھے۔ یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس کی آمد اتفاق ہے یا دانستہ؟ اس کی گاڑی فاخر کی جیپ سے کیسے ٹکرائی؟ اب اس کے ساتھ کیسا سلوک ہونے والا ہے؟

وہ دم بخود تھی۔ مٹا اس کی گود میں تھا۔ محافظوں اور واحدی وغیرہ میں کوئی بات ہو رہی تھی۔ بمشکل ڈیڑھ دو منٹ گزرے ہوں گے کہ ڈرائیور نشان علی تیزی سے جیپ میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ چہرے پر بیجانی کیفیت تھی۔

”کیا بات ہے نشان؟“ فاخر نے پوچھا۔

نشان علی نے تھوک نگلا اور شانی وغیرہ کی طرف دیکھا۔ شاید وہ بات کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

فاخر نے اس سے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ وہ جو کہنا چاہتا ہے کہے۔ نشان علی نے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ ”مالک! میں اس چادر والے بندے کو پہچان گیا ہوں۔ یہ کوئی اور نہیں رستم سیال ہے۔“

”رستم سیال؟“ فاخر نے حیرت سے کہا اور پورا گھوم کر عقب میں دیکھا۔ چند سیکنڈ تک اس کی نگاہ واحدی پر مرکوز رہی، پھر اس کے تاثرات بھی بدل گئے۔ شاید اس کی نگاہ نے بھی نشان علی کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”لگتا تو وہی ہے، بس داڑھی اور مونچھوں کا فرق ہے.....“

”سو فیصد وہی ہے مالک! مم..... میرا خیال ہے کہ بات بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نقصان تو دونوں گاڑیوں کا ہوا ہے۔“

شانی یہ سب سن رہی تھی اور اس کے کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ دل و دماغ میں رستم سیال کا نام ایک گونج کی طرح پھیل رہا تھا۔ رستم سیال علاقے کا معروف ڈکیت تھا۔ اس کے قصے اکثر لوگوں کی زبان پر رہتے تھے۔ وہ چکرا سی گئی۔ اس کا معطل ذہن اس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا کہ سیاہ کار کے قریب کھڑا شخص رنگ والی حلی کی کامالی ”واحدی“ ہے یا نامی گرمی ڈاکو رستم سیال؟

کیا واقعی یہ مالی کے بھیس میں رستم سیال تھا۔ شانی کو واحدی سے متعلق وہ واقعات یاد آئے جو اسے پہلے بھی الجھن میں مبتلا کرتے رہے تھے۔ واحدی نے کٹھولی گاؤں کے قریب ایک قبرستان میں شانی اور سیکند کو ایک بڑی مصیبت سے بچایا تھا اور ایسی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا جو ان دونوں کو اب تک یاد تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ واحدی کی فطری جی داری کا مظاہرہ ہوا تھا۔ لٹھ بازی کے مقابلے کے بعد فاخر عادل کو بے دردی سے زخمی کر رہا تھا، واحدی آگے آیا تھا اور اس نے فاخر کی لاٹھیاں اپنے ہاتھوں پر روکی تھیں۔

اس قسم کے اور بھی دو چار چھوٹے بڑے واقعات تھے جو شانی کو الجھن میں مبتلا کرتے تھے۔ اس کے اندر سے آواز آیا کرتی تھی۔ یہ شخص وہ نہیں ہے جو خود کو ظاہر کرتا ہے۔ آج وہ یہی بات ڈرائیور نشان اور اپنے شوہر کی زبانی سن رہی تھی۔ ایک ساتھ بہت سے مناظر شانی کے ذہن میں آئے اور اس کے ساتھ ہی وہ منظر بھی جب شانی نے اپنے مالی (واحدی) کے منہ پر طمانچہ مارا تھا..... اور وہ منظر بھی جب اسے بے توقیر کر کے گھر سے نکالا تھا۔

یہ بات تو شانی پہلے سے جانتی تھی کہ واحدی نے باغبانی کا کام صرف رنگ والی کی حویلی میں رہنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ رنگ والی میں ایک موقع پر واحدی نے اسے بتایا تھا کہ وہ رستم سیال کے قبیلے کا ہے اور اس کا دور کارشتے دار ہے۔ آج ایک مختلف بات کا پتا چل رہا تھا۔ وہ رستم سیال کا دور کارشتے دار نہیں تھا، وہ خود رستم سیال تھا۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ یہ سوال بے پناہ شدت اور خوف کے ساتھ شانی کے ذہن میں ابھرا اور اگر واقعی ایسا ہے تو پھر رستم سیال نے رنگ والی میں شانی کے ہاتھوں اپنی بے عزتی کیونکر برداشت کی۔

یہ سارے کے سارے خیالات بس دو تین سیکنڈ کے اندر شانی کے ذہن سے گزر گئے تھے۔ اس کی آنکھیں واحدی (یا رستم سیال) پر جمی تھیں جو بڑے انداز سے سیاہ کار کے پہلو میں کھڑا تھا اور فاخر کے گارڈز سے بات کر رہا تھا۔

پھر اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ باتوں میں تلخی آگئی ہے۔ جیسے بجلی چمکتی ہے، واحدی کا دایاں ہاتھ یکا یک گھوما اور ایک طوفانی مکا گارڈ کے چہرے پر پڑا۔ وہ اپنی رائفل سمیت اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا۔ جہاں وہ گرا وہاں واحدی (یا رستم سیال) کا ساتھی پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ رائفل گارڈ سے چھین لی۔ ڈرائیور نشان علی نے بھنا کر اپنی قمیص کے نیچے سے پستول نکالنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی مہلک آٹومیٹک رائفل کی نال اس کے سینے سے جا لگی۔

”خبردار!“ واحدی کے ساتھی نے کڑک کر کہا۔

ڈرائیور جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ یہ منظر فاخر ایئر کنڈیشنڈ جیپ کے اندر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تملایا ہوا باہر نکلنے لگا تو شانی نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ”نہیں فاخر! آپ باہر نہ نکلیں..... یہ بندہ..... خطرناک لگتا ہے۔“

جو کچھ بھی تھا اب فاخر کے لئے جیپ میں رکے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر باہر آیا۔ اتفاقاً اس وقت فاخر کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ ہتھیار یقیناً اس کے ہاتھ میں آچکا ہوتا۔ وہ واحدی کے سامنے پہنچا اور گرج کر بولا۔ ”تمہیں حیا آنی چاہئے۔ ایک تو گاڑی کو ٹکڑا کر ماری ہے، دوسری بد معاشی دکھا رہے ہو۔“

”بد معاش اگر بد معاشی نہیں دکھائے گا تو پھر کیا تم جیسے شریف دکھائیں گے جو صرف کمزور عورتوں اور نوکراہیوں سے کشتی لڑنا جانتے ہیں۔“

”کون ہوتی؟“ فاخر نے اس کے تند جملوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

وہ بڑے اعتماد سے مسکرایا۔ ایسے میں گھنی مونچھوں اور داڑھی کے اندر سے اس کے سفید ہموار دانتوں کی قطار چمک گئی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم مجھے پہچان چکے ہو۔ میں وہی ہوں جس کا اندازہ تم نے اور تمہارے کڑچھے نے لگایا ہے۔“ اس کا اشارہ ڈرائیور نشان علی کی طرف تھا۔
فاخر کا چہرہ اندرونی غضب سے سُرخ مائل ہو گیا۔ وہ بولا۔ ”چوریاں ڈکیتیاں کر کے کوئی رستم زمان نہیں بن جاتا۔ میرے لئے تمہاری حیثیت قانون کے بھگوڑے سے زیادہ نہیں ہے۔ کتنے دن بھاگے بھاگے پھرو گے۔ ایک دن تمہاری چمڑی ہوگی اور پولیس کے چھتر۔“
”پولیس کا ڈراو ادینا تیرے جیسے شہدوں کی پرانی عادت ہے۔ مرد کا بچہ تو وہ ہوتا ہے جو اپنے بازوؤں کے بل بوتے پر بات کرتا ہے۔“
واحدی نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں جہاں شانی کو ہمیشہ ایک خاموش عقیدت نظر آتی تھی آج نیلی آگ دکھائی دے رہی تھی۔
یہ آگ اپنے سامنے آنے والے کسی بھی شخص کو خاستر کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔

فاخر اور واحدی (یارِ رستم سیال) کے درمیان چند تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا پھر نہ جانے کیا ہوا کہ واحدی تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف گیا۔ اس نے لمبی شیور لیٹ کے اندر سے دوچمک دار لائٹیاں برآمد کیں۔ عجیب طیش کے عالم میں اس نے ایک لائٹھی فاخر کی طرف پھینکی اور دوسری اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی۔ بادلوں کی گرج سے مشابہ اس کی آواز شانی کے کانوں تک پہنچی۔ ”اگر تیرا نہیں تو آ..... آج میرے ساتھ بھی دو ہاتھ کر۔ تیری ساری لٹھ بازی نہ نکال دوں تو کہنا اپنے باپ کا نہیں!“

فاخر چند لمحے ساکت و جامد کھڑا رہا۔ یوں لگا جیسے کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پاتا رہا۔ ایک ساعت کے لئے محسوس ہوا کہ وہ لائٹھی دور پھینک دے گا دوسری ساعت میں لگا کہ وہ گالیاں بکتا ہوا پوری طاقت کے ساتھ واحدی پر پل پڑے گا۔ آخر وہ چند ساعتیں گزر گئیں۔ شانی نے بہم کر دیکھا۔ فاخر نے یکا یک ایک وحشیانہ چنگھاڑ کے ساتھ واحدی پر لائٹھی سے حملہ کیا۔ یہ اتنا شدید حملہ تھا کہ چوکس ہونے کے باوجود واحدی لڑکھڑا کر ایک درخت سے جا لگا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی تھی لیکن اس کے سنبھلنے کی رفتار بھی قابلِ داد تھی۔ اس سے پہلے کہ فاخر کی لائٹھی پھر اس کے جسم سے چھوتی، وہ بجلی کی طرح تڑپ کر لائٹھی کی زد سے نکل گیا۔ ایک لمحے کے لئے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں پھر لائٹھیاں لٹھ برداروں کے ہاتھوں میں برقی کوندوں کی طرح دکھائی دینے لگیں۔ وہ پوری طرح بے جگری اور بے پناہ شدت سے ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔

نیم پختہ راستے سے ہٹ کر کیکر اور جنت کے گھنے درختوں کے درمیان اچانک ہی ایک میدان کا رزار گرم ہو گیا تھا۔ دھول اٹھ رہی تھی نازک شاخیں ٹوٹ رہی تھیں لائٹھوں کی کھنا کھٹ اور لٹھ برداروں کے نعرے ہیجان خیز تھے۔ دیکھنے والی آنکھیں جیسے ساکت و جامد ہو کر رہ گئی تھیں۔ یوں دکھتا تھا کہ دو صحرائی بگولے ہیں جو ہوا کی غیر معمولی قوت سے باہم ٹکرائے ہیں اور ایک ہی بھنور کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

فاخر وہ لٹھ باز تھا جو آج تک کسی سے زیر نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف تاریک راتوں اور گھاتوں کا شنوار رستم سیال عرف واحدی تھا۔ وہ جسامت میں شاید گراڈیل فاخر سے کچھ کم ہی ہوگا لیکن طاقت اور پھرتی میں وہ قیامت نظر آتا تھا۔ دونوں دیوانگی کے عالم میں لڑتے ہوئے گاڑیوں کے قریب آئے۔ شانی اور مناسم کر لینڈ کروزر میں کچھ اور بھی دبک گئے۔ اچانک کسی لائٹھی کی طوفانی ضرب سے لینڈ کروزر کی عقبی سکرین بھی چمکنا

پور ہو گئی۔ یہ لڑائی کا فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ لٹھ بازی کی مہارت میں بھی فاخر کو کچھ فوقیت حاصل ہو لیکن اس کی کو واحدی کے بے پناہ جوش اور حوصلے نے پورا کر دیا تھا۔ گھسمان کی لڑائی میں فاخر کا سر پھٹ گیا تھا اور واحدی کی پیشانی سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ دونوں کے چہرے لہو لہان تھے۔ ان آخری مراحل میں فاخر کی وحشت دیدنی تھی۔ وہ لاٹھی کو ایک خاص مہارت کے ساتھ دونوں سروں کی طرف سے استعمال کر رہا تھا۔ اچانک ایک شدید ضرب جسے ”جج“ کہا جاتا ہے واحدی کے سینے میں لگی۔ وہ ڈمگا کر اپنی سیاہ شیور لیٹ کے قریب گرا۔ فاخر نے عقاب کی طرح اس پر چھلانگ لگائی اور اپنی لاٹھی کی مدد سے واحدی کی گردن دبانے لگا۔ ایک لمحے میں واحدی کا منہ کھل گیا اور آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ اس کا راکفل بردار ساتھی گارڈ کے پاس ہی کھڑا تھا، لیکن وہ بے حرکت تھا۔ غالباً فریقین میں طے ہو چکا تھا کہ اس لڑائی میں باہر سے کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ شانی کے ہاتھ کا پتہ چلے جا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کس کے لئے دعا گو ہو۔ ایک اجنبی کے لئے..... یا اپنے شوہر کے لئے اپنے شریک حیات کے لئے..... وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شاید اسی کشمکش کا نتیجہ تھا کہ وہ کوئی دعا ہی نہیں کر پا رہی تھی۔ اچانک اس نے فاخر کو ہوا میں اچھلتے دیکھا۔ فاخر کی کھڑکھڑاتی سفید شلوار قمیص ایک لمحے کے لئے شانی کی نظروں کے سامنے سے گزری۔ وہ قلابازی کھاتا ہوا لینڈ کروزر کے پچھلے ٹائر سے ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، واحدی کی لاٹھی اس کی کنپٹی کا بوسہ لے چکی تھی۔ یہ مہلک بوسہ تھا۔ ضرب زیادہ شدید نہ ہونے کے باوجود بے حد سنگین تھی۔ فاخر دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکا۔ چشم فلک نے یہ تماشا دیکھا کہ علاقے کا نامور اور ناقابل شکست لٹھ باز زمین بوس تھا۔ واحدی کی لاٹھی اس پر تو اتارے برس رہی تھی۔ وہ شیشے کی بکھری ہوئی کرچیوں پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ شانی درد سے چیختی ہوئی دیوانہ وار باہر نکل آئی۔

”رک جاؤ!“ وہ تڑپ کر پکارا لٹھی۔

لیکن اس کے پکارنے سے پہلے ہی واحدی یا رستم سیال وہ جو کوئی بھی تھا اپنا ہاتھ روک چکا تھا۔ اس کی لاٹھی کی نوک فاخر کی گردن میں دھنسی ہوئی تھی اور فاخر چاروں شانے چت تھا۔ کھیل ختم ہو چکا تھا۔ مقابلہ اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ ایک لفظ کہے بغیر اور اگر دیکھ لگا ڈالے بغیر واحدی واپس مڑا اور اپنے ساتھی سمیت اپنی کار میں جا بیٹھا۔ اس نے شانی پر بس ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد اس کی کار دھول اڑاتی کیکر اور جنت کے درختوں میں اوجھل ہو رہی تھی۔

فاخر کا چہرہ گاڑھے سرخ خون میں چھپا ہوا تھا۔ اس کی ایک کلائی سوچ کر کپا ہو رہی تھی۔ کندھے پر بھی گہری چوٹ آئی تھی۔ شانی اور نشان علی اسے سہارا دے کر چپ تک لائے اور خون بند کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

☆=====☆=====☆

اس حادثے کے بعد فاخر اور شانی اپنے محافظوں سمیت نار پور واپس آ گئے۔ فاخر کی مرہم پٹی کے لئے فوراً ڈاکٹر حویلی میں حاضر ہو گئے۔ سب کو یہی بتایا گیا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے جیب پر حملہ کیا اور چھوٹے چوہدری صاحب کو زخمی کر کے فرار ہو گئے۔ اس حملے کے سلسلے میں رستم سیال

اور اس کے مسلح ساتھیوں کا نام لیا جا رہا تھا۔ مقامی تھانے دار بہادر علی نے خود حویلی پہنچ کر ملزمان کے خلاف ڈاکے اور اقدام قتل کا پرچہ کاٹ لیا تھا۔ نارپور میں سنسی سی پھیلی ہوئی تھی۔ شانی کو معلوم ہوا تھا مہر نے اپنے گھاگ اور خطرناک کارندوں کو رستم سیال کی کھوج کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ کچھ کھوجیوں کو بھی پولیس اہلکاروں کی مدد کے لئے بھیجا گیا تھا۔

شانسی سے فاخر کی ملاقات اگلے روز دوپہر کو ہی ہو پائی۔ رات فاخر نے مردانے میں ہی گزاری تھی۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ یقیناً رستم سیال اور اس کے ساتھیوں سے بدلہ لینے کا پروگرام تیار ہو رہا ہوگا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد فاخر بیدروم میں آ گیا۔ اس کی ایک آنکھ سوچ کر لپٹا ہو رہی تھی۔ سر پر پٹی بندھی تھی جو اپنے سائز کے سبب پگڑی کی طرح نظر آتی تھی۔ کلائی پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ شانی اس کی مزاج پُرسی میں لگ گئی۔ فاخر کی حالت شانی کے لئے تکلیف دہ تھی۔ جو کچھ بھی تھا وہ اس کا شوہر تھا۔ اس کے سر کا سائیں۔ فاخر کے چہرے پر گہری کلفت دکھائی دیتی تھی۔ شاید یہ دہری کلفت تھی۔ ایک تو چوٹوں کی دوسری اس ہزیمت کی جو اسے بیوی اور محافظوں کے سامنے شکست کی صورت میں اٹھانا پڑی تھی۔

شانسی نے محتاط لفظوں میں اس کی دل جوئی کی کوشش کی مگر وہ اس طرح کی کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے فوراً ہی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ شانی سمجھ گئی کہ اسے بھی موضوع بدلنا ہوگا۔ اس نے رسمی انداز میں کہا۔ ”اباجی اور تاتیا معصوم تو ہمارا انتظار ہی کرتے رہ گئے ہوں گے۔ میں نے انہیں اطلاع بھجوائی تھی کہ ہم رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں گے۔“

عام سے انداز میں کہی ہوئی اس بات نے ایک دم فاخر کو بھڑکا دیا۔ طیش کی یلغار سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور جڑا مزید چوڑا نظر آنے لگا۔ اس نے جگر پاش نظروں سے شانی کو گھور کر زور سے دھکا دیا۔ وہ پلنگ کے بازو پر بیٹھی تھی۔ اُڑتی ہوئی قالین پر گری اور سرسنگ مرمر کی تپائی سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں میں نیلی پیلی چنگاریاں اُڑ گئیں۔ فاخر کی نہایت کرخت آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ”حرام زادی! میں یہاں مر رہا ہوں اور تجھے اپنے بچپلوں کی پڑی ہے۔ یہ ساری تیری ہی نحوست ہے۔ دفع ہو جا یہاں سے۔ دور ہو جا میری نظروں سے۔“

شانسی کی آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں۔ وہ اس کے لئے سخت الفاظ تو پہلے بھی استعمال کرتا تھا لیکن یہ سخت ترین تھے۔ شاید وہ کل کی ہار کا سارا غصہ اس پر اتار رہا تھا۔

”فاخر..... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔
وہ کچھ بھی کہے بغیر پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ شانی ہچکیوں سے رونے لگی۔ آنسو اور خون کے قطرے ایک ساتھ قالین پر گرنے لگے۔ اتنے میں چھوٹے ندیم نے کھڑکی سے جھانک کر شانی کا زخمی چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اس کی کپٹی سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ ندیم فوراً بھاگ گیا۔ یقیناً ماں کو بتانے گیا تھا۔ بھابھاب کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی تھی۔ شانی جلدی سے غسل خانے میں چلی گئی اور اپنے آنسو اور اپنا خون چھپانے کی کوشش کرنے لگی لیکن ایسی چیزیں چھپانے سے کب چھپتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں بھابھو کو سب معلوم ہو چکا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح شانی کو اپنے گلے سے لگایا اور اس کی ڈھارس بندھانے میں مصروف ہو گئی۔ ندیم اور مننا بھی اپنے معصوم انداز میں اس کی مدد کرنے لگے۔

رات کا وقت تھا۔ شانی اپنی خواب گاہ میں تھی۔ وہ پلنگ پر سیدھی لیٹی تھی۔ اس نے کاشن کا کڑھائی دار کرتہ پہن رکھا تھا۔ دلکش جسمانی

نشیب و فراز ٹیوب لائٹ کی دودھیاروشنی میں چمک رہے تھے۔ اس کی کپٹی پر میڈیکل ٹیپ چمکی تھی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن فاخر ابھی تک زنانے میں نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ آج رات بھی مردانے میں دوستوں کے ساتھ گزارے گا۔ مردانے میں مردوں کی مصروفیات کیا ہوتی تھیں اس کے بارے میں تحقیق کرنے کی اجازت حویلی کی عورتوں کو نہیں تھی۔

شانی کی جھیل آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ دل غم سے بھرا ہوا تھا پھر اس کا دھیان رستم سیال کی طرف چلا گیا۔ وہ رستم سیال جو پہلے زخمی حالت میں شانی کو اسی حویلی کے ایک کمرے میں ملا تھا اور پھر بعد میں کئی ماہ ایک مالی کی حیثیت سے رنگ والی کی حویلی میں موجود رہا تھا۔ وہ کیا چاہتا تھا؟ کیوں چاہتا تھا؟ اسے ایسا سوچنے کا کیا حق تھا؟ شانی کبھی حیرت اور کبھی غصے کے عالم میں سوچنے لگتی تھی۔

پتا نہیں کیوں ایک بات کا شانی کو اطمینان تھا۔ وہ جیسا بھی تھا اور اس کی ذہنی روا سے جس سمت بھی لے گئی تھی مگر وہ شانی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا پھر شانی رستم سیال یا واحدی کے موجودہ حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ شانی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کل دوپہر رستم سیال نے جو کچھ بھی کیا اس کی وجہ وہ خود تھی۔ شاید رستم نے اپنی سوچ کے مطابق فاخر سے اس ہزیمت کا بدلہ لیا تھا جو فاخر کے سبب عادل سلطان کو اٹھانا پڑی تھی۔ بہر حال وہ جو کچھ بھی ہوا تھا شانی کے لئے بڑے دکھ کا باعث تھا۔ فاخر کا سلوک شانی کے ساتھ جیسا بھی تھا لیکن اس کی تکلیف پر شانی کا دل رونے لگتا تھا۔ شاید اپنی مرحومہ ماں کی طرح وہ کسی کے بارے میں منفی انداز میں سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔

ایک بار پھر اس کے خیالات کا دھارا رستم سیال کی طرف مڑ گیا۔ نارپور کے چوہدری سیالوں کو پہلے ہی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ رستم کی کل والی کا رروائی کے بعد وہ بالکل ہی آگ بگولہ ہو گئے تھے۔ شانی جانتی تھی کہ مہر اور فاخر کا ”اثر رسوخ“ بڑے غضب ناک انداز میں رستم کا چھپا کر رہا ہوگا۔ مہر کے کارندے پولیس کے شانہ بشانہ رستم کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

وہ لیٹی رہی اور سوچتی رہی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ بس برآمدے کی ہلکی سی روشنی کھڑکی سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ دفعتاً شانی کو محسوس ہوا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا ہے اور کوئی اندر آ گیا ہے۔ اس کی نگاہ سامنے گئی اور وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا حویلی کا فرد نہیں تھا کیونکہ اسے یوں دبے پاؤں اندر آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آنے والے کا چہرہ ایک چادر میں چھپا ہوا تھا۔ وہ بالکل چوروں کے انداز میں جھک کر چلتا ہوا آیا اور شانی سے پانچ چھفٹ کے فاصلے پر آکھڑا ہوا گیا۔

پہلے تو شانی نے چیخنے چلانے کا ارادہ کیا لیکن پھر اس کی فطری دلیری اور فراست کام آئی، وہ شدید خوف کے باوجود اپنی جگہ بے حرکت لیٹی رہی۔ پلنگ کی دائیں سائیڈ ٹیبل کے پہلو میں ہنگامی گھنٹی کا بٹن موجود تھا۔ اس بٹن کا رابطہ براہ راست گارڈز کی کوٹھڑی سے تھا۔ شانی پلنگ کے بائیں کنارے پر تھی جب کہ نو وارد دائیں کنارے پر تھا۔ یہ پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ وہ اطلاعی گھنٹی تک ہاتھ پہنچانے کی کوشش کرتی۔ اسے چند سیکنڈ تک انتظار کرنا تھا تا کہ نو وارد دائیں کنارے سے ہٹ جائے۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد پڑی رہی۔ آنکھیں بند تھیں، لیکن پلکوں کے نیچے باریک سی جھری موجود تھی۔ آنے والا پلنگ کی پائنتی کی طرف سے گھوم کر مزید قریب چلا آیا..... پھر ایک سرسراتی ہوئی مدھم آواز شانی کے کانوں میں پڑی اور اس کی رگوں میں خون سنسن کر رہ گیا۔

یہ واحدی یعنی رستم سیال کی آواز تھی۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں شانی کو ”بی بی“ کہہ کر پکارا تھا۔ کئی سیکنڈ تک تو شانی کو یہی محسوس ہوا کہ سینے میں حرکت کرتے دل کے سوا اس کا پورا جسم پتھر اگیا ہے۔ تب ایک بار پھر ”بی بی“ کی مخصوص سرگوشی شانی کے کانوں تک پہنچی۔ وہ آنکھیں بند کئے بے حرکت لیٹی رہی جیسے گہری نیند میں ہو۔

رستم اس سے دو فٹ کی دوری پر کھڑا تھا اور ایک ٹک شانی کی صورت دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی تپش شانی اپنے رخساروں پر محسوس کر رہی تھی۔ سینے میں اس کا نازک دل ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ رستم نے ایک بار پھر ہولے سے شانی کو پکارا۔ تب یوں لگا وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو چھونا چاہتا ہے۔ اس کا ہاتھ شانی کے قریب آیا۔ چند لمحوں میں ہاتھ ہار ہا پھر جھک کر پیچھے ہٹ گیا۔

وہ دم بخود لیٹی رہی۔ آنکھوں کی جھری سے وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس ہی تھا لیکن اب اس کا ہیولا حرکت کر رہا تھا۔ وہ اس کے پاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ تب وہ اس کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ سوالات تیزی سے شانی کے ذہن میں اٹھ رہے تھے۔ وہ اس کے پاؤں کے قریب سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تب شانی نے اپنے تلوؤں کے قریب عجیب سا لمس محسوس کیا۔ کسی چیز نے بے حد نرمی اور ملائمت سے اس کے بائیں تلوے کو چھوا۔ وہ لرز اٹھی۔ یہ کسی اور شے کا نہیں ہونٹوں کا لمس تھا۔ دوا لڑتے اور شاید آنسوؤں میں بھیگے ہوئے ہونٹوں کا لمس۔ ان ہونٹوں نے بے حد آہستگی سے اسے چھوا اور آہستگی سے پیچھے ہٹ گئے۔

اب شانی کے لئے ممکن نہیں تھا کہ مزید خاموش رہتی اور بے حرکت لیٹی رہتی وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اسے یوں اٹھتے دیکھ کر رستم بری طرح چونکا۔ پھر اس کے جسم نے برق کی طرح حرکت کی اور اس کی چوڑی گرم تھیلی نے شانی کے ہونٹوں کو قدرے سختی سے ڈھانپ لیا۔

یقیناً رستم نے یہی سمجھا تھا کہ شانی نیند سے ابھی بیدار ہوئی ہے۔ وہ چند سیکنڈ تک شانی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ کہیں منہ سے ہاتھ ہٹانے کے بعد وہ چیخنا چلانا تو شروع نہیں کر دے گی پھر جیسے شانی کی نگاہوں اور اس کے تاثرات نے اسے یقین دلادیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ شانی کے ریشمی ہونٹوں اور عارضوں سے ہٹالیا۔ دونوں ایک دوسرے کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جن میں خوف کی آمیزش بھی تھی۔ تب رستم عرف واحدی نے سرگوشی میں کہا۔ ”بی بی! اس طرح یہاں آنے کی بہت بہت معافی چاہتا ہوں۔“

اس کے لہجے کی نرم کپکپاہٹ نے شانی کو ششدر کر دیا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ وہی رستم ہے جس کے خوف سے ایک خلقت لرزتی ہے اور جس نے صرف 36 گھنٹے پہلے فاخر سے خم ٹھونک کر مخلصیت مول لی تھی اس وقت نظر آنے والے رستم اور اب اس کے سامنے بیٹھے ہوئے رستم میں زمین آسمان کا فرق دکھائی دیتا تھا۔ ابھی چند لمحوں پہلے اس نے جو کچھ شانی کے ساتھ کیا وہ ناقابل یقین تھا۔ شانی اس کے خیال سے ہی شرم سے ڈوبی جا رہی تھی۔

وہ بے حد تلخ سرگوشی میں بولی۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس طرح میرے کمرے میں گھس آنے کا مطلب کیا ہے؟“

”میں سب جانتا ہوں بی بی! اس کے باوجود مجھ سے یہ غلطی ہوئی ہے۔ شاید آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ میرا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔“

”دماغ ٹھکانے پر لانے کے جو طریقے ہوتے ہیں ان کا بھی تمہیں پتا ہوگا۔“ وہ بے حد بے مروتی سے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے ملازموں کو آواز دینی چاہئے۔“ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کے لئے حرکت کی۔

رستم نے بے ساختہ اپنے دونوں ہاتھ شانی کے شانوں پر رکھ دیئے پھر یوں ہاتھ پیچھے ہٹائے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ بے انتہا عاجزی اور تحمل سے بولا۔ ”بی بی! مجھے اپنی مری ماں کی قسم ہے۔ میری طرف سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں بس دو چار منٹ میں۔“

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ شانی اپنی جگہ سے اٹھ نہیں سکی۔ جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔

وہ پلنگ پر تھی۔ وہ زمین پر بیٹھا تھا۔ کسی عقیدت مند کی طرح، کسی پرستار کسی دیوانے کی طرح۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

لرزاں پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان لمحوں میں وہ جیسے کسی معبد کے سب سے بلند چوڑے پر رکھی ہوئی دیوی تھی اور وہ اس کے سامنے سرنگوں کوئی سپاس گزار پجاری تھا۔ اس نے عجیب لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”بی بی! میں کوئی نا سمجھ بچہ نہیں ہوں۔ ہر اچھا بُرا سمجھتا ہوں۔ زمانے کے بہت سرد گرم دیکھے ہیں میں نے..... لیکن جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے اس کا میں نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔ کبھی اس کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا..... میں نے..... میں نے جب آپ کو پہلی بار دیکھا تھا بی بی! اس کے فوراً بعد میں وہ نہیں رہا تھا جو آپ کو دیکھنے سے پہلے تھا..... اور مجھے یقین ہے کہ اب میں کبھی وہ پہلے والا رستم نہیں بن سکوں گا۔“

اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”بی بی! میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں۔ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ بی بی! میں وہی رستم سیال ہوں جس کے قصے آپ نے لوگوں سے سنے ہوں گے اور جس کی ہسٹری علاقے کے بے شمار تھانوں میں موجود ہے۔ جس رات میں آپ سے ملا اس رات سے پہلے میں ڈاکو رستم سیال تھا۔ دنیا کی ہر برائی مجھ میں موجود تھی اور ہر اچھائی مجھ سے دور تھی، لیکن پھر آپ کو دیکھنے کے بعد میرے اندر کی دنیا بدلی۔ میں دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا۔ مجھے خود بھی پتا نہیں چلا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے خود کو بدلنے سے روکنے کی بہت کوشش کی مگر ہر کوشش بیکار گئی۔ جیسے پہاڑی ندی کا ریلا ہوتا ہے ایسا ہی کوئی ریلا تھا جو مجھے اپنے ساتھ بہاتا چلا گیا اور اب بھی بہاتا چلا جا رہا ہے۔ نہ میں کہیں رک سکتا ہوں نہ ٹھہر سکتا ہوں۔ نہ اپنا رستہ بدل سکتا ہوں۔ میں بالکل بے بس ہوں۔ بی بی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں راتوں کو دیوانوں کی طرح جاگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یہ میرے دل کو کیسا روگ لگا ہے۔“

اس کی پلکیں ہمیشہ کی طرح جھکی ہوئی تھیں اور وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ ”بی بی! میں سر سے پیر تک بدل گیا ہوں۔ ہر پچھلا ساتھی ہر پچھلا نانا ٹوٹ گیا ہے۔ برائی کے دنوں کا بہت سا پیسہ میرے پاس جمع تھا سب کا سب دریائے دکر دیا ہے میں نے..... ضرورت مندوں کو بھی نہیں دیا کہ مجھے اس پیسے ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔ اب اپنی طرف سے کوشش کر رہا ہوں کہ حق حلال کی روزی کماؤں اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہو رہا ہوں۔ اپنے باپ دادا کا گھر بیچ کر لوہے کے ایک چلتے کاروبار میں ڈالا ہے۔ مناسب آمدن ہو رہی ہے۔ شاید آپ سوچ رہی ہوں گی کہ آپ کو یہ سب کچھ بتا کر میں آپ کی نظروں میں اپنی عزت بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ عزت بن جائے گی تو پھر میں آپ سے کچھ اور بھی چاہوں گا کچھ اور بھی حاصل

کرنے کی تمنا کروں گا۔ نہیں بی بی! میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ نہ ہی آنے والے مہینوں اور سالوں میں ایسا کچھ ہوگا۔ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا..... کچھ بھی نہیں۔ زندگی کے آخری سانس تک میری بس ایک ہی تمنا ہوگی۔ آپ خوش رہیں اور میں کبھی کبھی آپ کو دیکھتا رہوں۔ دور ہی سے سہی..... فاصلے سے ہی سہی! آپ کی صورت پر میری نظر پڑتی رہے۔ میرے جینے کے لئے بس یہی ایک سہارا بہت کافی ہوگا بی بی۔“

وہ بولتا چلا جا رہا تھا اور آنسو اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس دیوانے سے کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ کئی باتیں ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ رستم عرف واحدی کہہ رہا تھا کہ وہ اسے دیکھنے کے سوا اور کوئی تمنا نہیں رکھتا، لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنے اس وعدے کی نفی کر چکا تھا۔ اس نے عجب وارفتگی کے عالم میں شانی کے جسم کو اپنے ہونٹوں سے چھوا تھا۔ شانی اس سے کہنا چاہتی تھی کہ..... انسان کے جذبے کبھی ایک مقام پر نہیں رہتے۔ وہ جو آج چاہتا ہے کل اس سے بڑھ کر چاہ سکتا ہے اور اس کا ثبوت ابھی کچھ دیر پہلے اس نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے بدن کو چھوا ہے۔

لیکن وہ یہ بات زبان پر نہیں لاسکی۔ ایسی بات اسے زبان پر لانی ہی نہیں چاہئے تھی۔ جو بات ابھی پردے میں تھی عیاں ہو جاتی۔ عدم سے ”وجود“ میں آ جاتی۔

شانی نے اپنا لہجہ ذرا نرم کیا لیکن تاثرات میں کوئی چلک پیدا نہیں کی اور بولی۔ ”تم نے جو کہنا تھا“ کہہ لیا۔ اب میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میرے لئے یہی بڑی بات ہے کہ آپ نے میری بات سن لی ہے۔“ اس کے لہجے میں مسرت آمیز کپکپاہٹ تھی۔

”لیکن اب میں کچھ اور سننا نہیں چاہوں گی۔“ شانی نے اسی لہجے میں کہا۔

”صرف ایک بات اور بی بی!“ وہ التجا سے بولا۔ اس کی نگاہ شانی کی زخمی کنپٹی پر تھی۔

شانی خاموش رہی وہ حوصلہ پا کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں آپ سخت پریشانیوں میں گھری ہوئی ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ کے کسی کام آسکوں۔ آپ کے معمولی سے معمولی کام کے لئے بھی میں اپنی جان بخوشی دے سکتا ہوں۔ آپ زندگی میں کبھی بھی کوئی بھی حکم کریں گی وہ اپنی جان دے کر پورا کروں گا۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولا ”مجھ جیسے حقیر آدمی کو آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے بی بی! لیکن ایک بات عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس کے لئے مجھے معافی دے دیں۔ میں جانتا ہوں مہر آپ کی زندگی کو خراب کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑے گا۔ وہ آپ کے خیالوں سے زیادہ برا بندہ ہے بی بی۔ وہ آپ کے شوہر کو بھی آپ سے دور کرتا چلا جائے گا۔ وہ آپ کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے بی بی۔ اگر آپ.....“

”خاموش رہو!“ شانی نے تلخ سرگوشی کی۔ ”میں اس بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ یہ میرے ذاتی مسئلے ہیں۔ اگر میں نے انہیں حل ہی کرنا ہے تو خود کروں گی اور میرا شوہر بھی ہے اس کام کے لئے۔ تم اس بارے میں بات کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ کبھی تم سے اس طرح کی حرکت نہ ہو۔“

”آپ..... آپ کس حرکت کی بات کر رہی ہیں؟“

”تمہاری دو حرکتیں مجھے سخت ناگوار گزری ہیں۔ تم نے فاخر پر حملہ کیا اور انہیں جسمانی نقصان پہنچایا۔ دوسرے تم آج یہاں میرے کمرے میں گھسے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس سے تمہاری جان اور میری عزت کو کتنا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“

وہ بغیر کسی وضاحت کے غیر مشروط انداز میں بولا۔ ”میں ان دونوں حرکتوں کے لئے بھی ہاتھ جوڑ کر معافی کا طلب گار ہوں۔“

”تم آئندہ کبھی فاخر کے راستے میں نہیں آؤ گے۔ نہ ان سے کسی طرح کا کوئی عناد رکھو گے۔ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی کوئی اس قسم کی غلطی نہیں کرے گا۔“

”ٹھیک ہے بی بی! لیکن.....“

”لیکن کچھ نہیں۔“ شانی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”میں اس بارے میں کوئی عذر سننے کو تیار نہیں۔“ لہجے میں ایسا رعب تھا کہ الفاظ میں بے پناہ طاقت سرایت کر گئی تھی۔

”ٹھیک ہے بی بی! جو آپ کا حکم!“ رستم نے سر جھکا لیا۔

شانی خاموش رہی۔ وہ بھی خاموش رہا۔ دور حویلی کے بیرونی پھانک پر پہرے داروں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ وہ ایک دوسرے کو چوکس رکھنے کے لئے پکار رہے تھے۔ ”جاگدے رہنا۔“

آخر رستم کھٹکا کر بولا۔ ”بی بی! کیا آپ نے میرے دیوانے پن اور میرے مجبور خیالوں کے لئے مجھے معاف کر دیا ہے؟“

”میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ اس آگ میں کھیلنے سے تکلیف اور جلن کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“ شانی کوشش کے باوجود اپنے لہجے میں زیادہ سختی پیدا نہیں کر سکی۔ اس کے لہجے کی نرمی اور الفاظ کے انتخاب نے رستم کے چہرے پر خوشی کی ایک موہوم سی لہر دوڑادی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس فقرے کو وہ اپنے لئے ایک بہت بڑا انعام سمجھ رہا ہے۔

وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں اب چلتا ہوں بی بی۔“ وہ اٹنے قدموں پیچھے ہٹا، جیسے شانی کی طرف پشت کرنا نہ چاہتا ہوں۔

شانی سرگوشی میں بولی۔ ”ایک منٹ ٹھہرو۔ کہیں اپنے ساتھ مجھے بھی کسی بڑی مصیبت میں نہ ڈال دینا۔ یہاں ہر طرف تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔“

وہ الٹا چلتے چلتے رک گیا۔ شانی نے الماری سے ایک چابی نکالی۔ رستم کو وہیں کمرے میں چھوڑ کر تیزی سے باہر آئی۔ اس کا دل پھڑ پھڑا رہا تھا۔ راہداری میں اچھی طرح دیکھنے کے بعد وہ آگے بڑھی اور دیوار پر لگے ایک سوئچ کو آف کر دیا۔ راہداری میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ واپس کمرے میں آئی اور رستم سے بولی۔ ”چلو آؤ!“

اس نے فوراً ہدایت پر عمل کیا اور شانی کے پیچھے آیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ خطرات کی موجودگی کے باوجود انہیں خاطر میں نہیں لا رہا۔ راہداری میں پندرہ بیس فٹ آگے ایک بالکل تنگ گزرگاہ تھی۔ مشکل سے ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ یہ اوپر سے چھٹی ہوئی اور بالکل تاریک تھی۔ وہ

دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ شانی نے ایک چھوٹے سے دروازے میں چابی گھمائی اور رستم سے بولی۔ ”اس دروازے سے نکل جاؤ۔ تھوڑا آگے ہی باہر کی دیوار ہے۔“

رستم نے الوداعی فقرہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”بی بی! ہمیشہ آپ کے کسی حکم کا منتظر رہوں گا۔“

شانے کے بدن میں ایک بار پھر پھریری سی دوڑ گئی۔ پتا نہیں کس لمحے میں بات کرتا تھا یہ شخص لگتا تھا کہ اثر روح تک اُتر گیا ہے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ دروازے سے نکل کر شانی کے سامنے سے گزرا تو شانی حتی الامکان حد تک دیوار سے لگ گئی پھر بھی شانی کو کراس کرتے ہوئے رستم کا پورا جسم ایک لمحے کے لئے پورے کا پورا شانی سے مس ہوا۔ ایک بجلی سی تھی جو لپکی اور شانی کی رگ جاں میں اُتر کر اوجھل ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ دروازے سے باہر تھا۔ شانی کا پتہ ہاتھوں اور ماتھے پر نمودار ہوتے پسینے کے ساتھ..... شیشائی ہوئی دروازہ مقفل کر رہی تھی۔

کمرے میں واپس آنے کے بعد بھی وہ کتنی ہی دیر تک کسی چڑیا کی طرح سہمی ہوئی ایک گوشے میں دبکی رہی۔ ہر گھڑی دل کو یہ دھڑکا لگا تھا کہ ابھی فائرنگ کی آوازیں آئیں گی اور رکھوالی کے کتے ہوشیار ہو کر شور مچانے لگیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ارد گرد کی فضا جوں کی توں رہی۔ دھیرے دھیرے شانی کا خوف کم ہوتا چلا گیا۔

☆=====☆

سیر ایجنٹ صفدر

سیر ایجنٹ صفدر، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک اور تیز رفتار اور ایکشن سے بھرپور ناول ہے۔ مظہر کلیم کے اس ناول کا تقسیم سیکریٹ سروس کے ایجنٹوں کی انفرادی کارکردگی اور صلاحیتوں پر مبنی ہے۔ مظہر کلیم اس سے پہلے بھی اس طرح کے کئی ناول لکھ چکے ہیں جیسے ”ڈیشنگ ایجنٹ“ اور ”جولیا نامشن“ وغیرہ۔ اس بار پاکیشیا سیکریٹ سروس کے چیف ایکس ٹونے صفدر کو ایک انتہائی خطرناک مشن سپرد کیا ہے اور وہ مشن ہے دشمن ملک کی فوجی لیبارٹری سے ایک اہم فارمولا کی چوری۔ یہ لیبارٹری بہت خطرناک صحرا کے وسط میں واقع ہے جہاں ہر وقت طوفانیں ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور ان ہواؤں کو پار کر کے اس لیبارٹری تک پہنچنا ناممکن۔ صفدر کو اکیلے اس ناممکن مشن کو ممکن بنانا ہے اور خود کو سپر ایجنٹ ثابت کرنا ہے۔ کیا صفدر اپنے اس مشن میں کامیاب ہو گیا؟ کیا باقی سیکریٹ سروس محض تماشا شانی بنی رہی؟ کیا عمران موت سے پنچہ آزمائی کر کے صفدر کی مدد کو پہنچا؟ ان سب سوالوں کے جواب جاننے کے لئے پڑھیے ناول ”سپر ایجنٹ صفدر“۔

”سپر ایجنٹ صفدر“ کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اگلے روز بھی وہ سبھی سبھی پھرتی رہی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ رات جو کچھ ہوا وہ اس کی پیشانی پر لکھا گیا ہے اور ہر کوئی اسے پڑھ لے گا۔ کم از کم فاخر تو ضرور ہی پڑھ لے گا۔ وہ اپنے آپ پر جھنجھلا رہی تھی۔ اس نے ایسی حرکت کیوں کی۔ اگر وہ پکڑا جاتا تو کیا ہوتا..... اور اگر اس کے کمرے میں پکڑا جاتا تو شاید قیامت ہی ٹوٹ پڑتی۔

شانی سے فاخر کی ملاقات اگلی رات ہی کو ہو پائی۔ اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے شانی کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ خواب گاہ کی کھڑکیوں سے باہر خشک ہوا چل رہی تھی اور سسک کے نیلے پردے ہوئے ہوئے بل رہے تھے۔

شانی سر جھکا کر فاخر کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے فاخر کی نگاہیں شانی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ فاخر کے اس انداز نے شانی کو اور بھی پزل کر دیا۔ اس کا پورا وجود ایک مدہم لرزش کی زد میں آ گیا۔ ایسی لرزش فاخر کے سامنے اکثر اس پر طاری ہو جاتی تھی۔

فاخر نے ہاتھ بڑھا کر شانی کی کینٹی کو چھوا اور قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”کیا زیادہ چوٹ لگ گئی ہے؟“

”نہیں۔ کچھ خاص نہیں۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”مجھے افسوس ہوا۔ اس وقت میرا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔“ فاخر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

شانی خاموش رہی۔ یہ نرم رویہ فاخر کے عمومی مزاج سے ہٹ کر تھا۔ تاہم اب کبھی کبھی شانی کو اس رویے کی جھلک نظر آ جاتی تھی۔

”کہو تو ڈاکٹر کو بلا دوں۔“

”نہیں..... اب میں ٹھیک ہوں۔“

”چلو کل تمہیں رنگ والی لے چلیں گے۔“ وہ فراخ دلی سے بولا۔

”لہل..... لیکن آپ کی چوٹیں تو ابھی ٹھیک نہیں ہوئیں۔ میری چوٹ بھی اباجی کو نظر آئے گی۔ خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔“

وہ بھاری بھر کم انداز میں ہنسا۔ ”مردوں کو چوٹیں لگتی ہی رہتی ہیں۔ رسی تمہاری چوٹ تو اسے چھپا لینا..... یوں کر کے!“ اس نے شانی کے ریشمی بالوں کی ایک تہہ ذرا نیچے کوکھ کا دی۔ یوں اس کی کینٹی کا زخم چھپ گیا۔

شانی کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھج گئے۔

وہ جہازی ساز کے پلنگ پر پھیل کر لیٹ گیا۔ یہ سونے کا وقت تھا۔ شانی نے لائٹ آف کی اور اس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ دو دن پہلے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بات کرنے لگا۔ وہ ارادہ ظاہر کر رہا تھا کہ رستم سیال سے ایک بار پھر دو دو ہاتھ ضرور کرے گا اور دو دو ہاتھ کرنے کے لئے اسے ہر صورت تلاش کروائے گا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شانی کے سامنے اپنی خجالت کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جس رستم کو وہ تلاش کرانے کی بات کر رہا ہے وہ قریباً چوبیس گھنٹے پہلے اسی کمرے میں اسی پلنگ کے قریب موجود تھا۔

گفتگو کرتے ہوئے فاخر کے چوڑے چکلے ہاتھ شانی کی نازک زلفوں سے کھیل رہے تھے۔ وہ دیر دیر سے قریب کرتا چلا جا رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی اس کے قریب ہو لیکن وہ تو قریب ہو کر بھی ”قریب“ نہیں ہوتی تھی۔ اس کا جسم بے شک فاخر کے قریب چلا جاتا تھا

لیکن وہ خود اپنے آپ سے دور کھڑی رہتی تھی۔ اب بھی اس کا جوان بدن فاخر کی بانہوں میں تھا لیکن اپنے بدن سے جیسے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ اسے لپٹا تا رہا، بھینپتا رہا، اس کے اندر کچھ جگانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ جیسے جیسے کہتا رہا وہ بلا حجت اس پر عمل کرتی رہی لیکن وہ ہر حرارت محبت، وہ دل نواز سرخوشی کہیں نہیں تھی جس کا فاخر متلاشی تھا۔ جس کا ہر مرد متلاشی ہوتا ہے۔ جو قدرت کا انعام ہوتی ہے۔ وہ محبت تو فاخر نے ایک پھرے ہوئے سا نڈ کی طرح خود اپنے پاؤں تلے روندی تھی۔ ایک عرصے پہلے ملیا میٹ کر دی تھی۔ اب بکھری ہوئی اور سلی ہوئی پتیوں سے دوبارہ پھول کیسے بنتا۔ وہ کتنی ہی دیر تک بکھری ہوئی پتیوں سے پھول بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب ناکام ہوا تو جھنجھلا گیا۔ حسب معمول اس کی حرکات و سکنات کرخت ہوتی چلی گئیں۔ شانی کی کپٹی کے زخم سے خون رسنے لگا۔ وہ اندر ہی اندر کراہنے لگی۔ ایک ناپسندیدہ بوجھ نے اس کے جسم کو دبایا۔ رخساروں پر کانٹے چبھے اور وہ بے حس سی بستر پر پڑی رہی۔

☆=====☆=====☆

لاہور کے ایک اچھے ہسپتال میں شانی کے اباجی کا آپریشن ہو چکا تھا۔ آپریشن کے بعد اگر ان کی حالت بہتر نہیں ہوئی تھی تو اس میں ٹھہراؤ ضرور آ گیا تھا۔ چچا ریکس تو جمع اہل و عیال لندن جا چکے تھے اب صرف چھوٹے چچا مرحوم کی بیوی چچی پروین تھیں جو اباجی کی دیکھ بھال کرتی تھیں یا پھر تایا معصوم تھے۔

رنگ والی آنے بعد شانی کا بہت دل چاہا کہ وہ چند روز اباجی کے پاس رہے اور ان کی دیکھ بھال کرے مگر فاخر اس کے لئے راضی نہیں تھا۔ وہ شانی کو اپنے ساتھ واپس لے جانا چاہتا تھا۔ ہاں اس نے اتنی رعایت ضرور کی کہ رنگ والی میں اپنا قیام بڑھا دیا۔ اب انہیں ایک کے بجائے دو راتیں رنگ والی میں رہنا تھا۔

شام کے وقت فاخر اپنے مقامی دوست سے ملنے گیا ہوا تھا شانی کچھ دیر آرام کرنے کے لئے سیڑھیوں کی ریلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ سنگ مرمر کی یہ سیڑھیاں بے حد صاف شفاف تھیں اور قریبی جھروکے سے بڑی خوشبودار ہوا آتی تھی۔ ان سیڑھیوں پر بیٹھنے کی عادت شانی کو بچپن سے تھی۔ شاید اس وقت سے جب اس نے سکول جانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔

پرانے ملازم خادم حسین نے شانی کو یوں سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا تو آنکھوں میں محبت کی جوت جگائے اس کے پاؤں کی طرف فرش پر بیٹھ گیا۔ ”کیا حال ہے بابا؟“ شانی نے اپنائیت سے پوچھا۔

”تمہارے بعد ہمارا کیا حال ہونا ہے دھی رانی۔ ہر پاسے اداسی چھائی رہتی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ کوئی رنگ والی کے سارے رنگ چرا کر لے گیا ہے۔ خالی کمرے کھانے کو دوڑتے ہیں۔“

”آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا بابا۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں پر وقت تو کبھی رکتا نہیں۔ جس طرح پانی اپنا رستہ خود بناتا ہے زندگی بھی جینے کے بہانے ڈھونڈ لیتی ہے۔“

”بالکل وڈی آپ جیسی باتیں کرتی ہے ٹو۔“ خادم حسین نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

”اب دیکھو ناں۔ جب وڈی آپادینا سے گئی تھیں سب کچھ اندھیر لگتا تھا۔ لگتا تھا اب کبھی روشنی ہوگی ہی نہیں، مگر تم نے دیکھا ہی ہوگا پھر زندگی نے جینے کے بہانے ڈھونڈ لئے۔ چاچا مشتاق بھائی عادل، اباجی اور ہم سب نے مل کر اس حویلی میں پھر سے رنگ اور روشنی بھری۔ اب چاچا مشتاق نہیں ہیں۔ بھائی عادل بھی نہیں..... اور میں بھی نہیں..... لیکن حویلی پھر بھی ہے۔ وقت پھر بھی چل رہا ہے۔“

خادم حسین نے ادھر ادھر دیکھا پھر سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ ”چھوٹا منہ بڑی بات ہے دھی رانی..... لیکن مجھے ایک بالکل کھالص بندے سے پتا چلا ہے کہ رستم سیال اور چوہدری فاخر جی کے بیچ لاشمی کا مقابلہ ہوا تھا..... اور اس مقابلے میں رستم سیال نے فاخر جی کو ہرا دیا ہے.....“

”تم سے کس نے کہی یہ بات؟“ شانی نے ماتھے پر سلوٹ ڈال کر پوچھا۔

خادم حسین اس کی سلوٹ دیکھے بغیر بولا۔ ”میرے ایک یار کا یار ہے۔ جی گا ماں گا ڈی نام ہے اس کا۔ گڈ (نیل گا ڈی) چلاتا ہے۔ اس نے یہ بات بتائی ہے جی۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ تو اپنے آپ میں بہت خوش ہو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا جی کہ رستم سیال جو بھی ہے جیسا بھی ہے پر اس نے ہم سب کا کچھ بخندا کر دیا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ قدرت نے چھوٹے چوہدری صاحب (عادل سلطان) کی ہار کا بدلہ چوہدری فاخر سے رستم سیال کے ہاتھوں لیا ہے۔ اس نے چوہدری فاخر جی کا سارا گھمنڈ آن کی آن میں ختم کر دیا ہے.....“

بات کرتے کرتے خادم حسین نے شانی کا چہرہ دیکھا اور وہاں غصے کے آثار پائے تو جلدی سے بات بدل دی۔ ”میں نے گا ماں گا ڈی سے کہا..... منہ سنبھال کر بات کرو۔ کچھ بھی ہے چوہدری فاخر جی رنگ والی کے جوائی ہیں۔ ہم سب کے لئے عزت کی جگہ پر ہیں۔ اگر وہ..... اگر وہ ہارے بھی ہیں تو اس میں ہمارے لئے خوشی کی کوئی گل نہیں ہے۔“

http://kitaabghar.com

http://kitaabghar.com

شانی کی گہری سنجیدگی دیکھتے ہوئے خادم حسین نے اس بارے میں اور کچھ نہیں کہا۔ دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے اٹھ گیا لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اندر سے مسرور ہے۔

شانی اپنی جگہ بیٹھی رہی اور سوچتی رہی۔ خادم کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ جو کچھ اس نے کہا تھا شانی کے لئے ناپسندیدہ تھا لیکن پتا نہیں کیوں شانی کو اس میں سچ کی جھلک نظر آتی تھی۔ خادم حسین تو خالی بات کر رہا تھا مگر شانی اچھی طرح جانتی تھی کہ رستم سیال نے جو کچھ کیا وہ عادل کا بدلہ لینے اور فاخر کو نیچا دکھانے کے لئے کیا۔ چند ماہ پہلے فاخر نے گرے ہوئے عادل پر لاشمیاں برسائی تھیں اور اسے مچھلی کی طرح تڑپنے پر مجبور کیا تھا۔ شاید ان لمحوں میں عادل کی وہ تڑپ رستم میں منتقل ہو گئی تھی اور اس کے اندر پروان چڑھتی رہی تھی۔

شانی نے ان باتوں کو سوچنا شروع کیا تو ڈیڑھ دو گھنٹے تک سوچتی چلی گئی۔ یہاں آ کر اس کی ذہنی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ انہیں یہاں دو راتیں قیام کرنا تھا۔ اک لحاظ سے یہ مختصر قیام شانی کے لئے اچھا بھی تھا۔ پتا نہیں کیوں یہاں آ کر ”یادیں“ بے طرح اسے ستانے لگتی تھیں۔ چاچا مشتاق کی آواز درود دیوار میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ عادل کے تہقے اس کی شرارتیں بیٹے ہوئے دنوں کے چھوٹے چھوٹے واقعات سب کچھ مل کر اسے گھیر لیتے تھے اور اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ دن رات اباجی کے پاس رہنا چاہتی تھی لیکن جب اس دوسرے پہلو سے سوچتی تھی تو پھر واپس لوٹنے کو دل چاہتا تھا۔ بے شک نارپور کی حویلی اس کے لئے ایک زنداں تھی لیکن اب رنگ والی کی حویلی بھی تو ایک زنداں بنتی جا رہی

تھی..... یادوں کا زنداں۔

اس دفعہ فصل غیر متوقع طور پر کچھ اچھی ہوئی تھی۔ فاخر کی کوشش سے بینک سے زرعی قرضہ بھی مل گیا تھا، حالات زیادہ نہیں تو کچھ بہتر ضرور ہو گئے تھے۔ ابا جی کے سامنے شانی خود کو بہت مطمئن اور خوش ظاہر کرتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اندر سے کتنی خوش ہے۔ وہ دہن نہیں زنداں کی دہن تھی۔ اپنے جاں گسل دکھ کو ہنسی میں چھپانا ایک نہایت دشوار کام ہوتا ہے اور شانی کو سیکھنے کے سامنے یہ کام اور بھی مشکل محسوس ہوتا تھا۔ وہ اس کی راز دواں سیلتی تھی۔ اس کی ازدواجی زندگی کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ ہونا چاہتی تھی۔ اس سے مہکتی راتوں، نرم گرم سرگوشیوں اور دل گدا ز محبت کے قصے سننا چاہتی تھی..... اور اس کے سامنے شانی کو اپنی طبع کے خلاف بے تحاشا جھوٹ بولنا پڑتا تھا۔

دور وز رنگ والی میں رکنے کے بعد شانی اپنے شوہر کے ساتھ نار پور واپس آ گئی۔ ابھی تو اس نے پیاروں کو صحیح طور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ دل جبر کے گھیرے میں تھا اور پلکوں کے پیچھے آنسو تھے۔ جو راستہ اس نے چنا تھا وہ قربانی کا راستہ تھا اور ایسے راستوں پر ایسے موڑ تو آتے ہی ہیں۔ اب ایک بار پھر وہی روز و شب تھے وہی صبح و شام تھے اور وہی چار دیواری تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا شانی کی ازدواجی زندگی کی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ فاخر اپنے ہی بچھائے ہوئے دام میں الجھتا جا رہا ہے۔ شانی اس کے حکم کی تابع تھی۔ اس کی بے دام کی غلام تھی، لیکن اس کی یہ غیر مشروط تابعداری بھی اب فاخر کو مطمئن نہیں کرتی تھی۔ وہ اس سے کچھ اور چاہتا تھا اور اس ”اور“ کی تلاش میں دن رات ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ کسی وقت وہ جنونی انداز میں شانی کو بھنبھوڑ ڈالتا تھا لیکن پھر خود ہی شرم سار ہوتا تھا اور اس کی دل جوئی میں لگ جاتا تھا۔ ایک دو بار اس نے شانی سے باقاعدہ معذرت بھی کی۔

شانئی قصداً کچھ نہیں کر رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا آپوں آپ ہوتا جا رہا تھا۔ کسی وقت اس نے چاہا بھی کہ اس طرح قریب ہو کر فاخر سے دور نہ رہے لیکن وہ قریب نہیں ہو سکی۔ اس نے رات کے ریشمی اندھیروں میں اپنے دل کی گہرائیوں کو ٹٹولا۔ ان میں سے فاخر کے لئے محبت اور گرم جوشی نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ وہی بے حسی اس پر طاری رہی جو اسے کٹھ پتلی بنا دیتی تھی اور یہ کٹھ پتلی صرف فاخر کے ہاتھوں کی جنبش سے حرکت کرتی تھی۔ فاخر جوں جوں ناکام ہو رہا تھا تو اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی حکمت عملی اور اپنی چالوں سے شانی کو سرتاپا حاصل کر چکا تھا..... پھر بھی حاصل کرنا چاہتا تھا اور یہ الگ نوعیت کی طلب روز بروز شدت اختیار کر رہی تھی۔ کسی وقت تو وہ نیم دیوانہ سا لگنے لگتا تھا۔

شانئی نے اپنی تسلیم و رضا اور محبت سے اپنے ارد گرد جو ماحول پیدا کر لیا تھا وہ بھی فاخر کی جھنجھلاہٹ اور محرومی میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ حویلی میں اور حویلی سے باہر ہر دل عزیز تھی۔ ہر کوئی اس کے حسن اخلاق کا دل سے معترف تھا۔ بھابھا اور بچے تو پہلے ہی اس کے دیوانے تھے گھر کے ملازمین بھی بڑی محبت اور اپنائیت سے اسے چھوٹی مالکن کہہ کر پکارتے تھے اور چھوٹی مالکن بھی ان کا یوں خیال رکھتی تھی جیسے کوئی اپنے قریبی عزیزوں کا رکھتا ہے۔ ان کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہوتی تھی۔ خاموشی کے ساتھ ان کی ضروریات پوری کرتی تھی اور کسی پر کوئی تکلیف آتی تو اسے اپنی تکلیف بنا لیتی تھی۔ شاید یہ سب کچھ اسے ماں کی طرف سے ورثے میں ملا تھا۔

پچھلے دنوں حویلی کے پرانے ملازم صدیق کی پوتی جھولے سے گر گئی تھی۔ اس کے سر پر چوٹ آئی۔ جان خطرے میں پڑ گئی۔ لاہور کے

پرائیویٹ ہسپتال میں آپریشن کے لئے فوری طور پر پچیس ہزار روپے درکار تھے۔ شانی نے فاخر سے ذکر کیا۔ اس نے سنی آن سنی کی تو شانی نے اپنے جیب خرچ سے بچائے ہوئے پیسے صدیق کو دیئے۔ بچی کی جان بچ گئی۔ صدیق کی بیوی بہت اچھی کشیدہ کا تھی۔ اس نے شکرانے کے طور پر شانی کو ایک قمیص کا ٹھکڑہ کر دی۔ یہ قمیص اپنی مثال آپ تھی۔ عام سے سوٹی دھاگوں کے ساتھ اس عورت نے گرتے کو قابل دید شے بنا دیا تھا۔ جس نے دیکھا بس دیکھتا رہ گیا لیکن فاخر کو یہ قمیص بالکل پسند نہیں آئی۔ شانی نے دومرتبہ یہ قمیص پہنی اور دونوں بار فاخر کا موڈ ابتر نظر آیا۔ اس موقع پر بھابھو نے شانی کو مخلصانہ مشورہ دیا اور اس سے کہا کہ وہ یہ قمیص کسی کو دے ڈالے ورنہ کسی روز اس کی وجہ سے فاخر اس پر پھٹ پڑے گا۔ شانی خود بھی ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ بھابھو کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شانی نے ایک روز چپکے سے یہ قمیص ایک بھکارن کو دے دی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ یہ قمیص اپنے پاس سنبھال کر رکھے گی تو بھی فاخر کی ناراضگی کا جواز پیدا ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ قمیص کی ناپسندیدگی کے پیچھے کیا وجہ ہے۔ فاخر ایک دم رقابت کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسے یہ ہرگز پسند نہیں تھا کہ ارد گرد کے لوگ شانی کو خصوصی اہمیت دیں اور وہ ان میں مقبولیت اختیار کرے۔

کسی وقت وہ یہ سمجھنے لگتا تھا کہ شاید شانی دوسروں کی نگاہوں میں نمایاں ہونے کے لئے ایسے کام کرتی ہے۔ وہ اسے دوسروں سے الگ تھلگ کرنے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اس کی فطرت کا حصہ ہے۔ محبت کرنا اس کے کردار کا لازمی جزو ہے۔ وہ تو ایسے لوگوں سے محبت کرنے پر بھی مجبور ہے جو اسے دن رات کانٹوں پر گھسیٹتے ہیں۔

☆=====☆

☆ ایک ایسی معصوم اور سادہ دل لڑکی کی داستان۔ جو ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی جو حسن پرست ہی نہیں حسن کا سوداگر بھی تھا۔

☆ دولت اور شہرت کے نشے نے اس کے قدم ڈگمگا دیئے۔ جب آنکھ کھلی تو وہ تہی داماں تھی۔

☆ خوابوں کی اس راہ گزری داستان جہاں قدم قدم پر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیاں بکھری ہوئی ہیں مگر اس کے افسانہ پر ایک گہری، اندھیری اور ہولناک دلدل ہے۔ جس میں معصوم اور سادہ دل لڑکیوں کی شرم و حیا اور عصمت نایاب کے گہرے ہو جاتے ہیں۔

☆ ”شو بزنس“ کے چمکیلے اور روپے پلے راستوں کی داستان، جہاں ہر سو ”حسن“ کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیاں بکھری ہیں دولت اور شہرت جہاں قدم قدم پر نچھاور ہونے کو تیار رہتی ہیں۔

☆ ان ہندو گلیوں کی کہانی، جہاں آگے کوئی منزل ہوتی ہیں تا پھر پیچھے کوئی راستہ چلتا ہے۔

مڑا کے ٹول نہ جائیں

شگفتہ بھٹی

قیمت: 350/-

الشاکست
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور۔

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

Ph: 7247414

براہ راست
منگوانے
کا پتہ

موسم بدل رہا تھا۔ گرمیوں اور برسات کے بعد اب سردیوں کے آثار شروع ہو گئے تھے۔ شانی کا دادا سرب صحت مند تھا۔ اکثر گہری شاموں اور اندھیری صبحوں میں وہ اپنی خاص کیاری کے ارد گرد منڈلاتا نظر آتا۔ اس کا خصوصی ملازم اکبر ابھی عموماً اس کے ہمراہ ہوتا تھا۔ وہ لاہور سے واپس آچکا تھا عادل سلطان کے ہاتھوں لگنے والی گولی کے بعد اکبر کی چال میں تھوڑی لنگڑاہٹ آگئی تھی، مگر اس کی طاقت اور چوکی میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔ اپنی کبوتر کے خون جھسی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ اکثر مہر کی وہیل چیر کے آس پاس دکھائی دیتا تھا۔

فاخر کئی دنوں سے خاموش تھا۔ شانی سے زیادہ بات نہیں کر رہا تھا۔ ایک خوشگوار شام کو وہ دونوں باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے اور بھابھو کے بچوں کو فٹ بال کھیلنے دیکھ رہے تھے۔ منا ہانپتا ہوا آیا اور ذرا سستانے کے لئے شانی کی گود میں چڑھ بیٹھا۔ شانی نے جلد ہی اسے نیچے اتار دیا۔ فاخر کی موجودگی میں وہ منے اور ندیم سے بھی زیادہ لاڈ پیار نہیں کرتی تھی۔ شانی کو لگتا تھا جیسے وہ ان سے بھی رقابت محسوس کرنے لگتا ہے۔

کچھ دیر بعد شانی کو محسوس ہوا کہ فاخر کا موڈ قدرے بحال ہونے لگا ہے۔ اس نے ایک دو انگڑائیاں لیں۔ منے اور ندیم سے چند باتیں کیں پھر جیب سے فرنیچ و ہسکی کی کوارٹر بوتل نکال کر ایک دو گھونٹ بڑے اسٹائل سے بھرے۔ شام کے سائے اندھیرے میں بدلنے لگے۔ کل چھٹی تھی۔ فاخر بڑے ایزی موڈ میں نظر آنے لگا تھا۔

اس نے شانی کو کمرے میں چلنے کے لئے کہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بھانپ گئی کہ اسے کیا فرض ادا کرنا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ کسی جیل و جت سے کام نہیں لیتی تھی۔ وہ دونوں کمرے میں آئے۔ فاخر نے کیسٹ پر اپنی من پسند پنجابی موسیقی لگائی۔ شانی نے سلک کے نیلگوں پر دے برابر کئے پھر ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شب خوابی کا مہین لباس پہنے کمرے میں آگئی۔ یہ بستر پر جانے کا وقت تو نہیں تھا لیکن اس حویلی میں کس وقت کیا کرنا ہے یہ وقت کے حساب سے نہیں فاخر کی مرضی کے حساب سے ہوتا تھا۔ وہ نیم دراز و ہسکی کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے رہا تھا ساتھ ہی سگریٹ بھی پھونک رہا تھا۔ شانی ایک معمول کی طرح اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اسے شب خوابی کے لباس میں دیکھ کر وہ چونک گیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
”یہ کیا ہے بھئی!“ اس نے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذرا حیرت سے پوچھا۔

”آپ ہی نے تو کہا تھا۔“
”میں نے تو اندر چلنے کو کہا تھا۔“

”مم..... میں سمجھی شاید.....“ وہ ہکلا کر رہ گئی۔
”یہ کیا ہے بھئی؟“ وہ بے زاری سے بولا۔ ”یہ کیا ہر وقت کاٹھ کی پتلی بنی رہتی ہو۔ کیا میں صرف اسی کی غرض سے تمہیں اندر بلا سکتا ہوں۔ کیا میاں بیوی میں اور کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آپس کی اور کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔“

”ہوتی ہے فاخر..... لال..... لیکن..... پہلے کبھی ایسا ہوا نہیں..... اس لئے.....“
”شانی..... شانی! خدا کے لئے اپنا یہ روپ بدلو..... مجھے اس سے گھبراہٹ ہونے لگی ہے بلکہ کیا کہنا چاہئے..... وحشت ہونے لگی ہے۔“

تم مجھے تکلیف دے رہی ہو۔ میرا سکون برباد کر رہی ہو۔ خدا کے لئے ایسا مت کرو۔“ فاخر کے لہجے میں برہمی تو تھی لیکن زیادہ سختی نہیں تھی۔

شانی سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ وہ اسے غصے سے لیکن بے بسی سے دیکھتا رہا۔ چند سیکنڈ اسی طرح گزر گئے پھر وہ ٹھہرے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ”جاؤ، کپڑے بدل کر آؤ۔ ہم تھوڑی دیر بیٹھیں گے۔ باتیں کریں گے۔“

”جی اچھا۔“ شانی نے کہا اور اندر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پہلے والے کپڑوں میں ملبوس واپس آ گئی۔

آج فاخر کے چہرے پر ایک بے بس سی نرمی تھی۔ وہ اس سے مدہم لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ یہ دل جوئی کی باتیں تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسے اندر سے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”شانی! کیا خیال ہے۔ اگلے ہفتے دوبارہ رنگ والی نہ چلیں؟“

”جیسے آپ کی مرضی۔“

”رمضان شروع ہونے والا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ رمضان سے پہلے تمہارے اباجی کو چند دن کے لئے یہاں لے آتے ہیں۔ وہ اب دلی سے ان کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ تمہیں بھی ان کی خدمت کا موقع ملے گا۔“

”پتا نہیں کہ وہ آسکیں گے یا نہیں۔ سفر ان کے لئے مشکل ہوگا۔“

”بھئی، ہم انہیں لکڑی گاڑی میں آرام سے لے کر آئیں گے۔ تم تھوڑا سا زور دو گی تو وہ آنے کے لئے تیار بھی ہو جائیں گے۔“

”آپ کہتے ہیں تو کہہ کر دیکھ لیں گے۔“ شانی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اوہ یاد آیا۔“ فاخر چونک کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”لاہور سے تمہاری پسند کی مٹھائی لایا تھا میں۔“

وہ الماری تک گیا اور خانے میں سے مٹھائی کا ڈبا نکال لایا۔ شانی نے کچن میں جا کر تھوڑی سی مٹھائی پلیٹ میں نکالی اور فاخر کے پاس آ بیٹھی۔ رات کی رانی کی خوشبو کمرے کو معطر کر رہی تھی۔ ”کھاؤ ناں بھئی۔“ فاخر نے کہا۔

”آپ بھی تو کھائیں۔“ وہ بولی۔

فاخر نے ایک ٹکڑا اٹھایا، ایک شانی نے بھی اٹھالیا۔

وہ باتیں کرنے لگے۔ شانی کے ریشمی بال ڈھیلے ہو کر رخساروں تک لٹک آئے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف لے جا کر بالوں کو سمیٹنے لگی۔ اسے بالوں کا بوڑھا ناتے دیکھ کر فاخر اپنی جگہ سے اٹھا۔ شیشے کی منقش تپائی پر تازہ پھولوں کا گلہ مستہ رکھا تھا۔ رات کی رانی کے چھوٹے پھولوں کے درمیان گیندے اور گلاب کے پھول تھے۔ فاخر نے گلاب کا ایک تازہ پھول نکالا اور شانی کے عقب میں جا کر اس کے بُوڑے میں اڑس دیا۔

یہی وقت تھا جب کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے سامنے حرکت سی نظر آئی۔ شانی نے چونک کر دیکھا، اس کا دادا سر مہر اپنی وہیل چیئر

دھکیلتا ہوا راہداری سے گزر رہا تھا۔ وہ ایک لمبے کے لئے کھڑکی کے سامنے رکا۔ اس نے اپنی اکلوتی جلتی ہوئی آنکھ سے اندر کا منظر دیکھا اور پھر آگے

بڑھ گیا۔ شانی ٹھک سی گئی۔ شاید فاخر بھی تھوڑا سا چوڑا تھا۔ شانی جانتی تھی کہ مہر ہر وقت شانی اور بھابھ پر نظر رکھتا ہے۔ خاص طور سے شانی تو ہر وقت مہر یا اس کے خاص کارندے اکبرے کی نظر میں رہتی تھی۔ اب بھی مہر کو کمرے کی کھڑکی کے سامنے دیکھ کر شانی کا دل دھک سے رہ گیا اور ذہن میں انجانے وسوسے سر اٹھانے لگے۔

فاخر نے اس صورتِ حال کا بظاہر کوئی نوٹس نہیں لیا اور شانی سے ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف رہا۔ رات کو وہ لوگ دیر تک جاگتے رہے چائے پیتے رہے اور وی سی آر پر ایک خوبصورت فلم دیکھتے رہے۔

بہت کچھ تبدیل ہو رہا تھا لیکن شانی کے اندر کا موسم تبدیل نہیں ہو رہا تھا۔ ایک خزاں سی تھی جو رگ و پے میں ٹھہر گئی تھی۔ مہر کا خوف بھی اپنی جگہ برقرار تھا۔ اس کی موجودگی شانی کو خوف زدہ کر دیتی تھی۔ وہ اپنے ذہن کو بہت سمجھانے کی کوشش کرتی تھی لیکن جب بھی وہ مہر کی آنکھوں میں دیکھتی تھی اسے ان میں ایک خونخوار ”بلی مار“ کا چہرہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے لگتا تھا کہ کسی دن مہر کے اندر کالا دوا پھوٹ پڑے گا اور وہ غضب ناک ہو کر شانی پر پل پڑے گا۔ اس کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے گا یا جان سے مار ڈالے گا۔ مہر کی غیر معمولی کینہ پروری ہر شے سے بالاتر تھی۔ وہ دیہی علاقوں کا وہ روایتی منتقم المزاج تھا جو صدیوں سے سنہرے دیس کی سنہری فضاؤں میں زہر گھول رہا ہے۔ اس کی بد خصلتی کا عالم یہ تھا کہ اس نے قادر بخش سے انتقام لینے کے لئے پون صدی تک انتظار کیا۔ قادر کی پہلی نسل میں کوئی لڑکی تو لد نہیں ہوئی تو اس نے دوسری نسل کی راہ دیکھی اور جب دوسری نسل کی سب سے پہلی لڑکی نے پیدا ہو کر جوانی کے پہلے زینے پر پاؤں رکھا تو مہر کا انتقام بچن پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

کسی وقت بیٹھے بیٹھے شانی کے دل میں ایک اور طرح کی چنگاری چمک اٹھتی تھی۔ ایک چہرہ اس کے تصور میں آتا تھا اور تمام تر کوشش کے باوجود وہ تصور سے چپکا رہتا تھا۔ یہ رستم عرف واحدی کا چہرہ تھا۔ اس چہرے کا تصور کیوں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا؟ وہ جھنجھلا کر سوچتی اور کسی اور مصروفیت میں دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگتی مگر دھیان پلٹ پلٹ کر اسی طرف چلا جاتا۔ شانی کو یوں لگتا جیسے اس شخص کے سینے میں بھڑکنے والی آگ کی کچھ چنگاریاں اس کے اپنے سینے میں آگری ہیں اور اب اندر ہی اندر کچھ سگرا رہی ہیں۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو جاتی۔ استغفار پڑھنے لگتی یا نوافل ادا کرنے بیٹھ جاتی۔ نہ چاہنے کے باوجود رستم کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے ”بی بی! جیسے پہاڑی ندی کا ریلہ ہوتا ہے ایسا ہی کوئی ریلہ ہے جو مجھے اپنے ساتھ بہاتا چلا جا رہا ہے۔ نہ میں کہیں رک سکتا ہوں نہ ٹھہر سکتا ہوں نہ اپنا راستہ بدل سکتا ہوں۔ میں بالکل بے بس ہوں بی بی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں راتوں کو دیوانوں کی طرح جاگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یہ میرے دل کو کیسا روگ لگا ہے۔“

وہ خوفزدہ ہو کر سوچتی۔ اس صورتِ حال کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ کیا یہ معاملہ کوئی سنگین صورت تو اختیار نہیں کر جائے گا؟ پھر اسے رستم کے الفاظ یاد آتے۔ اس نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔ ”میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا۔ کچھ بھی نہیں۔ زندگی کے آخری سانس تک میری بس ایک ہی تمنا ہوگی۔ آپ خوش رہیں اور میں کبھی کبھی آپ کو دیکھتا رہوں۔“

وہ صدقِ دل سے یہ دعا کرنے لگتی کہ اس شخص کے دل میں جو ناقابلِ قبول جذبہ پیدا ہوا ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی ختم ہو جائے یا اپنی شدت کھودے لیکن پھر اس کا دھیان خود اپنی طرف چلا جاتا۔ وہ سوچنے لگتی کیا اس شخص کے حوالے سے اس کے اپنے دل میں کچھ بھی نہیں ہے؟

اس سوال کا جواب پریشان کن طور پر نفی میں ملتا۔ اس کے اپنے دل میں بھی کچھ نہ کچھ تھا..... یا کچھ نہ کچھ پیدا ہو چکا تھا۔ اسے رستم سے ہمدردی تھی۔ ایک عام شخص کی حیثیت سے وہ اسے اچھا لگتا تھا۔ کئی موقعوں پر اس کی موجودگی اس کی ڈھارس بھی بندھاتی تھی۔ وہ جب نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تو وہ اس کے بارے میں سوچتی تھی لیکن اس کے سوا کچھ نہیں تھا..... کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ہفتے کے روز فاخر اور شانی پھر رنگ والی گئے۔ ابا جی نے گرم جوشی سے انہیں خوش آمدید کہا۔ فاخر کے رویے میں بھی محبت کی حرارت تھی۔ وہ ان کے لئے لاہور سے ایک سپیشلسٹ ڈاکٹر اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حویلی میں ہی چوہدری ارشاد کا معائنہ کیا اور ان کی حالت کو تسلی بخش قرار دیا۔ ان دونوں نے دوروز رنگ والی کی حویلی میں گزارے۔ فاخر شانی کو ساتھ لے کر چاچا مشتاق اور عادل کی قبروں پر بھی گیا اور فاتحہ خوانی کی۔

مقامی ایم این اے اتفاق سے فاخر کا دوست تھا۔ فاخر اس سے ملا اور اس پر زور دیا کہ وہ رنگ والی کی سڑک کی مرمت اور کشادگی کا کام جلدی شروع کرائے۔

آخری روز چوہدری ارشاد کے مجبور کرنے پر فاخر نے اپنا قیام ایک روز کے لئے مزید بڑھا دیا۔ چوہدری ارشاد چاہتے تھے کہ فاخر گاؤں کے نواح میں مچھلی کا شکار کھیلے۔ وہاں سائنن پر مچھلی کی غیر معمولی بہتات تھی۔ شانی کو یاد آیا کہ جب فاخر اس کی بارات لے کر نار پور سے رنگ والی آیا تھا تو اس نے باراتیوں کے ساتھ مل کر مچھلی کا شکار کیا تھا۔ اس شکار میں ان لوگوں نے بڑے اجڈ پن سے دھما کہ خیز مواد استعمال کیا تھا۔ بم چلا کر مچھلیوں کے چپترے اڑا دیے گئے تھے۔ شانی نے سوچا شاید اس مرتبہ بھی وہ اپنے طریقہ کار کے مطابق ہی شکار کھیلے گا لیکن یہ جان کر اسے خوشی ہوئی کہ اس نے جال کے ذریعے شکار کھینے کو ترجیح دی ہے اور ایک مقامی شکاری کی طرف سے آفر کئے جانے کے باوجود دھما کہ خیز مواد استعمال نہیں کیا۔

رات کو ایک پُر تکلف کھانے کے بعد چوہدری ارشاد اور فاخر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چچی پروین، تایا معصوم اور شانی بھی اس محفل میں موجود تھے۔ باتوں باتوں میں رستم سیال کا ذکر چھڑ گیا۔ چوہدری ارشاد نے پوچھا۔ ”اس کا کہیں کھوج لگا نہیں؟“

”نہیں ابھی تو نہیں۔ میرے بندے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ پولیس نے بھی چار پانچ سیالوں کو پکڑا ہوا ہے۔ ان سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔“

”بیٹھا ہو گا کہیں چوہے کی طرح گھس کر!“ تایا معصوم نے کہا۔

چچی پروین نے کہا۔ ”ایسے لوگ وقتی طور پر چپ ہو جاتے ہیں لیکن جب معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے تو پھر بد معاشیاں شروع کر دیتے ہیں۔“

”وہ بد معاش تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو خطرناک ڈکیت اور قاتل ہے۔“ تایا معصوم بولے۔

”لہلہ..... لیکن سنا ہے کہ اب کچھ عرصے سے اس نے کوئی واردات وغیرہ نہیں کی ہے۔“ شانی نے گفتگو میں حصہ لیا۔

”ہاں..... یہ بات تو میں نے بھی سنی ہے۔“ چوہدری ارشاد نے ہنکار بھرا۔ ”پچھلے ہفتے ایس اچھا امیاں مظفر میرے پاس آیا ہوا تھا۔ بتا رہا تھا کہ آج کل علاقے میں کافی سکون ہے۔ ڈکیتوں کے دو بڑے گروہ ختم ہو چکے ہیں۔ رستم سیال کا گروہ بھی خاموش ہے۔ یہ بھی بتا چلا ہے کہ رستم سیال بالکل بدل گیا ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو تتر بتر کر دیا ہے اور خود نماز روزے کی طرف توجہ دینے لگا ہے۔ رستم کے ایک جاننے والے نے تو

یہاں تک بھی بتایا ہے کہ رستم کے پاس چوری ڈاکے سے جمع ہونے والا آٹھ دس لاکھ روپیہ تھا جو اس نے دریا میں پھینک دیا۔ بعد میں کچھ زیورات وغیرہ اس نے ان کے حق داروں تک بھی پہنچائے ہیں۔“

”ایسی بات میں نے بھی سنی ہے مگر کیا پتا یہ بھی کوئی چال ہو۔ اس قسم کے لوگ پولیس کو دھوکا دینے کے لئے بھی تو کچھوے کی طرح اپنا سر چھپا لیتے ہیں۔“ تانیا معصوم نے خیال ظاہر کیا۔

”بہر حال جو کچھ بھی ہے ہمارے لئے تو وہ دشمن ہی ہے۔“ چوہدری ارشاد نے کہا۔ ”پچھلے ہفتے اس نے جو کچھ کیا ہے وہ سارا میں نے انسپکٹر مظفر کے گوش گزار کیا ہے۔“

شانی خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن اس کے لبوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ رستم کے حق میں کچھ کہہ سکتی اور شاید اسے کہنا بھی نہیں چاہئے تھا۔

رات گیارہ بجے کے قریب شانی اور فاخر خواب گاہ میں پہنچ گئے۔ فاخر دوستانہ انداز میں شانی کو مچھلی کے شکار کا احوال سنانے لگا۔ اس کے لب و لہجے اور رویے میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں..... اور یہ عمل مسلسل جاری تھا۔ بستر پر لیٹ کر فاخر نے بڑی نرمی سے شانی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ شب خوابی کا مہین ریشمی لبادہ شانی کے ریشمی بدن پر پھسل رہا تھا۔ دوریشموں کی رگڑ سے ایک خوبصورت اور جذبات انگیز سرسراہٹ پیدا ہوتی تھی۔ یہ سرسراہٹ فاخر کے لبوں میں آگ جگا رہی تھی۔ اس کا چہرہ شانی کی سیاہ زلفوں میں چھپتا چلا جا رہا تھا..... لیکن..... دوسری طرف وہی خاموشی تھی۔ وہ حرارت اور چاہت برائے نام ہی دکھائی دیتی تھی جس کا فاخر خواہش مند تھا۔

وہ اس چاہت کی طلب میں ہاتھ پاؤں چلاتا رہا پھر بے دم سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں اس نے بے بسی سے شانی کا چہرہ دیکھا پھر آزدہ لہجے میں بولا۔ ”شانی! ایسا کب تک چلے گا۔ کب تک میرے پاس ہو کر بھی دور رہو گی۔“

وہ خاموش رہی۔ اس نے ایک بار پھر گرم جوشی سے اسے بانہوں میں لیا۔ اسے چومنے لگا۔ لپٹانے لگا۔ وہ نیم دلی سے اس کے قریب رہی۔ آخر وہ ہانپ گیا۔ لاچار سا نظر آنے لگا۔ شانی نے اپنا حسین چہرہ اس کے سینے میں چھپائے سرگوشی کی۔ ”فاخر! مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ آپ تبدیل ہو رہے ہیں تو میں بھی تبدیل ہو رہی ہوں مگر اس تبدیلی میں کچھ وقت تو لگے گا.....“

فاخر نے ایک گہری سانس لی اور مجبور لہجے میں بولا۔ ”کتنا وقت؟“

”بس تھوڑا سا۔ میں بڑی طرح مکھڑگی تھی فاخر..... سمجھیں کہ کرچی کرچی ہو گئی تھی۔ اب آپ کی محبت مجھے سمیٹ رہی ہے۔ امید ہے کہ بڑی جلدی سمٹ جاؤں گی۔“

وہ جذبات سے بوجھل آواز میں بولا۔ ”اگر میرے پاس رہنے سے کوفت ہوتی ہے تو تم سے دور چلا جاتا ہوں۔ چند ہفتوں یا چند مہینوں کے لئے۔“

”نہیں فاخر!“ وہ اس کے توانا جسم کے گرد اپنی نازک بانہیں لپیٹتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے پاس ہونے سے ہی تو میں بدل رہی ہوں۔“

بس یہ چاہتی ہوں کہ مجھے تھوڑی سی مہلت مل جائے۔ اس مہلت کے بعد جب میں اس طرح..... آپ..... کے پاس لیٹوں تو میرے پاس وہ سب کچھ ہو جو ایک بیوی کے پاس ہونا چاہئے۔ آپ کو میرے اندر سچ نظر آئے۔ وہی سچ جس کے نہ ہونے کی وجہ سے میں اپنی نظروں میں آپ گر جاتی ہوں۔“ وہ شرم سے بوجھل لہجے میں سب کچھ کہہ گئی۔

اگلے روز انہیں رنگ والی سے واپس نارپور روانہ ہونا تھا۔ فاخر ابا جی کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا اور گپ شپ کر رہا تھا۔ شانی اس کمرے میں چلی آئی جہاں اس کی امی جی کی تصویر تھی۔ وہی تصویر تھی لیکن پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ آج چہرے پر چمک کچھ زیادہ ہے۔ وہی چمک جو رنگ والی کی دڈی آپا سے مخصوص تھی۔ دانائی اور محبت کی چمک۔ وہ اپنی ماں کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ماں جیسے کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا تھا ناں میری دھی! لڑائی صرف زور اور غصے سے ہی نہیں جیتی جاتی، عاجزی اور محبت سے بھی جیتی جاتی ہے اور ایسی جیت زیادہ دیر پا اور شاندار ہوتی ہے۔ درخت کا ”بی“ جب خود کو مٹی اور کچھڑ میں ملاتا ہے تو پھر درخت بنتا ہے۔ آگے کیا ہوگا اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ پر تُو نے نفرت اور دشمنی کو ”محبت اور صبر“ کے سامنے نیچا کر دکھایا ہے۔

☆=====☆=====☆

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

- ۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔
- ۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
- ۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو نوٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

شانی اور فاخر رنگ والی سے نار پور واپس آ گئے۔ اگلے چھ سات روز میں کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا لیکن شانی صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ مہر کی آنکھوں میں (بلکہ کہنا چاہئے اکلوتی آنکھ میں) قہر و غضب کی کیفیت ہمیشہ سے زیادہ ہے۔

پھر ایک دن بھابھ بونے شانی کے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے اسے بتایا۔ ”شانی مجھے لگتا ہے کہ مہر کو تجھ پر بڑا غصہ ہے۔ وہ آج کل فاخر کو تیرے خلاف بھڑکانے پر لگا ہوا ہے۔“

شانی نے لرز کر اپنا رخ پھیرا اور بھابھ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ ”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ اس نے پوچھا۔

بھابھو بولی۔ ”کل شام میں مہر کو کھانا دینے اس کے کمرے میں گئی۔ فاخروہاں پہلے ہی بیٹھا تھا۔ دادے پوتے میں بات ہو رہی تھی۔ دادا بڑے غصے میں تھا۔ گڑگڑغوغوغوغاں بولتا چلا جا رہا تھا۔ تمہاری بات کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، وہ دشمن کی بیٹی ہے اس سے وہی سلوک ہونا چاہئے جو دشمن سے ہوتا ہے۔ وہ اس گھر کی رانی نہیں نوکرانی ہے۔ چند دن کے لئے اسے نوکرانیوں کی طرح رکھو پھر میں تمہارے لئے سچ مچ کی رانی ڈھونڈ کر لاؤں گا۔“

”فاخر نے کیا کہا؟“ شانی نے پوچھا۔

”اس نے کیا کہنا تھا۔ مہر کے سامنے تو وہ بھی اونچی آواز میں نہیں بولتا۔ بس اتنا کہا کہ وہ بڑی احتیاط سے چل رہا ہے، آئندہ اور بھی احتیاط کرے گا۔ میں زیادہ دیر وہاں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی، اس لئے اندر چلی گئی۔ ورنہ پتا نہیں کیا کیا باتیں معلوم ہوتیں۔“

شانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمکنے لگی۔ بھابھو نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تجھے یہ سب کچھ اس لئے بتایا ہے کہ تجھے خبر ہے۔ ماشاء اللہ تو بڑی سیانی ہے۔ اپنے گھر کی ہر اونچ نیچ سمجھ گئی ہے۔ اگر مہر کے منہ سے آگ نکلنا شروع ہو گئی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ تجھے کامیاب ہوتے دکھ رہا ہے۔ تم دونوں کے سلوک نے اس کے اندر بھانپڑ لگا دیئے ہیں.....“

شانی نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ بس ناک سے سوسوں کی آواز نکالتی رہی۔ بھاؤ نے اس کے کھلے بالوں کو بڑے پیار سے کانوں کے پیچھے اڑسا اور بولی۔ ”بس اب ہمت نہ ہارنا۔ بیوی سے زیادہ خاوند کے قریب اور کوئی نہیں ہوتا۔ فخر کو اتنا پیار دو کہ اسے کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہ ملے۔“

شانی نے اثبات میں سر ہلایا لیکن اس کے ساتھ ہی دل میں ٹیس سی اٹھی۔ اس نے سوچا۔ وہ کہاں سے لائے پیار؟ اس پیار کی لاش پر تو فتح مند لشکر نے اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔ اب وہ کہاں کہاں سے نکلے اکٹھے کرے۔ وہ ان نکلڑوں کو ڈھونڈنے اور جوڑنے کی دن رات کوشش کر رہی تھی۔ کبھی لگتا تھا کہ کامیاب ہو جائے گی۔ کبھی محسوس ہوتا تھا کہ کامیابی بہت دور ہے۔

ابھی شانو اور بھا بھاتیں ہی کر رہی تھیں کہ مہر کی پُر غصہ غوں غاں سنائی دی۔

وہی آواز جوشانی پر لرزہ طاری کر دیتی تھی۔ شروع میں یہ آواز شانی کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھی لیکن اب اس شور میں سے کوئی کوئی لفظ اس کے لیے پڑنے لگا تھا۔

آواز سنتے ہی بھابو کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد مہراپنی وہیل چیئر چلاتا ہوا کمرے کے دروازے کے عین سامنے آن رکا۔ اس کی اکلوتی آنکھ شعلے برسا رہی تھی۔ غوں غاں گڑ..... خرخر غوں غا..... وہ طیش کے عالم میں منہ سے جھاگ اڑانے لگا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ اپنی پھلوری کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے اور بھابو پر یا اس پر لعن طعن کر رہا ہے۔

چند سیکنڈ بعد اس پر یہ عقدہ کھلا کہ اس لعن طعن کا نشانہ وہ خود ہے۔ بھابو نے زرد چہرے کے ساتھ شانی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم شام کو پھر پھلوری کی طرف گئی تھیں؟“

”نہیں بھابو۔“ شانی نے پورے یقین سے کہا اور نفی میں سر ہلایا۔

مہر ایک بار پھر غضب کے عالم میں اپنی جناتی زبان بولنے لگا۔ وہ اپنی وہیل چیئر آگے بڑھاتا چلا آ رہا تھا اور شانی کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ اسے کچھ مار ہی نہ بیٹھے۔ شاید بھابو نے بھی اس کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ غیر محسوس طور پر مہر اور شانی کے درمیان آ گئی۔

”مہر جی تو کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے خود تمہیں پھلوری کے پاس دیکھا ہے۔“

شانہی رو ہانسی ہو گئی۔ ”نہیں دادا! ام..... میں احاطے میں گئی تھی لیکن پھلوری کے تو پاس سے بھی نہیں گزری۔ شش..... شاید اندھیرے میں آپ کو دھوکا ہوا ہو۔“

مہر نے پھر پٹیش لہجے میں غوں غاں کی۔ ایک تنگی گالی کے الفاظ واضح طور پر سنائی دیئے۔ یوں لگتا تھا کہ مہر کا طیش بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی کرسی بڑھتے بڑھتے بھابو کے گھٹنے سے آگئی تھی۔ شاید وہ درمیان میں نہ ہوتی تو وہ اسے کوئی چیز اٹھا کر دے مارتا۔ بھابو نے اپنی انگلی کے ٹپ کے سے شانی کو سمجھایا کہ وہ بچہ ہوئے مہر کے سامنے خاموش ہی رہے۔

شانہی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر نظر جھکا لی پھر بھی اسے یہی محسوس ہوتا رہا کہ مہر کی اکلوتی آنکھ سے سانپ کا زہر خارج ہو ہو کر اس کے چہرے میں جذب ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مہر کی انگارے برساتی آواز بھی شانی کی سماعت کو مجروح کر رہی تھی۔

خدا خدا کر کہ قہر کا یہ چڑھا ہوا دریا اُترا..... اور مہراپنی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا احاطے کی طرف چلا گیا۔

بعد میں شانی سسکنے لگی۔ بھابو نے اسے گلے لگا کر دلاسا دیا۔ مٹا اور ندیم بھی ماں کی نقل کرتے ہوئے معصومیت سے شانی کے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگے اور پیچ پیچ کرنے لگے۔

شانہی نے بھابو کو بتایا کہ وہ ہرگز پھلوری کی طرف نہیں گئی۔ کیا اسے اپنی جان عزیز نہیں ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہاں سانپ گھومتا ہے۔

بھابو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے سامنے صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں تو سولہ آنے ٹھیک کہتی ہے۔ اسی بڑھے کا دماغ خراب ہے لیکن اس کی زبان کو کون پکڑ سکتا ہے۔ بس جو دماغ میں آیا بک دیا۔ تو پریشان مت ہو۔ میں فاخر کو بھی سمجھا دوں گی کہ اس کے دادے کو اندھیرے میں دھوکا ہوا ہے۔“

”پروہ ایسا کیوں کرتے ہیں بھابو! پچھلے ہفتے بھی فاخر مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تم پھلوری کی طرف کیوں گئی تھیں دادا جی ناراض ہو رہے“

ہیں۔ میں نے کہا، میں نہیں گئی تھی۔ فاخر اپنی بات کرتے رہے۔ کہنے لگے دادا نے تمہیں کہیں اس پاس دیکھا ہوگا تو کہہ رہے ہیں ناں۔“

”بس وہ تم دونوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ تو اپنا حوصلہ جوان رکھ۔ اللہ نے چاہا تو آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہاں چاچی! چھب ٹھیک ہو جائے گا۔“ منے نے بھی اس کے گال پر ہاتھ پھیرا۔

شانی رات تک کانپتی رہی۔ اسے خوف تھا کہ مہرجی سے ملنے کے بعد فاخر اس سے بہت ناراض ہوگا اور شاید وہ ہوتا بھی لیکن یہاں بھی بھابھ اپنی تمام تر فراست کے ساتھ بیچ میں آگئی۔ اس نے فاخر کو بہت کچھ سمجھا بچھا دیا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی وہ شانی نے پوری کر دی پھر بھی ایک دو دن تک فاخر خفا نظر آتا رہا۔ حالات بہت بدل چکے تھے۔ اگر مہر نے اس قسم کی چنگاری چند ماہ پہلے پھینکی ہوتی تو شاید بھڑک کر شعلہ جوالا بن چکی ہوتی۔ اب یوں لگتا تھا کہ فاخر کو بات سہنا اور برداشت کرنا آ گیا ہے۔ وہ شانی کی بات بھی تحمل سے سنتا تھا اور ٹھنڈے لہجے میں اس پر رائے بھی دیتا تھا۔

اس کے علاوہ شانی نے ایک اور تبدیلی بھی محسوس کی۔ لٹھ بازی میں فاخر کا شوق پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ وہ اکھاڑے میں جاتا ضرور تھا لیکن جلدی واپس آ جاتا تھا۔ ذاتی طور پر بھی وہ لالچی چلانے میں کم حصہ لیتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ اس کی کلائی کی چوٹ تھی۔ باقی چوٹیں تو ٹھیک ہو چکی تھیں لیکن دو ڈھائی ماہ گزرنے کے باوجود کلائی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس پر پلک دار پٹی باندھ کر رکھتا تھا۔ کبھی کبھی تو شانی کو یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ فاخر کے رویے میں جو پلک پیدا ہوئی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لٹھ بازی کی طرف سے اس کا دھیان کم ہو گیا ہے۔ اس کے اندر جو ایک بے جا رعب اور خرف پایا جاتا تھا اس میں..... رسم سے لڑائی کے بعد..... کمی واقع ہوئی تھی اور یہ تبدیلی مجموعی طور پر اس کے کردار کے لئے نیک شگون رہی تھی۔

چند ہفتے پہلے کی اس سنسنی خیز رات کے بعد رسم سیال کا پھر کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ دھیرے دھیرے شانی کا یہ اندیشہ ختم ہو گیا کہ کسی دن وہ اچانک پھر حویلی میں نظر آئے گا۔ اس کے بارے میں کوئی خبر کوئی اطلاع بھی شانی کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ حالانکہ کسی وقت غیر شعوری طور پر اس کے دل میں یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی تھی کہ رسم کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ جب فاخر اپنے کارندوں سے بات چیت کر رہا تھا، شانی نے اس کی بات پر کان دھرنے کی کوشش کی۔ جیسے وہ جاننا چاہ رہی ہو کہ یہ بات چیت رسم کے بارے میں تو نہیں۔ پتا نہیں کیوں..... کیوں رسم کا دھیان آپوں آپ شانی کے ذہن میں گھس آتا تھا۔ وہ اس کے خیال سے ذہن کو ہٹانے کی بہت کوشش کرتی لیکن زیادہ تر ناکام رہتی تھی۔ یہ معاملہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایسے میں وہ اپنا تجربہ کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ خود سے سوال کرتی۔ رسم جیسے بدنام زمانہ شخص کے بارے میں کیوں سوچتی ہو تم۔ کیا وہ تمہیں ایک خیر خواہ کی حیثیت سے اچھا لگتا ہے؟ ایک بھائی کی حیثیت سے اچھا لگتا ہے؟ یا پھر اس حیثیت میں اچھا لگتا ہے جس کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب نفی میں ہوتے تھے۔ تو پھر وہ کیا تعلق تھا جو دل کی اتھاہ گہرائی میں کہیں موجود تھا۔

وہ سوچتی تھی یہ کیسا جذبہ ہے؟ اسے کیا نام دیا جاسکتا ہے؟ یا پھر اسے بے نام ہی رہنا چاہیے۔

☆=====☆=====☆

گلابی جاڑ ابھی دور تھا۔ تاہم سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ شانی نے اپنے جہیز کا سب سے خوبصورت ڈبل لحاف نکالا تھا۔ میاں بیوی بیڈ روم میں تھے۔ وی سی آر پر ایک خوبصورت اردو فلم چل رہی تھی۔ فلم دیکھتے ہوئے فاخر کا ہاتھ بے خیالی میں لحاف کے سرخ مخمل کو سہلارہا تھا۔ فلم کا ایک رومانی سین شاید فاخر کو کچھ زیادہ ہی پسند آ گیا تھا۔ وہ کم از کم اسے تین بار ریو اسنڈ کر کے دیکھ چکا تھا۔ اب چوتھی بار ریو اسنڈ کر رہا تھا۔ یہ سین نو بیاہتا بیوی اور اس کے شوہر سے متعلق تھا۔ موسم سخت ابر آلود تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ شوہر دفتر جانا چاہتا تھا مگر بیوی اسے اپنی اداؤں سے لبھارہی تھی۔ اسے روکنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بار بار بستر پر گرا دیتی تھی اور بانہوں میں جکڑ لیتی تھی۔ سین کے آخر میں شوہر صاحب کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور وہ ٹائی اتار کر اپنا بریف کیس ایک طرف پھینک دیتے ہیں۔ بیوی کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چمکنے لگتے ہیں اور وہ شوہر سے لپٹ جاتی ہے۔

شانی جانتی تھی فاخر یہ منظر بار بار کیوں دیکھ رہا ہے۔ اس میں بیوی کی گرم جوشی اور وارننگ نمایاں تھی۔ وہی خالص کیفیت جو فاخر کو مطلوب تھی۔ جس کے لئے وہ سرگرداں تھا۔ وہ شانی کو پورے کا پورا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ پہلے دن سے پوری کی پوری اس کے پاس تھی۔ اس نے خود ہی اسے ادھورا کیا تھا۔ اب اس ادھورے پن کی وجہ سے نیم دیوانہ ہو رہا تھا۔

سین ختم ہوا تو فاخر نے فلم ادھوری چھوڑ کر ٹی وی بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد لائٹ بھی آف ہو گئی۔ دونوں لحاف میں بے حرکت پڑے رہے۔ باہر بوند باندی ہو رہی تھی۔ رات دھیرے دھیرے اپنے وسط کی طرف کھسک رہی تھی۔ فاخر کی انگلیاں بڑی نرمی سے شانی کی ریشمی زلفوں سے کھیلتی رہیں پھر وہ اسے قریب کرتا چلا گیا۔ وہی بکھری ہوئی پتیوں کو پھول کی صورت جوڑنے کا عمل۔ وہی سعی لا حاصل۔ وہی رائیگاں کوشش۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شانی کو اپنے التفات کی بارش میں بھگو کر اپنی ساری کوتاہیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہے۔ سارے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتا ہے مگر جب زخم خون اگل رہے ہوں تو جلد بازی نہیں کی جاتی۔ پہلے خون کا اخراج روکا جاتا ہے پھر مرہم جمایا جاتا ہے۔

شانی کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ اپنے شریک حیات کے ساتھ چلنا چاہتی تھی، لیکن ابھی اس کے پاؤں پورا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ لڑکھڑا جاتی تھی۔ لڑکھڑاتے ہوئے کورک کر سہارا دینا پڑتا ہے لیکن اگر اسے اپنے ساتھ کھینچا جائے تو وہ مزید لڑکھڑا جاتا ہے۔ شانی کے ساتھ بھی آج کل ایسا ہی ہو رہا تھا۔ فاخر سعی لا حاصل میں مصروف رہا۔ شانی محبت بھری گرم جوشی سے خالی رہی۔ تب فاخر کی بے بسی اچانک جھنجھلاہٹ میں بدل گئی۔ تاریکی میں جیسے شعلہ سا پا کا۔ شانی کی سرد بانہیں اپنے عریاں کندھوں سے ہٹا کر وہ یک دم اٹھ بیٹھا۔ اس کی نہایت کرخٹ اور بلند آواز خواب گاہ میں دھاڑ کی طرح گونجی۔ ”کیا چاہتی ہو تم.....؟ آخر کیا چاہتی ہو.....؟“

کوئی بہت بڑا شیشہ جیسے سماعت شکن دھماکے سے چکنا چور ہو گیا تھا۔ شانی بھی بوکھلا کر اٹھ بیٹھی۔ فاخر نے ٹیبل لیپ روشن کیا۔ اس کا چہرہ اندرونی غضب سے متمایا ہوا تھا اور آنکھیں انکارہ تھیں۔ ”نف..... فاخر..... کیا ہوا ہے؟“ وہ کمزور آواز میں بولی۔

”مجھ سے پوچھتی ہو کیا ہوا ہے، مجھ سے پوچھتی ہو؟“ اس کی آواز بلند ہوتی چلی جا رہی تھی۔ طیش بڑھتا جا رہا تھا۔

پھر لحاف دور پھینکا ہوا وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت مختصر لباس میں تھا۔ شانی نے ایک سفید چادر تیزی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ فاخر کی آنکھوں میں اب جنون نظر آنے لگا تھا۔ ہونٹ غضب ناک انداز میں کھج گئے تھے۔ وہ بچھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں یہ..... قصہ

ہی ختم کر دوں گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔۔۔ میں تجھے جان سے مار دوں گا۔۔۔۔۔“

وہ جنونی انداز میں ڈمگاتا ہوا الماری کی طرف گیا۔ نیچے والی دراز کھول کر اس نے ایک بڑا خنجر نکال لیا۔ خنجر کا کورا تار کر اس نے دور پھینکا تو خنجر دار پھل ٹیل لیپ کی روشنی میں خوفناک نظر آنے لگا۔ شانی کی سہی ہوئی چیخ اس کے سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے بے ساختہ پلنگ کے ایک کونے میں سینے کی کوشش کی۔

فاخر کسی درندے کی طرح اس کی طرف جھپٹا اور اسے پلنگ کے گوشے میں دبوچ لیا۔ وہ عقاب کے پنچوں میں پھر پھڑپھڑاتی ہوئی چڑیا کی طرح تھی بلکہ شاید وہ پھر پھر ابھی نہیں رہی تھی بلکہ سکتہ زدہ سی رہ گئی تھی۔ فاخر کا بایاں گھٹنا فوم پر تھا اور دایاں شانی کے پیٹ میں دھنس رہا تھا۔ شانی کے بال فاخر کی بائیں مٹھی میں بے دردی سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں خوفناک پھل کا خنجر تھا۔

☆=====☆=====☆

جلتی چھاؤں

قیمت: 150

انور احسن صدیقی

تیسرا کنارہ

قیمت: 350

نشاط خان

خارزار

قیمت فی حصہ: 60

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

کارنج کامسیجا

قیمت: 200

محمد فیاض ماہی

علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میوہ ہسپتال، لاہور۔

ناشر علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

Ph: 7247414

براہ راست
منگوانے
کا پتہ

”میں تجھے جان سے مار دوں گا۔ تیرے ٹکڑے کر دوں گا۔“ وہ ایک بار پھر جنونی انداز میں پھنکارا۔

اس کا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ شانی نے اپنی چیخ ہونٹوں کے اندر روکی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا جسم اپنے مجازی خدا کے مہلک ترین وار کے لئے تیار تھا۔ وہ جانتی تھی۔ ابھی سینے میں دل کے مقام پر درد کی ناقابل برداشت لہر اٹھے گی۔ خون اچھلے گا اور عدم آباد کی طرف اس کا مختصر سفر شروع ہو جائے گا۔ موت کا انتظار چند ساعتوں کا بھی ہو تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ شانی بھی اس ناقابل بیان مشکل سے گزر رہی تھی۔

ایک سیکنڈ گزرا۔ دو سیکنڈ گزرے اور پھر کئی سیکنڈ گزر گئے۔ جان لیوا وار نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح بے حرکت پڑی رہی۔ دھیرے دھیرے اس کے بالوں پر فاخر کے ہاتھ کی ناقابل برداشت گرفت کمزور پڑ گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔

فاخر کا خنجر والا ہاتھ اسی طرح اٹھا ہوا تھا لیکن اب اس کے تنے ہوئے چہرے پر جنون اور وحشت کی وہ کیفیت نہیں تھی۔ آنکھوں کے جہنم کا موسم بھی ذرا سا بدلا ہوا تھا۔ ان آنکھوں میں شانی کو شکست و ناکامی کی کرچیاں نظر آئیں۔ تب اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیٹ پر گھٹنے کا اذیت ناک دباؤ بھی ختم ہو گیا ہے۔ فاخر اس کے اوپر سے ہٹ گیا تھا لیکن اس کا خنجر والا ہاتھ ابھی تک اٹھا ہوا تھا۔ جیسے کسی مسماہ ہو جانے والے قلعے پر قلعے والوں کا جھنڈا لگا رہ جائے۔ تب آہستہ آہستہ یہ ہاتھ بھی نیچے گر گیا۔ فاخر کسی زخمی چوپائے کی طرح اس کے پہلو میں موجود تھا۔ اس کا سر تکیے کو چھو رہا تھا۔

پھر شانی کے کانوں نے پہلی بار اس کی سسکی سنی۔ وہ رو رہا تھا..... نار پور کا چوہدری جس کی پگڑی کا شملہ اور مونچھ کا بال کبھی نیچا نہیں ہوا تھا۔ چوپائے کی طرح گردن ڈالے پڑا تھا اور رو رہا تھا۔ بندرتج اس کا رونا کرب ناک ہوتا چلا گیا۔ بچکیوں سے اس کا وجود لرز رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اس طرح اونڈھالٹ گیا کہ اس کا سر شانی کے کندھے سے چھوٹنے لگا۔ شانی اسی طرح بے حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔

فاخر کی کرب ناک آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ”میں ہار گیا ہوں شانی! میں ہار گیا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ میری غلطیاں بخش دو۔ میں نے تمہیں بہت دکھ دیئے ہیں۔ بہت زلایا ہے۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ مجھے معاف کر دو.....“ اس کی ناک شانی کے کندھے میں دھنسی جا رہی تھی۔ وہ بولتا جا رہا تھا۔ ”مجھے تمہاری محبت چاہئے۔ تمہارا پیار چاہئے۔ وہی پیار جو تم اپنے ارد گرد کے سارے لوگوں سے کرتی ہو۔ اسی پیار میں سے میرا حصہ مجھے بھی دے دو۔ اگر مجھے یہ پیار نہ ملا تو میں مرنے جاؤں گا..... اپنی جان دے دوں گا.....“

شانی کا جسم سہم کر گٹھڑی سا بن گیا تھا۔ اس نے گٹھڑی کو کھولا اور فاخر کے پہلو میں لیٹ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس آنسو بہاتے شخص سے کیا کہے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے فاخر کے گھٹے سخت بالوں میں چلنے لگیں۔ وہ اسی طرح لیٹا رہا اور اس کی آنکھوں سے پانی رستار ہا۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے تب شانی نے کروٹ بدلتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

وہ اشک بار لہجے میں بولا۔ ”شانی! میں نے چاچا جان (چوہدری ارشاد) سے بھی بہت نا انصافیاں کی ہیں۔ میں کل ان سے بھی معافی مانگنے جاؤں گا۔ ان کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف کروں گا۔“

شانی نے نحیف آواز میں کہا۔ ”آپ ان سے ہنس کر بات ہی کر لیں گے تو ان کے سارے شکوے دور ہو جائیں گے۔“

”وہ مجھ سے بڑے ہیں۔ عزت کی جگہ پر ہیں۔ مجھے ان سے معافی مانگنی چاہئے۔“ فاخر بولا۔ ”شاید اس طرح عادل کی روح بھی مجھے معاف کر دے۔“

شانی خاموشی سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والا گرم پانی شانی کے سینے پر ریگتار رہا۔ پھر وہ سو گیا۔ شانی بھی سو گئی۔

☆=====☆=====☆

اگلے روز فاخر سارے کام چھوڑ کر رنگ والی گیا اور رات گئے واپس آیا۔ اس کے دل میں جو بات پیدا ہوئی تھی وہ اس نے پوری کی تھی۔ وہ شانی کے اباجی سے باقاعدہ معافی مانگ کر آیا تھا۔

دو دن بعد جب وہ شام کو گھر آیا تو کافی خوش تھا۔ اس سے پہلے جب وہ گھر آتا تھا تو حویلی کی ہر ذی جس شے جیسے سہم کر سکر جاتی تھی لیکن آج کل صورت حال کافی مختلف تھی۔ وہ گھر کے افراد اور ملازمین کے ساتھ بھی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔ بچے بھی جو پہلے خوف زدہ رہتے تھے اب فاخر کے ارد گرد نظر آنے لگے تھے۔

”تمہارے لئے ایک تحفہ ہے۔“ وہ شانی سے بولا۔

”کیسا تحفہ؟“ شانی نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔

”آؤ میرے ساتھ.....!“ وہ بولا اور شانی کو نشست گاہ میں لے گیا۔

شانی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہاں ایک ٹیلی فون سیٹ رکھا ہے۔ نشست گاہ کی طرف اس کا آنا کم ہی ہوتا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب یہاں ٹیلی فون ”انسٹال“ کر دیا گیا ہے۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔“ شانی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”اس سے اچھی ایک بات اور بھی ہے۔“ وہ بولا۔

وہ سوالیہ نظروں سے فاخر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ فاخر نے سیٹ کے قریب بیٹھ کر ایک نمبر ڈائل کیا اور تھوڑی دیر بعد ریسیور شانی کے کان سے لگا دیا۔ دوسری طرف سے اباجی کی آواز سن کر وہ دنگ رہ گئی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”ہیلو..... ہیلو..... کون؟“

”یہ میں ہوں شانی!“ وہ خوشی سے لرزتی آواز میں بولی۔ ”آپ کے ہاں کب لگا فون؟“

”جب تمہارے ہاں لگا۔ یہ تمہارے شوہر صاحب کا ہی کارنامہ ہے۔“ اباجی نے خوش دلی سے کہا پھر ذرا توقف سے بولے۔ ”کافی کوشش کی ہے اس نے۔ ورنہ اتنی جلدی یہ سہولت نہیں ملتی تھی۔ خاص طور سے ہماری حویلی میں تو تار کار پہنچنا ہی مشکل تھا۔“

شانی نے شکر گزار نظروں سے فاخر کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ باپ بیٹی بات کرنے لگے۔ رُکے ہوئے خیالات پانی کے رواں شفاف دھارے کی طرح بہنے لگے۔ اباجی فاخر سے خوش نظر آتے تھے۔ مسلسل اس کی تعریفیں کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ دعا کر رہے تھے کہ اس

کے اندر آنے والی یہ تبدیلی مستقل ثابت ہو۔ ان کی جہاں دیدہ نظریں فاخر کے حوالے سے مستقبل کی بڑی اچھی تصویر دیکھ رہی تھیں۔

اباجی خوش تھے تو شانی کو یوں لگ رہا تھا کہ ارد گرد کی ہر شے مسکرانے لگی ہے۔ غم کے سارے بادل چھٹ گئے ہیں۔

اور اس واقعے کے صرف تین روز بعد شانی کے پیارے اباجی اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ زندگی اسی حیران کن اور ناقابل اعتبار چیز کا نام ہے۔ رمضان کے بابرکت مہینے میں وہ روزے سے تھے۔ طبیعت بہت بہتر تھی۔ عصر کی نماز پڑھنے تا یا معصوم کے ساتھ مسجد گئے۔ وہیں سینے میں تھوڑی سی تکلیف ہوئی۔ چار پانچ منٹ کے اندر روحِ نقصِ عصری سے پرواز کر گئی۔ وہ ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔ یا اللہ مجھے چلتے پھرتے اٹھانا۔ دعا قبول ہوئی تھی۔ ہنستے مسکراتے چل دیئے اور آخری سانس بھی روزے کی حالت میں خدا کے گھر میں لی۔

اباجی کی جدائی ایک ایسا صدمہ تھا جس نے شانی کو سر سے پیر تک ہلا دیا۔ چند دن کے لئے تو اسے یہی محسوس ہوتا رہا کہ دنیا میں اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں۔ زندہ رہنے کا ہر جواز ختم ہو چکا ہے۔ وہ اپنے بابل کے آگن میں تھی لیکن بابل نہیں تھا۔ وہ اپنے ہی آنسوؤں کے دریا میں غرق تھی۔ ایسے میں تا یا معصوم بھو اور فاخر نے اسے بے حد سہارا دیا۔ دوبارہ سانس لینے اور سوچنے سمجھنے کے قابل بنایا۔ غم کے جان لیوا دھوئیں میں یہ احساس شانی کے لئے ہوا کا جھونکا تھا کہ اس کے اباجی اس دنیا سے خوش خوش گئے تھے۔ جب انہوں نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا تو ان کے اطراف سے دکھ و آلام کے بادل چھٹ چکے تھے۔ وہ مالی طور پر آسودگی محسوس کر رہے تھے۔ قرض خواہوں کے منخوس سائے سمٹ چکے تھے۔ اور ان کی زندگی کے ایک اہم دکھ نے بھی اپنی شدت کھو دی تھی۔ اس اہم دکھ سے مراد شانی کا دکھ تھا۔ شانی کی گھریلو زندگی نے کروٹ بدل لی تھی۔ فاخر میں رونما ہونے والی مثبت تبدیلیاں بہت نمایاں تھیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اپنے آخری دنوں میں شانی کے اباجی اس کی طرف سے سکھی تھے۔

چوہدری ارشاد کی آخری رسوم میں علاقے کے لوگ اٹھ پڑے تھے۔ یہ ایک طرح سے اس بامروت اور بُردبار چوہدری کی بے داغ زندگی کو خراجِ عقیدت تھا لیکن دو افراد ایسے تھے جو چوہدری ارشاد سے بہت قریبی ناتا ہونے کے باوجود اسے سفرِ آخرت پر روانہ کرنے کے لئے نہیں آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو مہر جی تھا۔ وہ بیماری کا بہانہ بنا کر نارپور میں ہی ایٹھنتا رہا۔ دوسرا چاچا رئیس تھا۔ جیسا کہ شانی کو بعد میں معلوم ہوا وہ چوہدری ارشاد کے انتقال سے پانچ روز قبل تک اپنے کسی کام سے پاکستان میں موجود تھا۔ ممکن تھا کہ انتقال کے وقت بھی موجود ہو مگر جنازے میں نہیں آیا تھا۔ بعد میں چاچا رئیس نے انگلینڈ سے تعزیت کا ایک خط لکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ شانی سوچ سوچ کر حیران ہوتی تھی۔ کتنا فرق تھا دونوں بھائیوں میں۔ ایک چاچا مشتاق تھا ایک چاچا رئیس۔

وقت اپنی رفتار کے ساتھ چلتا ہی رہتا ہے۔ شدید ترین غم بھی روز و شب کی گردش کے ساتھ اپنی شدت کھونے لگتے ہیں۔ شانی قریباً دو ماہ تک تا یا معصوم اور چاچی پروین وغیرہ کے ساتھ اباجی کے گھر میں ہی رہی۔ رنگ والی کے محبت بھرے ماحول اور سیکنہ صفران جیسی سہیلیوں کی موجودگی نے اسے تیزی کے ساتھ سنبھلنے میں مدد دی پھر وہ نارپور واپس آ گئی۔

☆=====☆=====☆

نارپور واپس آنے کے بعد ایک بار پھر اس کے سامنے اس کی ازدواجی زندگی تھی اور ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز تھے۔ الجھن اور سلجھن کا یہ سفر ایک بار پھر وہیں سے شروع ہوا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔ خواب گاہ میں پیش آنے والے آخری واقعے کے بعد شانی کے اندر بھی دور رس تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ خود کو دھیرے دھیرے بدلتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ اگر اس کے مجازی خدا نے میانہ روی اختیار رکھی اور جلد بازی نہ کی تو وہ بہت جلد خود کو مکمل طور پر سنبھال لے گی پھر اس کی روح اس کے جسم سے علیحدہ نہ رہے گی اور جب فاخر اس کے قریب آئے گا تو وہ جسم و جاں کی ساری چاہتوں کے ساتھ اسے گلے لگا سکے گی۔

نارپور واپس آنے کے بعد ساتویں آٹھویں روز کا ذکر ہے۔ بڑی عید کی آمد آمد تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں اور ملازمائیں تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ بھابھو کے بہت مجبور کرنے پر شانی نے بھی چیز کا ایک نسبتاً سادہ جوڑا نکال کر درزن کو دے دیا تھا۔ عید سے ایک ہفتہ پہلے حسبِ رواج چوڑیاں بیچنے والیاں گاؤں میں آئیں۔ چند عورتیں حویلی بھی پہنچ گئیں۔ ملازمائیں رنگ برنگی چوڑیاں خریدنے لگیں۔ کچھ نے جھکے اور انگوٹھیاں وغیرہ خریدیں۔ شانی اپنے کمرے میں موجود تھی اور کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ ایک درمیانی عمر کی فربہ اندام عورت بھابھو کی منت سماجت کر کے کسی نہ کسی طرح شانی کے پاس کمرے میں چلی آئی۔ اس نے چوڑیوں کا ٹوکرا سر سے اتارا اور پھسکڑا مار کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ اکثر قبائلی عورتوں کی طرح رخسار چوڑے اور ہاتھ پیر مضبوط تھے۔ اس کی ستواں ناک میں چاندی کا کوکا دمک رہا تھا۔ عمر پینتیس کے قریب تھی اور یہ کہا جاسکتا تھا کہ تین چار سال پہلے تک وہ خوبصورت رہی ہوگی۔

شانی نے غور سے دیکھا تو اسے عورت کے ماتھے پر نماز کا ہلکا سا محراب نظر آیا۔ اس کی شرتی آنکھوں میں بھی نیکی اور روحانیت کی جھلک نظر آتی تھی پھر شانی کو ایک اور بات بھی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ عورت کی صورت کچھ دیکھی بھالی سی لگتی ہے۔ کوئی ایسی بات تھی اس عورت میں کہ شانی کو اس سے باتیں کرنے میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ دوسری عورتیں چوڑیاں وغیرہ بیچ کر دوسرے گھروں کی طرف چلی گئیں لیکن وہ عورت وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھی رہی اور من مومنے انداز میں شانی سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے اپنا نام گینہ بتایا تھا۔ دریا کے پار نیل پور گاؤں کے قریب ان کی زمین تھی۔ اس کے خاوند نے گھوڑیاں اور بھیڑ بکریاں وغیرہ پال رکھی تھیں۔ یہ لوگ سیال تھے۔ شانی کو عورت کی کلائیوں میں چاندی کے چھپے کڑے بھی نظر آئے۔

شانی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”اگر تمہارا اپنا کھیت ہے۔ ڈھور ڈنگر بھی ہیں تو پھر تمہیں چوڑیاں بیچنے کی کیا ضرورت ہے گینہ؟“ اس نے عجیب سی نظروں سے شانی کو دیکھا۔ کن آنکھوں سے اس پاس کا جائزہ لیا اور ہولے سے بولی۔ ”چوہدرانی جی۔ اگر میں کہوں کہ میں چوڑیاں بیچنے والی نہیں ہوں تو پھر؟“

”کیا مطلب؟“

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ والہانہ انداز میں بولی۔ ”اگر میں کہوں کہ میں نے صرف آپ کو دیکھنے کے لئے چوڑیوں والی کا بھیس بدلا ہے تو پھر؟“

شانی کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ ایک لمحے کے لئے اسے خوف محسوس ہوا کہ کہیں یہ کوئی نوسر باز ہی نہ ہو لیکن پھر اس کی شرمیلی آنکھوں میں جھانک کر اسے اندازہ ہوا کہ یہ عورت اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

”تمہاری بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“ شانی نے الجھن سے کہا۔

وہ والہانہ انداز میں شانی کو دیکھے جا رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہی بولی۔ ”آپ مجھے نہیں جانتی ہیں پر میں آپ کو بہت دنوں سے جانتی ہوں اور جب سے آپ کو جانتی ہوں آپ کو دیکھنے کے واسطے جی چلتا رہتا تھا۔“

اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ”آپ کے بارے جیسا سوچا تھا آپ اس سے زیادہ اچھی نکلی ہیں۔ بہت زیادہ اچھی نکلی ہیں۔ اس لئے دل کرتا ہے کہ آپ سے کچھ بھی نہ چھپاؤں مجھے آپ سے کوئی ڈر خطرہ نہیں ہے۔ اگر میں گلّتی بھی کر رہی ہوں تو آپ یہ گلّتی ضرور ماف کر دیں گی۔ کر دیں گی ناں۔“

”گنیمہ مجھے ابھی تک تمہاری کوئی بات سمجھ ہی نہیں آئی۔ میں تمہیں کیا جواب دوں؟“

وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولتی چلی گئی۔ ”رستم سیال کا نام آپ نے ضرور سنا ہوگا“ میں اس کی خالہ جادوہن ہوں۔ آج سے چار پانچ سال پہلے اس کے ساتھ میری شادی بھی ہونے لگی تھی مگر پھر نہ ہو سکی۔ میراویاہ چروسیال سے ہو گیا۔ اب میں اس کے دو بچوں کی ماں ہوں اور اپنے گھر میں خوش باش ہوں۔ رستم اب بھی ہم سے ملتا رہتا ہے۔ اب میرے لئے وہ بس بھرا کی طرح ہی ہے۔“

اس تمہید کے بعد گنیمہ نے دائیں بائیں دیکھ کر اپنی آواز مزید پست کی اور اصل موضوع کی طرف آگئی۔ ”چوہدرانی جی! آپ پریشان نظر آنے لگی ہیں! پر میں اک وار پھر کہوں گی کہ مجھ سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اور اللہ سوہنے نے چاہا تو آپ کی طرف سے بھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ چوہدرانی جی! میں تو بس اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں آئی ہوں۔ میں وہ صورت دیکھنا چاہتی تھی جس نے ایک پتھر میں تریڑ (درڑا) ڈالی اور اسے موم کر دیا۔“

”تمہاری کوئی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔“ شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر لی۔

نیک صورت عورت نے بڑی محبت اور بے تکلفی سے شانی کا نرم ہاتھ اپنے کھر درے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ ”چوہدرانی جی! یہاں ہمارے درمیان جو باتیں ہو رہی ہیں وہ قبر کی دیواروں تک میرے اندر ہی رہیں گی۔ باہر نہیں نکلیں گی۔ آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔“

”میں پریشان نہیں ہوں گنیمہ..... لیکن تم نے جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو۔“

وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ”چوہدرانی جی! عشق محبت پیار کے بارے میں لوگوں کی طرح میں نے بھی بہت کچھ سنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس بارے میں سب کچھ جانتی ہوں پر کچھ دن پہلے مجھ کو پتا چلا کہ میں تے کچھ بھی نہیں جانتی اور شاید میری طرح کافی سارے لوگ بھی کچھ نہیں جانتے۔ میں نے ایک ایسے بندے کو دیکھا چوہدرانی جی جس نے کسی کے ساتھ عشق کیا اور پھر کر کے دکھایا۔ اس طرح اس کے عشق میں خود کو فنا کیا کہ باقی سب کچھ بھلا دیا۔“

شانی کے دل میں زلزلہ سا برپا ہو گیا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ بات کس رخ پر جا رہی ہے۔

وہ خاموش رہی تو نگینہ نے کہا۔ ”آپ پوچھیں گی نہیں کہ میں کس کی بات کر رہی ہوں؟“
”کس کی؟“

”رستم سیال کی!“ نگینہ نے کہا اور ایک چھٹا سا شانی کے سینے میں ہوا۔ نگینہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”چوہدرانی جی! رستم ایک پتھر تھا جی! لوہا تھا! ایسا لوہا جس کو زہر کی پان چڑھائی گئی ہو۔ جو صرف کاٹنا جانتا ہو! بس مارنا جانتا ہو۔ ہمارے قبیلے کے لوگ سوچتے تھے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے اور شاید دریا بھی الٹا چل سکتا ہے پر رستم بدل جائے یہ نہیں ہو سکتا پھر یہ ہوا جی۔ ہم سب کی اکھیوں کے سامنے ہوا۔ میں قسم کھاتی ہوں چوہدرانی جی! میں یہاں رستم کی تعریفیں کرنے نہیں آئی۔ میں تو صرف آپ کو دیکھنا چاہتی تھی اور آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ رستم کس طرح بدلا ہے۔ ہاں چوہدرانی جی! یہ بالکل وکھری طرح کا کام ہوا ہے۔ شاید یہ کام سارے علاقے کی پولیس بھی مل کے نہ کر سکتی تھی۔ وڈے وڈے افسر وزیر نہیں کر سکتے تھے وہ اپنے آپ ہو گیا اور اتنے چپ چاپ رہے ہوا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ پہلے رستم نے وارداتیں چھوڑیں، پھر اپنے گروہ کے بندے چھوڑے، پھر بالکل الگ تھلگ ہو گیا۔ بہت تھوڑے لوگوں کو پتا ہے کہ وہ اب بیچ وقت کا نمازی ہے۔ رُوکھی سوکھی کھاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جوگ لے لیا ہے اس نے۔ پہلے اس کا دل پتھر تھا جی۔ وڈی سے وڈی بات کا اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ پر اب کسی کو ذرا سادھی دیکھ کر اس کی اکھیوں میں پانی چپکنے لگتا ہے۔

چوہدرانی جی! مجھے ہر ویلے اس بات کی ٹوہرہ رہتی تھی کہ رستم کے ساتھ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ میرے بندے چروہ نے ایک دن کہا تھا، رستم کے کچھ یار کہتے ہیں کہ رستم کو کسی گڈی سے عشق ہو گیا ہے۔ یہ ایسا عشق ہے جس نے رستم کو دنیا کی ہر شے بھلا دی ہے۔

چوہدرانی جی! ہمارے خاندان کی عورتوں میں عام طور پر اس بارے میں گل ہوتی رہتی ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ اگر رستم کسی گڈی سے عشق کرتا تو اس کے لئے اس سے ویاہ کرنا کون سا مشکل کام تھا۔ وہ دس پہرے توڑ کر بھی اس گڈی کو گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا۔ پر ہماری برادری کی اماں حاجن سیانی کہتی ہے، گڈو! عشق پہرے توڑنے کا نام نہیں۔ یہ تو خود پر پہرے لگانے کا نام ہے۔ مجھے اماں سیانی کی یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی پر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جس طرح کا عشق رستم نے کیا ہے، اس طرح کا بس کوئی کوئی کرتا ہے۔“

شانی کا دل سینے میں سہم کر پھڑک رہا تھا۔ وہ بس خاموشی سے نگینہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

نگینہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ایک مہینہ پہلے کی گل ہے، اماں حاجن سیانی بیمار ہو گئی۔ اس کا سادہ (سانس) خراب ہو گیا اور خراب ہی ہوتا چلا گیا۔ سارے قبیلے کو پتا لگ گیا کہ اماں سیانی اب بچ نہیں سکے گی۔ شاید میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ اماں حاجن سیانی نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ بس اکیلی رہتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب اماں اٹھارہ ورے (سال) کی تھی اس کا منگیت شادی سے بس دو چار ہفتے پہلے گڈی کی نکر سے مارا گیا تھا۔ بس پھر اماں نے سب کچھ بھلا کر اللہ سے لو لگائی..... اور ایسی لگائی کہ پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

اماں سیانی دم در دو بھی کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑی شفا تھی۔ بس پانی میں پھونک مار کر دیتی تھی اللہ سو ہنا ہر بیماری کو ٹھیک کر دیتا تھا۔ رستم سیال بھی وارداتیں چھوڑنے کے بعد کبھی کبھی اماں سیانی کے پاس آیا کرتا تھا۔ وہ دودو گھنٹے سر جھکا کر اس کے سامنے بیٹھا رہتا اور کچھ پڑھتا رہتا۔

جب اماں سیانی جیادہ بیمار ہوئی تو رستم بھی سیانی کے ڈیرے پر پہنچا تھا۔ ایک رات وہاں رہا تھا پھر اسے اپنے ایک یار کے ساتھ کسی کام سے فوراً لاہور جانا پڑ گیا۔ اگلے روز اماں حاجن سیانی اور بھی جیادہ بیمار ہو گئی تھی۔ اس کی آخری رات کو میں اس کے پاس تھی۔ میں نے اماں کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ میرا بندہ چمر واماں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ رات گیارہ بجے کے قریب چمر وحکیم کو لینے گیا تو اماں مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ کہنے لگی۔ ”گو! تُو نے مجھ سے کئی بار پوچھا تھا ناں کہ رستم کو کس گڑی سے پیارا ہوا ہے۔ لے آج میں تجھے بتا دیتی ہوں۔ پتا ہے تجھے کہ میں کیوں بتا رہی ہوں؟ میں تجھے اس لئے بتا رہی ہوں کہ تیرے اندر سے یہ گل کبھی باہر نہیں نکلے گی۔ تُو اس کو اپنے تک ہی رکھے گی..... رکھے گی ناں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں اماں جی! آپ نے کہہ دیا ہے تو ہمیشہ رکھوں گی۔“

اماں سیانی بولی۔ ”اس گل کا پتا صرف تین بندوں کو ہے۔ صرف تین کو۔ رستم وہ گڑی اور میں۔ اب تُو چوتھی شامل ہو رہی ہے۔“ اماں یوں بول رہی تھی جیسے نیند میں ہو۔ اس کی نظر مٹی کے دیے پر تھی۔

میں نے کہا۔ ”اماں! کون ہے وہ گڑی؟“

”مجھے پتا ہے تم نے سن کر حیران ہونا ہے۔ وہ بیاہی ہوئی گڑی ہے۔ نارپور کے چوہدری مہر کے چھوٹے پوتے کی گھر والی ہے۔“ میں سن کر سچ مچ حیران رہ گئی۔ اماں اپنی بات کہہ کے چپ ہو گئی تھی۔ میں انتظار کرتی رہی کہ وہ کچھ اور بھی بولے گی پر نہیں بولی۔ آخر چمر واپس آ گیا۔ حکیم اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ کسی کام سے دوسرے پنڈ گیا ہوا تھا۔ اماں سیانی نے چمر سے کہا۔ ”تم ہیر سید وارث شاہ بڑی اچھی پڑھتے ہو مجھے سناؤ۔“

چمر ورات گئے تک وارث شاہ سنا تا رہا۔ صبح اماں نے اشاروں سے نماز پڑھی اور تھوڑی ہی دیر بعد دم دے دیا۔“

گنیمہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی کالی سیاہ آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔ ”اماں سیانی کے دنیا سے جانے کے بعد میں کئی دن تک سوچتی رہی کہ اماں نے مجھے آپ کے بارے میں کیوں بتایا۔ اس سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا اور شاید ملے بھی نہ..... سیانے کہتے ہیں ناں کہ اللہ والوں کی رمزیں اللہ سوہنا ہی جانتا ہے۔“

ہوا سے کمرے کا محرابی دروازہ خود بخود کھل گیا تھا۔ گنیمہ نے خود ہی اٹھ کر دروازہ بند کیا اور شانی کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”چوہدرانی جی! میں آپ سے ایک وار پھر کہتی ہوں کہ یہاں آنے میں میری کوئی غرض نہیں ہے۔ نہ اپنی نہ کسی اور کی۔ کسی اور کی غرض رستم کی غرض ہی ہو سکتی ہے ناں لیکن اس کو تو آپ سے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ میں سچ کہتی ہوں چوہدرانی جی! جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے وہ آپ کو چاہتا تو بہت ہے۔ شاید اتنا کہ آپ کے ایک ہا سے (مسکراہٹ) کے لئے ساری دنیا قربان کر دے پر آپ سے دور رہ کر بھی وہ دیکھی نہیں ہے۔ وہ بس اپنے آپ میں مست ہے۔ آپ کو پیر جھنڈے شاہ کا تو پتا ہی ہوگا۔ ان کا مزار آپ کے گاؤں رنگ والی کے پاس ہے۔“

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی۔ ”آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ جھنڈے شاہ کے مزار پر لوگ اپنے چھڑے ہوؤں کے نام کی دیگ چڑھاتے ہیں اور منت مانگتے ہیں

کہ ان کا میل ہو جائے اور اگر میل نہ ہو سکے تو وہ جہاں رہیں سکھ سے رہیں۔“

شانی نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

گنبد بولی۔ ”پچھلے آٹھ نو ماہ سے مزار پر ہر روز بلا ناغہ ایک منچھڑے ہوئے کے نام کی دو دیکھیں چڑھائی جاتی ہیں۔ ہماری برادری میں اکثر لوگوں کو پتا ہے کہ یہ دیکھیں رستم کی طرف سے چڑھائی جاتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ دیکھیں اس گروی کے نام کی ہیں جس کے عشق نے رستم کو چور سے قطب بنایا ہے۔ پر کسی کو پتا نہیں کہ گروی ہے کون؟ اور نہ ہی کبھی کسی کو پتا لگتا ہے پتا لگ بھی کیسے سکتا ہے۔ اماں حاجن سیانی اب اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ رستم نے ساری زندگی اس بارے میں زبان نہیں کھولی نہ ہی آپ نے کھولی ہے چوہدرانی جی۔ باقی رہی میں..... تو میں نے اماں سیانی کے سامنے قسم کھائی تھی۔ اب آپ کے سامنے بھی اپنے سر کے سائیں کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ بات میرے ساتھ ہی قبر میں جائے گی۔“

شانی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے نازک ہونٹوں پر جیسے خاموشی کی مہر سی لگ گئی تھی۔ کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ اس عورت کو جھڑکیاں دے کر کمرے سے نکال دے۔ کبھی جی چاہتا تھا کہ خاموشی سے اس کی باتیں سن لے اور اسے دل کا بوجھ ہلکا کر لینے دے۔ اب شانی کی سمجھ میں یہ بات بھی آگئی تھی کہ عورت کی شکل جانی پہچانی کیوں لگی تھی۔ وہ رستم کی خالہ زاد تھی۔

خاموشی کے اس وقفے میں گنبد بھر محویت سے اس کا چہرہ دیکھتی چلی گئی۔ شانی نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا۔ ”تم مجھے اچھی اور نیک لگتی ہو، یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہاری یہ باتیں سن لی ہیں۔ کیا تمہیں کچھ اور بھی کہنا ہے؟“

”کہنے کو تو بہت کچھ ہے چوہدرانی جی! مجھے تو یوں لگتا ہے جی کہ..... مجھے رستم کے عشق سے عشق ہو گیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کئی دنوں تک اسی طرح آپ کے قدموں میں بیٹھی رہوں اور آپ کی شکل دیکھتی رہوں۔ پر مجھے پتا ہے میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتی۔ یہ بڑی خطرناک جگہ ہے جی۔ ہم سب کو پتا ہے کہ مہر جی کتنے غصے والا چوہدری ہے۔ اس کے بندے ہر آنے جانے والے پر شکرے کی نظر رکھتے ہیں۔ کسی کو شک بھی ہو گیا کہ میں چوڑیوں والی نہیں..... سیالوں کی عورت ہوں تو مجھے بجلی کے ٹوکے میں سے گزاردیں گے۔“

شانی کے ماتھے پر ہل دیکھ کر اس نے ایک دم موضوع بدلا۔ ”ہاں چوہدرانی جی! مجھے ایک اور گل یاد آئی ہے۔ جاتے جاتے یہ بھی آپ کو سنا دوں۔“

”کون سی گل؟“

”رستم سیال کی گل جی۔“ وہ شانی کو بدستور والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پتا ہے جی، پچھلے سے پچھلے ہفتے کیا ہوا.....؟ پر پتا نہیں کہ آپ میری گل پر یقین کریں گی کہ نہیں۔“

”تم نے جو کہنا ہے جلدی کہہ لو۔“ شانی کے لہجے میں ضبط کا عنصر تھا۔

وہ بولی۔ ”لاہور میں فلموں کی ایک بڑی ایکٹرا اپنے رستم کی عاشق بنی ہوئی ہے۔ وہ چار چھ مہینے پہلے شوٹنگ شائنگ کرنے یہاں ایک باغ میں آئی۔ تب رستم نے سچ سچ کے غنڈوں سے اس کی جان اور عزت بچائی تھی۔ وہ اس ویلے کی رستم کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ جس دن اماں سیانی فوت ہوئی اس سے دو روز پہلے وہ رستم کو ڈھونڈتی ہمارے گھر آگئی۔ علاقے کا سب سے بڑا ٹکس افسر حاجی حیات خان رستم کا پکا یار ہے۔ رستم اس ویلے حیات کے ڈیرے پر تھا۔ وہ سیدھی ڈیرے پر پہنچ گئی۔ رستم سے کہنے لگی۔ ”میرے ساتھ لاہور چلو یا کچھ دن مجھے اپنے پاس رہنے دو۔“ شاید آپ

سمجھیں کہ میں گپ لگا رہی ہوں، پر اس گل کا علاقے کے بہت سے لوگوں کو پتا ہے، اخبار میں بھی خبر چھپ گئی تھی۔ یہ دیکھیں میں آپ کو دکھاتی ہوں۔“ اس نے ٹوکری میں سے چوڑیوں کے آٹھ دس بنڈل نکالے اور نیچے بچھایا ہوا اخبار کا ایک صفحہ نکال کر شانی کے سامنے کر دیا۔ شانی نے حیرانی سے پڑھا۔ ایک خوبصورت ایکٹریس کی رنگین فوٹو کے نیچے لکھا تھا۔ ”نوخیز ہیر وٹن ناد یہ دو دن تک پراسرار طور پر غائب رہنے کے بعد واپس۔ کہا جاتا ہے کہ ابھرتی ہوئی شعلہ بدن ہیر وٹن ناد یہ اس جی دار کی کھوج میں تھی جس نے کچھ عرصہ پہلے اس کی جان بچائی تھی۔ یاد رہے کہ قریباً چار ماہ پہلے نارپور نامی گاؤں کے پاس شوٹنگ کے دوران میں کچھ اصلی غنڈوں نے فلمی یونٹ پر حملہ کیا اور سیکس سبل ناد یہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ جسے اس نامعلوم شخص نے ناکام بنا دیا۔۔۔۔۔“

کچھ مزید تفصیلات بھی اس خبر میں درج تھیں۔

شانی کو غور سے پڑھتے دیکھ کر نگینہ نے کہا۔ ”اند کی بات یہ ہے چوہدرانی جی کہ یہ ”سوئی بلا“ پوری دو راتیں حاجی حیات خان کے ڈیرے پر رہی ہے۔ اس کی گندی نظر رستم پر تھی۔ پر اس کی دال نہیں لگی جی۔۔۔۔۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ رستم تو مملتوں کی طرح ہو چکا ہے۔ تیسری رات سے پہلے رستم اس بلا کو خود لاہور چھوڑ کر آیا۔ میں نے آپ کو بتایا نا کہ جس رات کی صبح اماں سیانی فوت ہوئی۔ رستم اور اس کا افسر دوست کسی کام سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ وہ یہی کام تھا جی۔“

شانی سر جھکائے سن رہی تھی۔ وہ نگینہ کی باتوں پر کسی طرح کا تبصرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شانی کو چپ دیکھ کر نگینہ بولی۔ ”شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو چوہدرانی جی! اس کے بعد میں اور آپ کبھی نہ ملیں۔ پر آج آپ کے ساتھ جو وقت گزرا اور جو باتیں کیں وہ سدا یاد رہیں گی۔ میرے من میں آپ کو دیکھنے کی حسرت تھی۔ سو آج آپ کو دیکھ لیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جن صورتوں سے سچا عشق ہو جاتا ہے وہ کیسی ہوتی ہیں۔ سو آپ کو دیکھ لیا۔ عشق کی وجہ کا پتا چل گیا اور عشق کا بھی۔ اب میں اُن پڑھ بھی اندازہ لگا سکتی ہوں کہ سسی سوئی اور ہیر کس طرح کی ہوتی ہوں گی اور ان سے عشق کرنے والوں نے اپنی جان کی بازی کیوں لگائی۔۔۔۔۔“

شاید سوئی سوئی آنکھوں والی خانہ بدوش نگینہ کچھ اور بھی کہتی مگر اس دوران میں فاخر کی گاڑی کی آواز مین گیٹ پر سنائی دینے لگی تھی۔ شانی چونک سی گئی۔ اسے چونکتے دیکھ کر نگینہ کا رنگ بھی متغیر ہو گیا۔ ”شش شاید۔۔۔۔۔ آپ کے خاوند صاحب آگئے ہیں۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”ہاں وہ آگئے ہیں اب تم جاؤ۔“

”اچھا جی، سلاماں لیکم۔“ اس نے جھک کر شانی کے ہاتھ پر ماتھا رکھا، پھر اپنے ٹوکے کی سب سے خوبصورت چوڑیاں شانی کی جھولی میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”یہ ایک گریب مسکین کا تحفہ آپ جیسی چوہدرانی کے قابل تو نہیں ہے پر آپ قبول کریں گی تو میں ساری زندگی خوش ہوتی رہوں گی۔“

شانی نے چوڑیاں جلدی سے گاؤتیکے کے پیچھے رکھ لیں اور بولی۔ ”نگینہ تم بہت اچھی ہو لیکن اب کبھی اس حویلی میں آنے کی کوشش نہ کرنا۔“

”آپ فکر نہ کریں بی بی! میں سمجھ رہی ہوں۔“ نگینہ دل گیر آواز میں بولی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اس نے ایک بار پر جھک کر سلام کیا اور آنکھوں میں محبت کی پُر خلوص نمی لئے واپس مڑ گئی۔

☆=====☆=====☆

شانی ایک عجیب سی کشش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اسے رستم کی ذات سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ عجیب سا خوف تھا۔ اس خوف کی گہرائی میں کہیں حیرانی اور اُنسیت بھی شامل تھی۔ یہ کیسی اُنسیت تھی، کیسی وابستگی تھی۔ وہ اسے کوئی نام نہیں دے سکتی تھی اور اس کے وجود سے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیوں قائم ہوا تھا یہ رشتہ اور کب قائم ہوا تھا؟ وہ کون سی گھڑی تھی جب علاقے کے بدنام ڈاکو کی نگاہ میں وہ اُتری تھی اور اس کی کاپلٹ کا سبب بنی تھی۔ شاید یہ کام اس وقت ہو گیا تھا جب اس نے پہلی بار شانی کو دیکھا تھا۔ وہ زخموں سے پُور دیوار کے سہارے بیٹھا تھا پھر وہ چکر اکر گرنے لگا تھا۔ شانی نے بے ساختہ کہا تھا۔ ”ہائے میں مر گئی۔“ اور لپک کر اسے تھام لیا تھا۔

اس کا سر شانی کی گود میں آ گیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد اس نے شانی کو دیکھا تھا۔ ہاں..... شاید یہ وہی گھڑی تھی وہی پہلی نظر تھی۔ اس نظر کی تاثیر عرصہ گزر جانے کے باوجود شانی کو آج تک یاد تھی اور شاید شانی کے سینے کے اندر کہیں بہت گہرائی میں یہ نظر آج تک پیوست تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی تھی اور سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ کہیں اس کے سینے کے اندر تہہ در تہہ پردوں اور کواڑوں کے پیچھے رستم کے لئے کوئی نرم گوشہ تو موجود نہیں ہے۔

مگر پھر یہ خیال کر کے اسے تسلی ہوتی تھی کہ اگر کوئی ایسا گوشہ ہے تو بھی اسے ہمیشہ تہوں کے پیچھے ہی رہنا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ رستم کا عشق خاموش عشق ہے۔ یہ عشق اس سے کبھی کچھ مانگے گا نہیں۔ زندگی میں اسے کسی آزمائش میں نہیں ڈالے گا بس ”وہ جو کچھ بھی ہے“ زندگی کی آخری سانس تک رستم کے اندر ہی رہے گا۔

اب وہ اپنا پورا دھیان اپنی ازدواجی زندگی کی طرف دینا چاہتی تھی۔ قدرت کی مہربانی نے اسے ایک موقع دیا تھا کہ وہ اپنی گھر بیوا لجنھوں کو سلکھا کر اپنی زندگی میں نئی خوشیاں اور رنگ بھر سکے اور وہ یہ موقع کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے چند ماہ پہلے فاخر سے تھوڑے عرصے کی مہلت مانگی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ عرصہ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ خوف ہمہ وقت اس کے دامن گیر میں رہتا تھا کہ کہیں طویل انتظار کی اکتاہٹ سے فاخر کے مزاج پر منفی اثر نہ پڑ جائے۔ وہ بہت بدل چکا تھا لیکن کچھ بھی تھا اسے خاندانی وراثت میں انا اور حاکمیت ملی تھی۔ اپنی بات منوانے کی خواہش اس کے خون میں پیوست تھی۔ شاید اس خواہش کی شدت ہی تھی جس نے اسے اس طرح بدلاتھا۔ شانی کا حقیقی پیار پانے کے لئے اس نے اپنے دل و دماغ میں سجائے ہوئے بہت سے پُر شکوہ بُت اپنے ہاتھوں سے توڑے تھے اور اب منتظر تھا کہ اسے اس کی ”طلب“ کا صلہ ملے۔ اگر گہرائی میں جا کر دیکھا جاتا تو یہ بھی ان پرستی اور ضد کی ایک شکل ہی تھی لیکن کچھ بھی تھا شانی کو عزت سے زندہ رہنے کی راہ مل رہی تھی۔ اس نے شوہر کی جسم پرستی اور عیش کوشی کے بت توڑے تھے اور وہاں محبت کا شگوفہ کھلا تھا۔ اب وہ اپنی دل گداز محبت سے اس شگوفے کو پالنا چاہتی تھی۔ باقی سب کچھ بھول کر صرف اور صرف ایک شوہر پرست بیوی کا لازوال کردار ادا کرنا چاہتی تھی۔ ہاں..... وہ باقی سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔

چند روز بعد عیدالضحیٰ تھی۔ شانی جانتی تھی اپنے جسم اور اپنی روح کے خوش نماترین پھول فاخر کے قدموں پر نچاؤ کرنے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ اسے چاند رات کا انتظار تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنے جسم میں وہی میٹھی میٹھی لہر محسوس کرنے لگی جو شادی کے پہلے پہلے دنوں میں محسوس ہوئی تھی۔ سینے میں انگڑائی سی جا گئی تھی۔ دل میں کچھ ہوتا تھا۔ فاخر کو دیکھ کر دل میں جو خوف اور گریز سا جاگا کرتا تھا وہ بدرجہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اب اس کا بالوں

بھرا گرائڈیل جسم بھی شانی کو کچھ زیادہ بُرا نہیں لگتا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ جلد ہی اپنے رہے سہے گریز پر بھی قابو پالے گی۔

چاند رات سے ایک رات پہلے اس نے ہاتھوں اور پاؤں پر مہندی لگائی۔ اگلے روز نہانے کے لئے بہترین اُٹن خود بنایا۔ چاند رات کو پہننے کے لئے جوڑا تیار کیا۔

صبح سویرے اسے پتا چلا کہ فاخر کو ضروری کام سے گجرات جانا پڑ رہا ہے اور وہ چاند رات کو نو دس بجے سے پہلے واپس نہیں آ سکے گا۔ چلو یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ دس بجے تک واپس آ جائے گا ورنہ نارپور سے باہر جانے کے بعد فاخر کی واپسی کئی کئی روز بعد ہوتی تھی۔

شام ہونے کے بعد شانی کو مہرجی کے کمرے میں جانا تھا۔ معمول کے مطابق مہر کی ٹانگیں دبانے کی باری آج بھابو کی تھی، لیکن بھابو چونکہ بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی لہذا یہ کام شانی کو کرنا تھا۔ وہ حسبِ معمول مہر کے کمرے کی طرف روانہ ہوئی۔ مہر کی پھلواڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ کافی فاصلہ رکھتی تھی۔ جب سے اسے وہاں سانپ کی موجودگی کا پتا چلا تھا، پھلواڑی کے حوالے سے اس کا خوف بڑھ گیا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے کسی وقت اس کی نگاہ سُرخ پھولوں اور سنہری مائل پتوں والے مخصوص پودوں پر پڑتی تو دل میں کراہت جاگتی۔ اسے لگتا تھا ان پتوں کی شہادت سانپ کے پھن جیسی ہے۔

زنانے سے حویلی کے وسطی حصے کی طرف جانے والی روش پر اپنے تلے قدم رکھتی وہ مہر کے کمرے میں پہنچی۔ وہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ آج صورتِ حال کیا رخ اختیار کرنے والی ہے۔

مہر بستر پر نیم دراز تھا۔ سینے تک سفید چادر کھچی ہوئی تھی۔ منقش حقے کی نال پہلو میں دھری تھی۔ پٹنگ کی عقی دیوار پر کلہاڑیاں، لٹھیاں اور دو چاندی کی برچھیاں سجاوٹ کے طور پر آویزاں تھیں۔ بائیں طرف الماری تھی جو سنیاں کی شعبہ نائپ دواؤں سے بھری ہوئی تھی۔ جب شانی یا بھابو مہر کی ٹانگیں دباری ہوتی تھیں پرانا ملازم اکبر اکثر کمرے میں آتا جاتا رہتا تھا۔ آج بھی وہ دیوار کی طرف منہ کئے کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھا تھا اور بڑے انہماک سے حقے کی چلم بھرنے میں مصروف تھا۔

شانی اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ گئی اور ٹانگیں دبانے لگی۔ کمرے کی مخصوص بودھیرے دھیرے اس کے پیچھے دلوں میں گھس کر حواس پر اثر کرنے لگی۔ اس نے سانپ کو کبھی قریب سے نہیں دیکھا تھا نہ ہی اسے پتا تھا کہ سانپ کے جسم سے اٹھنے والی بو کیسی ہوتی ہے مگر پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ مہر کے کمرے میں پھیلی ہوئی بو سانپ کی بو ہے۔

وہ پلپلی پنڈلیاں دباتی رہی۔ اکبر انگڑااتا ہوا آیا اور قالین پر بیٹھ گیا۔ اس نے چلم بدلی اور ادب سے جھک کر حقے کی نئے مہر کی ٹھوڑی پر ٹکا دی۔ وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر مہر کے اشارے پر وہیں قالین پر بیٹھ گیا۔ مہر کا موڈ آج کچھ عجیب سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور اکلوتی آنکھ کی چمک معمول سے زیادہ تھی۔ شانی کو یوں محسوس ہوا کہ مہر کے بوڑھے جسم میں اضطراب کی لہری دوڑ رہی ہے۔ مہر نے اپنے مخصوص لہجے میں اکبر سے کچھ کھسر پھسر کی۔ اس کھسر پھسر میں سے بس دو چار الفاظ ہی شانی کی سمجھ میں آئے۔ ”دادا..... عورت..... دولت بی بی..... کینے..... وغیرہ.....“

مہرباں ختم کر چکا تو اکبر نے اس کے مترجم کے فرائض ادا کرتے ہوئے شانی سے کہا۔ ”چھوٹی چوہدرانی مہرجی آپ سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔“

”کیا؟“ شانی نے کہا۔

”مہرجی پوچھ رہے ہیں کہ آپ کے دادا نے دولت بی بی سے بیاہ رچا کر جو غلط کام کیا اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

شانہ کارنگ زرد ہو گیا۔ اس سے پہلے مہرجی کبھار شانی کے لئے سخت الفاظ استعمال کر لیتا تھا لیکن یوں سنجیدہ انداز میں اس نے کبھی ماضی کی تلخیوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”دادا! گزرے ہوئے سالوں میں جو کچھ ہوا اس کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ پتا نہیں اور نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔ میرا تعلق واسطہ آپ سے اور آپ کے گھر سے ہے۔ میں آپ سب کی خدمت دل و جان سے کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے پرانی باتوں سے کچھ لینا دینا نہیں۔“

جواب میں مہر پورے کا پورا بھڑک اٹھا۔ اس نے اکبر کے واسطے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں کچھ لینا دینا ہوگا، لیکن مجھے ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ قادر بخش کی پوتری اپنے بڑوں کے کرتوتوں پر لعنت بھیجتی ہے یا سمجھتی ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا؟“

مہر کا جنونی انداز دیکھ کر شانی کارنگ ہلدی ہونے لگا تھا۔ وہ ہکا کر بولی۔ ”دادا! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ سب غلط تھا تو پھر غلط ہی ہوگا۔ میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔“

مہر نے ایک بار پھر قہر ناک انداز میں جناتی زبان بولی۔ ”غوں غاں خرخر..... گھر گھر.....“ کے درمیان فقط چند لفظ ہی شانی کی سمجھ میں آ سکے۔ ”دولت بی بی..... باپ..... دادا..... حرامی.....“

اکبر نے بڑی بے باکی سے مترجم کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹی چوہدرانی جی! مہرجی کہتے ہیں سارا جگ جانتا ہے کہ مہرجی نے تمہارے دادا کا مار مار کر حشر کر دیا تھا۔ اسے زمین چاٹنے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے بے غیرتی دکھائی اور ہار کر بھی دولت بی بی کا دولہا بن بیٹھا۔ اگر دولت بی بی کے باپ کے منہ میں زبان کے بجائے کتے کا چڑا تھا تو تیرے دادا کو ہی حیا کرنی چاہئے تھی۔ وہ کسی طرح دولت بی بی کا حق دار نہیں تھا۔ وہ ساری زندگی دولت بی بی کے ساتھ زنا کرتا رہا ہے۔“

شانہ کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں۔ اس کا سارا بدن کانپتا جا رہا تھا لیکن ہاتھ میکانی انداز میں مہر کی پنڈلیاں دبا رہے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہ سکی۔ اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ مہر اپنے ایک ملازم کے منہ سے اپنی بہو کے بزرگوں کے متعلق ایسے کلمات کہلو رہا ہے۔

مہر غضب کے عالم میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی اکلوتی آنکھ سے زہریلے شعلے نکل رہے تھے۔ اکبر کے واسطے سے بولا۔ ”آج تجھے ماننا پڑے گا کہ تیرا دادا تیری دادی کا حق دار نہیں تھا۔ اس نے شادی نہیں کی چوری کی اور اگر اس نے چوری کی تو وہ چور تھا اور اس چوری کی وجہ سے جو پیدا ہوا وہ حرامی تھا۔ ہاں تیرا دادا چور اور تیرا باپ حرامی تھا..... بول..... اپنے منہ سے بول نہیں تو میں تیری چمڑی ادھیڑ دوں گا۔“

شانی کو لگا کہ اسے غش آجائے گا اور وہ مہر کی ٹانگوں کے اوپر بی گرجائے گی۔ اس نے رحم طلب نظروں سے اپنے دادا سسر کی طرف دیکھا اور پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی۔ ”داداجی! بڑوں کی کسی غلطی کی سزا مجھے نہ دیں..... مم..... میں تو آپ کی بیٹی ہوں۔“

”بکواس بند کر..... جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر..... اپنے منہ سے اقرار کر کہ تیرا دادا چور اور باپ حرامی تھا..... میں تیرے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔“ مہر کے یہ الفاظ اکبر نے بے دھرم شانی تک پہنچائے۔

شانی سر تا پا لرز رہی تھی لیکن ہاتھ اب بھی میکا کی انداز میں مہر کی پنڈ لیاں دبا رہے تھے۔ کئی ماہ تک گھنٹوں، مہر کی مٹھی چا پی کر کر کے یہ جیسے اس کی عادتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ہونٹ خشک ہو کر ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔ مہر کا غضب انتہا کو چھونے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ داستانوں کے زہر پیلے اثر دہے کے مانند اس کے منہ سے بھی نیلے شعلے نکلنے لگیں گے۔ ”تُو بولتی کیوں نہیں۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ اپنے منہ سے بول۔“ غضب کے سبب مہر کی آواز اب ناقابلِ شناخت ہو گئی تھی۔

شانی سکتے میں تھی۔ اچانک مہر نے اپنی صحت مند ٹانگ کو ایک غصیلہ جھٹکا دیا۔ اس کی ایڑی شانی کی پسلیوں سے ٹکرائی اور وہ جو پلنگ کے کنارے پر بیٹھی تھی، اچھل کر قلائین پر جا گری۔ اس کے ہونٹوں سے دہی دہی کراہ نکلی اور زمین آسمان نگاہوں میں گھومتے محسوس ہوئے۔ اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کہ مہر نے اکبرے کو کمرے کا اکلوتا دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ کھڑکیاں پہلے سے بند تھیں۔ اکبرے نے جلدی سے دروازے کی اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

مہر کے اشارے پر ادنیٰ ملازم اکبر نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے شانی کو کلائی سے پکڑا اور تقریباً گھسیٹ کر مہر کے پاس لے گیا۔ جھٹکا لگنے سے شانی کا نفاست سے باندھا ہوا بٹن اڑھایا ہو گیا اور بالوں کی کچھ لٹیس اس کے چہرے پر بکھر گئیں۔ اب مہر پٹنگ پر تھا اور شانی نیچے قالین پر۔ اکبر نے کی نہایت گستاخ اور بے رحم گرفت شانی کی کلائی پر قائم تھی۔ وہ ست رنگی چوڑیاں جو چند دن پہلے سیلانی عورت گنیمہ نے بڑی چاہت سے شانی کو دی تھیں اور جو آج شانی نے اپنے شوہر کے لئے کلائیوں میں سجائی تھیں، ٹوٹ ٹوٹ کر قالین پر گر رہی تھیں۔ شانی کی نازک کلائی سے خون رسنے لگا تھا۔

مہر کے ہونٹوں سے اڑ رہے جیسی پھنکار نکلی۔ اس کا صحت مند ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ شانی نے سمجھا شاید وہ اسے تھپڑ مارنا چاہتا ہے، لیکن یہ چیز تھپڑ سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ یہ منقش حقے کی نئے (نالی) تھی۔ شائیں کی آواز سے یہ نالی شانی کی کمر پر پڑی اور اسے لگا کہ جسم میں دھکتی ہوئی سلاخ اتر گئی ہے۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی اور آنکھوں سے ایک بار پھر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نئے کی دوسری ضرب شانی کے بائیں کندھے پر لگی اور یہ بھی بے حد تکلیف دہ تھی۔ اکبرے کا انداز بھی گستاخ تر ہوتا جا رہا تھا۔ شانی کو دبوچ کر رکھنے کے لئے اس نے شانی کے بال بھی مٹھی میں جکڑ لئے تھے۔

شانی کو دو تین دردناک ضربیں لگانے کے بعد مہر ایک بار پھر طیش کے عالم میں پھنکارنے لگا۔ شانی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”دادا!.....! میں نے کوئی غلطی نہیں کی، پھر بھی مجھے معاف کر دیں۔“

مہرنے اکبرے کی وساطت سے کہا۔ ”تو معافی کے قابل نہیں ہے۔ تیری رگوں میں جتنا بھی گندہ خون ہے سارے کا سارا میں آج نکال لوں گا۔ اس کے بعد ہی تو معافی کے قابل ہوگی۔“

”مم..... میں..... آپ کی بہو ہوں دادا..... آپ کی عزت.....“

”بہو کیا تو نوکرانی بننے کے لائق بھی نہیں ہے۔ حرام زادی تیرا ایک گناہ یہ بھی ہے کہ تو نے اس حویلی کی رانی بننے کا خواب دیکھا۔“

مہر کی وحشت عروج پر تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی بیٹھی ہوئی مفلوج آنکھ میں بھی تھوڑی سی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے کمر وہ ہونٹوں سے لیس دار مادہ بہہ رہا تھا اور ٹھوڑی کو تر کر رہا تھا۔ اس نے اکبرے کو کوئی شیطانی اشارہ کیا۔ اکبراجو پہلے ہی ”چھوٹی چوہدرانی“ کا ہر ادب آداب بھول چکا تھا اب بالکل ہی غنڈا نظر آنے لگا۔ اس کا ایک ہاتھ شانی کی نازک کلائی پر تھا اور دوسرا اس کے بالوں پر تھا۔ وہ اسے تقریباً گھینٹا ہوا ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔ کمرہ کیا تھا یہ چاروں طرف سے بند ایک کوٹھڑی تھی۔ صرف ایک کھڑکی تھی جو مہر والے کمرے کی طرف کھلتی تھی لیکن فی الحال وہ بھی بند تھی۔ فرش پر دری بچھی تھی اور ایک طرف گدا پڑا تھا۔ دیگر سامان میں دو ٹرک تھے۔ ایک الماری کے ساتھ ایک رائل اور ایک کلہاڑی دیوار پر آویزاں تھی۔ ایک ٹیپ ریکارڈر اور چھوٹا ٹی وی بھی اس کوٹھڑی نما کمرے کے اسباب میں شامل تھا۔ دائیں طرف کونے میں کوئی نوکری نما شے کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ مہر کے چہیتے ملازم اکبرے کا کمرہ تھا۔

شانی دیکھ رہی تھی کہ حالات بدترین رخ پر جا رہے ہیں۔ ارد گرد کی ہر شے اس کی نگاہوں میں دھندلا رہی تھی۔ اس نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔ کہاں ہو فاختہ..... کہاں ہو میرے مجازی خدا..... پھر اس کا دھیان بھابھ کی طرف گیا..... کہاں ہو بھابھ..... کہاں ہو میری چھوٹی سی تکلیف پر تڑپ جانے والی؟

وہ مدد کے لئے کسی کو پکارنا چاہتی تھی پھر شاید اس غرض سے اس نے اپنا منہ کھولا تھا اپنے سینے میں سانس جمع کی تھی، لیکن پھر فوراً ہی ایک طوفانی تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا۔ اس کا ذہن کچھ دیر کے لئے گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ وہ شاید دو چار منٹ کے لئے بے ہوش یا نیم بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید وہ نیم بے ہوش ہی تھی۔ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اسے گھسیٹا جا رہا ہے۔ کسی شے سے باندھا جا رہا ہے۔ اسے اپنے ٹخنوں کے قریب اور کلائیوں پر شدید چھین محسوس ہو رہی تھی۔

چند منٹ کے وقفے کے بعد جب اس کا ذہن دوبارہ صاف ہوا اور آنکھوں کے سامنے سے دھندکی چادر ہٹئی تو کوٹھڑی کا منظر بہت بدلا ہوا نظر آیا۔ چار پائی کی ادوائن کے ساتھ اس کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے اور پاؤں بھی باندھے دیئے گئے تھے۔ تاہم باندھتے ہوئے یہ احتیاط کی گئی تھی کہ کلائیوں اور ٹخنوں پر گہرے نشانات نہ پڑیں۔ رسیوں کے نیچے شانی کو اسفنج کے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔

اکبر اس سے چند فٹ دور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا انداز بالکل مختلف تھا۔ وہ اب ملازم نہیں تھا اور نہ ہی شاید وہ چوہدرانی تھی۔ اس نے مکمل بے باکی سے شانی کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہارے دماغ میں یہ خیال ہے کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کو آئے گا تو بالکل بھول جاؤ۔ یہاں کوئی آئے گا اور نہ تمہاری آواز یہاں سے باہر جائے گی۔ چھوٹے چوہدری صاحب بڑے چوہدری صاحب مہرجی کے بھیجنے پر

ہی گجرات گئے ہوئے ہیں۔ ان کا کام ایسا ہے کہ کل صبح سے پہلے ختم ہو ہی نہیں سکتا۔ بڑی چودہ رانی (بھابھو) کے لئے بھی ایسا انتظام ہے کہ وہ سویرے سے پہلے واپس نہیں آسکتی ہیں۔“ اکبرے کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔

اس چمک کو دیکھ کر شانی کو اپنے اندر ایک خوفناک کچکی کا احساس ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا دادا سرِ عداوت اور کدورت میں ساری حدوں کو پھلانگ گیا ہے۔ اس نے شانی کو لا چار کر کے اپنے ایک ادنیٰ ملازم کے سامنے پھینک دیا ہے۔

اکبرے کی ہنسی ہوئی آواز ایک بار پھر شانی کے کانوں میں گونجی۔ ”جو کچھ مہرجی تمہارے ہونٹوں سے سننا چاہتے ہیں انہیں سنا دو۔ شاید..... شاید..... پھر تمہاری بچت کی کوئی صورت نکل آئے۔“

اکبرے کی بات سن کر شانی کی فطری حوصلہ مندی اس کے اندر جاگ گئی۔ اس نے بے پناہ کرب اور دکھ کے عالم میں سوچا ”جو کچھ اس کے ساتھ ہونا ہے وہ تو شاید ہونا ہی ہے، لیکن وہ اپنے منہ سے اپنے باپ دادا کو گالی نہیں دے گی۔ یہ بات بہت ممکن تھی کہ اس کے ہونٹوں سے اپنے من پسند الفاظ سن کر بھی مہروہی کچھ کرے جواب کرنے جا رہا ہے۔

شانی کی آنکھوں سے آنسو بوندوں کی طرح گر رہے تھے اور وہ خود کو زمین آسمان کے درمیان معلق محسوس کر رہی تھی۔ آدھا پون گھنٹا پہلے مہرے کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے ساتھ یہ کچھ ہونے والا ہے۔

اچانک اس کی نگاہ اکبرے کے قریب رکھی ایک شیشے کی بوتل پر پڑی۔ اس بوتل میں سنہری رنگ کی کوئی دوا گندم کے دانوں کی شکل میں تھی۔ بوتل کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ قریب ہی پانی کا گلاس رکھا تھا جس میں سے دو تہائی پانی غالباً پی لیا گیا تھا۔ شانی کے بے پناہ خوف میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ وہ اس دانے دار سنہری دوا کے بارے میں جانتی تھی۔ بھابھو سے اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا..... بلکہ وہ جب سے اس حویلی میں آئی تھی اس حوالے سے کچھ نہ کچھ سن رہی تھی۔ یہاں اپنی آمد کے تیسرے ہی دن شانی غلطی سے مہر کی پھلواری میں چلی گئی تھی۔ مہر خوفناک انداز میں اس پر جھپٹا تھا اور وہ جان بچا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔

بعد میں ایک موقع پر بھابھو نے شانی کو تفصیل سے بتایا تھا کہ ”سپ گندل“ نامی ایک پودا مہرجی کی پھلواری میں اگتا ہے۔ بعد میں سنیاں کے طریقے سے اسے ایک سنہری دوا کی شکل دی جاتی ہے جو مہر کے لئے آبِ حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ مہر اور اس ”سپ گندل“ کے بارے میں اور بھی کئی گفتنی اور ناگفتنی باتیں شانی نے سن رکھی تھیں۔ مہر کی مٹھی چا پی کے لئے شانی اس کے کمرے میں آتی ہی رہتی تھی۔ اس نے مہر کی الماری میں گندم کے دانوں جیسی اس سنہری دوا کی جھلک کئی بار دیکھی تھی۔ آج یہی دوا الماری سے باہر بھی نظر آ رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ مہر کے چبیتے ملازم اکبرے نے اس کا استعمال کیا ہے۔

چند ہی سیکنڈ بعد شانی کے اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔ شانی کے دیکھتے ہی دیکھتے اکبرے نے اپنی بھدی سانولی تھیلی پر سنہری دانے دار ”سپ گندل“ کی تھوڑی سی مقدار مزید نکالی اور اسے پھانک گیا۔ فوراً بعد گلاس کا بچا کھچا پانی بھی اس کے حلق سے نیچے اتر گیا۔

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ تاہم بدترین اندیشے اس کے دل و دماغ کو زخمی کر رہے تھے۔ وہ ایک اور بات نوٹ

کر رہی تھی۔ دم بدم اکبرے کی کیفیت بدلتی جا رہی تھی۔ شاید ”سپ گندل“ نے اس پر اثر شروع کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ مائل ہو رہی تھیں۔ سانولا چہرہ متمنا لگا تھا اور پیشانی کی رگیں پھولتی جا رہی تھیں۔ اکبرے کی عمر پینتیس سے اوپر رہی ہوگی۔ چہرہ چوڑا چکلا تھا۔ پیشانی سے بال اُڑ چکے تھے۔ عام طور پر دھوتی کرتے یا شلوار کرتے پہنتا تھا۔ گلے میں بڑا سا رومال جھولتا رہتا تھا۔ وہ سانپ کا زہر نکال کر اسے جمع کرنے کا طریقہ جانتا تھا۔ ایک دوبار شانی نے بھی اسے سانپ کا زہر نکالتے دیکھا تھا۔

بہر حال فی الوقت تو اکبر خود سانپ بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ تر ہوتی گئیں۔ ہونٹ کھچ سے گئے۔ شانی دیکھ رہی تھی کہ سردی کے باوجود اکبرے کے چہرے کے مساموں سے پسینہ بہنے لگا ہے۔ اس پر جنونی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اکبرے کی آنکھیں اس جنونی کیفیت کا سب سے زیادہ شکار تھیں۔ وہاں شانی کو ایک خوفناک بھوک دکھائی دینے لگی۔ ایسی بھوک جو باقی ہر احساس پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ اکبرے کی آنکھوں میں موجود بے باکی اب بے شرمی کی حدوں سے بھی کہیں آگے نکل گئی تھی۔ وہ اب انسان لگتا ہی نہیں تھا۔ بگڑی ہوئی شکل اور ہانپتی ہوئی سانسوں والا کوئی درندہ نظر آتا تھا۔ شاید یہی تھا مہر کی سپ گندل کا اعجاز؟ یا شاید یہ سپ گندل کا اعجاز نہیں تھا یہ انسان کے اندر نسل در نسل پروان چڑھنے والی عداوت اور کدورت کا ”اعجاز“ تھا۔

سپ گندل تو ایک پودا تھا۔ اس کا اچھا یا بُرا کوئی بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ بالکل جیسے انسان کے اندر پایا جانے والا جذبہ تسخیر کسی بھی اچھے یا بُرے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ مہرجی جیسے لوگ اس جذبہ تسخیر سے پیدا ہونے والی بے پناہ توانائیوں کو دشمنیاں پروان چڑھانے اور لاشے گرانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی کدورتوں کو نسل در نسل پالتے ہیں اور زہریلی تاثیر والا تناور درخت بناتے ہیں۔ مہر کے جذبہ تسخیر نے دولت بی بی کو فتح کرنا چاہا مگر اپنی بد قسمتی کے سبب نہ کر سکا۔ اس نے دولت بی بی کو حاصل کرنے والے شخص سے دشمنی پالی اور..... پالتا چلا گیا۔ یہ ایک ایسی زہریلی سپ گندل تھی جو اس کی رگ رگ اور نس نس میں پھیل گئی۔ مدتیں گزر گئیں، نسلیں بدل گئیں لیکن وہ اپنے اندر پھیلی خطرناکی کو کم نہیں کر سکا۔ آج پون صدی بعد وہ اپنی خداداد ناکامیوں کا بدلہ شانی سے لے رہا تھا اور اس طریقے سے لے رہا تھا کہ رات کے اس خنک پہر کو بھی پسینہ آگیا تھا۔ وہ اپنے پوتے کی پاک دامن بیوی کو ایک بدمست نوکر سے تارتار کروانے جا رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ قادر بخش اور دولت بی بی سے قرار واقعی بدلہ لے رہا ہے۔

اکبر ایک بچہ ہوا جانور تھا اور شانی سے چند فٹ کی دوری پر تھا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے یکا یک اسے آگ لگ جائے گی۔ بھک بھک کی آواز کے ساتھ شعلے اس کی آنکھوں اور منہ سے خارج ہونے لگیں گے۔ بیس تیس سینڈ پہلے اس نے تپائی پر رکھا ہوا پانی کا جگ اپنے سر پر انڈیلا تھا اور اس کے چہرے کی حد سے بڑھی ہوئی متمنا ہٹ قدرے کم ہوئی تھی لیکن اب پھر چہرہ آگ کی طرح دھک رہا تھا۔

تب شانی کے دھندلائے ہوئے ذہن نے ایک اور بات نوٹ کی۔ ایک اور دل فگار بات۔ اکبرے نے کوٹھڑی کی اکلوتی کھڑکی کے پٹ ذرا سے وا کر دیئے۔ اس کھڑکی کی دوسری جانب مہر کا کمرہ تھا۔ شاید..... شاید اکبر شانی کی چیخ پکار اور منت سماجت اپنے آقا کے بندکانوں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ شانی نے کہیں پڑھا تھا دو ڈھائی ہزار سال پہلے بابل اور مصر وغیرہ کے امراء اور رئیس اپنے سامنے عصمتیں لٹواتے تھے اور یہ تماشے دیکھ کر

خوش ہوتے تھے۔ شاید مہر کی رگوں میں دوڑنے والے خون میں بھی کوئی ایسی ہی خباثت شامل تھی۔

یہ نازک ترین لمحات تھے۔ شانی نے مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا۔ وہ درد بھرے فریادی انداز میں چیخی۔ ”بچاؤ..... کوئی ہے..... کوئی ہے..... بچاؤ۔“

شانسی کی آواز بہت بلند تھی مگر اکبر کے چہرے پر مطلق پریشانی نظر نہیں آئی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اور مہر اپنے انتظامات کی طرف سے مطمئن ہیں۔ شانی نے اپنے شریک حیات کی خوشنودی کے لئے اپنی کلائیوں میں چوڑیاں سجائی تھیں، ہاتھوں پر مہندی کے خوش نما پھول بنائے تھے۔ اپنے بدن کو مل کر اُٹھن اور صندل سے دھویا تھا۔ اسے کیا پتا تھا، یہ سب کچھ ایک بدبودار جانور کے ہاتھوں پامال ہونے والا ہے۔

آخری چارے کے طور پر وہ اپنی فریاد مہر کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگی۔ ”دادا..... ایسا مت کرو۔ میں اپنی مری ماں کی قسم کھاتی ہوں۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی..... مجھے معاف کر دو۔ دادا! تم کہو گے تو میں اپنے میکے سے ہر رشتہ توڑ لوں گی۔ کسی کو صورت نہیں دکھاؤں گی۔ تمہاری اور تمہارے بیٹے کی باندی بن کر رہوں گی لیکن میرے ساتھ ایسا مت کرو.....“

کوئی جواب نہیں آیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آواز پتھر کی دیواروں سے ٹکرا کر نابود ہو گئی ہے۔

دفعۃً اس نے اکبر کے کوخود پر جھپٹے دیکھا۔ اس کے نازک جسم پر جیسے کوئی بہت بڑی خاردار جھاڑی اپنے تنے سمیت آن گری تھی۔ اس نے چیخا چاہا تو اس کا منہ ایک بے رحم ہتھیلی نے ڈھانپ لیا۔ اس نے بھرپور مزاحمت کی۔ ایک باعصمت عورت کی حیثیت سے مزاحمت کا حق ادا کر دیا۔ اس نے اکبر کے کیپسلیوں پر گھٹنوں کی کئی کرخت ضربیں لگائیں اور مزاحمت کا امنٹ ثبوت فراہم کرتے ہوئے اس کے منخوس جسم پر کئی جگہ اپنے دانتوں کے نشان چھوڑے۔

اکبر ادرندے کی طرح چنگھاڑتا ہوا چیخے ہٹ گیا۔ سڀ گندل نے اس کے جسم میں دوزخ بھر رکھا تھا۔ وہ لہراتا ہوا کمرے کی طرف گیا۔ وہاں اس نے نوکر قسم کی چیز پر سے کپڑا ہٹایا۔ یہ ایک نوکر نہیں تھا۔ یہ تین چار نوکریاں ”پناریاں“ تھیں۔ ایسی پناریوں میں سانپ ہوتے ہیں اور ان میں بھی یقیناً سانپ تھے۔ اکبر نے ہاتھ پر ایک سیاہ دستانہ چڑھایا اور سب سے اوپر والی پناری کا ڈھکنا کھول دیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ کوبرا نظر آ رہا تھا۔ اکبر نے اسے گردن کے قریب سے پکڑا تھا۔ کوبرے کا خوفناک منہ درندے کے جبرؤں کی طرح کھلا تھا۔ یکا یک شانی کی نگاہ کوبرے کی دم پر پڑی۔ وہاں ایک آر پار ہوتا ہوا سوراخ تھا۔ یہ وہی کوبرا تھا جسے مہر پھلاری میں رکھتا تھا اور اس کے فضلے سے سڀ گندل کے لئے کھا دیا تھا۔ اب یہ کوبرا اکبر کے ہاتھ میں تھا یا شاید یوں کہنا چاہئے کہ کوبرے کے ہاتھ میں کوبرا تھا۔

اکبر انگڑاتا ہوا شانی کی طرف پلٹا اور ”کوبرا بدست“ شانی پر حملہ آور ہوا۔ یہ سچ سچ قیامت کے لمحے تھے۔ شانی کے جسم میں زہریلے خنجر اتار دیے جاتے یا انگاروں پر گھسیٹا جاتا تو بھی اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنا کوبرے کے منہ کوخود سے چند انچ کے فاصلے پر دیکھ کر ہو رہی تھی۔ ان جان لیوا لحوں میں شانی کو پتا چلا کہ اسے مہر کے جسم اور اس کے کمرے سے جو مخصوص بو آیا کرتی تھی وہ واقعی سانپوں کی بو تھی، یہ مشہور تھا کہ مہر سانپ کا تازہ خون اور اس کے پتے کا پانی ایک ہی پیالے میں ڈال کر پی جاتا ہے۔ یقیناً یہ سانپ کی بو ہی تھی جو مہر کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔

ہاں ایک کو برا اس سے چند ناچ کے فاصلے پر تھا اور دوسرا کو برا اسے اپنے جسم کے پیچ و خم میں لپیٹ رہا تھا۔ یہ دوسرا کو برا اپنی سفاک آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”تیرے بھائی نے میری ٹانگ توڑی تھی۔ وہ بدلہ بھی تو باقی ہے تجھ سے۔“

خوف اور دہشت نے شانی کو بتدریج سکتہ زدہ کر دیا۔ وہ اکبرے کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کو برا کے کھلے منہ میں دیکھتی جا رہی تھی۔ یہ کو برا صرف چند ناچ کی دوری پر تھا اور اکبرے کا دم کاٹا ہوا لہجہ شانی کو بتا رہا تھا کہ اگر اس نے مزاحمت جاری رکھی تو یہ فاصلہ مزید کم ہو جائے گا۔

یہی وقت تھا جب کہیں قریب ہی دستک کی مدھم آواز ابھری۔ شانی کو لگا کہ یہ دستک مہر کے دروازے پر ہوئی ہے۔ چند سیکنڈ بعد شانی کو ادھ کھلی کھڑکی میں سے مدھم نسوانی سرگوشی سنائی دی۔ یہ آواز ادھیڑ عمر ملازمہ جالاں کی تھی۔ جالاں اکبرے کی رشتہ دار تھی اور اس کا شمار مہر کے ذاتی ملازموں میں ہوتا تھا۔ سرگوشی کے بعد مہر کے کمرے کا دروازہ پھر بند ہو گیا۔ جالاں واپس چلی گئی۔ ایک مختصر سا وقفہ آیا اس کے بعد مہر کی صورت کھڑکی کے چوکھٹے میں نظر آئی۔ وہ اپنی ڈھیل چیر ڈھکیلتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔

اس نے غرغراتی اور خرخراتی آواز میں اپنے چہیتے اکبرے کو کچھ سمجھایا۔ مہر کی بات میں فاخر اور گاڑی کے الفاظ واضح طور پر شانی کی سمجھ میں آئے۔ امید کی کئی کریمیں ایک ساتھ شانی کے دل میں روشن ہوئیں۔ مہر کا لہجہ اور الفاظ شانی کو سمجھا رہے تھے کہ غیر متوقع طور پر فاخر کی واپسی ہو گئی ہے۔

اچانک اکبرے نے شانی کے منہ میں زبردستی کپڑا گھسیڑ دیا۔ کپڑے کے اوپر اس نے اپنا رومال کس کر باندھ دیا۔

کو برا سانپ ایک بار پھر پٹاری میں پہنچ چکا تھا۔ کسی حد تک افراتفری کے عالم میں اکبر اکبرے سے باہر نکل گیا۔

مہر کا چہرہ کھڑکی میں نظر آ رہا تھا اور اس کی اکلوتی لٹکارے مارتی آنکھ جنونی انداز میں شانی پر مرکوز تھی۔

اکبرے کی واپسی دو تین منٹ بعد ہو گئی۔ مہر سے کھسر پسر کرنے کے بعد وہ سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا اور شانی کے سر ہانے کھڑا ہو گیا۔

اس نے کھڑکی بند کر دی تھی۔ بمشکل ایک دو منٹ گزرے ہوں گے کہ فاخر کی جاں افزا آواز شانی کے کانوں سے نکل گئی۔ وہ مہر کے کمرے میں موجود تھا۔ ہاں اس کا شریک حیات اس کی عزت اور جان کا محافظ اس سے چند گز کی دوری پر موجود تھا۔ اس نے جسم اور جان کی پوری توانائی کے ساتھ اپنے شوہر کو پکارنا چاہا مگر گلے میں پھنسے ہوئے کپڑے کے گولے نے اس کی آواز سینے میں ہی دبا دی۔

فاخر کی نہایت مدھم آواز شانی کے کانوں تک پہنچی۔ ”دادا..... شانی تو ادھر نہیں آئی؟“

جواب میں مہر کی ناقابل فہم آواز ابھری۔ وہ فاخر کے سوال کا جواب نفی میں دے رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان چند فقروں کا تبادلہ ہوا۔

شانی کو یوں لگا کہ فاخر واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہے مگر پھر ایک جملے نے شانی کی ٹوٹی ہوئی امید دوبارہ باندھ دی۔ فاخر نے کہا تھا ”دادا..... لیکن یہ شانی کی چپل؟“

وہ جب مہر کے پاؤں دبانے کے لئے پلنگ پر چڑھتی تھی تو چپل پانسی کی طرف اتار دیتی تھی۔ اب یہی چپل فاخر کے رکے رہنے کا جواز

بن گئی تھی۔

مہر نے ناقابل فہم آواز میں کچھ کہا۔

جواب میں فاخر بولا۔ ”مگر دادا..... وہ چپل..... کے بغیر کیسے جاسکتی ہے۔“

پھر مہر کی ناقابل فہم آواز (آواز میں بوکھلاہٹ کا عنصر تھا)

فاخر نے نہایت پریشان لہجے میں کہا۔ ”دادا..... آپ..... آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔ مم..... مجھے شانی کہیں نظر نہیں آرہی۔“

جواب میں پھر غوغاں ابھری۔ غالباً مہر کہہ رہا تھا کہ کیا وہ اس سے جھوٹ بول رہا ہے؟

فاخر کی آواز میں خوف اور غصے کی آمیزش بڑھ گئی۔ ”آپ جھوٹ نہیں بول رہے تو کیا میں بول رہا ہوں؟ شانی کہیں نہیں ہے۔ اس کی

چپل یہاں پڑی ہے۔“

پھر مہر کی مبہم غوغاں۔

فاخر نے چیخانی لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”دادا! میں جانتا ہوں آپ نے..... آپ نے شانی کے ساتھ کچھ کیا ہے۔ کدھر ہے

وہ..... اور وہ آپ کا اکبر؟ وہ کہاں ہے؟ اکبرے.....“ فاخر آوازیں دینے لگا۔

پھر شاید اس نے مہر کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ”آپ پیچھے ہٹیں دادا۔ مجھے دیکھنے دیں! اکبر کہاں ہے۔“ فاخر کا لہجہ بلند ہوتا

جا رہا تھا۔

مہر چنگھاڑا۔ اس کے الفاظ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے فاخر کے لئے راستہ چھوڑنے سے انکار کیا ہے اور اسے بری طرح ڈانٹ رہا ہے۔

یہ کشمکش قریباً ایک منٹ تک رہی اور پھر انتہا کو پہنچ گئی۔ مہر کی گھن گرج میں جنونی انداز تھا۔ غالباً وہ پوتے کو بے غیرتی کا طعنہ دے رہا تھا۔

اسے بتا رہا تھا کہ شانی اس حویلی میں سزا بھگتتے کے لئے آئی تھی، عیش کرنے کے لئے نہیں۔ دوسری طرف فاخر نے فیصلہ کن لہجہ اختیار کیا۔

”دادا..... مجھے ہندوق سے نہ ڈراؤ۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ میں جانتا ہوں شانی یہاں ہے۔ ہٹ جاؤ.....!“

شانی اکبرے کے بچوں میں ایسے ہی تھی جیسے عقاب کے بچوں میں چڑیا۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا منہ اکبرے نے

دونوں ہاتھوں سے بند کر رکھا تھا۔ غالباً وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے یہ وقت ٹل جائے مگر یہ وقت ٹلنے والا نہیں تھا اور نہ ہی فاخر یہاں ٹلنے کے لئے آیا

تھا۔ دادا پوتے میں کشمکش نقطہ عروج کو پہنچی پھر سیون ایم ایم رائفل کا خوفناک دھماکا سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی فاخر کی کراہ ابھری۔ وہ گر پڑا تھا۔ مہر

کی جنونی آواز فضا میں گونجی اور اس نے ایک فائر مزید کیا۔

اکبرے نے بوکھلاہٹ کے عالم میں شانی کو چھوڑا اور اپنے آقا مہر کی طرف لپکا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی حیرت زدہ آواز شانی کی سماعت

سے ٹکرائی۔ وہ مہر سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ کیا ہو گیا چوہدری جی؟“

شانی تڑپ چل رہی تھی۔ کسی طرح منہ کا کپڑا بھی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ شانی نے خود کو بمشکل اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ

ابھی دل سینے میں پھٹ جائے گا۔ اس نے آنکھوں پر بے پناہ جبر کر کے کھڑکی سے جھانکا۔ دوسری طرف قریباً تیس فٹ دور کمرے کے قالین پر فاخر کا

خونچکاں جسم پڑا تھا۔ اسکی چھاتی اور پیٹ پر گہرے گھاؤ خون اگل رہے تھے۔ مہر کسی جاہر حاکم کی طرح ذہیل چیخ پر بیٹھا تھا..... رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔

”فاخر..... فاخر.....“ شانی کی دلدوز پکار رات کے سناٹے میں گونجی اور وہ شدید کرب کے عالم میں کھڑکی کی چوٹھ سے سر ٹکرانے لگی۔ ”مجھے بھی مار دو..... میری جان بھی لے لو..... میری جان بھی لے لو.....“ وہ فریادی لہجے میں چلائی۔ ان لمحوں میں موت اسے نعمت محسوس ہو رہی تھی۔

یکا یک اس کی دھندلائی نگاہوں نے ایک ڈرامائی منظر دیکھا۔ اسے لگا جیسے یہ سب کچھ حقیقت میں نہیں ہو رہا۔ یہ کسی فلم یا ڈرامے کا منظر ہے۔ اس نے اکبرے کو بڑی پھرتی سے مہر کی رائفل سنبھالتے دیکھا پھر اسے کہیں آس پاس ہی رستم سیال کی دل دہلا دینے والی چنگھاڑ سنائی دی۔ اس کی سماعت دھوکا نہیں کھا سکتی تھی یہ اسی کی آواز تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ مہر کے کمرے کے عین سامنے رستم کسی سے گتھم گتھا ہے۔ اس سے پہلے کہ اکبرار رائفل سمونت کر اپنے ساتھی کی مدد کو پہنچتا، مہر کے کمرے کی بیرونی کھڑکی زوردار دھماکے سے کھلی اور رستم جست لگا تا ہوا اندر آ گیا۔ اس کے لمبے سفید کرتے پر خون کے تازہ دھبے تھے اور ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ کودتے ہوئے اس کے سر سے نیلے کپڑے کا ڈھانا کھل گیا تھا اور اس کے گھنے طویل بال اس کے چہرے پر لہرانے لگے تھے۔

اکبرے نے رائفل اس کی طرف سیدھی کی مگر اس کی اور رستم کی رفتار میں وہی فرق تھا جو زندگی اور موت میں ہوتا ہے۔ خون آلود خنجر کا وار اکبرے کی شررگ پر ہوا۔ اس کے گلے کی پھولی ہوئی رگوں میں سے خون فوارے کی طرح نکلا۔

جیسے یہ خون نہ ہو مہر کی سپ گندل کا پُر آشوب زہر ہو۔ دوسرا وار ناف سے ذرا اوپر تھا۔ رستم نے وحشت کے عالم میں خنجر کو اوپر کی طرف کھینچا۔ اکبرے کا پیٹ چاک ہوا اور انتڑیاں ٹٹکنے لگیں۔ سر کی زوردار ٹکر سے اس نے اکبرے کو دو رگوشے میں پھینک دیا۔ رائفل پھسل کر پلنگ کے نیچے چلی گئی تھی۔

مہر اپنی وہیل چیئر تیزی سے دھکیلتا ہوا اس کو کھڑی نما کمرے کی طرف آیا جہاں شانی موجود تھی۔ اس کے دو مقصد ہو سکتے تھے۔ وہ رستم سے چھپنا چاہتا تھا یا رستم کے ہاتھوں مرنے سے پہلے کسی طرح شانی کو مارنا چاہتا تھا۔ بہر حال ان میں سے کوئی مقصد بھی پورا نہیں ہوا۔ وہ ابھی لمبوتری کو کھڑکی کی دہلیز پر ہی تھا کہ رستم نے بلائے ناگہانی کی طرح اسے عقب سے دبوچ لیا۔

اس دوران میں حویلی کے احاطے میں فائرنگ ہوتی رہی تھی۔ یکا یک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ یہی محسوس ہوا کہ ساری کی ساری حویلی بارود سے پُر زے ہو کر اڑ گئی ہے اور نار پور میں بکھر گئی ہے۔

جیسا کہ بعد میں پتا چلا احاطے میں رستم کے ایک مسلح ساتھی اور حویلی کے محافظوں کے درمیان فائرنگ ہو رہی تھی۔ کسی ایک فریق کا چلایا ہوا برست گودام میں رکھے ڈیزل کے ڈرموں میں لگا۔ یہاں مہر کے ٹریکٹروں، ٹیوب ویلوں اور تھریشروں کے لئے کم و بیش چار ہزار لیٹر ڈیزل آئل جمع تھا۔ اس ڈیزل میں دھماکوں سے شعلے بھڑکے اور ڈرم ماچس کی ڈبیوں کی طرح اڑتے ہوئے گلی کوچوں میں بکھر گئے۔ اس کے ساتھ ہی پوری حویلی آگ کی پلیٹ میں آ گئی۔

دھماکے کے فوراً بعد 200 لیٹر کا ایک جلتا ہوا ڈرم کھڑکی توڑ کر مہر کے وسیع کمرے میں آن گرا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کا سامان دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ مہر اپنی وہیل چیئر پر تھا لیکن اس کی گردن رستم کے بازو کے شنبے میں تھی۔ وہ اپنی گردن جھڑانے کے لئے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ اس کی

اکلوتی آنکھ میں اب بھی قہر کے شعلے تھے۔ رستم نے وحشت کے عالم میں اس کے دل کے مقام پر خنجر گھونپا اور پھر ایک جھٹکے سے اسے نکالا اور اس کے پیٹ اور سینے پر پے در پے وار کرنے لگا۔ شانی نے آنکھیں بند کر لیں۔ غوں غاں خرخر..... غوں غوں گھر گھر..... مہر کے منہ سے اب بھی قہر ناک آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی خبیث روح اپنے مسکن کو چھوڑنے سے انکار کر رہی ہے مگر جب خون جسم سے فواروں کی صورت چھوٹ رہا ہو تو روح کو نفسِ عنصری خالی کرنا ہی پڑتا ہے۔

شانی نے نیم غشی کی مختصر کیفیت کے بعد آنکھیں کھولیں تو رستم خنجر سے اس کی بندشیں کاٹ رہا تھا۔ سامنے وہیل چیئر پر مہر کی لاش ”عداوت پرستی اور کینہ پروری“ کا انجام بن کر پڑی تھی۔ شانی اس کی لاش سے نگاہیں چراتی رستم کے ساتھ مہر کے کمرے میں آئی۔ ایک تہائی کمرہ آگ کی لپیٹ میں تھا۔ حدت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ شانی شوہر کے جسم سے لپٹ گئی۔ وہ بے حرکت تھا۔ سانس کی آمد و رفت بھی معدوم تھی۔ کمرے میں پھیلی آگ فاخر کے پاؤں کے قریب پہنچ چکی تھی۔ شانی اپنے لہجے میں ہزار التجائیں سمیٹ کر بولی۔ ”رستم..... انہیں بچاؤ۔ انہیں ہسپتال لے جاؤ۔“

رستم نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر خون میں ڈوبے ہوئے بے جان فاخر کو کندھے پر لادا اور شانی کا ہاتھ تھام کر دھوئیں اور آگ سے باہر نکلا۔ پوری حویلی دھڑا دھڑل رہی تھی۔ آگ اتنی تیزی سے بھڑکی تھی کہ شاید کم ہی لوگوں کو جان بچانے کا موقع ملا تھا۔ سیاہ دھوئیں کے مرغوں کے قرب و جوار کو ڈھانپتے جا رہے تھے۔ رستم نے اپنے چہرے پر ڈھانڈا دوبارہ باندھ لیا تھا۔ وہ دونوں دھوئیں میں کھانتے اور آنسو بہاتے حویلی سے باہر آئے۔ نارپور میں قیامت کا سماں تھا۔ گاؤں کے لوگ بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ چار قرعہ میکانوں میں بھی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ شانی نے کچھ موبیٹیوں کو بھی زخمی حالت میں بھاگتے دیکھا۔ رستم شانی کو لئے ایک بغلی گلی میں آیا۔ یہاں ایک جیب موجود تھی۔ تینوں جیب میں بیٹھے اور جیب تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

شانی رو رہی تھی اور اپنے بے حس و حرکت شوہر کو ہلاتی چلی جا رہی تھی۔ ”فاخر آنکھیں کھولیں۔ فاخر! خدا کے لئے آنکھیں کھولیں۔“ رستم نیم پختہ راستے پر جیب کو طوفانی رفتار سے اڑا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ شانی کو تسلی دینے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ گہری تاریکی میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ ایک زخمی کو لے جا رہے ہیں یا ایک مردہ شخص کو۔ قریباً تین میل آگے آنے کے بعد چھوٹی نہر کے پل پر رستم کو ایک کھجے کی روشنی دکھائی دی۔ روشنی کے عین سامنے پہنچ کر رستم نے جیب کو تیزی سے بریک لگائے۔ ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر وہ کچھلی نشست پر آیا جہاں نارپور کا چھوٹا چوہدری فاخر بے حرکت لیٹا تھا۔ سرکاری کھجے کی روشنی اسے سر سے ناف تک روشن کر رہی تھی۔ رستم نے فاخر کے سینے سے کان لگا کر اس کی دھڑکن سنی پھر گردن کو چھو کر اس کی نبض ڈھونڈی۔ پلکوں کو اٹھا کر پتلیوں میں جھانکا..... پھر ایک گہری آزرده سانس لے کر سر جھکا لیا۔

”کیا ہے رستم.....؟ کیا ہے؟“ شانی کر بناک آواز میں کرائی۔

وہ خاموش رہا۔

”کیا ہے رستم؟ کیا..... یہ نہیں رہے..... بولو کیا نہیں رہے.....؟“

وہ ہولے سے بولا۔ ”ہاں بی بی..... یہ نہیں رہے۔“

”یہ غلط ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔“ شانی کی دلدوز پکار سنائے کو چیرتی چلی گئی۔ اس نے ایک بار پھر فاخر کو جھنجھوڑا۔ تب اس کے سینے سے چمٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ رستم نے اسے کندھوں سے تھاما اور سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆=====☆=====☆

نارپور سے قریب سات میل آگے پولیس کے ایک ریٹائرڈ حوالدار کے ہاں انہوں نے پناہ لی۔ یہ شخص بھی رستم کے با اعتماد دوستوں میں سے تھا۔ فاخر کی لاش ان کے ساتھ تھی۔ رورو کر شانی بے حال ہو رہی تھی۔ رات آخری پہر اس کی حالت میں معمولی بہتری ہوئی۔ شانی، رستم اور ان کے میزبان کے درمیان طویل مشورے کے بعد طے ہوا کہ فاخر کو اس طریقے سے نارپور روانہ کر دیا جائے کہ جسد خاکی پہنچانے والے کے متعلق کسی کو معلوم نہ ہو۔ فی الحال یہی ان سب کے لیے بہتر تھا۔

اپنے شریک حیات کو آنسوؤں کی موسلا دھار بارش کے دوران میں شانی نے اس کے گاؤں کی طرف رخصت کیا۔ یوں لگتا تھا کہ رورو کر وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ رستم نے اسے نیند کی دوا دی۔ وہ پورے آٹھ پہر سوئی رہی۔ اگلے روز رات کو وہ جاگی۔ ستائیس اٹھائیس گھنٹے پہلے پیش آنے والے واقعات جاگتی آنکھوں کے ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہے تھے۔ ان کے بارے میں سوچ کر ہی اس کا دل پتے کی طرح لرزنے لگتا تھا۔

سامنے دیہاتی طرز کی گول تپائی پر دو پہر کا اخبار پڑا تھا۔ پہلے صفحے پر نارپور کی جلتی حویلی کی تصویر تھی۔ شعلے تھے اور سیاہ دھوئیں کے بلند وبالا مرغولے تھے۔ اس آگ میں یقیناً کچھ بے گناہ بھی خاکستر ہوئے تھے مگر گناہ گاروں کی تعداد زیادہ تھی۔ شانی نے تصویر کی نگاہ سے دیکھا ان شعلوں میں بہت کچھ جل رہا تھا۔ قیمتی فرنیچر، بیش قیمت قالین، بلند وبالا منقش دروازے، مہر اور فاخر کے خونخوار پہرے دار، ان کے خون آشام کتے..... شکاری عقاب، زہریلے سانپ اور سانپوں سے بڑھ کر زہریلا خود مہر اور اس کا وحشی غلام اکبر۔ شانی نے تصویر کی نگاہ سے سب کچھ دیکھا پھر بے ساختہ اس کی نگاہ خبر پر پھسلنے لگی۔ لکھا تھا۔ کل رات نارپور میں چوہدری مہرجی کی مشہور حویلی آگ سے خاکستر ہو گئی۔ اس واقعے میں چوہدری مہر، چھوٹے چوہدری فاخر اور ان کی چھوٹی بہو سمیت کم و بیش چوبیس افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ ہلاک ہونے والوں میں زیادہ تعداد چوہدری مہر کے گارڈز اور ملازمین کی ہے۔

واقعات کے مطابق کل شب گیارہ بجے کے قریب نامعلوم مسلح افراد نے حویلی میں گھسنے کی کوشش کی۔ محافظوں اور مسلح افراد میں فائرنگ کا آزادانہ تبادلہ ہوا۔ حویلی کے ایک گودام میں ایک دن پہلے ڈیزل کی کھیپ پہنچی تھی اور اس وقت وہاں ڈرموں میں کم و بیش چار ہزار لیٹر ڈیزل موجود تھا۔ فائرنگ کے دوران میں اچانک گودام میں آگ بھڑک اٹھی۔ سماعت شکن دھماکے ہوئے اور آنا فانا پوری حویلی آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ آگ اتنی شدید تھی کہ بہت کم افراد کو باہر نکلنے کا موقع مل سکا۔ جلتے ہوئے تیل کے سبب حویلی کے چار پانچ نواحی مکانوں میں بھی آگ بھڑک اٹھی۔ مقامی آبادی نے اپنے طور پر آگ پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن انہیں بُری طرح ناکامی ہوئی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اچانک بھڑکنے والی اس آگ میں حملہ آوروں میں سے بھی ایک یا دو افراد جاں بحق ہوئے ہیں۔ قریباً تمام لاشیں اس بُری طرح جل چکی ہیں کہ ان کی شناخت ناممکن ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ چھوٹے چوہدری فاخر مہر کی لاش حویلی سے قریباً تین سو گز دور کھیتوں

سے ملی ہے۔ لاش علی الصبح دریافت ہوئی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ فائرنگ میں زخمی ہونے کے بعد انہوں نے حملہ آوروں سے جان بچانے کی کوشش کی لیکن کھیتوں تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیا۔

خوش قسمتی سے سانحے کے وقت چوہدری مہر کی بڑی بہو اور ان کے دو بچے حویلی میں موجود نہیں تھے۔ مزید تفصیلات موصول ہو رہی ہیں۔ شانی نے ایک بار پھر زار و قطار رونا شروع کر دیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی آہ و زاری میں شدت آتی گئی۔ مجبوراً رستم نے ایک بار پھر اسے نیند کی دوا دے دی۔ وہ اگلے روز سہ پہر کے وقت بیدار ہوئی۔ وہ چار پائی پر تھی۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ سرما کی سنہری دھوپ کھڑکی کی درزوں سے چھن کر اندر آرہی تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں رستم جائے نماز پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال اس کے چہرے پر جھول رہے تھے۔ وہ بالکل بے حرکت تھا۔

وہ بھی بے حرکت لیٹی رہی اور سوچتی رہی۔ یہ سب کیا ہوا تھا؟ کیسے ہو گیا تھا؟ اتنا بڑا سانحہ؟ اتنا بڑا واقعہ؟ اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ موت کے جبروں سے زندہ نکل آئی ہے۔ وہ جب معمول کی مٹھی چا پی کرنے مہر کے کمرے میں داخل ہوئی تھی اسے کیا پتا تھا کہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے۔ اب مہر نہیں تھا۔ اس کے بیشتر خونخوار غنڈے بھی نہیں تھے وہ بھی نہیں تھا جس کی خواہش پوری کرنے کے لئے شانی نے چاندرات کو چوڑیاں پہنی تھیں اور ہاتھوں پر مہندی رچائی تھی..... اور تو اور وہ خود بھی نہیں تھی۔ اخباری خبروں اور دنیا کی نظروں میں تو وہ بھی حویلی کے چوبیس مہینوں کے ساتھ ہی جل کر کوئلہ ہو چکی تھی۔

وہ لیٹی رہی اور سوچتی رہی۔ مستقبل کیا ہوگا؟ کیا وہ اپنی دنیا میں واپس جاسکتی ہے؟ اور پھر ”اپنی دنیا“ تھی بھی کہاں؟ اب کون تھا اس کا پیچھے؟ کوئی نہیں تھا اور اگر کوئی تھا بھی..... تو اس تک پہنچنے کے لئے شانی کو نار پور والوں کی دشمنی کا زہریلا دریا پار کرنا تھا۔ نہیں نہیں وہ واپس نہیں جاسکتی۔ اس کے دل کے اندر سے یہ آواز ایک پکار بن کر ابھری۔ گزرے ہوئے واقعات پیچھے چنگھاڑتے تصورات کا روپ دھار کر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ ایک سوال رہ رہ کر اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ فاخر کے گولیاں لگنے کے بعد بالکل آخری لمحوں میں رستم اچانک وہاں کیسے پہنچ گیا۔ کیا اسے کسی نے خبر دی تھی یا کوئی اتفاق عین وقت پر اسے وہاں کھینچ لایا تھا۔ اگر کچھ دیر بھی رستم وہاں نہ پہنچا ہوتا تو یقیناً شانی بھی اس دنیا میں نہ ہوتی۔ شانی کو محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے عقاب کی سی جھپٹ کے ساتھ اسے بچایا ہے۔

باہر سے کسی نے رستم کو آواز دی اور وہ دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر جائے نماز سے اٹھ گیا۔ رستم کے باہر جانے کے بعد بھی شانی اپنی جگہ گم صم لیٹی رہی۔ اس کی آنکھیں ہولے ہولے برستی رہیں۔

اچانک ایک بار پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ شانی نے نیم غنودگی کے عالم میں دیکھا کہ کوئی عورت ہاتھ میں گلاب اور گیندے کا گلہستہ لئے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے یہ چھوٹا سا گلہستہ الماری کے اوپر شیشے کے بڑے گلاس میں رکھا اور شانی کی طرف مڑی۔ یہی وقت تھا جب شانی نے اس کی صورت دیکھی۔ شانی بُری طرح چونک گئی۔ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی کی دھند ایک دم ہی چھٹ گئی تھی۔ اس نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ نگاہیں بدستور عورت کے چہرے پر تھیں۔ یہ عورت کوئی اور نہیں گنبد تھی۔

گمینہ سے شانی کی پہلی اور آخری ملاقات عید سے چند روز پیشتر ہوئی تھی پھر فخر آ گیا تھا اور گمینہ خوف زدہ انداز میں شانی کو الوداع کہہ کر چلی گئی تھی۔ آج ایک بار پھر وہ اس کے سامنے تھی۔ اس کی پیشانی اور ٹھوڑی پر چند روز پرانی چوٹوں کے نشان تھے۔ گمینہ آنکھوں میں آنسو لے کر شانی سے لپٹ گئی اور کتنی ہی دیر تک سسکتی رہی۔ ”تم یہاں کیسے گمینہ؟“ شانی نے اشک بار لہجے میں پوچھا۔ گمینہ ہینگلی آنکھوں کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اس روز میں آپ کو خدا حافظ کہہ کر چلی گئی تھی ناں۔ پر میں حویلی سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔“

”باہر نہیں جاسکتی تھیں؟“ شانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”آہو چوہدرانی جی! گیٹ سے باہر نکلنے سے پہلے ہی وڈے چوہدری کے نوکروں نے مجھے روک لیا تھا۔ ان کو شک پڑ گیا تھا کہ میں کسی چکر میں یہاں آئی ہوں۔ وہ مجھے پکڑ کر کچھڑی داڑھی والے منشی رشید کے پاس لے گئے۔ منشی رشید نے بھی مجھے شک کی نظروں سے دیکھا اور چوہدری مہر کے پاس لے گیا۔ چوہدری مہر نے کہا کہ اس کو ابھی حویلی میں رکھو اور پوچھ گچھ کرو۔“

میں تین روز تک حویلی میں ہی رہی جی۔ وہ مجھے مارتے کوٹتے رہے اور دھمکیاں دیتے رہے۔ وہ میرے منہ سے کچھ اگلوانا چاہتے تھے۔ پر میں نے بھی اپنے سر کے سائیں کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لفظ بول کر نہیں دیا چوہدرانی جی! ایک لفنگے پہرے دار نے مجھے بے عزت کرنے کی دھمکی بھی دی پر اللہ سوہنے کا شکر ہے کہ وہ دھمکی ہی رہی۔ نہیں تو گمینہ نے آپ مر جانا تھا اور اس کتے کی ٹانگیں بھی چیر دینا تھیں۔“

شانہ نے یہ سب کچھ حیرت سے سنا۔ ”پھر تم وہاں سے نکلیں کیسے؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے تو آپ نے نکالا جی۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے شام کے بعد آپ کو مہر کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا تھا جی..... میں بڑی دیر تک انتظار کرتی رہی کہ آپ باہر نکلیں گی۔ پر آپ تو نکلی ہی نہیں۔ میرے دل میں کچھ کچھ ہونے لگا۔ اماں حاجن سیانی کے صدقے اللہ سوہنے نے میرے دل میں ڈالا کہ آپ کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میرا اشک ٹھیک نکل آیا۔ مجھے آپ کی مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ ایسے لگا کہ آپ کسی کومد کے لئے بلارہی ہیں۔ ساتھ ہی میں نے ایک نوکرانی کو بھی دیکھا جو گھبرائی ہوئی مہر کے کمرے سے نکلی تھی۔“

بس جی! اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ..... سچے عشق کی دین ہے یا پھر اماں سیانی کا فیض ہے۔ اللہ سوہنے نے مجھے ہمت دی اور میں نے کچھ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے تین دن تو مجھ پر سخت پہرا رہا تھا پر چاند رات کو کوئی ایسی خاص نگرانی نہیں تھی۔ منشی رشید نے مجھ سے کہا تھا کہ عید کے دن مجھ کو چھوڑ دیں گے۔ پر میں ان کے چھوڑنے سے پہلے ہی حویلی سے نکل آئی۔ رکھوالی والے بڑے بڑے کتے ابھی بندھے ہوئے تھے۔ گیٹ پر پہرے دار باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب سے نکل کر گئی میں آگئی۔ یہاں اندھیرا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتی پنڈ کے چھپر کی طرف چلی گئی۔ یہاں ایک تانگے والا کھڑا تھا۔ میں نے اس کی منت کی اور وہ مجھے سیدھا حاجی حیات خان کے ڈیرے پر لے گیا۔

حیات خان شہر گیا ہوا تھا۔ رستم ڈیرے کے برآمدے میں چادر تانے سو رہا تھا۔ میں نے اس کو جگایا اور بتایا کہ مہر کی حویلی میں چھوٹی چوہد رانی سخت مصیبت میں ہے۔ رستم نے ایک سیکنڈ نہیں لگایا اور اپنی جیب کی طرف دوڑ پڑا۔

شانی سب کچھ خاموشی سے سن رہی تھی۔ آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔ گمینہ خاموش ہوئی تو وہ آزرہ لہجے میں بولی۔ ”مجھے کیوں بچایا تم لوگوں نے؟ مر جانے دیا ہوتا مجھ کو۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں چوہد رانی جی! آپ کو اللہ سونے نے بچایا ہے۔ وہ آپ کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے۔ آپ اس لئے زندہ ہیں کہ یہ اللہ سونے کی مرضی ہے اور شاید.....“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی پھر ذرا ہمت کر کے بولی۔ ”اور شاید اس میں رستم کے پاک عشق کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ سچا عاشق ہے چوہد رانی جی۔ اماں سیانی کہتی تھیں وہ سچا عاشق ہے۔ ایسا عشق کیا نہیں جاتا خود بخود ہو جاتا ہے۔ ایسے عشق میں کچھ لیا نہیں جاتا بس دیا ہی جاتا ہے اور جب بندے کا دھیان لینے کی طرف نہیں ہوتا اللہ سونے کا دھیان دینے کی طرف ہو جاتا ہے۔ دیکھیں اللہ سونے نے آپ کو جلتی بلتی حویلی کے اندر سے زندگی دی اور کس طرح دی۔ اماں سیانی کی ساری باتیں صحیح ہوتی ہیں۔“

شانی جیسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ اس کا سر گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا اور جسم ہچکیوں سے مل رہا تھا۔

گمینہ..... اماں حاجن سیانی کی عقیدت مند..... شانی کے پاس بیٹھی رہی اور آہستہ آہستہ شانی کی پشت پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ اس کے چاندی کے کڑے کلائیوں میں گنگنائے رہے۔

”اچھا چوہد رانی جی! آپ لیٹ جائیں۔ میں آپ کے لئے چائے بنواتی ہوں۔“

شانی لیٹ گئی۔ وہ باہر چلی گئی۔

پندرہ بیس منٹ بعد پھر آہٹ ہوئی۔ اس مرتبہ اندر آنے والا رستم تھا۔ اس نے سمجھا کہ شاید شانی سو رہی ہے۔ وہ باہر جانے کے لئے پلٹا لیکن شانی کے جسم میں حرکت دیکھ کر رک گیا۔

”بی بی! آپ جاگ رہی ہیں؟“

”ہاں۔“ شانی نے غنودگی سے بوجھل آواز میں کہا۔

”اچھا میں آپ کے لئے چائے لاتا ہوں۔“

شانی کے منع کرنے کے باوجود وہ باہر چلا گیا اور چائے لے آیا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر پیٹی بندھی تھی۔ یقیناً یہ چوٹ حویلی کے خون ریز واقعات کی نشانیوں میں سے ایک تھی۔

شانی نے بڑی خاموشی کے ساتھ چائے پی۔ اس کے سر کا بھاری پن قدرے کم ہو گیا تھا۔ اس دوران میں رستم اس کے آس پاس ہی موجود رہا تھا۔ اس کا ”بی بی“ کہنے کا انداز وہی تھا جو شانی کے کانوں کے راستے روح میں اترتا تھا اور اسے جھنجھوڑ دیتا تھا۔ وہ رستم کے اس انداز سے بچتا تھا جتنی بھی لیکن بچ نہیں سکتی تھی۔ پتا نہیں کہ رستم کا لہجہ کیا بھردیتا تھا اس لفظ میں کہ یہ لفظ نہیں رہتا تھا ایک دل گداز اور اشک بار کہانی بن جاتا تھا۔

کچھ دیر بعد حوالدار کی بیوی آ گئی۔ وہ ایک سمجھ دار گھریلو عورت نظر آتی تھی۔ وہ شانی سے کھانا کھانے کا اصرار کرتی رہی، مگر شانی کو بالکل بھوک نہیں تھی۔

اسی دوران میں ایک اور ادھیڑ عمر عورت بھی اندر آ گئی۔ وہ دیہاتی انداز میں سفید قمیص اور نیلا تہبند پہنے ہوئے تھی۔ اس کی گود میں ڈیڑھ دو سال کی پیاری سی بچی تھی۔ رورو کر عورت کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھ سے شانی کے سر پر بار بار پیار دیا اور چار پائی کے ساتھ ہی پیڑھی ڈال کر بیٹھ گئی۔

شانی نے حوالدار کی بیوی سے پوچھا ”یہ کون ہیں؟“

وہ بولی۔ ”یہ رستم کی رشتے دار ہیں۔ رستم کی خالہ زاد بہن کی ساس۔“

”بہت دکھی لگ رہی ہیں۔“

”چاندرات کو چوہدری مہر کی حویلی میں جو آگ لگی تھی اس میں ان کی بہو بھی جل گئی تھی۔“ حوالدار کی بیوی نے کہا۔

شانی کے چہرے پر غم کے سائے اور گہرے ہو گئے۔ ”وہ وہاں کیسے گئی تھی؟“

ادھیڑ عمر عورت رونے لگی۔ حوالدار کی بیوی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ بولی۔ ”بس۔ اس نصیبوں جلی کی تقدیر وہاں لے گئی۔ خدا کا قہر ہوتا

ہے۔ مہر اور اس کی حویلی ایسے ہی تو کونکہ نہیں بن گئی۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ شانی نے کہا۔

”ہمارا اندازہ تو یہی ہے جی کہ اس نصیبوں ماری کو مہر کے غنڈوں نے اغوا کر لیا تھا۔“ ادھیڑ عمر عورت نے روتے ہوئے کہا۔ ”ہم چار دن

تک پاگلوں کی طرح اس کو ڈھونڈتے رہے۔ عید کے دن حویلی سے نکلنے والی لاشوں سے اس کی لاش نکلی۔ میرے پتر نے اسے ہاتھوں کے کڑوں

سے پہچانا۔“

ایک ایک شانی کو اپنے جسم میں تیز سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا نام تھا آپ کی بہو کا؟“

”گنبد۔ ہم اسے گنبد کہتے تھے۔ وہ بہو نہیں تھی جی، دھی تھی میری۔“ عورت نے روتے ہوئے کہا۔

شانی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ عورت کیا کہہ رہی ہے۔ وہ پتھرائی نظروں سے اسے دیکھتی چلی

گئی پھر اس کے ہونٹوں سے ٹوٹی پھوٹی آواز نکلی۔ ”آپ..... آپ کس گنبد کی بات کر رہی ہیں؟ وہ جو..... رستم کی خالہ زاد ہے؟“

”آہو چوہدرانی جی! آپ جانتی تھیں اس کو؟“ ادھیڑ عمر عورت قدرے حیرت سے بولی۔

”ہاں..... نن..... نہیں.....“ شانی ہکا کر چپ ہو گئی۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اسے لگا کہ خواب آور دواؤں کا اثر ابھی ذہن پر باقی ہے۔ وہ پتھرائی نظروں سے ارد گرد دیکھنے لگی۔ ابھی قریب ایک گھنٹہ پہلے..... گنبد

یہاں اس کے سامنے موجود تھی اور اب یہ دونوں عورتیں کہہ رہی تھیں کہ وہ حویلی میں مر گئی ہے۔ اس نے کوئی ڈراؤنا پسند نہ کیا تھا یا یہ عورتیں بے خبری

کے اندھیرے میں تھیں۔

شانی کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے بستر پر بیٹھے بیٹھے دیوار سے ٹیک لگالی۔

ادھیر عمر عورت شانی کی حالت سے بے خبر کہہ رہی تھی۔ ”یہ میری گود..... میں اس بہشتن کی چھوٹی دھبی ہے جی۔ اس سے ایک سال بڑا

<http://kitaabgghar.com>

ایک پتر ہے۔ وہ اپنے پیو کے پاس ہے۔ رورو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ پیو اسے بہلانے کے لئے لے گیا ہے۔“

یہ سب کیا تھا؟ کیا ہو رہا تھا؟ شانی نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تو لگا کہ اندر کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ گیند کی شبیہ

تصور میں ابھر آئی۔ وہ اپنے چوڑے رخساروں اور سوئی سوئی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک اجلی سی خوبصورت

روشنی تھی۔ کہیں پاس کے مکان میں ریڈیو بج رہا تھا۔ آواز شانی کی سماعت سے ٹکرانے لگی۔

کتاب گھر کی پیشکش

بھلیا اسام مرتنا ہیں۔

<http://kitaabgghar.com>

<http://kitaabgghar.com>

گور بیا کوئی ہو..... گور بیا کوئی ہو

(ہم مکر بھی زندہ رہیں گے۔ قبر میں ہماری جگہ کوئی اور ہے۔ ہماری جگہ کوئی اور ہے)

شانی نے گھٹی ہوئی آواز میں حوالدار کی بیوی کو مخاطب کیا اور بولی۔ ”رستم کہاں ہے؟“

کتاب گھر کی پیشکش

”وہ باہر گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں آ جاتا ہے۔ تمہیں کچھ چاہئے تو نہیں دھی رانی؟“

<http://kitaabgghar.com>

<http://kitaabgghar.com>

”نن..... نہیں..... میں بس ذرا لیٹنا چاہتی ہوں۔“

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔“ شانی نے جھوٹ بولا۔ اس کا سر بے طرح چکر رہا تھا۔

دونوں عورتیں باہر نکل گئیں۔ شانی پسینے میں تر سوچنے لگی۔ یہ کیا ہوا ہے؟ کیا واقعی اس نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا ہے۔ اس

کے دماغ پر ابھی تک ٹریکولائزر کی غنودگی موجود تھی۔ کیا اس غنودگی نے اسے کوئی انہونا منظر دکھایا ہے۔

پھر یکا یک اس کی نگاہ ایک چیز پر پڑی اور پورے جسم پر چیونٹیاں سی ریگ گئیں۔ دل سینے میں یکبارگی پھڑک کر رہ گیا۔

کمرے کے دائیں گوشے میں الماری کے اوپر شیشے کے گلاس میں گلاب اور گیندے کا جھوٹا سا گلستہ موجود تھا۔

”اوہ میرے خدا.....!“ اس نے سردونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بے دم ہی ہو کر لیٹ گئی۔

☆=====☆=====☆

رات کا وقت تھا۔ کمرے میں بلب کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں کے کھیتوں سے آوارہ کتوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ شاید کوئی راہ

گیر گھڑسوار ہوگا جس کے پیچھے یہ خدائی فوجدار بھاگ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے ان کا شور معدوم ہو گیا..... خاموشی چھا گئی۔ بس دور کہیں کسی

کاشتکار کے ڈیرے پر ڈیزل انجن کی کوکوسنائی دیتی رہی۔ کمرے میں شانی اور رستم کے سوا کوئی نہیں تھا۔

شانی ادھ کھلی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ آنکھوں میں تھیر اور الجھن کی بہت گہری پرچھائیاں تھیں۔ اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں

کہا۔ ”رستم! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں؟“
”پوچھیں بی بی۔“

”چاند رات کو جو بلی میں آگ لگنے سے پہلے تم اچانک وہاں کیسے پہنچ گئے۔ کیا تمہیں پتا تھا کہ وہاں یہ سب کچھ چل رہا ہے؟“
رستم نے عجیب نظروں سے شانی کو دیکھا پھر اس نے سر جھکا لیا۔ کالے بالوں میں لمبی لٹیں اس کے رخساروں پر جھونے لگیں۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ ان لمحوں میں وہ سچ مچ کوئی جوگی نظر آنے لگا تھا۔ کھڑکی سے باہر نیم اور ہیری کے سائے پُراسرار انداز میں لہرا رہے تھے۔ رستم نے حسبِ عادت زمین پر نگاہیں جمائے ہوئے پوچھا۔ ”بی بی! آپ مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

شانی نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہوا ہے کہ..... میں بالکل چکر لگئی ہوں۔ مم..... میرا دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہا۔“

رستم سوالیہ نظروں سے شانی کا چہرہ تک رہا تھا۔

”رستم! کیا تمہیں انہونی باتوں پر یقین ہے؟ کیا تم..... میرا مطلب ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ بندہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ سکتا ہے یا کوئی ایسی حقیقت جو خواب کی طرح لگے.....“

رستم کے چہرے کی ہجانی کیفیت کچھ اور بڑھ گئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ اس نے یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں شانی کی جانب دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”بی بی! کہیں..... وہ..... آپ کے پاس بھی تو نہیں آئی؟“
”کک..... کون؟“

”گلیزہ!“

شانی کا نپتی آواز میں بولی۔ ”ہاں..... ہاں آئی تھی۔ مم..... میں یہی تو تم سے پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ وہ کہاں ہے..... وہ..... حوالدار کی بیوی اور دوسری عورت تو کہہ رہی ہے کہ..... وہ مر گئی ہے لیکن وہ تو یہاں آئی تھی..... یہاں.....“ شانی نے زور دے کر کہا۔

یوں لگا جیسے رستم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ”بی بی! ہماری اماں سیانی کہا کرتی تھیں۔ کچھ باتوں کو پہلے ماننا پڑتا ہے ان کی سمجھ بعد میں آتی ہے۔ اس دنیا میں بہت کچھ ایسا ہے جو ہماری عقل مت سے بالکل باہر ہے۔“

شانی کے جسم پر کچھ طاری ہو گئی تھی۔ ”رستم! کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ کیا.....؟“
”ہاں بی بی! گلیزہ مر چکی ہے۔ میں نے خود دیکھی ہے اس کی لاش..... لیکن میں نے اسے زندہ بھی دیکھا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شانی دہشت سے کراہی۔
”جس طرح وہ آپ سے ملی ہے اسی طرح مجھ سے بھی ملی تھی اور جس وقت وہ ملی تھی اسے مرے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔“

شانی کا منہ کھلا تھا۔ وہ رستم کی جانب دیکھتی چلی گئی۔ رستم بولا۔ ”اب سے پہلے میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بتاتا تو کوئی مانتا نہیں۔ میرا مذاق اڑایا جاتا لیکن میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔ اس لئے کہ آپ کے ساتھ بھی وہی ہوا جو میرے ساتھ ہوا۔ وہ آپ سے بھی ملی ہے یہ بات ماننے والی نہیں لیکن یہ بات ہوئی ہے۔“

شانی ساکت بیٹھی رہی۔ کھڑکی سے باہر نیم اور پیری کے پیڑوں کے سائے جھومتے رہے۔ شانی نے اپنے جسم کے گرد لپٹی چادر کو مضبوطی سے تھام لیا، جیسے اس کا سہارا لینا چاہتی ہو۔ رستم نے کہنا شروع کیا۔ ”چاندرات کو میں حیات خان کے ڈیرے پر تھا۔ حیات خان لاہور گیا ہوا تھا۔ میں عشاء کی نماز پڑھ کر کمرے میں سو گیا۔ اچانک کسی نے مجھے ہلا کر جگایا۔ میں نے آنکھیں ملے ہوئے دیکھا، وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ بلب کی روشنی میں اس کا وہ تعویذ چمک رہا تھا جو کچھ دن پہلے اماں سیانی نے اسے دیا تھا۔ میں نے کہا گینے ٹو یہاں؟“ وہ بولی۔ ”میرے پاس سوال جواب کا وقت نہیں۔ میرے ساتھ چلو۔ چھوٹی چوہدرانی کی جان سخت خطرے میں ہے۔“

میں اس کے ساتھ جیپ میں آ بیٹھا اور جیپ پوری رفتار سے حویلی کی طرف دوڑادی۔ میرا گونگا ساتھی مختار بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ راستے میں مجھے بتاتی رہی کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ کس طرح چوڑیاں بیچنے والی کاروبار میں آپ کو دیکھنے پہنچی تھی لیکن پھر منشی رشید کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے کہا کہ مہر چھوٹی چوہدرانی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس نے اپنے کانوں سے مہر اور اکبرے کی باتیں سنی ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ چھوٹی چوہدرانی کو اس زہریلے سانپ سے ڈسوا دیا جائے جو مہر کی پھلواڑی میں رہتا ہے۔ بعد میں وہ کہہ دیں گے کہ چھوٹی چوہدرانی بار بار منع کرنے کے بعد بھی پھلواڑی میں گئی تھی۔ جہاں اسے شیش ناگ نے کاٹ لیا۔ ان کا یہ منصوبہ کافی پرانا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ چھوٹی چوہدرانی پر بے وجہ پھلواڑی میں جانے کا الزام لگاتے رہے ہیں۔

”میں پوری رفتار سے گاڑی چلاتا رہا۔ ہم صرف آٹھ دس منٹ کے اندر نار پور میں تھے۔ جس وقت میں حویلی میں پہنچا اور جیپ سے نکل کر حویلی کے مین گیٹ کی طرف بھاگا، مجھے گینے کہیں نظر نہیں آئی۔ مجھے یہی لگا کہ وہ ہم سے پہلے جیپ سے نکل گئی تھی۔ گونگے مختار نے گیٹ پر کھڑے دو ہندو کو گولیاں ماریں۔ میں خنجر لے کے اندر گھس گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ کو بتا ہی ہے۔“

رستم نے چند لمحے توقف کیا پھر گھمبیر لہجے میں کہنے لگا۔ ”میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آیا بی بی۔ جو باتیں معلوم ہوئی ہیں ان سے تو یہ بتا چلا ہے کہ..... گینے کو اسی وقت گولی لگ گئی تھی جب وہ میری طرف آنے کے لئے حویلی سے بھاگ رہی تھی۔ ابھی وہ مین گیٹ سے نکلی نہیں تھی کہ پہرے داروں نے اسے دیکھ لیا۔ انہوں نے اسے لٹکا کر اور رکنے کا کہا۔ وہ نہیں رکی۔ پہرے دار انورے نے پیچھے سے گولی چلا دی۔ یہ گولی اس کا سینہ پھاڑ کر نکل گئی اس کی جلی ہوئی لاش بھی حویلی کے اندر سے ہی ملی ہے۔“

رستم چپ ہو گیا۔ رات بھی خاموش تھی اور رات کے سناٹے میں ہر شے بھی جیسے کسی گہرے مراقبے میں چلی گئی تھی۔ تاریکی کے پیش منظر میں کھڑکی کے پٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

شانی کے سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ اماں حاجن سیانی کے بقول عاشق صادق تھا..... اور شانی خود مر جھکائے حیرت کے سمندر میں غرق تھی۔

☆=====☆=====☆

تیسرے روز رات کے وقت حوالدار کے گھر میں ہی شانی اور رستم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

شانے نے نہا کر حوالدار کی بیوی کے کپڑے پہنے تھے۔ یہ کپڑے اسے کافی کھلے تھے..... پھر بھی اچھے لگ رہے تھے۔ اس کے بال بغیر کنگھی کے بھی سنورے سنورے نظر آتے تھے اور جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ ایک کلائی پر چوڑی لگنے کے زخم تھے جو اب مندمل ہو رہے تھے۔ دوسری کلائی پر ایک نیل کا مدھم نشان اب بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ نشان مہر کے حقے کی بے رحم نے کا تھا۔ رستم نے سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں نسواری گرگابی تھی۔ اس کی داڑھی کے بال نرم اور چمکیلے تھے۔ دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔

ماضی کے چند دن جیسے ایک طلسمی دھندلکے میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس دھندلکے میں لپٹا ہوا وہ منظر..... وہ بھی ایک منظر شانی کو بار بار یاد آ رہا تھا جب حویلی کے اندر وہ اکبرے کی گرفت میں تھی اور کوبرا سانپ کا منہ اس کے جسم سے چند انچ کے فاصلے پر تھا تو کیا واقعی اس کو برے کا زہر اس کے اندر اتارا جانا تھا۔ کیا واقعی ایسا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اسے سانپ سے ڈسوا کر پھلجھواری میں پھینک دیا جاتا تو فخر اور بھابھو وغیرہ کو یہ باور کرانا بہت آسان تھا کہ وہ پھلجھواری میں گھسنے کی وجہ سے سانپ کا شکار ہوئی ہے۔ اس صورت حال کے لئے ”زمین“ تو وہ لوگ پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔ مہر کم از کم دوبار شانی پر پھلجھواری میں گھسنے کا الزام لگا چکا تھا.....

کو برے کی دُم کی خوفناک سرسراہٹ اور اس کے کھلے جڑے کا تصور شانی کو پسینے میں تڑپ کر کرنے لگا۔ اسے اپنا سانس رکنا محسوس ہوا۔ رستم نے کھنکار کر شانی کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بولا۔ ”بی بی! ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ پولیس مہر کی حویلی پر حملہ کرنے والوں کو ڈھونڈ رہی ہے اور میں تو پہلے ہی نارپور والوں کی نظر میں بہت کھٹکتا ہوں۔“

”پھر کیا پروگرام ہے تمہارا؟“ شانی نے پوچھا۔

”میں کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ آزاد علاقے میں کئی دوست ہیں۔ چار چھ ماہ وہاں گزار دوں گا“ پھر آئندہ کا سوچوں گا۔ مجھے اصل فکر آپ کی ہے۔“

”میری فکر نہ کرو۔“

”لیکن آپ کہاں جائیں گی؟“

”ابھی تم مجھے کسی طرح گجرات پہنچا دو۔ وہاں شاہد ناؤن میں میری ایک رشتہ دار ہیں۔ دو تین دن وہاں رہوں گی۔ اس دوران میں کچھ

نہ کچھ سوچ لوں گی۔“

وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر آزدگی سے بولا۔ ”میں آپ کے بارے میں بہت سوچتا رہوں گا۔“

”کیوں سوچتے رہو گے۔“ شانی نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”شاید۔ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔“ رستم کے لہجے میں بے ساختگی تھی۔

چند سیکنڈ تک گھمبیر خاموشی طاری رہی تب شانی نے کہا۔ ”رستم! تم سے ایک بات کہوں۔“

”ہاں بی بی۔“

”تم بہت عجیب شخص ہو۔“

”مجھ سے عجیب میری سوچیں ہیں۔“ وہ سر جھکائے ہوئے بولا۔

”تم جانتے ہو ایسی سوچوں کا انجام مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔“

”میں سب جانتا ہوں..... لیکن پھر بھی مجبور ہوں۔ اتنا مجبور کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔“ وہ رواں لہجے میں کہہ گیا۔

شانی کی آنکھوں کے نازک کنارے سُرخ ہو گئے۔ ”تم..... تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی.....“ وہ کہتے کہتے ایک دم

چپ ہو گئی۔

شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی بات کہنے جا رہی ہے۔ اگر وہ فقرہ مکمل کر دیتی۔ کہہ دیتی کہ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی

کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہو تو یہ اس کی شدید اندرونی بے کلی کا اظہار ہوتا جس کا اظہار کسی طور بھی مناسب نہیں تھا لیکن کیا وہ واقعی اس فقرے کو چھپانے

میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے ایک نظر رستم کے چہرے کی طرف دیکھا۔ نہیں..... وہ نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ادھوری بات خود بخود مکمل ہو گئی تھی اور اس

مکمل بات کا عکس رستم کے چہرے پر نظر آنے لگا تھا۔ ہاں..... بات مکمل ہو گئی تھی اور ثبوت یہ تھا کہ رستم کی دونوں پلکوں پر دو آنسو لرزنے لگے تھے۔

وہ تیزی سے مڑی اور آندھی کی طرح کمرے میں داخل ہو گئی۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ

نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ کوئی قوت بے پناہ کشش سے اسے کھینچ رہی تھی۔ یہ ناپیدہ کشش کیا تھی؟ اس کا نام کیا تھا؟ اس کی ماہیت کیا تھی؟

اس کا وجود کیوں تھا؟ اُن گنت سوالات تھے مگر جواب کوئی نہیں تھا۔

ٹھیک دو گھنٹے بعد وہ لوگ حوالدار کے گاؤں سے گوجرانوالہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ حوالدار کے چھوٹے بھائی کے پاس ایک سوزوکی

پک اپ موجود تھی جس پر وہ گاؤں سے دودھ شہر تک پہنچاتا تھا۔ حوالدار واپس لے لی۔ اب وہ انہیں اس پک اپ

پر لے کر جا رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق شانی کو گجرات اُترنا تھا جب کہ رستم کو سرانے عالمگیر پہنچانا تھا۔ سرانے عالمگیر سے اسے بذریعہ بس پشاور روانہ

ہونا تھا۔ پشاور سے آگے کرم ایجنسی کا آزاد علاقہ اس کی منزل تھا۔

حوالدار رضا واپس لے لی۔ اب وہ انہیں اس پک اپ سے سیٹ کر دیتا تھا کہ بظاہر پک اپ کے عقب میں صرف

سامان ہی نظر آ رہا تھا۔ اس سامان سے آگے قریباً ڈھائی فٹ چوڑی ساڑھے چار فٹ لمبی جگہ خالی تھی۔ یہاں ایک گدے پر شانی اور رستم بیٹھے تھے۔

وہ لوگ رات کو قریباً گیارہ بجے روانہ ہوئے۔ پک اپ کی حالت اچھی تھی۔ پہلے کچے راستے کا سفر، پھر نیم پختہ سفر اور آخر میں وہ پکی

سڑک پر آ گئے جو ایک گھنٹے کے اندر انہیں گوجرانوالہ پہنچانے والی تھی۔

دونوں مکمل خاموشی کے ساتھ سفر کر رہے تھے لیکن ان کے ذہن خاموش نہیں تھے۔ وہ اپنے اپنے طور پر مصروف تھے۔ ماضی قریب کے

اندوہناک واقعات ایک فلم کی طرح شانی کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کتنا کچھ ہو گیا تھا اور کتنی جلدی ہو گیا تھا۔ اس کی شادی ہوئی، اس

...

کے پیارے چاچا مشتاق انتقام کی بھینٹ چڑھے۔ اس کا جان سے پیارا بھائی ہمیشہ کے لئے جدا ہوا، پھر باپ بھی جدا ہو گیا اور اب وہ بھی نہیں تھے جنہوں نے شانی کی زندگی کو زہر آلود کیا تھا۔ فاخر اپنے کردار پر پشیمان ہونے کے بعد اور خود کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے بعد بھی مکافاتِ عمل سے بچ نہیں سکا تھا اور مہر جو انسان کے روپ میں ایک سانپ تھا، وہ بھی اپنے سنہلیوں سمیت خاکستر ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ کچھ سانپ اپنے بچوں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ شاید مہر بھی اسی نسل کا سانپ تھا۔ دشمنی کا زہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا کہ اس نے اپنے پوتے کو بھی انتقام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا اور اپنے ہاتھوں سے مار دیا۔

فاخر کے آخری دن شانی کو یاد تھے۔ شانی پر ظلم اور جبر کے پہاڑ توڑنے کے بعد فاخر کی شکست اس کے اندر سے نمودار ہوئی تھی۔ شانی کی عاجزی، ثابت قدمی اور غیر معمولی قوت برداشت نے فاخر جیسے پتھر میں گداز پیدا کر دیا تھا اور اسے جھکنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ شانی کے سچے التفات کے لئے یوں تڑپا تھا کہ اس کی ساری آن بان شانی کے قدموں میں نچھاور ہو گئی تھی۔

ہاں نارپور جیت کر بھی ہار گیا تھا اور رنگ والی ہار کر بھی جیت گئی تھی۔ شانی ان واقعات کے بارے میں سوچتی رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رستے رہے۔ تب اس کا دھیان ایک بار پھر نگینہ کی طرف چلا گیا۔ نگینہ کا خیال آتے ہی اسرار اور تحیر کی ایک ناقابلِ بیان لہر شانی کے رگ و پے میں پھیل جاتی تھی۔ اسے اس اسرار کا ہر لہر یاد تھا۔ وہ کیا معمہ تھا؟ وہ کیا پہیلی تھی؟ وہ کئی دن گزرنے کے باوجود سمجھ نہیں پاتی تھی۔ وہ زیادہ سوچتی تھی تو ذہن ماؤف ہو جاتا تھا۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر حوالدار کی بیوی یا رستم کے پاس چلی جاتی تھی۔ ایسے میں اس کا دل بے پناہ تیزی سے دھڑکتا تھا۔

کیا وہ جاگتی آنکھوں کا خواب تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر یہی ”جاگتا خواب“ رستم کو کیوں نظر آیا تھا؟ وہ جس حلیے اور جس انداز میں رستم کو دکھائی دی، بعین اسی حلیے اور انداز میں شانی سے ملی۔ اس نے جو باتیں رستم سے کیں۔ انہی باتوں کا عکس شانی کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں نظر آیا۔

بے شک جب شانی نے اسے دیکھا شانی غنودگی میں تھی۔ رستم نے بھی اسے نیند سے بیدار ہو کر غنودگی کی حالت میں دیکھا تھا لیکن رستم کی غنودگی تادیر نہیں رہی تھی۔ وہ تو نگینہ کے ساتھ جیب میں بیٹھا تھا، کئی میل کا سفر کر کے نارپور پہنچا تھا۔ اس دوران میں وہ اس کے عقب میں بیٹھی باتیں کرتی رہی تھی۔

شانی نا سمجھ بنی نہیں تھی۔ وہ حقیقت اور وہاں کے کافرق جانتی تھی۔ وہ خوابیدہ کیفیت میں ضرور تھی مگر اس کے حواس تو مختل نہیں تھے وہ دیوانگی کا شکار بھی نہیں تھی وہ جانتی تھی اس نے نگینہ کو دیکھا ہے۔ اس کا لمس محسوس کیا ہے اور اس سے باتیں کی ہیں۔ اور یہ سب کچھ..... یہ سب کچھ اس وقت ہوا ہے جب نگینہ کو مرے ہوئے دو دن ہو چکے ہیں۔

رستم کی آواز نے شانی کو پریشان خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ پک آپ کے اندر اس سے صرف ڈیڑھ دو فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ ”بی بی! ہم گجرات پہنچنے والے ہیں۔“

شانی چونک گئی۔ ایک دم اسے جھٹکا سا لگا۔ سوچوں میں ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ وہ دور ہا قریب آ رہا تھا جہاں سے انہیں جدا ہو جانا تھا پھر شاید زندگی میں کبھی ملاقات ہونا تھی یا نہیں۔

شانی کچھ دیر سوچتی رہی۔ تب اس نے کوشش کر کے اپنے لہجے میں ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت پیدا کی اور بولی۔ ”رستم میری ایک بات مانو گے؟“

”بی بی! آپ کی زبان سے نکلا ہوا لفظ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔“

”تم شادی کر لینا۔“ شانی نے اچانک کہا۔

رستم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اندھیرے کے باوجود شانی کو لگا کہ رستم کا سارا جسم سر تا پا کانپ گیا ہے۔

چند لمحے کے توقف سے اس کی آواز ابھری۔ ”بی بی! اتنی کڑی سزا کیوں دے رہی ہیں مجھے؟ میں نے آپ سے کچھ مانگا تو نہیں۔ مانگنا تو دور کی بات ہے، میں نے تو آپ سے کبھی کوئی امید بھی نہیں لگائی۔ امید تو وہاں ہوتی ہے جہاں خواہش ہوتی ہے۔ میری کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں تو بس اسی طرح رہنا چاہتا ہوں جس طرح ہوں۔“

”کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی باقی کی زندگی خود کو تمہارا گناہ گار سمجھتی رہوں۔ یہ سوچتی رہوں کہ میری وجہ سے کوئی اپنی زندگی برباد کر رہا ہے۔“

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ اس کے موتیوں سے دانت نیم تاریکی میں چمک گئے۔ ”بی بی! آپ اسے زندگی برباد کرنا سمجھتی ہیں۔ آپ تو بہت سمجھ دار ہیں بی بی! آپ ایسی بات کیوں کر رہی ہیں؟ میری زندگی برباد نہیں ہے۔ یقین کریں میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔ میرے دل کے اندر آپ کی ذات کی وجہ سے جو روشنی پیدا ہوئی ہے وہ دنیا کی قیمتی ترین شے ہے۔“

”نہیں رستم! تم خود کو دھوکا دے رہے ہو۔ تمہیں خود پتا نہیں کیا کر رہے ہو۔ تم ساری زندگی کانٹوں پر گزارنا چاہتے ہو، کس لئے.....؟ کسی صلے کی تمنا کے بغیر اتنی لمبی اذیت کوئی نہیں جھیل سکتا۔ تمہیں پتا ہو یا نہ ہو پر صلے کی تمنا تمہارے اندر کہیں گہرائی میں ضرور ہوگی۔ میں اس تمنا کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ میں اس خیال کے ساتھ نہیں جی سکتی کہ کوئی میری وجہ سے تباہ ہے۔“ شانی کے لہجے میں وہی فطری محبت بول رہی تھی جو کسی ذی روح کو دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

ایک ایک رستم کا لہجہ گھمبیر ہو گیا۔ وہ بوجھل آواز میں بولا۔ ”بی بی! آپ اپنے اور میرے تعلق کی توہین کر رہی ہیں۔ آپ نہیں سمجھتیں کہ آپ کے لئے میرے اندر کیا ہے۔ آپ بالکل نہیں سمجھتیں۔ اگر..... اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں آپ سے سچا اور پاک عشق کرتا ہوں تو یہ ایک گھسا پٹا لفظ ہوگا۔ میرے اندر جو کچھ ہے وہ ان لفظوں سے بہت اونچا ہے..... میں آپ کو کیسے بتاؤں..... کس طرح بتاؤں کہ میں آپ کے بغیر بھی اتنا ہی خوش ہوں جتنا آپ کے ساتھ ہو سکتا ہوں۔“ آخری لفظ کہتے کہتے رستم کے لہجے میں قرونوں کی لاچاری اور بے بسی سمٹ آئی۔

شانی نے بے ساختہ اپنے سامنے بیٹھے انوکھے شخص کو دیکھا۔ اس کے ”کم گوشت“ چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔ جیسے سونا کسی بھٹی میں پک کر کندن ہو گیا ہو۔ ان لمحوں میں اسے لگا کہ وہ اس شخص کو ہزار ہا سال سے جانتی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کو اس کی ایک ایک ادا کو پہچانتی ہے۔ کون تھا یہ شخص؟ شانی کے ابا جی کہا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی شخص کو دیکھ کر ہمیں لگتا ہے کہ اسے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔ بہت اچھی طرح جانا ہوا ہے۔ حالانکہ ہم اس سے پہلی بار مل رہے ہوتے ہیں۔ پتا ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہم سب عالم ارواح میں تھے۔ یہ اسی عالم کی شناسائیاں ہیں جو ہمیں یہاں نظر آتی ہیں۔

تو کیا اس بچکولے لکھاتی پک آپ میں اس کے سامنے بیٹھا ہوا یہ شخص بھی اسی عالم ارواح کی شناسائی ہے؟ شانی نے عجیب کرب کے عالم میں سوچا۔

اچانک پک آپ ایک دھچکے سے رک گئی۔ یہ جی ٹی روڈ تھی۔ آگے پیچھے تاریکی تھی۔ بس گاڑیوں کی روشنیاں تھیں جو آہستہ آہستہ قریب آتی تھیں اور پھر لپک کر ان کے پاس سے گزر جاتی تھیں۔

”کیا ہوا رضا؟“ رستم نے پکار کر پوچھا۔

”لگتا ہے کہ بیلٹ ٹوٹ گئی ہے۔“ اگلے کیبن سے حوالدار رضا کی آواز آئی۔

”سیلف مار کر دیکھو۔“

”اوپس رستم بھائی۔ اگر ٹائمنگ بیلٹ ہوئی تو انجن کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔“

”نہیں۔ ٹائمنگ بیلٹ نہیں ہے۔“ رستم نے یقین سے کہا۔ ”تم سیلف تو مارو۔“

رضانے دو چار دفعہ سیلف مارا لیکن گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ مجبوراً رستم کو سامان ہٹا کر باہر نکلتا پڑا۔ شانی وہیں بیٹھی رہی۔ پک آپ کے اگلے حصے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ رستم اور رضا خرابی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے پھر وہ دونوں پک آپ کو دھکیل کر نیچے نشیب میں لے گئے۔ پک آپ درختوں کے درمیان پہنچ کر رک گئی۔ سڑک اب قدرے بلندی پر چالیس پچاس گز دور نظر آ رہی تھی۔

یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ خنک ہوا چل رہی تھی۔ رستم نے شانی کو بتایا کہ پک آپ خراب ہو گئی ہے۔ رضا بس پر بیٹھ کر مکینک کو لینے جا رہا ہے۔

”اوہ خدایا۔ کتنی دیر لگے گی۔“ شانی نے کہا۔

”یہ تو مکینک کے آنے پر ہی پتا چلے گا۔“

”ایک ڈیڑھ گھنٹہ۔“ شانی نے پوچھا۔

”شاید..... یا شاید اس سے زیادہ۔ لگتا ہے قدرت کو ہمارا تھوڑا سا ساتھ اور منظور ہے۔“ پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”میں ادھر باہر ہی بیٹھتا ہوں۔ آپ تھک گئی ہوں گی۔ لینے کی کوشش کریں۔“

”نہیں۔ میں بھی باہر ہی آ جاتی ہوں۔“ شانی نے کہا۔

پتا نہیں کیا بات تھی۔ گمینہ والے واقعے کے بعد سے اسے تنہائی اور تاریکی ڈرانے لگی تھی۔ اس نے کبھی خلاف عقل باتوں پر یقین نہیں کیا۔ اس کی شخصیت میں غیر معمولی اعتماد و استحکام تھا۔ اپنے خاندان میں وہ باہمت مشہور تھی اور اس کی ہمت میں یقیناً اب بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی لیکن یہ ”وارد خوف“ بھی اپنی جگہ حقیقت تھا۔

رستم نے سامان ہٹانے میں شانی کی مدد کی اور وہ رکوع کے بل جھک کر پک آپ سے باہر نکل آئی۔ دونوں پک آپ کے قریب ہی ہموار گھاس پر بیٹھ گئے۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور اس کے عکس میں کچھ فاصلے پر ایک وسیع پانی جھلملاتا نظر آ رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”یہ چناب ہے بی بی۔“

مختصر جواب کے بعد رستم خاموش ہو گیا۔ شانی بھی خاموش تھی۔ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ قریباً دو سو گز دور چناب بھی خاموشی میں ان کا شریک رہا اور بے آواز بہتا رہا۔ بلندی پر جی ٹی روڈ جاگ رہی تھی۔ گاڑیوں کے تیز رفتار ناز تار کول پر رگڑ کھا کر عجب ڈراؤنی آواز پیدا کرتے تھے۔ خاموشی طویل ہو گئی تو شانی کو الجھن ہونے لگی۔ ”کوئی..... بات کرو رستم!“

رستم نے گہری سانس لے کر سامنے چناب کی طرف دیکھا اور کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ”بی بی! یہ پانی سچی محبتوں کا گواہ ہے۔ سچی محبتیں جن کا انجام وچھوڑا ہوتا ہے۔ اسی پانی میں سوئی اور مبینوال ڈوبے تھے ناں۔ شاید انہی کیکروں میں کہیں مبینوال کی جھونپڑی ہوگی۔ شاید رات کا ایسا ہی پہر ہوتا ہوگا جب سوئی گھر سے پر تیرنے کے لئے نکلتی تھی۔“

رستم کی بات نے ایک دم ہی ارد گرد کا مفہوم بدل دیا۔ چاندنی میں چمکتا چناب محبت کا دریا بن گیا۔ شانی کی ساعت سے سوئی کی آواز نکلنے لگی۔ مبینوال کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ کچھ انوکھی سی کیفیت محسوس کی اس نے۔

وہ بولی۔ ”رستم! سچی محبتوں کی کہانیاں میں نے بھی پڑھی اور سنی ہیں۔ ان کا انجام جدائی ہی کیوں ہوتا ہے؟“

”بس بی بی! یہ قدرت کے کام ہیں۔ کہتے ہیں کہ جدائی سے عشق اور عاشق ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتے ہیں۔“

”کیا تم بھی ایسا سمجھتے ہو؟“

”میرے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے بی بی۔ میں تو بس اپنے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ میں نے..... کسی سے سچا اور پاک عشق کیا ہے۔“

”کیا سچا اور پاک عشق وہ ہوتا ہے جس میں پیار کرنے والے ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔ کبھی ملنے نہیں؟“

”نہیں بی بی! اماں سیانی کہتی تھی، سچا اور پاک عشق وہ ہوتا ہے جس میں جدائی اور ملاپ کا مطلب ایک ہی ہو۔ نہ ملنے سے محبت کم ہوئے وچھڑنے سے کم ہو۔ اماں سیانی کہتی تھی سچے عاشق ویسے تو ایک ہوتے نہیں لیکن اگر کبھی ہو جائیں تو ایک ہو کر بھی عاشق ہی رہتے ہیں۔ اگر ہیرا رانجھا مل بھی جاتے تو حیاتی کی آخری سانس تک ہیرا رانجھا ہی رہتے۔ وہ کہتی تھی پیار کرنے والے کا کام بس یہ ہوتا ہے کہ وہ پیار کرتا جائے۔ میل اور وچھوڑے (جدائی) کے چکروں میں نہ پڑے۔“

احمد اقبال کے قلم سے شہرہ آفاق سلسلہ وار کہانی

”اس کا مطلب ہے تم اداس نہیں ہو؟“ وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

رستم نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ ہمت کر کے بولی۔ ”تمہیں مجھ سے کوئی شکوہ کوئی گلہ نہیں ہے؟“

”نہیں،“ رستم نے کہا۔

”اور نہ کبھی ہوگا؟“ شانی نے پوچھا۔

مداری

2 حصے شائع ہو گئے ہیں

قیمت فی حصہ 60 روپے

”نہیں بی بی..... کبھی نہیں۔“

”کیا میں اس اطمینان کے ساتھ یہاں سے جاسکتی ہوں کہ تمہاری طرف سے مجھ پر کسی طرح کا کوئی بوجھ نہیں ہے؟“

”ہاں بی بی! آپ جاسکتی ہیں۔ میں اپنے خون سے لکھ کر دینے کو تیار ہوں، آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ آپ کے تو بس احسان ہی احسان ہیں۔“

وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ ”لیکن..... میں خود کو آزاد محسوس کیوں نہیں کرتی۔ کیوں مجھے لگتا ہے کہ میں کسی چیز میں جکڑی ہوئی ہوں۔ کیوں لگتا ہے ایسا؟“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”یہ آپ کی اپنی سوچ ہے بی بی! میں اسے بدل نہیں سکتا۔“

وہ عجیب لہجے میں کہنے لگی۔ ”تم بہت اچھے ہو رستم..... بہت ہی اچھے لیکن جتنے اچھے ہو، اس سے کہیں زیادہ ظالم ہو۔“

”مم..... میں سمجھا نہیں بی بی؟“ وہ نظر چرا کر بولا۔

”میرا خیال ہے کہ میں سمجھا بھی نہیں سکتی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کا احترام کرتے ہوئے رستم بھی فوراً اٹھ گیا۔ چناب اب انہیں مزید اچھی طرح نظر آنے لگا تھا۔ سچی محبتوں کی کہانی اپنے پانیوں میں

سمیٹے وہ بڑی خاموشی سے جنوب کی طرف بہہ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد رضا ایک موٹر رکشا پر ملینک کو لے کر پہنچ گیا۔ بیٹری سے بلب کے تار جوڑ کر ملینک اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ رضا اور رستم بھی اس کے پاس کھڑے تھے۔ غیر متوقع طور پر پانچ منٹ کے اندر گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔

اب وہ ایک بار پھر پک اپ میں تھے اور پک اپ چناب کو پار کر کے گجرات کی طرف جا رہی تھی۔ شانی اور رستم دونوں چپ تھے۔ پک اپ میں بیٹھنے کے بعد ان میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ان آخری لمحوں میں شانی کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا مگر جس طرح پُر سکون سمندر کے نیچے تھلکہ خیز طوفان اودھم مچاتے ہیں اس کے دل میں بھی عجیب رقت آمیز ہلچل تھی۔

پھر پک اپ آہستہ ہوئی اور چند ہچکولے کھانے کے بعد آخر شب کی تاریکی میں رک گئی۔ کیمپن میں سے رضا کی آواز آئی۔ ”رستم بھائی اب

کس پاس (کس طرف) جانا ہے؟“

رستم نے شانی کی طرف دیکھا۔ ”بی بی! کس طرف جانا ہے؟“

”تمہیں نہیں پتا؟“

”میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔“ اس کا ہر لفظ ایک سوال تھا۔

”کہاں ہیں ہم؟“

”جی والے چوک پر۔ آپ کی دائیں طرف والی سڑک گجرات شہر کو جاتی ہے۔ سامنے والی بائی پاس کی طرف۔“

شانے کے کانوں میں طوفان کا شور تھا۔ اس شور میں سے جیسے گھینے کی آواز ابھر کر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”چوہدرانی جی! رستم آپ کو چاہتا

تو بہت ہے۔ شاید اتنا کہ آپ کے صرف ایک ہا سے (مسکراہٹ) کے لئے ساری دنیا قربان کر دے۔ پر آپ سے دور رہ کر بھی وہ دیکھی نہیں ہے۔ وہ بس اپنے آپ میں مست ہے.....“ پھر گننے نے اماں سیانی کے حوالے سے ایک بات کہی تھی۔ ”..... اماں سیانی نے کہا تھا، ایسا عشق کیا نہیں جاتا، خود بخود ہو جاتا ہے۔ ایسے عشق میں کچھ لیا نہیں جاتا، بس دیا ہی جاتا ہے اور جب بندے کا دھیان لینے کی طرف نہیں ہوتا، اللہ سوہنے کا دھیان دینے کی طرف ہو جاتا ہے۔“

تو کیا اللہ سوہنے کا دھیان دینے کی طرف ہو گیا تھا۔ شانی نے سوچا۔ وہ رستم کو کچھ دے رہا تھا اور اپنی عطا کے لئے شانی کو وسیلہ بنا رہا تھا۔ کیا واقعی ایسا ہو رہا تھا؟ شاید واقعی ایسا ہو رہا تھا۔ شانی اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی کے باوجود خود کو ایک کٹھ پتلی کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ نادیدہ ہاتھ کی نادیدہ ڈوریں تھیں جو اسے اپنی مرضی میں جکڑ رہی تھیں۔ شاید یہ امر ربی کی ڈوریں تھیں۔ ان لمحوں میں اس پر یہ انکشاف بھی ہو رہا تھا کہ جس طرح دوستی اور دشمنی کے درمیان ایک باریک لکیر کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح جدائی اور ملاپ کے درمیان بھی باریک لکیر ہی ہوتی ہے۔ چند گھنٹے پہلے تک وہ جس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی وہ آپوں آپ ذہن پر وارد ہو رہی تھی۔

اس نے پلکیں اٹھا کر عجیب نظروں سے رستم کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ایک تک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لمبے بال رخساروں پر جھول رہے تھے۔ چاند پک آپ کی کھر کی میں تصویر کی طرح ساکت تھا۔ رستم نے مدہم آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ ”بی بی! کس طرف جانا ہے؟“ شانی کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں گہری ہوتی چلی۔ کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا..... کچھ بھی نہیں پھر ایک تھکے ہارے پیراک کی طرح جو خود کو حالات کی سرکش لہروں پر چھوڑ دیتا ہے شانی نے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی پلکیں جھکا کر..... لیکن مستحکم لہجے میں کہا۔ ”فی الحال سیدھے چلو۔“

”فی الحال سیدھے چلو۔“ ان تین لفظوں کی گونج جیسے دور دور تک پھیل گئی۔ چناب کی ریت کے ذروں سے لے کر فلک کے ستاروں تک ہر شے نے یہ تین الفاظ سنے۔

رستم کے چہرے پر اندرونی مسرت کا رنگ بکھر گیا۔ شانی ابھی جدا نہیں ہو رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

گاڑی بائی پاس کی طرف روانہ ہو گئی۔ شانی نے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ کسی طرف دیکھنا نہیں چاہتی..... اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے رستم کی طرف تو ہرگز نہیں۔ پک آپ جی ٹی روڈ پر دوڑتی رہی۔ خٹک ہوا ان دونوں کے ارد گرد سرسراتی رہی۔ تیز رفتار گاڑیاں اطراف سے گزرتی رہیں۔ پھر دھیرے دھیرے رات کے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونے لگی۔

ایک ایک شانی کو محسوس ہوا کہ ان کا سفر طویل ہو گیا ہے۔ رستم نے تو کہا تھا کہ انہیں سرائے عالمگیر تک جانا ہے۔ جہاں تک شانی کو معلوم تھا، گجرات سے سرائے عالمگیر تک کا سفر اتنا زیادہ نہیں تھا۔

بہت دیر بعد شانی نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر رستم کی طرف دیکھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ نیم اُجالے میں اب اس کی صورت شانی کو بہتر طور پر

نظر آ رہی تھی۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ شانی نے پوچھا۔

”پنڈی۔“ رستم نے جواب دیا۔

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ پک آپ کو سرائے عالمگیر تک جانا ہے۔ وہاں سے بس پکڑنی ہے۔“

”اب میں نے پروگرام بدل دیا ہے بی بی۔ آپ ساتھ جو ہیں۔“ شانی خاموش رہی۔

وہ بولا۔ ”پنڈی میں ایک دور کارشتے دار ہے بی بی۔ اس کے پاس جائیں گے۔ وہ جگہ ہمارے لئے بڑی محفوظ رہے گی۔“

ایک بار پھر ان دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہو گئی۔ وہ اپنی اپنی سوچ میں گم ہو گئے۔

راولپنڈی شہر کے جنوبی مضافات میں وہ ایک وسیع کٹھی تھی۔ رقبہ تقریباً تین کنال رہا ہوگا۔ تعمیر شدہ لگ بھگ ایک کنال تھی۔ باقی رقبہ خالی تھا۔

یہاں سیب، انار اور لوکاٹ وغیرہ کے درخت تھے۔ بیرونی دیوار کی بلندی دس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ اس کٹھی میں شانی کی ملاقات ایک جوان سال شخص زوار سے ہوئی۔ زوار کے ساتھ اس کی بیوی اور ایک سنجیدہ صورت خاتون تھی جس کے بارے میں شانی نے اندازہ لگایا کہ وہ زوار کی ساس ہوں گی۔

رستم اور زوار میں گہری شناسائی اور بے تکلفی پائی جاتی تھی۔ رستم نے زوار کو ”زارے“ کے یک نیم سے مخاطب کیا۔ اس سے پہلے دونوں گرم جوشی سے بغل گیر بھی ہو چکے تھے۔ شانی کو زوار کی بیوی شیری کے پاس چھوڑ کر رستم نے زوار کو ساتھ لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ان کے جانے سے خواتین کو باتیں کرنے میں آسانی محسوس ہوئی۔

شیری نے ادھیڑ عمر خاتون کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہماری ماسی زینب ہیں لیکن ہم ان کو اپنے گھر کے فرد کی طرح سمجھتے ہیں۔ بڑا پیار ہے انہیں ہم سے۔“

شانسی کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ سنجیدہ صورت عورت شاید شیری کی ماں ہے۔ شکلوں کی مشابہت اکثر دھوکا بھی دیتی ہے۔

شیری کی عمر بمشکل بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ وہ بڑھی لکھی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ راولپنڈی ہی کی رہنے والی ہے۔ وہ جاذب نقوش اور متوازن جسم کی مالک تھی۔ سیاہ آنکھوں میں شوخی اور زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں شے اس کے ہونٹ تھے۔ یہ ترشے ہوئے ہونٹ خاموشی کی حالت میں بھی مسکراتے ہوئے نظر آتے تھے۔

تعارف باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ رستم کے کہنے کے مطابق شانی نے اپنا تعارف مختصر الفاظ میں کروایا۔ اس نے بتایا کہ وہ گجرات کے ایک نواحی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ والدین فوت ہو چکے ہیں۔ کوئی بھائی بھی نہیں۔ پرانی دشمنی چل رہی تھی اور مخالفوں کی طرف سے جان کا خطرہ تھا۔ اس کا ایک چچا ہے جو بیرون ملک مقیم ہے۔ وہ رستم کا بھائی بنا ہوا ہے۔ اسی چچا کے کہنے پر رستم اسے دشمنی کے اس نزعے سے نکال کر لایا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے کچھ باتیں فرضی تھیں۔ رستم فی الحال نہیں چاہتا تھا کہ شانی کے بارے میں اصلیت ان لوگوں کو بھی بتائی جائے۔ شیری نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ۔ ”ہماری شادی پچھلے مارچ میں ہوئی تھی۔ زوار کی دیہی علاقے میں زمینداری ہے۔ وہ وہیں پلا بڑھا ہے۔ اب بھی اسے شہر سے زیادہ گاؤں میں رہنا پسند ہے، لیکن میرا معاملہ الٹ ہے۔ میری خواہش کو بھانپتے ہوئے زوار نے تین مہینے

پہلے ہی یہ گھر خریدا ہے۔۔۔۔۔“

اس نے ذرا توقف کیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”نئی نئی شادی ہے ناں۔ باتیں مانی جا رہی ہیں۔ پھر تو وہی لال پیلی آنکھیں ہونی ہیں اور ہمارا خشک ہوتا خون ہونا ہے۔ یعنی چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔“

”تمہارے ہنستے مسکراتے میاں کو دیکھ کر مجھے تمہارے خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہو رہا ہے۔“ شانی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”آپ شادی شدہ ہیں؟“

”نن۔۔۔۔۔ نہیں۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔ مبارک ہو۔ میرے نزدیک غیر شادی شدہ ہونا اور خوش قسمت ہونا ہم معنی ہیں۔۔۔۔۔ جہاں تک زوار کی مسکراتی صورت کا تعلق ہے میں بس اتنا ہی کہوں گی، ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔“

”آپ۔۔۔۔۔ دلچسپ لوگ لگتے ہیں۔“ شانی نے کہا۔

اتنے میں زوار دروازے پر نمودار ہوا۔ ”کون دلچسپ ہے جی؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”یہاں تمہارا ذکر ہرگز نہیں ہو رہا۔“ شیریں بولی۔

”تو پھر تمہارا ہو رہا ہوگا اور اگر واقعی ایسا ہو رہا ہے تو پھر مجھے اپنی مہمان سے ہمدردی ہے۔ ان کی خوش فہمی بڑی جلدی اور بڑے بُرے طریقے سے دور ہونے والی ہے۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی شانی مسکرا دی۔

میاں بیوی کے درمیان نوک جھوک کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شاید یہ طویل ہو جاتا تاہم اس دوران میں سنجیدہ صورت عورت نے شانی کا ستا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے بیٹی بہت تھکی ہوئی ہے۔ اسے کچھ دیر آرام کی ضرورت ہے۔“

شیریں کا ذہن بھی فوراً اس طرف منتقل ہو گیا۔ اس نے اپنے شوہر سے چونچ لڑانے کا سلسلہ ختم کیا اور پوری طرح شانی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ شانی، خاتون خانہ کے ساتھ ایک کشادہ کمرے میں آ گئی۔ گھر کی سجاوٹ میں سلیقہ تھا۔ آرائش میں وسطی اور شمالی پنجاب کا ملا جلا تاثر ملتا تھا۔ ایک کھڑکی سرسبز لان کی طرف کھلتی تھی۔ یہاں ایک جانب گیراج میں شانی کو سیاہ رنگ کی بہت بھاری بھر کم موٹر سائیکل دکھائی دی۔ قریب ہی نمبر پلیٹ کے بغیر ایک گرے رنگ کی خیر کھڑی تھی۔ ایک طرف شیڈ کے نیچے پرندوں کے لئے بہت بڑا پنجرہ بنایا گیا تھا۔ جس میں انواع و اقسام کے رنگ برنگ پنچھی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور مختصر فضا میں اُڑائیں بھر رہے تھے۔ شانی کو باطمینان طریقے سے لٹانے اور کھڑکیوں کے پردے برابر کرنے کے بعد شیریں باہر نکل گئی۔

شانیا واقعی بہت تھکی ہوئی تھی۔ اس اجنبی جگہ اور ان نہایت اجنبی حالات میں بھی اسے نیند آ گئی۔ وہ بیدار ہوئی تو سہ پہر ہونے والی تھی۔ اصولی طور پر اسے بھوک محسوس ہونی چاہئے تھی لیکن جب سینے میں گلے تک نمکین آنسو جمع ہوں تو کھانے پینے کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔ جو افراد

سوچیں تھکاوٹ اور نیند کے سبب کچھ دیر کے لئے اس سے دور ہو گئی تھیں وہ پھر ذہن پر یلغار کرنے لگیں۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ سامنے سرسبز لان کا منظر تھا۔ کچھ ایسا ہی لان رنگ والی کی حویلی میں بھی تو تھا۔ رنگ والی کی حویلی جہاں وہ تھی اس کے اپنے تھے اس کے پیارے ابا جی تھے۔ وہ اپنے ابا جی کی بغل میں دبک کر صبح سویرے ایسے ہی بھیکے بھیکے لان میں ٹھہلا کرتی تھی۔ آہ کہاں گئے وہ سب لوگ؟ کچھ ہمیشہ کے لئے..... نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے اور کچھ موجود ہونے کے باوجود اس کے لئے موجود نہیں تھے۔ وہ چچی پروین، تایا معصوم، بابا خادم اور سکیئہ وغیرہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ یقیناً ان سب لوگوں کے لئے وہ مر چکی تھی۔ عین ممکن تھا کہ رنگ والی کی جنازہ گاہ میں اس کی غائبانہ نماز جنازہ ہو چکی ہو اور حویلی میں دسواں کی رسم بھی ادا کی جا چکی ہو۔

اس نے اپنی موت کے بعد سارے مناظر تصور کی نگاہ سے دیکھے۔ نارپور سے یہ چیختی چنگھاڑتی خبر بذریعہ ٹیلی فون رنگ والی پہنچی ہوگی کہ مہرجی کی حویلی میں آگ لگ گئی ہے اور مہرجی سمیت زیادہ تر اہل خانہ جل مرے ہیں۔ تایا معصوم اور چچی پروین، خادم حسین کے ساتھ روتے پیٹتے علی الصبح نارپور پہنچ گئے ہوں گے۔ جلی اور ادھ جلی لاشوں کے انبار میں وہ شانی کو تلاش کرتے رہے ہوں گے پھر کونکہ ہو جانے والی لاشوں میں سے ایک لاش اس کی تصور کر لی گئی ہوگی۔ چچی پروین پر غشی کے دورے پڑے ہوں گے۔ تایا معصوم ہچکچایاں لے کر بے حال ہو گئے ہوں گے اور اس کی جان سے پیاری سی سکیئہ..... وہ تو شاید اب بھی آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبی ہوگی۔ رنگ والی کے نئے قبرستان میں شاید چند کونلوں کے اوپر مٹی ڈال کر اس کی قبر بھی بنائی جا چکی ہو۔

کس قدر عجیب سا احساس تھا یہ کہ وہ زندہ تھی اور اس کی قبر بھی بن چکی تھی۔ یعنی وہ بیک وقت مُردہ تھی اور زندہ بھی۔ اچانک اس کی سوچوں کا دھارا ایک اور سمت مڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی بدن میں پھر سرد پھریری دوڑ گئی۔ اسے نگینہ کا خیال آیا۔ اس نے نگینہ کو جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس نے نگینہ سے باتیں کی تھیں۔ اس کو چھو تھا اور نگینہ کو مرے ہوئے دودن گزر چکے تھے۔

”یا خدا! وہ کیا ماجرا تھا؟“ یہ سوال سینکڑوں دفعہ شانی کے ذہن میں کلبلا چکا تھا اب ایک بار پھر کلبلا لگا۔ وہ کمرے میں تنہا تھی۔ اسے اپنے قرب و جوار سے خوف محسوس ہونے لگا۔ الماری، کرسیاں، شیشے کی تپائی، ہر شے اسے ڈرانے لگی۔ اسے لگا کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور نگینہ ہاتھ میں گلاب اور گیندے کے پھولوں کا گلدستہ لئے مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو جائے گی۔

شانی نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرنے کے باوجود اسے خوف آتا رہا۔ اچانک دروازہ کھلا اور کوئی ہولے سے اندر آ گیا۔ شانی نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں..... وہ گلدستہ لئے سامنے کھڑی تھی لیکن وہ نگینہ نہیں شیری تھی۔ نیلی ساڑھی اس کے چست بدن پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے گلدستہ تپائی پر رکھا اور بولی۔ ”رستم بھائی کہہ رہے تھے کہ میں دیکھ کر آؤں۔ آپ سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں۔“ ”ابھی جاگی ہوں۔“ شانی نے کہا۔

”میں آپ کے لئے کھانا لے کر آتی ہوں۔“ وہ واپس جانے کے لئے مڑی۔ شانی نے اس کا بازو تھام لیا۔ ”نہیں شیری! مجھے ایک نوالے کی بھوک نہیں۔“

شیری کچھ دیر اصرار کرتی رہی پھر بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ میرے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں رستم بھائی کو سمجھتی ہوں۔“

کچھ ہی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ شانی نے سر اور سینے پر اوڑھنی درست کی اور بولی۔ ”آجائیں۔“

دروازہ کھلا اور رستم اندر داخل ہوا۔ سر جھکائے ہوئے وہ دور رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس کی آواز ابھری۔ ”بی بی یہاں آپ کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ شیری دل کی بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ماسی زنب بھی یہیں ہے۔ آپ کو کسی شے کی ضرورت ہو یہاں سے گھنٹی کا بٹن دبا دیں۔ میں اوپر کی منزل پر رہوں گا لیکن کہیں دور نہیں جاؤں گا۔ آپ کسی بھی وقت مجھے بلا سکتی ہیں۔“

”نار پور سے کوئی نئی اطلاع ملی؟“ شانی نے پوچھا۔

”نہیں بی بی بس اخبار میں چھوٹی موٹی خبریں آرہی ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ نار پور والوں کا شک سیدھا مجھ پر آتا ہے۔ میری تلاش میں چھاپے مارے جارہے ہیں۔“

”تمہارا ساتھی بھی تو حویلی میں مارا گیا تھا۔“ شانی نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

”آپ گونگے مختار کی بات کر رہی ہیں لیکن میرے اور گونگے کے تعلق کا تو کسی کو پتا ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی اس کی لاش کئی دوسری لاشوں کی طرح کونکہ ہو گئی تھی۔“

”مجھے اس کی موت کا بہت دکھ ہے۔“ شانی نے کہا۔

”اس کی جان جانے کا دکھ تو مجھے بھی ہے لیکن جس کام کے لئے جان گئی ہے وہ بھی معمولی نہیں تھا۔ آپ کی زندگی بچی ہے بی بی اور اس کام کے لئے تو میری جان بھی سو بار چلی جاتی تو پرواہ نہیں تھی۔“ رستم کے لہجے میں بناوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ سچائی پکے ہوئے انگوروں کے رس کی طرح الفاظ سے ٹپک رہی تھی۔

شانہ کی کوشش کے باوجود اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ سکی۔ اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ تم آزاد علاقے میں جانا چاہتے تھے لیکن میری وجہ سے یہاں پنڈی میں رک گئے ہو۔“

”اگر ایسا ہے بھی تو اس میں کیا خرابی ہے بی بی۔“

”ہو سکتا ہے کہ آزاد علاقے میں تم زیادہ محفوظ ہوتے۔“

”میری طرف سے آپ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ اللہ کے کرم سے میں کہیں بھی غیر محفوظ نہیں ہوں اور یہ جگہ تو ہم دونوں کے لئے خاص طور سے بالکل مناسب ہے۔“

شانہ خاموش رہی۔ وہ مؤدب انداز میں گویا ہوا۔ ”میری آپ سے ایک درخواست ہے بی بی..... آپ کچھ دنوں کے لئے ہر طرح کی پریشانی دل و دماغ سے نکالنے کی کوشش کریں۔ اپنے آپ کو سکون دیں۔ آئندہ کے بارے میں سوچنے کے لئے آپ کے پاس بہت وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں جب آپ آئندہ کے بارے میں سوچیں تو آپ کے ذہن پر کسی طرح کا بوجھ نہ ہو۔ آپ اپنی زندگی کا نقشہ بناتے ہوئے بالکل ہلکی پھلکی ہوں۔“

وہ اسے کیسے بتاتی، وہ جو کچھ بھی ہے لیکن ایک عورت ہے۔ حساسیت اس کی فطرت ہے۔ وہ ان مہیب طوفانوں کو کیسے بھول سکتی ہے جنہوں نے کچھ ہی عرصہ پہلے اس کی زندگی کو تہہ وبالا کیا ہے۔ مستقل طور پر تو درکنار وہ عارضی طور پر بھی ان سوچوں سے پیچھا نہیں چھڑا پارہی تھی۔ بس نیند ہی تھی جو تھوڑی دیر کے لئے اس کے ذہن پر کسے ہوئے غم کے شکنجے کو ڈھیلا کرتی تھی۔

رات کا کھانا سب نے اکٹھے کھایا۔ شیری نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ بھنی ہوئی مرغی، مٹن کے کباب، بریانی اور فرنی۔ بہت کچھ مینیو میں شامل تھا۔ کھانے کے دوران میں بھی نوبیا ہتا میاں بیوی میں نوک جھوک جاری رہی۔ لگتا تھا کہ دونوں عام حالات میں بھی چونچ لڑانا جاری رکھتے ہیں تاہم شانی کی موجودگی میں وہ کچھ زیادہ ہی مزاح تخلیق کر رہے تھے۔ غالباً اپنی دانست میں وہ شانی کا دل بہلا رہے تھے۔ رستم اور زوار میں بھی کافی بے تکلفی نظر آتی تھی مگر شانی کی موجودگی میں یہ بے تکلفی کہیں دبک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ زوار نے ایک دوسرے رستم پر فقرہ چپکانے کی کوشش کی لیکن اس کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے اس سلسلے کو آگے نہیں بڑھایا۔۔۔۔۔ شانی کی موجودگی میں رستم ایک دم لئے دیئے ہوئے نظر آتا تھا۔

دوروز اسی طرح گزر گئے۔ شانی اور شیری زیادہ وقت اکٹھے گزار رہی تھیں۔ شیری ایک سمجھ دار اور ہمدرد لڑکی تھی۔۔۔۔۔ شانی نے اسے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے زیادہ جاننے کی کوشش شیری نے نہیں کی نہ ہی ماسی زنب نے اسے کسی طرح کریدنا چاہا۔ تیسرے دن علی الصبح زوار رنگ دار شیشوں والی گاڑی میں بیٹھ کر کسی کام سے نکل گیا۔ شانی ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھی تھی وہ اخبار دیکھ رہی تھی۔ نارپور کے المناک حادثے کی بازگشت ابھی تک خبروں میں موجود تھی۔ ایک باکس میں اس چھوٹی سی خبر پر شانی کی نگاہ پڑی۔

”حادثے ٹوکئی دن ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک مرنے والوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ جولاہیں کوئلہ بن گئی ہیں یادہماکوں سے جن کے چیتھڑے اڑ گئے ہیں ان کی شناخت ناممکن ہے۔ مرنے والوں کے کچھ لواحقین تا حال اس امید میں ہیں کہ شاید سمار ہو جانے والے تہہ خانوں میں سے کوئی شخص زندہ یا مردہ حالت میں نکل آئے۔ یاد رہے کہ دوروز پہلے تہہ خانے کے بلے سے ایک لاش ملی تھی۔“

شانی کی آنکھیں ڈبڈبائے لگیں۔ بیت جانے والے سارے اندوہناک مناظر ذہن میں تازہ ہونے لگے۔ پھر فاختہ کی موت کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس نے اپنے دادا سے چیخ کر کہا تھا۔ ”دادا! آپ جھوٹ نہیں بول رہے تو کیا میں بول رہا ہوں۔ شانی کہیں نہیں ہے۔ اس کی چپل یہاں پڑی ہے۔“

جواب میں دادا کی جنونی آواز گونجی تھی۔ نفرت اور انتقام کے خونی کھیل نے یوں رنگ جمایا تھا کہ دادا پوتا ایک دو بے کے مقابل آگئے تھے۔ آتش فشاں جب پھٹتا ہے تو سب سے پہلے خود کو دہی راکھ کرتا ہے۔ نارپور کے آتش فشاں نے بھی خود کو کھلسا لیا تھا۔ جس وقت شانی نے کھڑی میں سے فاختہ کو دیکھا تھا، گولیاں اس کے جسم سے پار ہو چکی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ شانی کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن شاید شانی کی چیخ و پکار اس کے کانوں تک پہنچی ہو۔ آہ۔۔۔۔۔ وہ چاند رات تھی۔ اس چاند رات میں محبت کے پھول کھلے تھے۔ شانی نے خود کو اپنے شریک حیات کی بانہوں میں یوں گرا لیا تھا کہ اس کے تمام دیرینہ شکوک کا مداوا ہونا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ زندگی کا رخ کچھ دیگر راہوں کا راہی ہونے والا تھا۔ وہ چاند رات لہو میں نہانے والی تھی۔ محبت کے پھولوں کی جگہ آگ کی کیا ریوں میں خون کے پھول کھلنے والے تھے۔

تب شانی کو فاخر کا آخری سفر یاد آیا۔ رستم اور شانی خونچکاں فاخر کو لے کر ہسپتال کی طرف لپکے تھے۔ رستم نے حتی الامکان تیزی سے جیپ چلائی تھی۔ ایک دو جگہ تو جیپ الٹنے الٹنے بچی تھی لیکن پھر اچانک ان دونوں کو احساس ہوا تھا کہ موت اور زندگی کی جنگ میں نارپور کا چھوٹا چوہدہری ہار چکا ہے۔ وہ ایک زخمی کونہیں لاش کو لے جا رہے ہیں۔ شانی اپنے شریک حیات کے سینے پر گر کر دیوانوں کی طرح روئی تھی۔

یہ سب کچھ یاد کر کے ایک بار پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ایک ایسے شخص کے لئے رورہی تھی جس نے اسے مسلسل کانٹوں پر گھسیٹا تھا۔ قرونِ اولیٰ کے کسی ظالم آقا نے اپنی زرخیز باندی پر بھی وہ ستم نہ ڈھائے ہوں گے جو شانی پر ڈھائے گئے تھے۔ آج بھی اس کی روح اور جسم پر کئی گہرے زخم تھے لیکن وہ پھر بھی اس شخص کے لئے رورہی تھی۔ وہ جو بھی تھا مگر اس کا شوہر تھا۔ حساس لوگ تو ”راہ چلتے“ جس درخت کی چھاؤں میں بیٹھے ہیں اسے بھی یاد رکھتے ہیں۔ فاخر کے ساتھ تو اس نے پھر ایک عرصہ گزارا تھا۔

اس کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا ان پر ابھی تک اس مہندی کا مدہم رنگ موجود تھا جو چاند رات کو شانی نے فاخر کی خوشی کے لئے لگائی تھی۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اچانک دروازے پر مدہم دستک ہوئی۔ ”کون ہے؟“ شانی نے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ ”میں ہوں شانی۔“ شیریں کی شیریں آواز آئی۔

شاننی نے جلدی سے واش روم میں گھس کر چہرے پر پانی ڈالا اور چہرے کو تولیے سے صاف کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ شیریں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور غالباً اس ایک نظر میں ہی وہ جان گئی کہ شانی روتے روتے اٹھی ہے۔ بہر حال بہت سی دیگر باتوں کی طرح اس نے یہ بات بھی کریدی نہیں۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ شیریں نے پوچھا۔

”کافی بہتر ہوں۔“

”بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے۔ آئیں ذرا لان میں گھومیں۔“

شاننی نے بالوں کو سیٹے ہوئے اور ڈھنی لی اور چپل پہنتے ہوئے باہر آ گئی۔ واقعی موسم خوشگوار تھا۔ طویل گرمیوں کے بعد سردیوں کی آمد کے آثار اچھے لگ رہے تھے۔ شیریں نے محبت بھری نظروں سے شانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ بڑی خوبصورت ہیں۔“ اس کا انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ شانی بھی بے ساختہ شرملا گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے چہرے پر خون کی سی لہر دوڑ گئی ہے۔

”کیسی بات کر رہی ہو؟“ شانی نے کہا۔

”بب..... بس یونہی کہہ دیا۔“ وہ ہلکائی۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”دراصل سوچ رہی ہوں کہ آپ کسی بھی بناؤ سنگھار کے بغیر اتنی اچھی لگ رہی ہیں تو جب ذرا جتنی سنورتی ہوں گی تو کیسی لگتی ہوں گی۔“

”ہو سکتا ہے کہ بُری لگنے لگوں۔“ شانی نے کہا۔ اچانک اس کی نظر ایک بند دروازے پر پڑی۔ یہ دروازہ مقفل تھا۔ اس پر کسی نے سُرخ

رنگ کے موٹے مار کر سے لکھ دیا تھا۔ ”ماضی قریب“ شانی دوبار پہلے بھی اس دروازے کو دیکھ چکی تھی۔ ”یہ کیا ہے بھئی؟“ شانی نے پوچھا۔
 شیریں کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”یہ بھی ہے ایک تماشا۔ زوار ایسے تماشوں کا بہت شوقین ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“

شیریں نے چند لمحے سوچا، پھر چنچل انداز میں بھاگتی ہوئی کمرے کی طرف گئی چند سیکنڈ بعد وہ ہاتھ میں ایک ”کی رنگ“ لئے نمودار ہوئی۔
 لبوں میں مسکراہٹ دبی ہوئی تھی۔ ”آئیے آپ کو دکھاؤں۔“ اس نے شانی سے کہا اور جھک کر کی ہول میں ایک چابی گھمانے لگی۔
 چند ہی سیکنڈ بعد شانی اور شیریں ایک ہال نما کمرے کے اندر تھیں۔ روشندانوں سے مدھم روشنی اندر آرہی تھی۔ شیریں نے ٹیوب لائٹ آن کر کے اس روشنی میں اضافہ کر دیا۔ شانی نے ارد گرد دیکھا اور حیران رہ گئی۔ یہ کمرہ عجیب و غریب اشیاء سے بھرا ہوا تھا۔ دو عدد بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل جن پر گرد کی تہیں جمی تھیں۔ شراب کی خالی بوتلیں۔ ایک عدد دور مار رائفل جس پر ٹیلی اسکوپ لگی تھی۔ انگریز اداکاراؤں کی نیم برہنہ اور برہنہ تصویروں کے پوسٹر سی ڈیز واکر کی ٹاکی اور پٹانہیں کیا کچھ۔

”یہ سب کیا ہے؟“ شانی نے حیرت سے دریافت کیا۔

”ماضی قریب۔“ شیریں مسکرائی۔

”کس کا ماضی قریب؟“

”اس کا جس کے پلے بندھ گئی ہوں۔“ شیریں نے کہا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ”زوار ڈیڑھ دو سال پہلے آج کے زوار سے بہت مختلف تھا..... وہ سٹوڈنٹ لیڈر تھا اور لیڈر بھی ایسا جو بات بعد میں کرتا تھا ہاتھ پہلے چلاتا تھا۔ وہ کالج کے ہاسٹل میں کسی ریاست کے شہزادے کی طرح رہتا تھا۔ ایم ایس سی کی کلاس میں اس نے پورے چھ سال قیام کیا۔ اس کے بعد بھی منت سماجت کر کے نکالا گیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خود ہی نکل گیا کیونکہ پھر اسے اپنے سامنے مار دھاڑ اور دادا گیری کے کئی اور میدان نظر آنے لگے تھے۔ بہر حال اس کے بعد بھی اس نے طلباء کی سیاست سے اپنا پاؤں باہر نہیں نکالا۔ بلکہ اب بھی وہ اس میدان میں گاہے بگاہے داخل ہوتا رہتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں۔“

شانہ نے اس کی بات پکڑتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چور اب چوری سے چلا گیا ہے؟“

”چلا کہاں گیا جی..... زبردستی مار کوٹ کر بلکہ پھینٹی لگا کر اسے تائب کرایا گیا ہے۔“

”اور میرا خیال ہے کہ یہ کام تم نے خود کیا ہوگا۔“ شانی نے کہا۔

”توبہ جی توبہ۔“ اس نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔ ”میری اتنی مجال کہاں کہ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالوں۔ یہ معرکہ کسی اور کا سر کیا ہوا ہے۔“

”کسی اور کا؟“

”جی ہاں..... آپ اسے اچھی طرح جانتی ہیں۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

”کہیں..... تم رستم کی بات تو نہیں کر رہی ہو۔“

”جی ہاں۔“ شیری نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ ”رستم بھائی کی یہ نیکی ایسی ہے جسے میں ساری زندگی فراموش نہیں کر سکتی۔“

”رستم اور زوار میں پرانا دوستانہ لگتا ہے۔“ شانی نے خیال ظاہر کیا۔

”یہی تو مزے کی بات ہے۔ یہ دوستانہ بہت زیادہ پرانا نہیں لیکن اتنا چکا اور گہرا ہے کہ..... بس کچھ نہ پوچھیں۔“ اس نے چند لمحے توقف کیا اور بولی۔ ”رستم اور زوار کی دوستی کوئی تین سال پہلے اس وقت ہوئی تھی جب رستم بھائی ایک سنگین کیس میں سیالکوٹ پولیس سے بچتے پھر رہے تھے اور گوجر خان کے قریب ایک گاؤں مٹھوالی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو زوار بھی مٹھوالی ہی کا رہنے والا ہے۔ رستم بھائی وہاں مٹھوالی میں ایک کھیت مزدور کے بھیس میں رہ رہے تھے۔“

اچانک وہ بولتے بولتے رک گئی۔ چونک کر شانی کو دیکھا اور کہنے لگی۔ ”پتا نہیں مجھے یہ باتیں آپ سے کرنی بھی چاہئیں یا نہیں۔“

شانی نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”شیری یہاں میرے اور تمہارے درمیان جو باتیں بھی ہوں گی وہ ہم دونوں کے درمیان ہی رہیں گی۔“

اس نے ایک بھر پور نظر شانی کے چہرے پر ڈالی اور بولی۔ ”پتا نہیں کیوں آپ پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔“

شانی مسکرائی۔ ”تو پھر دل کا کہا مان لو۔“

”نہ بھی مانوں گی تو دل خود منوالے گا۔ پتا نہیں کیا جاوے آپ میں؟ سچ کہتی ہوں دو چار دن میں ہی آپ بالکل اپنی لگنے لگی ہیں۔ دل چاہتا ہے..... دل چاہتا ہے ہر معاملے میں آپ پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں۔“

”شکریہ کہ تم مجھے اس قابل سمجھ رہی ہو۔“

شیری بولی۔ ”چلیں آئیں اوپر جا کر ٹیرس پر بیٹھتے ہیں۔“

شانی نے رضا مندی ظاہر کی۔ شیری نے سامنے دیوار پر لگے ہوئے دو پوسٹروں کو ناراض نظروں سے دیکھا۔ دونوں میں امریکن اداکارہ راکیل ویلچ دو بابت لباس پہنے اپنے ساتھی مرد سے بوس و کنار کرتی نظر آتی تھی۔ شیری نے پوسٹر پھاڑ کر دیوار سے اتارے اور انہیں چرمر کر کے ہاتھ میں لے لیا۔

”ماضی قریب“ کا دروازہ بند کرتے ہوئے وہ دونوں اوپر ٹیرس کی طرح بڑھیں۔

ٹیرس پر ایک بیضوی شکل کا سنگ روم بھی شامل تھا۔ اس میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ یہاں بیٹھ کر جنوب میں دور تک سطح مرتفع کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ شمال کی طرف اسلام آباد کے سفید درو دیوار اور فیصل مسجد کے دور افتادہ مینار نظر آتے تھے۔ ان میناروں سے ذرا ہٹ کر پہاڑوں کی آغوش میں راول ڈیم کا پانی بھی جھلک دکھاتا تھا۔

شیری نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”رستم بھائی قریباً چھ ماہ تک مٹھوالی گاؤں میں روپوش رہے تھے۔ ان دنوں شاید اپنی کچھ پرانی

نیکیوں کے طفیل کالج والوں کی جان میرے شوہر نامدار سے چھوٹ چکی تھی یعنی وہ کالج کو خیر باد کہہ کر گاؤں میں مقیم تھا۔ وہیں پردوں کی دوستی پر وہان چڑھی۔ ان دنوں دنوں ہی ”معرفت کے اعلیٰ درجات“ پر فائز تھے۔ دنوں کے دماغ روشن تھے اور ہر قسم کے بیش قیمت منصوبوں سے بھرے ہوئے تھے۔ قتل، اغوا، دغا فساد، غرض ہر قسم کی مہم جوئی کے لئے دنوں کے پاس بے تحاشا وقت اور توانائی موجود تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وقت ان کا ساتھ دیتا اور گردشِ ایام ان کے عزائم کو درہم برہم نہ کرتی تو یہ چاند سورج کی جوڑی ثابت ہوتی۔ کامرانیوں کے اعتبار سے یہ دنوں سلطانہ ڈاکو، ملنگی اور بہرام شہرام کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے.....“

”تم کہنا چاہتی ہو کہ یہ جرائم کے راستے پر چلنے جا رہے تھے۔“

”اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو میں کہوں گی کہ رستم بھائی تو پہلے ہی اس رستے پر بہت آگے تھے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ آپ نے بھی اخباروں وغیرہ میں اس بارے میں بہت پڑھا ہوگا..... ہاں یہ زوار صاحب نئے نئے عقل مند ہوئے تھے۔ اپنے پختہ عزم اپنی یکسوئی اور محنت شاقہ سے اپنا نام اونچے درجے کے بدمعاشوں میں لکھوانا چاہتے تھے۔ مگر وہ کیا کہتے ہیں، ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اوپر والے کی مہربانی ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تبدیلی کی ہوا چلی اور بہت کچھ بدل گیا۔“

شیری نے چند لمحے توقف کر کے شانی کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی۔ ”تبدیلی کا آغاز رستم بھائی سے ہوا تھا۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جس نے ہر اس شخص کو حیران کر دیا جو رستم بھائی کو تھوڑا بہت بھی جانتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رستم بھائی کے طور اطوار بدلنا شروع ہوئے اور پھر بدلتے چلے گئے۔ وہ پرانے قانون شکن تھے۔ پولیس کے محکمے میں رستم بھائی کے بہت سے یار دوست تھے جو ہر اچھے بُرے کام میں رستم بھائی کی مدد کرتے تھے۔ رستم بھائی نے قانون شکنی سے ہاتھ اٹھایا تو پھر ان کے ماحول میں بھی تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ جن چند دوستوں نے رستم بھائی کے بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتا کیا وہ تو ان کے ساتھ رہے باقی سب دور ہو گئے اور پھر ان سے ہر ناتا ٹوٹ گیا..... زوار بھی رستم بھائی کے ان دو تین دوستوں میں سے تھا جنہوں نے اس تبدیلی میں ان کا ساتھ دیا۔ شروع شروع میں اس مسئلے پر رستم بھائی اور زوار میں شدید جھگڑے بھی ہوئے۔ ایک جھگڑے کی تو میں چشم دید گواہ ہوں۔ اس جھگڑے میں دنوں نے باز ارحسن کے قریب ایک دوسرے کو زبردست مار لگائی تھی۔ اس لڑائی میں زوار زخمی ہو کر گر گیا تھا۔ بعد میں رستم بھائی اسے خود ہی اٹھا کر ہسپتالوں میں نقل ہوتے پھرے تھے۔ دنوں میں محبت کا ایک ایسا رشتہ ہے جو کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ میرے خیال میں یہ محبت ہی تھی جو بالآخر جیت گئی۔ رستم بھائی آہستہ آہستہ لیکن بتدریج زوار کو اپنی طرف کھینچ کر لے گئے۔ وہ من مانیوں سے باز آ گیا اور اپنی زندگی کو ایک نئے رخ پر لے آیا۔“

”جن دنوں یہ سب کچھ ہو رہا تھا تم کہاں تھیں؟“ شانی نے مسکرا کر پوچھا۔

”میں ان کے آس پاس ہی تھی۔“ وہ بھی مسکرائی۔ ”دراصل میں کبھی اپنے کالج کی یونین کی صدر تھی۔ مختلف میٹنگز اور تقریبات میں زوار سے آنا سامنا ہوتا رہتا تھا۔ یہ حضرت طلباء و طالبات میں شیطان کی طرح مشہور تھے۔ بس قسمت کی خرابی تھی کہ ان شیطان صاحب کی نگاہ کرم مجھ پر پڑ گئی اور شیطان کا تو آپ کو پتا ہی ہے..... بندے کو جنت سے نکلوا کر چھوڑتا ہے۔ اس تفصیل میں گئی تو یہ گفتگو بہت لمبی ہو جائے گی۔ مختصر آئیے کہ یہ

حضرت ان دنوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے..... ایسے کبل کی طرح جسے میں چھوڑ سکتی تھی نہ پکڑ سکتی تھی۔ بس نیم دیوانے ہو گئے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ کسی حد تک میری مت بھی انہوں نے مار دی تھی۔ میں جانتی تھی کہ یہ کس قسم کا بندہ ہے۔ اس کی مصروفیات کیا ہیں؟ کہاں کہاں معاشقے چل رہے ہیں۔ کہاں کہاں رنگ بازی ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کے خیال میں مگن تھی۔ جہاں بلاتا چلی جاتی تھی۔ جو کہتا تھا مان لیتی تھی۔“ شیریں نے آنکھیں بند کر کے جھرجھری سی لی۔ جیسے تصور میں وہ سارے نرم گداز مناظر آگئے ہوں۔ پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ”اب سوچتی ہوں تو کانپ جاتی ہوں۔ وہ بڑا خطرناک راستہ تھا۔ جس پر ہم چل رہے تھے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو جاتا تھا۔ یہ وہی دن تھے جب رستم کے اندر سے ایک نئے رستم بھائی برآمد ہوئے اور اس نئے رستم بھائی نے زوار کو بھی بدلنا شروع کر دیا۔ ایک روز رستم بھائی نے مجھے اور زوار کو اکیلے میں دیکھا۔ انہوں نے ہم دونوں سے کہا کہ اگر ہم اس حد تک آگے نکل گئے ہیں تو پھر ہمیں فوراً شادی کر لینی چاہئے۔

زوار سے شادی میری خواہش تھی۔ اصل مسئلہ تو زوار کا تھا۔ وہ ایک ایسے گھوڑے کی طرح تھا جس پر کاشی ڈالنا تو درکنار اسے اس کی مرضی کے خلاف چھوڑنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال یہ رستم بھائی کا حوصلہ ہے جنہوں نے اس بے حد اتھرے گھوڑے کو رام کیا اور اس اسٹیج تک پہنچایا کہ ایک دن زوار نے آنکھوں میں خلوص کی چمک لے کر خود مجھ سے شادی کی درخواست کی۔“

”ابھی تم نے رستم اور زوار کے درمیان ہونے والی جس لڑائی کا ذکر کیا، وہ بھی تو اسی سلسلے کی کڑی نہیں تھی؟“ شانی نے پوچھا۔

”ہاں..... آپ کہہ بھی سکتی ہیں۔“ شیریں بولی۔ ”ان دنوں زوار اپنی چندال چوڑی کے ساتھ ہر ہفتے باقاعدگی سے بازار حسن جاتا اور ڈانس دیکھتا تھا۔ اوہاں پنڈی وال دوست ہر وقت اس کا دم چھلا بنے رہتے تھے۔ وہاں عام طور پر پھنڈے بازی بھی ہوتی تھی۔ رستم بھائی زوار کو روکتے تھے اور وہ رکتا نہیں تھا۔ بس اس بات پر وہ جنگ عظیم ہوئی تھی۔“

”ہاں تو تم شادی کی درخواست کا ذکر کر رہی تھیں۔ تو کیا تم نے زوار کی وہ درخواست قبول کر لی؟“

شیریں کا لہجہ پھر مزاحیہ ہو گیا۔ ”قبول کر لی۔ اس لئے تو اس حال میں بیٹھی ہوئی ہوں جی۔“ وہ مظلوم شکل بنا کر بولی۔ ”بلکہ..... بلکہ اس میں زیادہ قصور امی ابوکا ہے۔ اگر میری عقل گھاس چرنے لگتی ہوئی تھی تو وہ ہی کچھ ہوش کے ناخن لے لیتے۔ پتا نہیں کیا جادو کیا اس شعبدے باز نے ان پر۔ انہوں نے ہاں کہہ دی اب اس حماقت کے بدلے گن گن کر لئے جارہے ہیں مجھ سے۔ بس یہ سارے مرد ایک سے ہی ہوتے ہیں۔“ شیریں نے سر آہ بھری۔

”نہیں..... نہیں ایسا مت کہو۔“ شانی جلدی سے بولی۔ ”زوار تو بہت اچھا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے پیار دیکھا ہے۔“

”پیار ضرور ہوگا لیکن میرے لئے نہیں ہوگا۔“ شیریں نے بڑے یقین سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر بولی۔ ”اب ذرا دیکھئے شادی کے بعد کتنے حوصلے بڑھ گئے ہیں میاں صاحب کے..... اپنی آوارہ گردیوں اور خرمستیوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے انہیں باقاعدہ میوزیم کی شکل دے دی ہے اور دروازے پر لکھ دیا ہے ”ماضی قریب“ یہ بھی مجھے دھمکانے کا ایک طریقہ ہے کہ دیکھ لے بی بی! یہ ماضی ابھی مجھ سے زیادہ دور نہیں گیا۔ کسی بھی وقت حال میں تبدیل ہو کر تجھے بے حال کر سکتا ہے۔ دیکھیں جی! اگر بچو جی میں اتنی ہمت تھی تو شادی سے پہلے بنایا ہوتا یہ گندہ میوزیم۔ اس وقت تو جیسے منہ

میں زبان نہیں تھی۔ گردن میں ہڈی نہیں تھی۔ ابو کے سامنے سر ڈالے بیٹھا تھا اور بکری کی طرح میں میں کر رہا تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا پردے کے پیچھے سے.....“

”اچھا چلو چھوڑو۔ پھر شادی کے بعد کیا ہوا۔ کیا زوار نے تمہیں گاؤں میں رکھنا چاہا؟“

”ہاں جی۔ اس معاملے پر بھی ٹھیک ٹھاک بھڑا ہوا۔ باقاعدہ ہاتھ پائی تک نوبت آگئی تھی ہم دونوں میں لیکن میں اپنے اصولی موقف پر قائم رہی اور زوار کو صاف بتا دیا کہ وہ طے شدہ باتوں کو نہ چھیڑے۔ ہم شہر میں ہی رہیں گے۔“

”مجھے یقین آ گیا کہ تم کالج میں واقعی سٹوڈنٹ لیڈر رہی ہو۔“ شانی نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

شاید شانی اور شیر کی درمیان ہونے والی یہ انکشاف انگیز گفتگو مزید جاری رہتی کہ اچانک کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف شور سنائی دیا۔ ماسی زینب کسی سے جھگڑ رہی تھی۔ شیر کی اور شانی نے ایک ساتھ اٹھ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ شانی کو اپنی رگوں میں خون جتا محسوس ہوا۔ کوٹھی کے مین گیٹ پر پولیس موجود تھی۔ ایک پولیس موبائل گیٹ کے عین سامنے کھڑی تھی۔ دور اُنفل بردار گاڑی کے قریب پائے جاتے تھے جب کہ باقی گیٹ پر تھے۔

”تو کیا یہ لوگ رستم کو ڈھونڈتے ہوئے پہنچ گئے ہیں.....؟“ یہ سوال ایک میخ کی طرح شانی کے دماغ میں پیوست ہو گیا۔

شیر کی کاچہرہ بھی متغیر تھا۔ وہ کچھ کہے سے بغیر تیزی سے نیچے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد شانی نے اسے گیٹ پر پولیس والوں سے بحث کرتے دیکھا۔ شیر کی کاچہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے اور ٹھوس انداز میں بول رہی تھی۔ پولیس آفیسر جو انسپکٹر تھا کچھ دبا ہوا نظر آنے لگا۔ آوازیں شانی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ بہر طور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ پولیس پارٹی گھر کی تلاشی لینا چاہتی ہے۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جو وہ بار بار شیر کی کے سامنے لہرا رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سرچ وارنٹ تھا۔ شیر کی نے ایک بار اس وارنٹ پر نظر ڈالی اور اسے بے پرواہی سے واپس انسپکٹر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

کچھ دیر تک یہ تکرار جاری رہی۔ آخر پولیس انسپکٹر شیر کی اور ماسی زینب کو دھکیلتا ہوا گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کے ماتحت بھی بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ شانی کی ناگوں سے جان نکل رہی تھی۔ وہ میسر سے نکل کر تیزی سے اس کمرے تک پہنچی جہاں رستم مخواب تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ سیدھی اندر چلی گئی۔ رستم سیدھا لیٹا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھا۔ کشادہ چھاتی کا زیرو بم بتا رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ شانی نے جھنجھوڑ کر اسے جگایا۔ ”رستم اٹھو! پولیس آئی ہے۔“

رستم سُرخ آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا اور حیرت سے شانی کو دیکھنے لگا۔ ”رستم! نیچے پولیس والے آئے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر میں اوپر پہنچ جائیں گے۔ م..... مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے لئے آئے ہیں۔“

رستم نے اپنے خوابیدہ ذہن کو چند سیکنڈ میں سنبھال لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تکیے کے نیچے بھرا ہوا کولٹ پستل موجود تھا۔ اس نے پستل قمیص کے نیچے اڑا اور کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی سے نیچے محن کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں دو پولیس والے نظر آئے جو ماسی زینب سے ایک دروازے کا بند تالا کھلوا رہے تھے۔

”اب کیا ہوگا رستم؟“ شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”آپ بے فکر رہیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔“ رستم کے لہجے میں بلا کا اعتماد اور سکون تھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم چھت پر جا کر ساتھ والی چھت پر کود جاؤ۔ کہیں چھنے کی جگہ مل جائے گی۔“

وہ بولا۔ ”پہلے یہ تو بتا چلے کہ یہ غیثت یہاں آئے کس لئے ہیں۔“ وہ بدستور مطمئن تھا۔ شانی کو اس کے اطمینان پر حیرانی ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے اعصاب کی غیر معمولی مضبوطی کا احساس ہو رہا تھا۔ رستم کا اعتماد دیکھ کر شانی کی اپنی ہلچل بھی کم ہو گئی تھی۔ رستم پر دے کی اوٹ سے بغور صحن کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی قمیص کے نیچے پستول کا ابھار شانی کی دھڑکنیں تیز کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد بھاری بوٹوں کی آواز سیڑھیوں پر سنائی دینے لگی۔ وہ لوگ اوپر آ رہے تھے۔ شانی نے کراہ کر کہا۔ ”رستم! تم کہیں ادھر ادھر ہو جاؤ۔“

”بی بی! مجھے نہیں لگتا کہ یہ میرے لئے آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور معاملہ ہو۔“

اس سے پہلے کہ شانی اپنی بات پر اصرار کرتی، رستم نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی اور لائٹ آف کر دی۔ چند سیکنڈ بعد پولیس والے بالائی منزل پر دندناتے لگے۔ وہ دھڑ دھڑ دروازے کھول رہے تھے۔ چیزوں کو بے پرواہی سے الٹ پلٹ رہے تھے، ادھر ادھر پھینک رہے تھے۔ گاہے بگاہے شیر کی احتجاجی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔

وہ ابھی تک پولیس اہلکاروں سے الجھ رہی تھی۔ شانی کو لگا کہ سردی کے باوجود اس کا سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا ہے۔ وہ اور رستم دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ایک بھاری بھر کم آواز آئی۔ ”اوئے حشمت علی! تم ادھر گیلری (لیرس) میں دیکھو اور نیاز تم میرے ساتھ آؤ۔“ یقیناً یہ کرخت آواز پولیس انسپکٹر کی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا جس میں شانی اور رستم موجود تھے۔

”اوئے کون ہے اندر۔ دروازہ کھولو۔“ انسپکٹر کی مشتعل آواز ابھری۔

رستم بے حرکت کھڑا رہا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شانی کو بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

دو تین بار دروازہ کھٹکھٹانے اور گالیاں بکنے کے بعد انسپکٹر اور دو سپاہی آگے بڑھ گئے۔ وہ دوسرے کمرے میں تاکا جھانکی کرنے لگے۔ صرف ایک حوالدار کھڑکی کے سامنے موجود تھا۔ کھڑکی ادھ کھلی تھی۔ حوالدار نے جالی سے چہرہ لگایا اور کمرے کے اندر جھانکنے لگا۔ کمرے میں تاریکی اور باہر روشنی تھی۔ وہ حوالدار کو صاف دیکھ رہے تھے۔ مگر حوالدار کو اندر دیکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ دونوں دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ اگر اس موقع پر وہ ذرا بھی حرکت کرتے تو شاید حوالدار انہیں دیکھ لیتا۔ کم از کم رستم تو ضرور نظر آ جاتا کیونکہ وہ کھڑکی سے زیادہ قریب تھا۔ یہ رستم کا بے پناہ اعتماد ہی تھا کہ وہ اس موقع پر بھی بالکل پرسکون تھا اور اس نے ذرا سی جنبش بھی نہیں کی۔

حوالدار نے ناکام ہو کر چہرہ کھڑکی سے پیچھے ہٹا لیا۔ غالباً اس نے تصور کر لیا تھا کہ دروازہ اندر سے بند نہیں بلکہ باہر سے مقفل کیا گیا ہے۔

شانی کو خوشگوار حیرت ہوئی جب اس نے محسوس کیا کہ پولیس والے گھریلو سامان کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد واپس جا رہے ہیں۔

رستم نے ہولے سے کہا۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ وہ ہمارے لئے نہیں آئے۔“

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس موقع پر وہ بڑی طرح چونک گئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب اس کے ہاتھوں نے رستم کا بازو تھام لیا تھا۔ شانی کے ہاتھوں کی سخت گرفت رستم کے عریاں بازو پر کہنی کے قریب موجود تھی۔ اپنی نازک ہتھیلیوں کے نیچے اسے نسوں کا ابھارا اور بالوں کی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس مردانہ لمس نے ایک لمحے میں اسے نچل کر دیا۔ اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لئے۔ یقیناً پُر اندیش لمحات کے باوجود رستم نے بھی اس لمس کو محسوس کیا تھا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

پولیس پارٹی اب چلی منزل پر تھی۔ شانی نے دیکھا کہ ایک لوڈر پر تین بھاری بھر کم موٹر سائیکلیں لادی جا رہی تھیں۔ یہ وہی موٹر سائیکلیں تھیں جو آج ہی شانی نے زوار کے خاص کمرے میں دیکھی تھیں۔ ان موٹر سائیکلوں کے علاوہ چند رائفلیں اور شراب کی خالی بوتلیں وغیرہ بھی لوڈر پر بار کی جا رہی تھیں۔ شیری پاس ہی موجود تھی اور موبائل فون اس کے کانوں سے لگا تھا۔ یقیناً وہ اس صورت حال کے حوالے سے زوار سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد پولیس والے سامان سمیت کوٹھی سے روانہ ہو گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے زوار کے گھریلو ملازم لیاقت کو بھی گاڑی میں بٹھالیا تھا۔

پولیس کی روانگی کے بعد شانی اور رستم نیچے آ گئے۔ شیری اب بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں وہ کچھ زیادہ فکر مند نہیں ہے۔ وہ برآمدے میں بید کی آرام دہ کرسی پر بیٹھی ٹیڑا پیک جوس پی رہی تھی۔

رستم نے اس سے پوچھا۔ ”یہ وہی باری والا معاملہ تو نہیں؟“

”اسی کتے کو خارش ہو رہی ہے۔“ شیری نے کڑوے لہجے میں تائید کی۔

”لگتا ہے کہ اس کے دماغ کے کیڑے جھاڑنے ہی پڑیں گے۔“ رستم نے پُر سوچ انداز میں کہا۔

پولیس افسر سے دھکم پیل میں شیری کے ہاتھ کی پشت سے ماس چھل گیا تھا۔ وہاں خون کی سُرخی نظر آ رہی تھی۔

چوٹ دیکھ کر شانی بے تاب ہو گئی۔ شیری کو اٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”آؤ میرے ساتھ تمہیں دو الگاؤں۔“

وہ اسے کمرے میں لے آئی اور اپنے بیگ میں سے بینڈیج کا سامان نکال لیا۔ شیری کے ہاتھ پر پٹی کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”یہ

باری کون ہے؟“

”ہے ایک بد خصلت۔“ وہ بولی۔ ”زوار کے پرانے دوستوں میں سے ہے۔ اس کے پیٹ میں ہر وقت اس بات کے مروڑاٹھتے ہیں کہ

زوار نے بد معاش ٹولے سے الگ ہو کر گھر کیوں بسایا ہے۔ پہلے تو پیا ر محبت سے اسے اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرتا رہا، ناکام ہو کر غنڈا گردی پر

اُتر آیا ہے۔ بگڑا ہوا ریکس زادہ ہے اوپر سے کوئی ماما چاچا پولیس کے محکمے میں بھی ہے۔ آج کل وہ موٹر سائیکلوں پر اپنا دعویٰ کر رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”آپ نے جو بی ایم ڈیو موٹر سائیکلیں دیکھی ہیں یہ کافی مہنگی ہیں۔ یہ دو ڈھائی سال پہلے زوار نے اپنی جیب سے ہی خریدی تھیں۔ کسٹم اور دیگر واجبات سب اپنی جیب سے ادا کئے تھے۔ اس وقت جناب کا دماغ کچھ ہلا ہوا بھی تھا۔ یہ چار عدد موٹر سائیکلیں جناب نے اپنے خاص دوستوں کو مفت دی تھیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ یہ دونوں کی ملکیت ہی ہو گئیں۔ یہ موٹر سائیکل سوار ٹولہ کافی عرصے تک راولپنڈی اور اسلام آباد کی سڑکوں پر اودھم مچاتا رہا ہے۔ زوار بھی ان میں شامل تھا۔ سال ڈیڑھ سال پہلے جب زوار کی عقل داڑھ نکلی اور اس نے اپنا چلن بدلا تو سب کچھ بدل گیا۔ زوار نے باری اور باقی دو دوستوں سے موٹر سائیکلیں بھی واپس لے لیں۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ان موٹر سائیکلوں پر کیا کیا خرمستیاں ہوتی ہیں۔ اب باری نے زوار کو پریشان کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ ہر آٹھویں دسویں روز پولیس کسی نہ کسی بہانے دروازہ کھٹکھٹا دیتی ہے۔ آج وہ لوگ موٹر سائیکلیں ہی اٹھا کر لے گئے ہیں۔“

”یہ تو کافی سنجیدہ مسئلہ ہو گیا۔ نوکر کو بھی لے گئے ہیں۔“

شیری مسکرائی۔ ”آپ فکر مند نہ ہوں۔ آپ ابھی زوار کو ٹھیک سے جانتی نہیں ہیں۔ وہ آپ نے پنجابی کا محاورہ تو سنا ہوگا۔ سانپ کو سانپ لڑے تو زہر کس کو چڑھے..... زوار جب اپنے خاص موڈ میں آتا ہے تو کچھ کم زہر پلا نہیں ہوتا۔ وہ باری جیسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتا ہے۔ ایک دو دن میں وہ سب ٹھیک کر لے گا۔“

شیری نے ایک دو دن کا کہا تھا، مگر شانی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اگلے ہی روز دو پہر سے پہلے تینوں دیوبند موٹر سائیکلز ایک پرائیویٹ لوڈر پر واپس آ گئیں۔ لائسنس شدہ رانکھیں اور دیگر سامان بھی جیسے گیا تھا ویسے ہی پلٹ آیا۔ ملازم لیاقت رات کو ہی واپس آ گیا تھا۔ سامان واپس آنے کے بعد شیری اور زوار میں خوب لڑائی ہوئی۔ شیری بولی۔ ”دیکھو تمہیں اپنے واہیات سامان کی کتنی فکر ہے۔ اسے چوبیس گھنٹے بھی تھانے میں نہیں رہنے دیا۔ پچھلے مہینے جب یہی کمینے پلے تلاش کے بہانے میری سنگھار میز توڑ گئے تو تم نے اس کی مرمت تک نہیں کروائی۔“

”بھئی، وہ اس لئے کہ تم خوبصورت ہو۔ اتنی خوبصورت کہ تمہیں سنگھار اور سنگھار میز کی ضرورت ہی نہیں۔“ زوار نے جھٹ جواب دیا۔

”وہ سنگھار میز میرے جہیز کی تھی اور میرے جہیز کی ہر چیز تمہارے نزدیک غیر اہم اور بے کار ہے۔“

”لیکن جہیز والی تو غیر اہم نہیں ہے ناں۔“ زوار شرارت سے بولا۔

”دن کے وقت تو وہ بھی غیر اہم ہے۔“ شیری غصے میں کہہ گئی۔

”چلو۔ آج ثابت کر دیتے ہیں تم کسی بھی وقت غیر اہم نہیں ہو۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

مفہوم سمجھ کر شیری شرم سے سرخ ہو گئی۔ زوار فوراً بدلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”آؤ آج دن دیہاڑے تمہیں..... شاپنگ کرواتے ہیں اور خوب کرواتے ہیں۔ اگر چاہو تو شانی صاحبہ کو بھی ساتھ لے چلو۔ آج کا سارا دن تمہارے نام۔“

”بہت شکریہ۔ ہمیں جانا ہوگا تو خود چلے جائیں گے۔“ شیری نے اپنی خوبصورت ناک چڑھائی اور پاؤں پیچتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

زوار نے مسکین صورت بنا کر شانی کو مخاطب کیا۔ ”دیکھیں جی! اسے جتنی تکلیف سنگھار میز ٹوٹنے کی ہے اس سے دس گنا کم بھی دل ٹوٹنے کی ہوتی تو آج ہم ایک کامیاب جوڑا ہوتے۔“

”تم اب بھی کامیاب ہو۔ بس شرارتی بچوں کی طرح ذرا لڑ لیتے ہو۔“ شانی نے کہا۔

رات کو شیر کی کاموڈ بالکل بحال تھا۔ زوار نے اس کی زخمی سنگھار میز شہر کی بہترین فرنیچر ورکشاپ میں مرمت کے لئے بھجوا دی تھی۔ یہ بڑی سہانی رات تھی۔ پوری رات کا چاند سر شام ہی مشرقی پہاڑیوں سے طلوع ہو گیا تھا۔ چیز اور سفیدے کے بلند درختوں میں سرسراتی ہوئی خشک ہوا بدن کو گدگداتی تھی۔ شیر نے ہلکے گلابی رنگ کا کادار جوڑا پہن رکھا تھا۔ کلائیوں میں تازہ موٹے کے گجرے تھے۔ لباس کے نیچے اس کا بدن بھرپور تھا۔ وہ ایک چنپل ادا کے ساتھ رات کی دہلیز پر تھی اور اس کی آنکھوں میں وہی سرخوشی تھی جو نو بیاہتا لوگوں کی آنکھوں میں رات کی دہلیز پر پہنچ کر ہوتی ہے۔ آنچل ڈھلکا ڈھلکا سا پاؤں ہلکے ہلکے سے۔ آمدہ ساعتوں کا انتظار جن میں خوشگوار لمس اور نشاط انگیز قرب کا وعدہ ہوتا ہے۔ ابھی صرف ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ خواب گاہوں میں جانے کا وقت بہت دور تھا لیکن شیر کی آنکھوں میں ابھی سے بستر بچھا نظر آتا تھا۔

ہاتھوں میں کافی کے کپ لئے وہ دونوں میسر پر آ بیٹھیں۔ نیچے سرسبز لان پر رستم نماز پڑھ رہا تھا۔ سلام پھیرنے کے بعد اس نے جائے نماز تہہ کی اور اوپر میسر کی طرف دیکھا۔ پھر وہ میڑھیاں چڑھ کر میسر پر چلا آیا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے شانی سے پوچھا۔ ”بی بی! میں بازار جا رہا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔“

”نہیں! ابھی تو کچھ نہیں چاہئے۔“ شانی نے کہا۔

وہ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ شیر کی نظروں سے اسے جاتے دیکھتی رہی پھر طویل سانس لے کر بولی۔ ”شانی! مجھے سب کچھ بہت عجیب سا لگتا ہے۔“

”کیا؟“

”رستم بھائی! جب آپ سے بات کرتے ہیں تو ان کی نظریں ہمیشہ جھکی رہتی ہیں۔ آپ بھی ان کی طرف زیادہ نہیں دیکھتیں۔ پھر ان کا ”بی بی“ کہنے کا انداز بھی بے حد عجیب ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح وہ ”بی بی“ کہتے ہیں اس طرح کوئی اور کہہ نہیں سکتا۔“

شانی خاموش رہی۔

شیر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میرا اور زوار کا حتمی فیصلہ ہے کہ آپ سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کریں گے لیکن..... کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بغیر کسی سوال جواب کے سمجھ میں آتی ہیں..... بالکل خوشبو کی طرح جو اپنے آپ پھیلتی ہے۔ نظر نہیں آتی لیکن اس کے ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔“

شانی سمجھ گئی کہ بات کس رخ پر جا رہی ہے۔ اس نے موضوع بدلنے کے لئے کوئی مناسب فقرہ ڈھونڈنا شروع کیا مگر اس دوران میں شیر بول پڑی۔ ”میں اور زوار اکثر سوچا کرتے تھے کہ وہ کیا چیز ہے جس نے رستم بھائی کو اتنی جلدی اور اتنی طاقت سے بدلا ہے۔ اتنا تو ہمیں بھی پتا

چل گیا کہ کوئی لڑکی ہے۔ رستم بھائی اس کی محبت میں یوں گرفتار ہوئے ہیں کہ باقی سب کچھ بھلا دیا ہے۔ مگر وہ ہے کون؟ کہاں رہتی ہے؟ کیسی ہے؟ ان سوالوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ زوار حالانکہ رستم کا بے تکلف دوست ہے لیکن اس میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس بارے میں کچھ پوچھ سکتا۔ ایک دوسرے اس نے بے تکلفی کے زعم میں رستم بھائی سے پوچھا بھی لیکن اتنا سنجیدہ اور خشک جواب ملا کہ دوبارہ اس کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ ناراضگی دکھانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ دن گزرتے گئے اور ہمارا تجسس اس بارے میں بڑھتا گیا۔ وہ کون ہے؟ وہ کہاں ہے؟ اس قسم کے بے شمار سوال تھے۔ پھر..... ایک دن پتا ہے کیا ہوا؟“

شانی بس سوالیہ نظروں سے شیر کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

شیری بولی۔ ”پھر ایک دن..... رستم بھائی آپ کے ساتھ اس چار دیواری میں آ گئے۔ کہتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں ہم عورتوں کی حس تیز ہوتی ہے۔ شانی آپ یقین کریں؟ آپ کی پہلی جھلک دیکھتے ہی مجھے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ وہ آپ ہی ہیں جس نے..... ایک خونی ڈاکو اور خطرناک قاتل کی کاپی پٹی ہے اور اسے انسان بلکہ بہت اچھا انسان بنا دیا ہے..... اب آپ اقرار کریں یا نہ کریں۔ اس بارے میں کوئی بات کہیں یا نہ کہیں لیکن میں اور زوار اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ آپ ہی ہیں جس نے رستم اور ان کے کئی ساتھیوں کی زندگیاں بدلی ہیں اور اس طرح بدلی ہیں کہ لوگ دیکھتے رہ گئے ہیں۔“

شیری کی نظریں شانی کے تلخ چہرے پر جمی تھیں اور وہ خاموش بیٹھی تھی۔ ایک گہرے سمندر کے مانند اوپر سے بے صدا اندر سے پُرشور اور متلاطم۔

”میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟“ شیری نے ہولے سے پوچھا۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں شیری۔ میں اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔“ شانی نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ چاند افق سے ابھر کر کافی اوپر آ گیا تھا۔ اس کی روشنی دور مار لگے کی پہاڑیوں پر چمک رہی تھی۔

اس رات شانی بہت دیر تک جاگتی رہی۔ شیری کی باتوں نے اس کے اندرونی اضطراب میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ نادان نہیں تھی۔ وہ اپنی طرف اٹھنے والی ہر نظر کا مفہوم سمجھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کچھ چھپانا چاہ رہی ہے وہ چھپنے والا نہیں۔ پچھلے کئی دن سے وہ مسلسل اپنے اور رستم کے تعلق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ بھول بھول سوچتی تھی اس کی الجھن میں اضافہ ہوتا تھا۔

رستم کے لئے اس کے دل میں نرم گوشہ تو موجود تھا اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ گوشہ وسیع ہو رہا تھا مگر ابھی اس کیفیت کو کوئی واضح شکل نہیں ملی تھی۔ بے شک رستم اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کی موجودگی شانی کی ڈھارس بندھاتی تھی۔ وہ جب موجود نہیں ہوتا تھا تو شانی اس کے بارے میں سوچتی تھی..... لیکن اس سب کے باوجود وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ رستم سے محبت کرتی ہے۔ کم از کم یہ شدید محبت تو ہرگز نہیں تھی۔ ایسی محبت جس کے بعد کسی کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ زندگی بوجھ لگنے لگتی ہے۔

ایک دو بار اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ جیون کا راستہ بے حد سناں ہو گیا ہے۔ اس خاردار راستے پر دور دور تک کوئی اپنا نہیں

ہے۔ اگر وہ کہیں آگے چل کر رستم کا ہاتھ تھام لے تو شاید زیست کا سفر آسان ہو جائے لیکن اس نے جب بھی ایسا سوچا دل میں عجیب سی بے چینی جاگ گئی۔ اسے رستم کے قرب کے تصور سے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ جانتی تھی وہ اس سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ ایسی غیر معمولی محبتوں کے لئے قرب..... زہر قاتل ہوتا ہے..... وہ اس نہایت نازک اور لطیف جذبے کو قتل کرنا نہیں چاہتی تھی جو اس کے اور رستم کے درمیان موجود تھا۔

پھر کسی وقت اس کا دھیان رستم کے موجودہ حالات کی طرف چلا جاتا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ نارپور کے سیال بھی بڑی تندہی سے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو کب کا قبائلی علاقے میں روپوش ہو چکا ہوتا لیکن اب اس کی وجہ سے وہ یہاں پنڈی میں روپوش ہونے پر مجبور تھا۔ موجودہ صورت حال میں وہ رستم کے لئے بوجھ کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ آزادی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا..... اس کی ”بے حرکتی“ اس کے لئے موت کا پھندا بن جاتی تو کیا ہوتا؟

کیا وہ رستم کو اپنی وجہ سے نقصان اٹھاتے دیکھ سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب یکسر نفی میں تھا۔ وہ اندر سے کانپ جاتی تھی۔ ایسے میں ذہن کے اندر یہ خیال ابھرتا تھا کہ وہ رستم کو چھوڑ کر چپ چاپ کسی طرف نکل جائے۔ رستم نے اس کے لئے کئی قربانیاں دی تھیں۔ اب اسے مسلسل آزمائشوں میں ڈالے رکھنا کہاں کا انصاف تھا؟

لیکن پھر فوراً ہی دوسری طرح کے خیال ذہن پر حملہ آور ہوتے۔ کیا رستم اس کی اچانک دوری برداشت کر لے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے پھر نارپور یا رنگ والی پہنچ جائے اور دشمنی کی مہلک آگ کی نذر ہو جائے.....

اس سوچ میں بہت وزن تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شیریں نے جو کچھ کہا تھا وہ مزید خوفزدہ کر دینے والا تھا۔ شیریں نے سیدھے سادے انداز میں اس شدید محبت کا ذکر کیا تھا جو شانی کے حوالے سے رستم کے دل میں موجود تھی..... شانی جانتی تھی ایسے جذبے بڑے سرکش اور بے رحم ہوتے ہیں۔ انسانوں اور ان کی زندگیوں کو ماچس کی تیلیوں کی طرح بکھیر دیتے ہیں۔ کہیں رستم بھی تو بکھر نہیں جائے گا..... کہیں اس کی زندگی بھی تو چکناپور نہیں ہو جائے گی۔ یہ بڑا اہم سوال تھا اور اس کا جواب شانی کے دل کی گہرائی میں پکپی سی پیدا کر دیتا تھا۔

وہ ان تمام سوچوں کا ایک نتیجہ نکالتی تھی اور نتیجہ یہ تھا کہ وہ رستم سے دور چلی جانا چاہتی ہے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ ٹوٹ پھوٹ جائے۔ کسی وقت وہ بے ساختہ سوچتی۔ کتنا اچھا ہو کہ رستم کی زندگی میں کوئی اچھی لڑکی آجائے جو اسے سنبھال لے۔ آنا فانا اس کے دل میں بس کر اسے اپنے دل میں بسالے..... رستم کے جذبہ محبت کی ساری شدتیں اس لڑکی کی طرف منتقل ہو جائیں۔ وہ نا دیدہ جال ٹوٹ جائے جس نے شانی کو جکڑ رکھا ہے۔ وہ آزاد ہو کر کسی ان دیکھی منزل کی طرف ہجرت کر جائے۔ یوں رستم سے دور جاتے ہوئے اسے یہ اطمینان ہو کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔

شانی کو آج کل ہمہ وقت یہی گلتا تھا کہ وہ دو کشتیوں کی سوار ہے۔ وہ رستم سے دور جانا چاہتی ہے اور پاس بھی رہنا چاہتی ہے۔ رات کی تنہائیوں میں اس کے دل کی کیفیت عجیب ہو جاتی۔ اسے لگتا کہ کوئی غیر مرئی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے..... یا پھر کوئی اور ہے جو کمرے کی تنہائی میں اس کے قریب ہے۔ اسے کسی کے سانسوں کی مدھم آواز سنائی دیتی..... کانوں میں چاندی کے کڑوں کی کھڑکھڑاہٹ گونجتی۔ ذہن میں ایک ڈرانے والی سوچ ابھرتی۔ کہیں گلیہ تو اس کے آس پاس موجود نہیں۔

وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی اور پھر جلد ہی اس کی فطری دلیری اور قوت برداشت اس کے کام آتی اور وہ اس سہمی واہے کے جال سے نکل آتی۔

ایک شام شانی ٹی وی لائونج میں ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو گئی۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ اچانک ماسی زینب کی آواز نے اسے جگا دیا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”کیا بات ہے ماسی جی؟“ شانی نے پوچھا۔
 ”تم نے اس برقع والی کو دیکھا ہے؟“ ماسی نے کہا۔
 ”کون برقع والی؟“

شجر ممنوعہ

علی میاں پبلیکیشنز
 ۲۰۔ عزیز مارکیٹ، رازدوار، لاہور۔

محی الدین نواب

قیمت -/100 روپے

”وہی جو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی ہے۔“ ماسی نے دبی آواز میں کہا۔

”نن..... نہیں۔ میں ذرا سو گئی تھی۔“

”وہ اوپر گئی ہے رستم کے پاس۔“

شانی کا ذہن ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ اسے ماسی زینب کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

ماسی نے کہا۔ ”ابھی ایک لڑکی آئی ہے۔ کہتی ہے کہ میں رستم کے پنڈ سے آئی ہوں۔ اس سے ملنا ہے۔ میں نے اسے اوپر رستم کے کمرے

میں بھیج دیا۔“

”اب وہ کہاں ہے؟“

”آؤ“ میں تمہیں دکھاؤں۔“ ماسی زینب رازداری سے بولی اور شانی کی انگلی پکڑ کر اسے میڑھیوں کی طرف لے آئی۔

شیری اور زوار دونوں گھر میں نہیں تھے..... ماسی زینب کے انداز نے شانی کو پریشان کر دیا تھا۔

ماسی شانی کو کھینچتی ہوئی بالائی منزل پر لے آئی۔ یہاں شام کی گہری تاریکی نے پر پھیلا لئے تھے۔ ماسی نے شاید جان بوجھ کر کوئی لائٹ

نہیں جلائی تھی۔ وہ شانی کو سیدھا ایک ادھ کھلی کھڑکی کے سامنے لے آئی۔ آنکھوں کے اشارے سے اس نے شانی سے کہا کہ وہ اندر دیکھے۔

شانی نے جھپکتے ہوئے اندر نگاہ دوڑائی۔ رستم کے کمرے کا ایک تہائی حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک صوفہ ایک شیشے کی تپائی اور دیوار گیر

الماری کا تھوڑا سا حصہ۔ صوفے پر ایک برقع پوش لڑکی بیٹھی رو رہی تھی۔ اسے خوبصورت کہا جاسکتا تھا۔ رونے سے اس کی سفید ناک اور آنکھیں سُرخ

ہو رہی تھیں۔ شانی کو اس کی شکل کچھ شناسا سی لگی۔

اسی دوران میں کمرے کے دوسرے گوشے سے رستم کی ناراضگی بھری آواز ابھری۔ ”تمہارے علاوہ اور کون جانتا ہے کہ میں یہاں ہوں؟“

”صرف..... صرف یعقوب۔“ لڑکی نے ”صرف“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور تم جانتے ہو کہ یعقوب کے سینے سے کوئی بات باہر نہیں

نکل سکتی۔“

”میں اس کے بارے میں کیا جانوں گا۔ میں تو تمہارے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ پتا نہیں تم کیسی عورت ہو۔ میرے لئے مصیبت

بن گئی ہوتی..... بھوت بن کر چٹ گئی ہو مجھ سے۔“

لڑکی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”رستم! میں بہت بدل گئی ہوں۔ تمہارے لئے خود کو بہت بدلا ہے میں نے۔ ذرا میری طرف غور سے تو دیکھو۔ کیا تمہیں مجھ میں کچھ نیا نظر نہیں آتا؟“

”لیکن..... لیکن تمہیں یہاں کا پتہ کیسے چلا؟“ رستم نے شپٹا کر کہا۔

”بس لگن سچی ہو اور بندہ کوشش کرے تو خدا بھی ملتا ہے۔“

”اگر کوئی تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا ہو تو پھر؟“ رستم کے دھیمے لہجے میں گرج تھی۔

”نہیں رستم! میں بڑی سے بڑی ضمانت دے سکتی ہوں کہ ایسا نہیں ہوا۔“

اچانک شانی کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اسے یاد آ گیا کہ خوبرو لڑکی کی شکل جانی پہچانی کیوں لگ رہی ہے۔ نارپور کی حویلی میں ایک روز گمینہ نے اپنے چوڑیوں والے ٹوکڑے کے نیچے سے ایک اخبار نکالا تھا۔ اس اخبار میں اس لڑکی کی تصویر موجود تھی۔ ہاں! یہ وہی تھی۔ اُبھرتی ہوئی معروف اداکارہ نادیہ..... جو رستم سے ملنے کے لئے اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر اچانک نارپور چلی آئی تھی اور دو روز حاجی حیات خان کے ڈیرے پر رہی تھی۔

شانے سنائے میں رہ گئی۔ ایک فلمی اداکارہ کو میک اپ کے بغیر سادہ سے برقع میں دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ وہ شکل صورت سے عام گھریلو لڑکی نظر آتی تھی۔ کوئی خاص نخر ابھی نہیں تھا۔ یا شاید واقعی اس نے خود کو تبدیل کر رکھا تھا۔

رستم اس سے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو! میں یہاں تمہیں ایک منٹ کے لئے برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ میرے دوست کا گھر ہے۔ یہاں اس کی فیملی ہے۔ تمہیں یہاں سے جانا ہوگا۔ ابھی..... اسی وقت۔“

”پلیز ایسا مت کرو۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں بہت کچھ چھوڑ کر آئی ہوں۔“

”تو میں نے کہا تھا چھوڑنے کے لئے۔ میں تمہارے کسی قول فعل کا ذمہ دار نہیں ہوں۔“

”تم کچھ بھی کہو رستم! لیکن میں اب واپس نہیں جاسکتی۔ مجھے اپنے پاس رکھو گے تو اسی میں تمہاری بھی بہتری ہے۔ تم بھی محفوظ رہو گے۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ”رستم! میں تم سے دور نہیں رہ سکتی۔ بار بار تمہاری طرف آؤں گی..... میری یہ بے قراری تمہارے لئے خطرہ بن جائے گی۔ کوئی اور بھی میرے قدموں کا پیچھا کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا تو پھر.....“

”بہت خوب۔ تم مجھے دھمکا رہی ہو۔“ رستم کا لہجہ آتش بار تھا۔

”نہیں! خدا کی قسم نہیں۔“ اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں تو تمہاری بے دام کی غلام ہوں۔“

”بس اتنی درخواست کرتی ہوں۔ مجھے خود سے دور نہ کرو۔“

وہ ہاتھ باندھے کسی حسین پجاری کی طرح رستم کے رو برو کھڑی تھی۔ ہلکی براؤن آنکھوں میں التجا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ برقع کے اندر

سے بھی اس کا پہچان خیز جسم اپنے خدو خال نمایاں کر رہا تھا۔

رستم شانی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا، تاہم اس کی آواز ساعت تک پہنچ رہی تھی۔ رستم نے کہا۔ ”جو کچھ بھی ہے۔ تم یہاں نہیں رہ سکتی ہو۔ تمہیں جانا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چلی جاتی ہوں۔“ نادیر نے جلدی سے کہا۔ ”لیکن مجھے اپنے آس پاس تو رہنے دو۔“

”کیا مطلب؟“ رستم کی ناراض آواز ابھری۔

”یہاں پاس ہی میری ایک پرانی سیٹیلی کا مکان ہے۔ میں وہاں رہ لوں گی۔“

”سیٹیلی کا مکان؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم ڈرامہ کر رہی ہو۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بس تم مجھے اپنے آس پاس رہنے کی اجازت دے دو۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں کہوں گی۔“

”سیٹیلی کے مکان والا جھوٹ کیوں بول رہی ہو تم؟“

”نہیں رستم! واقعی یہاں میرے پاس رہنے کے لئے مکان ہے۔“

”کس کا مکان ہے؟“ رستم کی آواز میں بدستور ناراضگی تھی۔ دونوں دھیمی آواز میں بول رہے تھے لیکن شانی چونکہ کھڑکی کے بالکل پاس تھی اس لئے گفتگو کا مفہوم سمجھ رہی تھی۔ ماسی زنب اسے وہاں چھوڑ کر نیچے جا چکی تھی۔

”بتاؤ۔ کس کا مکان ہے؟“ رستم نے سوال دہرایا۔

وہ ڈرے ڈرے تاثرات کے ساتھ بولی۔ ”اور زیادہ ناراض تو نہیں ہو جاؤ گے؟“

”دیکھو مجھ سے الٹی سیدھی بات نہ کرو۔ سیدھا سیدھا بتاؤ کہ کس کا مکان ہے؟“

وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ انداز میں لگاؤ اور معنی خیزی تھی۔ اس مسکراہٹ کے ذریعے شاید اس نے اپنی گھبراہٹ کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ دھیمی آواز میں بولی۔ ”اسی لین میں دو گھر چھوڑ کر میں نے 14 نمبر کوٹھی کرائے پر لے لی ہے۔ مم..... مجھے پہلے ہی ڈرتھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ

نہیں رہنے دو گے۔“

”میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ.....“ رستم کی کرخت سرگوشی ابھری۔ ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اب اس میں نہیں کیا کر سکتا

ہوں۔“

عالمی رستم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ نادیر بھی کھڑی ہو گئی۔ شانی جلدی سے ایک چوڑے ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ دونوں آگے پیچھے کرے سے نکلے۔ رستم آگے اور نادیر پیچھے تھی۔ نادیر نے مجبورا انداز میں پوچھا۔ ”تو تمہاری طرف سے اجازت ہے؟“

”میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔“ رستم نے غصیلی سرگوشی کی اور پاؤں پختا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

حالات نے ایک دلچسپ موڑ لیا تھا۔ شانی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نادیر نامی اس فلمی اداکارہ سے راولپنڈی کی اس کوٹھی میں اس

انداز سے ملاقات ہوگی۔

نادیہ کی یہاں آمد سے ایک بات تو کلیئر ہو جاتی تھی۔ وہ رستم کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھی۔ اگر اپنے بیان کے مطابق وہ واقعی اپنی فلمی مصروفیات ترک کر کے لاہور سے یہاں آ پہنچی تھی اور اس نے رستم کے قریب رہنے کے لئے ایک مکان بھی لے لیا تھا تو پھر یہ بڑی حیران کن صورت حال تھی۔ بے شک نادیہ کوئی بہت بڑی اداکارہ نہیں تھی۔ وہ ابھی ترقی کے ابتدائی زینوں پر تھی۔ اداکارہ سے زیادہ اس کی پہچان ایک ”سیکس سمبل“ رقاصہ کی حیثیت سے تھی مگر کچھ بھی تھا اس نے لاہور کی فلم نگری میں اپنے سارے کاموں کو فل اسٹاپ لگا کر..... اور یہاں پہنچ کر ایک بڑا قدم اٹھایا تھا۔ ماسی نہن کو شانی نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ یہ لڑکی رستم کے گاؤں کی ہی ہے اور اپنے کسی ذاتی کام سے یہاں پہنچی ہے۔ رات کو شیریں اور زوار شاپنگ کے حوالے سے لڑتے جھگڑتے گھر پہنچ گئے۔ زوار کے نزدیک شیریں سے بڑھ کر فضول خرچ عورت رُوئے زمین پر نہیں تھی اور شیریں کے نزدیک دنیا کے کنجوس ترین مردوں میں زوار سر فہرست تھا۔ بہر حال پکیٹوں اور لفافوں کی تعداد بتا رہی تھی کہ اس مرتبہ شیریں کا موقف کمزور ہے۔ شانی نے ان دونوں کو بھی نادیہ کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا۔ بہر حال اتنا بتانا تو ضروری تھا کہ کوئی برقع پوش عورت رستم سے ملنے آئی تھی۔

اگلے دو روز تک اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ تیسرے روز شام کو شانی نے صحن میں ایک منظر دیکھا اور چونک گئی۔ ایک قریبی کٹھی کی چھت پر پرسوں والی برقع پوش لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ چھت کی منڈیر اونچی تھی۔ لڑکی، یعنی نادیہ کے صرف شانے اور چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بالوں کی لٹیں اور اس کا سبز آنچل ایک ساتھ ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ بالائی منزل پر رستم کے کمرے ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رستم کے کمرے کی کھڑکیاں تاریک تھیں۔ وہ شاید سو رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک وہاں کھڑی رہی یہاں تک کہ اندھیرا چھا گیا۔ وہ شانی کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

رات نو بجے کے لگ بھگ وہ کمرے کی کھڑکی میں نظر آنے لگی۔ اس وقت رستم اور زوار لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ شانی اور شیریں برآمدے میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ شانی کا دھیان ٹی وی کی طرف کم اور پڑوس کی کھڑکی کی طرف زیادہ تھا۔ وہ اس انوکھی صورت حال سے پوری طرح باخبر تھی۔ معروف فلمی اداکارہ نادیہ ایک سامنے والی کھڑکی میں موجود تھی..... اور اپنے محبوب مرد سے آنکھ مچولی کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی..... وہ حسن و شباب کی ساری رعنائیوں سے لیس ہو کر یہاں پہنچی تھی اور اپنے من کی مراد پانے کے لئے ہر حد تک جانے کو تیار نظر آتی تھی۔ شانی نے اسے تین دن پہلے بند کمرے میں رستم کے روبرو دیکھا تھا۔ ان لمحوں میں جیسے اس کا انگ انگ خود سپردگی کی دہائی دے رہا تھا۔ انسان کا ذہن بھی عجیب گورکھ دھندا ہے۔ بندے کو ایسے ایسے چکروں میں الجھاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

جو کچھ یہاں ہو رہا تھا اس سے صرف شانی آگاہ تھی..... لیکن جلدی ہی یہ آگاہی شانی تک محدود نہیں رہی۔ اگلے روز شام کو شانی نہا کر ہاتھ روم سے نکلی تو شیریں بھاگی بھاگی اس کے پاس آئی۔ وہ اب اسے بے تکلفی سے باجی کہنے لگی تھی بولی۔ ”شانی باجی! آئیں! میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتی ہوئی برآمدے میں لے آئی۔ تو لیے میں لپٹے ہوئے شانی کے بال کھل کر اس کی کمر کو بھگونے لگے۔ دونوں

ایک نیم تارک کو نے میں کھڑی ہو گئیں۔ شیرنی نے کہا۔ ”وہ سامنے چھت پر دیکھیں..... اور بوجھیں کہ کون ہے؟“

وہاں کل کی طرح ناد یہ موجود تھی۔ شانی نے آنکھیں کھل کر دیکھا اور انجان بن کر بولی۔ ”کون ہے؟“

شیرنی سنسنی خیز انداز میں کہنے لگی۔ ”باجی شانی، مجھے ایک شک پڑ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فلمی اداکارہ ناد یہ ہے۔ وہی ناد یہ جس کا تذکرہ اخباروں میں رستم بھائی کے ساتھ آیا تھا۔“

”واقعی؟“ شانی نے اس موقع پر انجان بننا بہتر سمجھا۔

”آپ ذرا غور سے دیکھیں نا۔“ شیرنی نے اصرار کیا۔

شاننی نے چھت پر نگاہیں مرکوز کیں۔ ”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

”سو فیصد ٹھیک کہہ رہی ہو باجی۔“ شیرنی کے لہجے میں سنسنی تھی۔ ”اور یہ سب کچھ اتفاقیہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ ایکٹرس پلاننگ کے تحت

یہاں آئی ہے۔ اس کی آمد چار پانچ دن پہلے ہی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے یہ کبھی کرائے کے لئے خالی تھی۔“

”کیا ہو سکتی ہے پلاننگ؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ شیرنی نے آنکھیں گھمائیں۔ ”یہ چندال ہاتھ دھو کر اپنے رستم بھائی کے پیچھے پڑی ہوئی ہے..... آپ

انجان مت بنیں۔ مجھے پتا ہے آپ بھی بہت کچھ جانتی ہوں گی۔“

”بہت کچھ تو نہیں۔ بس تھوڑا بہت۔“

”خیر جو بھی ہے لیکن اس وقت اہم ترین مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ حرافہ یہاں ہمارے گھر کے عین سامنے موجود ہے۔ اوہ مائی گاڈ..... اب پتا

نہیں کہ رستم بھائی اس بارے میں جاننے ہیں یا نہیں۔“

شاننی کو وہیں چھوڑ کر شیرنی سڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر رستم کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

شاننی وہیں کھڑی رہی۔ ناد یہ چھت پر ٹھہرنے والے انداز میں گھوم رہی تھی۔ ہوا چل رہی تھی اور اس کے بال اڑ رہے تھے۔ وہ گاہے بگاہے

رک کر اپنے بالوں کو سینے کی کوشش کرتی تھی۔ بے شک وہ ایک ایکٹرس تھی اور لاہور کی فلم نگری سے تعلق رکھتی تھی لیکن ایک بات ماننا پڑتی تھی اس کی

شکل و صورت میں ایکٹرسوں والا بازاری پن اور تصنع نہیں تھا۔ باقی دلوں کے حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد شیرنی پھر اس کے سامنے موجود تھی بولی۔ ”رستم بھائی انجان نہیں ہیں۔ انہیں اس چھک چھلو کی یہاں آمد کے

بارے میں پتا لگ چکا ہے اور آپ کے لئے ایک نئی خبر بھی ہے۔“

”کیسی خبر؟“

”تین دن پہلے جو برج والی ہمارے ہاں آئی تھی وہ یہی خانہ خراب تھی۔“

شاننی نے اپنی بے خبری کا بھرم رکھنے کے لئے چہرے پر حیرت سجائی۔

شیری جلے کئے انداز میں بولی۔ ”یہ ان عورتوں میں سے ہے جو اپنا سب کچھ تھیلی پر لئے پھرتی ہیں۔ اپنے حسن کے خنروں سے مردوں کو بے حال کرتی ہیں لیکن اگر ان کو خود کوئی مرد پسند آجائے تو پھر کتیا کی طرح اس کے پاؤں چاٹنے کے لئے بھی تیار رہتی ہیں۔ اب یہ اُلوی پٹھی پتا نہیں کہ کس طرح اور کیسے رستم بھائی کا کھوج لگا کر یہاں تک پہنچی ہے اور دلیری دیکھیں کہ گھر کے عین سامنے ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئی ہے۔ میں تو آج ہی شیخ صاحب کی بیگم سے بات کرتی ہوں۔ ان سے پوچھتی ہوں کہ یہ کس ”شریف زادی“ کو کوشی دے ڈالی ہے انہوں نے۔“

شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”کچھ بھی کرنے سے پہلے رستم سے مشورہ ضرور کر لینا۔ کہیں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو جائے۔ ایسی عورتوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا..... رستم نے خود کو یہاں روپوش کیا ہوا ہے اور یہ عورت اس ٹھکانے کو جان چکی ہے۔“

شانی کی بات سے شیری کا جوش قدرے ماند پڑ گیا۔ آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ شانی نے کہا ”رستم جانتا ہے کہ ناد یہ یہاں موجود ہے۔ اس کے باوجود وہ خاموش ہے۔ آخر اس کی کوئی وجہ ہوگی۔“

کچھ دیر تک وہ دونوں اس بارے میں بات کرتی رہیں۔ پھر زوار کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور شیری اس کے استقبال کے لئے مین گیٹ کی طرف چلی گئی۔

☆=====☆=====☆

اردو ادب کے مشہور افسانے

کتاب **اردو ادب کے مشہور افسانے** بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔ (آخری آدمی، پسماندگان، انتظار حسین)؛ (آپا، ممتاز مفتی)؛ (آنندی، غلام عباس)؛ (اپنے دکھ مجھے دے دو، وہ بڑھا، راجندر سنگھ بیدی)؛ (بلاؤز، کالی شلوار، سعادت حسن منٹو)؛ (عید گاہ، کفن، شکوہ شکایت، منشی پریم چند)؛ (گڈریا، اشفاق احمد)؛ (توبہ شکن، بانو قدسیہ)، (گنڈاسا، احمد ندیم قاسمی)؛ (حرام جادی، محمد حسن عسکری)؛ (جینی، شفیق الرحمن)؛ (لحاف، عصمت چغتائی)؛ (لوہے کا کمر بند، رام لعل)؛ (ماں جی، قدرت اللہ شہاب)؛ (مٹی کی مونالیزا، اے۔ حمید)؛ (اوور کوٹ، غلام عباس)؛ (مہا لکشمی کا پل، کرشن چندر)؛ (ٹیلی گرام، جو گندر پال)؛ (تیسرا آدمی، شوکت صدیقی) اور (ستاروں سے آگے، قراۃ العین حیدر)۔

یہ کتاب **افسانے** سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ شیریں نے شانی کو بتایا کہ والدہ کی خراب طبیعت کی وجہ سے چھ سات روز کے لئے میکے جانا پڑ رہا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں شانی اس ایکٹرس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہے جو ان کے گھر کے عین سامنے مورچہ لگائے بیٹھی تھی۔ شیریں نے شانی کے ہاتھ تھام لئے اور کئی سینڈ تک عجیب نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ کہنے لگی۔ ”شانیا باجی، پتا نہیں کیا بات ہے دو چار دنوں میں ہی یوں لگنے لگا ہے کہ آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے لئے کچھ کروں۔ آپ کے کسی کام آؤں..... لیکن آپ تو کچھ بتاتی ہی نہیں..... پتا نہیں کیسے کیسے دکھ اپنے سینے میں سینے بیٹھی ہیں۔“

”کچھ بھی سمیٹا ہوا نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ خود کو پریشان نہ کرو۔“

اس نے جیسے شانی کی بات سنی ہی نہیں۔ اپنی رومیں بولتی چلی گئی۔ ”آپ کی ذاتی زندگی میں دخل دینے کا مجھے کوئی حق نہیں اور نہ میں دینا چاہتی ہوں لیکن ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کہ یہ بات میرے دل کی گہرائی سے اٹھتی ہے اور وہ یہ کہ آپ کو کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ کوئی مضبوط اور محبت بھرا سہارا..... پلیز باجی، آپ اپنے آس پاس دیکھیں۔ اگر آپ کو کوئی ایسا سہارا نظر آئے اور آپ اس کے لیے دل میں تھوڑی سی بھی گنجائش پائیں تو اس سے دور مت رہیں۔“

شانیا جانتی تھی کہ شیریں کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہ خاموش رہی۔

شیریں کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اور ہلکی سی شوخی تھی۔ بولی ”ہو سکتا ہے کہ آپ کے آس پاس کوئی ایسا ہو جو آپ سے بہت محبت کرتا ہو۔ اس کے لب خاموش ہوں لیکن وہ دن رات آپ کا نام لے کر جیتا ہو۔ سیانے کہتے ہیں کہ ایسی محبتوں کی قدر کرنی چاہئے۔ ورنہ آہستہ آہستہ وہ دور ہو جاتی ہیں..... یا انہیں کوئی دور کر دیتا ہے۔ اچھے بُرے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں نا۔“

شیریں جو کچھ کہہ رہی تھی وہ شانی کی سمجھ میں آ رہا تھا لیکن یہ سب کچھ شانی کے ذہن سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

پچھلے دو تین دن میں شانی نے نادیہ کو بغور دیکھا تھا۔ اس کی چال ڈھال کا مشاہدہ کیا تھا۔ ایک بار اتفاقاً گھر کے سامنے واقع پارک میں بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ صبح بہت سویرے شانی ماسی زینب کے ساتھ تھوڑی سی چہل قدمی کے لئے گئی تھی۔ وہاں نادیہ اپنی دس بارہ سالہ ملازمہ کے ساتھ نیلے رنگ کے ننھے ننھے پھول توڑ کر ایک ننھا سا گلہ سہ بنا رہی تھی..... دونوں میں سلام دعا ہوئی تھی۔ شانی نے کہا۔ ”آپ وہی ہیں نا جو سامنے 14 نمبر کوٹھی میں رہتی ہیں؟“

نادیہ نے اثبات میں جواب دیا تھا اور اس کے بعد دونوں میں چار پانچ منٹ بات ہوئی تھی۔ اس بات چیت میں شانی کو نادیہ کچھ ایسی بُری نہیں لگی تھی۔ بے شک اس کے چہرے پر حسن کی چکا چوند تھی اور جسم بھی چیختا چنگھاڑتا ہوا تھا، مگر یہ سب کچھ لباس میں ڈھکا ڈھکا اور دبا دبا سا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ان عورتوں میں سے ہے جو ذرا سی کوشش سے کسی بھی خشک سے خشک مرد کو متوجہ کر سکتی ہیں۔

اسی روز شام کو شیریں میکے چلی گئی۔ شانی اب گھر میں تنہا تھی۔ تنہائی میں سوچیں اسے مزید شدت سے گھیرتی تھیں اور بے بس کر دیتی تھیں۔ کبھی کبھی اس وسیع و عریض کوٹھی میں بھی اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ کہاں؟ یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں

نادیہ کو یہاں دیکھنے اور اس سے ملنے کے بعد شانی کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اگر وہ کسی روز اچانک یہاں سے چلی بھی جائے تو شاید رستم کے لئے یہ صدمہ زیادہ شدید ثابت نہ ہو۔ اس خیال کی بظاہر کوئی ٹھوس وجہ تو نہیں تھی بہر حال یہ شانی کے ذہن میں موجود تھا۔

شیری کے جانے کے بعد دو تین روز میں شانی نے نادیہ سے کچھ راہ ورسم پیدا کی۔ وہ تو جیسے پہلے ہی کسی ایسے موقع کی منتظر تھی۔ پہلے تو چھت پر سے ہی دونوں میں سلام دعا ہوتی رہی۔ پھر ایک روز دوپہر کو نادیہ بریانی کی پلیٹ لے کر از خود شانی کے پاس چلی آئی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ابھی ابھی کوکنگ سیکھی ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ آج پہلا کھانا پکایا ہے۔ اگر آپ اس میں کوئی ”رسک“ نہ سمجھیں تو کچھ کر ضرور دیکھیں۔“

شانی نے چکھا۔ جو کچھ تھا گزارے مافق تھا تاہم شانی نے تعریف کی اور حوصلہ افزائی کے الفاظ کہے۔ ابھی تک دونوں میں تفصیلی تعارف نہیں ہوا تھا۔ آج یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ صورت حال ایسی تھی کہ دونوں اپنا تعارف نہیں کر سکتی تھیں۔ مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ شانی نے نادیہ کو بتایا کہ وہ شیری کی پرانی سیکلی ہے۔ والدین اور بڑے بھائی کی وفات کے بعد وہ گاؤں سے یہاں آگئی اور اب کوئی ملازمت تلاش کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی ہے۔ نادیہ نے شانی کو اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اداکاری کا شوق تھا“ کچھ عرصہ پہلے ڈراموں اور فلموں میں اداکاری کرتی تھی۔ اس کام میں مجھے کافی عزت اور شہرت بھی ملی، لیکن اب ایک دم اکٹا گئی ہوں۔“

شانی نے کہا۔ ”شاید اسی لئے آپ کی شکل کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔“

”یقیناً بہت سے لوگ مجھے جانتے ہیں۔“ وہ مسکرائی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اب میں اور طرح کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا گھر ہوشوہ اور بچے ہوں۔ روپے پیسے کی مجھے کوئی کمی نہیں۔ بس ایک اچھے جیون ساتھی کی تلاش ہے۔“

شانی نے دل میں سوچا..... ساتھی بھی تو ڈھونڈ چکی ہوا اور اس کے قریب بھی پہنچ چکی ہو۔ اب آئندہ کیا ہوگا۔ اس کے متعلق تو اللہ ہی جانتا ہے۔

کچھ دیر تک شانی اور نادیہ میں باتیں ہوئیں۔ باتوں کے دوران میں بھی نادیہ کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹکتی رہیں۔ وہ جیسے کسی کو تلاش کر رہی تھی اور شانی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کسے تلاش کر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ ”کل پھر بریانی بناؤں گی اور آپ کو ٹیسٹ کراؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ کل کا ذائقہ آج سے بہتر ہوگا۔“

”مجھے بھی لگ رہا ہے۔“ شانی نے کہا۔

اگلے روز وہ شام کو آئی۔ اس نے گلابی رنگ کی زبردست شلوار قمیص پہن رکھی تھی کپڑے کی تراش ایسی تھی کہ بدن کے دل آویز خطوط نمایاں ہوتے تھے..... آج بریانی واقعی کل سے بہتر تھی۔ شانی نے اسے جو دو چار مشورے دیئے تھے ان پر اس نے ذہانت سے عمل کیا تھا۔ آج اتفاقاً رستم بھی گھر میں ہی موجود تھا۔ شانی نے کچھ بریانی ایک پلیٹ میں نکالی اور ماسی زنب کو دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ رستم کو دے آؤ اور پوچھنا کیسی ہے؟ یہ مت بتانا کہ کون لایا ہے۔“

ماسی زنب کی واپسی دو چار منٹ بعد ہوئی۔ کہنے لگی۔ ”رستم کو بہت پسند آئی ہے پوچھ رہا ہے کس نے بنائی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاید تم نے بنا کر بھیجی ہے۔“

شانی نے ماسی سے کہا۔ ”اس سے کہو کہ آکر دیکھ لے کس نے بنائی ہے۔“

کچھ دیر بعد زینوں پر رستم کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر وہ ان کے سامنے تھا۔ شانی کے پاس نادیا کو بے تکلفی سے بیٹھے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”تم یہاں؟“

نادیا پہلے تو ذرا گھبرائی پھر سنبھل کر بولی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے پہلے سے جانتے ہو۔ خیر یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ ملک کے لاکھوں لوگ مجھے جانتے ہیں۔“

”کیوں آئی ہو تم یہاں؟“ رستم بھنگا گیا۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ”میں تمہارے پاس کہاں اپنی پیاری دوست کے پاس آئی ہوں۔ آج کل ان سے کھانا پکانا سیکھ رہی ہوں۔ ایک نئے اسٹائل سے جینا چاہ رہی ہوں اس لئے بہت کچھ سیکھنا پڑے گا۔“

”تم نے جو کچھ سیکھ لیا ہے وہی کافی ہے۔ جاؤ لاہور میں کسی کیمبرے کے سامنے ڈانس کرو اور کھیتوں میں چھلانگیں لگاؤ۔ یہاں بھلے مانس لوگوں میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”بھلی مانس بننے کے لئے ہی تو بھلے مانس لوگوں میں آئی ہوں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں پھر دلدل میں واپس جاؤں۔“

”تم دلدل سے نکلی ہی کب ہو۔ تم تو اپنی دل پشوری کے لئے بس سوا گرجا رہی ہو۔ اداکاری تمہارا پیشہ ہی نہیں تمہاری فطرت بن چکی ہے۔ میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ جاؤ یہاں سے۔“

نادیا تحمل اور سکون سے رستم کا غصیلالوجہ برداشت کر رہی تھی۔ ماتھے پر سلوٹ تک نہیں تھی۔ اس موقع پر شانی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”رستم اس وقت یہ میری مہمان ہیں۔ تم ان سے اس لمحے میں بات نہیں کر سکتے۔“

رستم کا چہرہ سُرخ ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ شانی کی بات کا کوئی سخت اور مدلل جواب دینا چاہتا ہے۔ نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ جیسے وہ کوئی ادنیٰ غلام ہو اور اپنے آقا و ان داتا کے سامنے زبان کھولنا اس کی ہمت اور طاقت سے باہر ہو۔ آقا نے جو کہہ دیا۔ وہ صحیح ہے یا غلط بس وہی حقیقت ہے اور اسی کو ماننا عین اطاعت ہے۔

شانی نادیا کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ نادیا بولی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ سے اس بارے میں چھپایا۔ دراصل میں اور رستم ایک دوسرے کو بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ گوجرانوالہ کے نواحی علاقے میں ایک گاؤں نارپور ہے۔ چند ماہ پہلے وہاں ایک فلم کی شوٹنگ کے لئے گئے تھے۔ وہاں ہمارے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا۔ کچھ مسلح غنڈوں نے ہمارے یونٹ کے تین چار افراد کو سخت زخمی کر دیا اور مجھے اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے جانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر ایک عام آدمی نے فلمی ہیرو والا کردار ادا کیا اور میری جان ان شرابی غنڈوں سے چھڑائی۔ وہ آدمی یہی رستم تھا۔ اس واقعے کے بعد ہم دونوں میں جان پہچان پیدا ہوئی اور ہم ایک دوسرے کے کچھ قریب آ گئے لیکن اس دوران میں ایک دو غلط فہمیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ ان غلط فہمیوں کا دھواں ابھی تک آپ نے رستم کے چہرے پر دیکھ ہی لیا ہے۔“

”آپ اداکارہ ہیں اور آپ کی کہانی بھی بالکل فلموں جیسی ہے۔“ شانی نے ہولے سے کہا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں شانی۔ میرے خیال میں مجھے آپ کو بتا دینا چاہئے کہ میں یہاں صرف رستم کے لئے ہی موجود ہوں۔ آپ کو میری باتیں عجیب لگیں گی اور پتا نہیں آپ میرے بارے میں کیا سوچیں گی مگر میں اس موقع پر آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ شاید آپ کو معلوم ہوا ہی ہوگا کہ دس گیارہ دن پہلے ایک برقع والی عورت یہاں رستم سے ملنے آئی تھی۔“

شانہ نے اثبات میں جواب دیا۔

نادیہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ”وہ میں ہی تھی۔“

شانہ نے نادیہ کا انکشاف خاموشی سے سنا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ یہ سب کچھ پہلے سے جانتی ہے بلکہ ان دونوں کا طویل مکالمہ بھی سن چکی ہے۔

اس روز نادیہ ساری کی ساری شانی کے سامنے کھل گئی۔ اس نے صاف الفاظ میں شانی کو بتایا کہ وہ رستم کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے ہر حد تک جانے کو تیار ہے۔ شانی کو اس کے لہجے میں جذبے کی شدت اور خواہش کی شدت محسوس ہوئی۔ اس نے شانی کو اپنا ہمدرد وہم مزاج تصور کر لیا تھا اور اس کے سامنے دل کا ہر پھپھولا پھوڑنے کو تیار ہو گئی تھی۔

شانہ توجہ اور اپنائیت سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ رستم کے لئے نادیہ کے جذبے کی شدت محسوس کر کے معلوم نہیں کیوں شانی کے سینے میں کچھ ہونے لگا تھا۔ یہ کیا تھا؟ ایک ٹیس..... ایک جلن..... یا شاید صرف ایک تلخ احساس۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا، شانی اسے نظر انداز کر کے نادیہ کی باتوں پر توجہ دیتی رہی۔

اگلے روز نادیہ نہیں آئی مگر اس سے اگلے روز شانی نے ماسی زینب کے ہاتھ اسے پھر بلا بھیجا۔ دونوں قریباً دن بھر ساتھ رہیں۔ رستم بھی گھر میں ہی موجود تھا۔ یقیناً نادیہ کی موجودگی اسے بے چین کر رہی تھی مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی بے چینی یا ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتا۔ شانی کے سامنے اس کی ساری فزکس کیمسٹری ہی بدل جاتی تھی۔ ایک عجیب رشتہ تھا اس کا اپنی ”بی بی“ کے ساتھ۔ بی بی نے جو کہہ دیا وہ اس نے بے چوں و چرا مان لیا۔

شانہ بڑے دھیان سے نادیہ کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی نادیہ اسے دل سے بُری نہیں لگ رہی تھی۔ نادیہ کی اس بات میں بھی صداقت محسوس ہوتی تھی کہ وہ خود کو مکمل طور پر تبدیل کر رہی ہے اور ایک نئی زندگی نئے ڈھنگ سے شروع کرنا چاہتی ہے۔ نادیہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے شانی کو بتایا تھا کہ وہ پچھلے کئی ہفتے سے رستم کی کھوج میں تھی۔ فلم لائن میں نادیہ کا سیکرٹری یعقوب نام کا شخص تھا۔ نادیہ کے بقول یہ ادھیز عمر شخص بے حد کارآمد ہونے کے علاوہ نہایت دیانت دار اور مخلص بھی تھا۔ اس نے کسی طرح رستم کو یہاں راولپنڈی میں تلاش کیا تھا۔

ایک دن شانی پر انکشاف ہوا کہ نادیہ کی آواز بھی اس کی طرح خوبصورت ہے۔

اس نے نادیہ کو گنگٹنا نے کے لئے کہا۔ اس نے فیض کی ایک غزل بڑے اچھے تلفظ اور سُور کے ساتھ سنائی۔

جب وہ گنگٹنا رہی تھی رستم زینے اُتر کر نیچے چلا آیا۔ غالباً اسے گمان ہوا تھا کہ شانی گنگٹنا رہی ہے۔ اس نے دروازے میں سے نادیہ کو

دیکھا تو جلدی سے واپس پلٹنے لگا۔ شانی نے آواز دے کر اسے روک لیا..... ”جی بی بی“ وہ دروازے پر ہی کھڑے کھڑے بولا۔

”اندر آ جاؤ، تمہیں ایک بڑی اچھی آواز سنواتے ہیں۔“
”دل..... لیکن۔“

”آ جاؤ نا۔“ شانی نے دروازہ کھٹکے۔

وہ سر جھکائے ہوئے اندر آ گیا، نادیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شانے! آپ ان سے کوئی بدلہ لے رہی ہیں۔ دیکھ نہیں رہیں کہ ان کی صورت کتنی پریشان ہو گئی ہے۔ یہ ہرگز سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔“

”آپ گائیں گی تو موڈ بھی بن جائے گا۔“ شانی نے شیریں کا ستار نادیہ کی طرف کھٹکاتے ہوئے کہا۔
”کیا سناؤں؟“ وہ مسکرائی تو اس کے گال میں خوبصورت گڑھا پڑا۔
”کوئی پنجابی چیز سنا دیں۔“ شانی نے کہا۔

نادیہ کی نازک انگلیاں مشاقی سے ستار کے تاروں پر حرکت کرنے لگیں۔ وہ بڑے انداز سے بیٹھی تھی۔ ایک اداکارہ کی حیثیت سے وہ اپنے جسم کے خوش نما خطوط کو غیر محسوس طور پر نمایاں کرنے کا فن بھی جانتی تھی۔ اس نے دھیمی آواز میں گانا شروع کیا۔

چنے نال چاننی تارے نال کو ماہیا
توں پھل موچے داں میں تیری خشبو ماہیا

(جیسے چاند کے ساتھ چاندنی اور تارے کے ساتھ روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح تُو موچے کا پھول ہے اور میں اس کے ساتھ تیری خوشبو ہوں)
جب وہ گارہی تھی زوار بھی گھر آ گیا۔ محفل جمی دیکھ کر وہ بھی ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا۔ زوار بھی رستم اور نادیہ کی پوری کہانی سے آگاہ ہو گیا تھا۔ یقیناً اسے بھی نادیہ کا یوں آزادانہ اپنے گھر میں آنا جانا پسند نہیں تھا، مگر نادیہ کے ساتھ شانی کا گہرا دوستانہ دیکھتے ہوئے اور اس حوالے سے رستم کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

نادیہ کی دل آویز اور نفیس آواز نے واقعی سماں باندھ دیا۔ زوار موسیقی کی سمجھ بوجھ رکھتا تھا وہ نادیہ کو بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو گیا۔ پنجابی گیت ختم ہوا تو زوار نے ایک اور گیت کی فرمائش کر دی۔ شانی نے کن آنکھیں سے رستم کی طرف دیکھا۔ وہ اس صورت حال سے خوش نہیں تھا مگر شانی کی وجہ سے چپ رہنے پر مجبور تھا۔ یقیناً رستم کو زوار پر بھی غصہ آ رہا تھا جو اس کی بغل میں بیٹھ کر نادیہ کو داد دے رہا تھا۔
زوار کی فرمائش پر نادیہ نے جو دوسرا گیت سنایا وہ اردو تھا اور اسے فلمی کلاسیکل گیت کہا جاسکتا تھا۔ نادیہ کی نکھری اور اجلی اجلی آواز کمرے میں گونجی۔

نہ چھڑا سکو گے دامن نہ نظر بچا سکو گے

یہ گیت حسب حال بھی تھا۔ گانے کے دوران میں نادیہ کی نہایت شوخ و چنچل نظریں گاہے بگاہے رستم کی طرف اٹختی رہیں۔ وہ اپنی جگہ

ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ اگر بی بی کا حکم نہ ہوتا تو شاید کب کا اٹھ کر جا چکا ہوتا۔

اس رات کھانے کے بعد جب شانی برآمدے میں بیٹھی تھی رستم اس کے قریب چلا آیا۔ ”میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں بی بی۔“
”تو کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔“ شانی نے سامنے بید کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ بیٹھ گیا۔ نگاہیں حسب معمول جھکی ہوئی تھیں۔ کھاکر کر بولا۔ ”بی بی! آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ مجھے کس بات کی سزا دے رہی ہیں؟“
”میں نے کیا کیا ہے؟“

”آپ جانتی بھی ہیں کہ یہ عورت کیا چاہتی ہے؟ کس وجہ سے یہ یہاں موجود ہے۔ اس کے باوجود آپ اسے بار بار یہاں بلاتی ہیں۔ آپ اس کی باتوں پر نہ جائیں۔ یہ جو کچھ خود کو دکھانے کی کوشش کر رہی ہے، اصل میں وہ نہیں ہے۔ یہ صرف اس کا بہروپ ہے، مجھ تک پہنچنے کے لئے۔“
”رستم! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ بہروپ نہ ہو۔ اس نے واقعی خود کو تبدیل کرنے کی دل میں ٹھان لی ہو۔ میں اس کی باتیں بڑی توجہ سے سنتی ہوں۔ مجھے ان میں سچائی کی جھلک نظر آتی ہے۔“

”آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے بی بی۔ سینما اسکرین پر اپنے جلوے دکھانے والی عورت خود کو اتنی جلدی کیسے تبدیل کر سکتی ہے۔“
شانی نے عجیب نظروں سے رستم کو دیکھا اور نرم لہجے میں بولی۔ ”ایسا ہوتا ہے رستم! خونی ڈاکو اور بے رحم قاتل اگر دیکھتے ہی دیکھتے بہت نیک اور ہمدرد انسان بن جاتے ہیں تو ایک ایکٹرس بھی شریف اور گھریلو عورت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ یہ سب اندر کے موسم کی بات ہوتی ہے۔ جب یہ بدلتا ہے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔“

رستم کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ کچھ دیر کے لئے وہ لا جواب سا ہو گیا تھا۔ شانی نے کہا۔ ”جہاں تک میرا خیال ہے نادیا ایک اچھی لڑکی ہے۔ وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ جب تم اس کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہو تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔“

رستم نے چونک کر شانی کو دیکھا، اس کے منہ سے نکلنے والا ”دکھ“ کا لفظ جیسے کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے سینے پر لگا تھا۔ وہ ایک دم خجل نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی لرزاں پلکیں جھکائیں اور بولا۔ ”ٹھیک ہے بی بی! میں آئندہ اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔“
وہ اٹھا اور اپنے قدموں باہر نکل گیا۔ کوئی اسے دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ وہ کوئی عقیدت مند ہے، کوئی سپاس گزار پرستار ہے جو اپنے مدوح کے آستانے سے اٹھ کر باہر آ رہا ہے۔

شیری کا قیام اپنے میکے میں کچھ لمبا ہو گیا تھا۔ اس کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دن میں ایک دو بار اس کا فون آ جاتا تھا۔ لڑنے جھگڑنے کے لئے اسے زوار کی کمی بھی بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ رات کو ایک بار وہ زوار کو فون ضرور کرتی تھی۔ شیری کو بھی تعجب تھا کہ شانی نے نادیا سے دوستی کر لی۔ یہ صورت حال اسے بھی کچھ پسند نہیں آئی تھی مگر شانی کی وجہ سے اس نے زیادہ کلمتہ ہائے اعتراض نہیں اٹھائے تھے۔

شانی اس کوشش میں تھی کہ رستم اور نادیا کے درمیان گفت و شنید کوئی صورت پیدا ہو۔ یہ گفت و شنید ہی ہوتی ہے جو ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور فاصلے کم ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے شانی، نادیا کی ہر ممکن مدد کر رہی تھی۔ وہ کوشش کر کے ایسے مواقع پیدا کر لیتی تھی جب رستم کو

نادیہ سے بات کرنا پڑتی تھی۔ یوں نادیا یہ خود بھی کم فعال نہیں تھی۔ اس کی شوخی آمیز ذہانت دیواروں میں در بنانے کی قدرت رکھتی تھی۔ اس کا حسین سراپا اور گداز لہجہ مشکل میں اس کے مددگار اور معاون تھے۔ زوار کے ساتھ نادیا کی کافی بننے لگی وہ اسے بڑے بھائی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ وہ بھی اس کی آواز کا مداح تھا۔ ایک روز زوار کی فرمائش پر نادیا نے ایک پرانی پاکستانی فلم کا مزاحیہ گانا ایسے قبچہہ بار انداز میں سنایا کہ رستم بھی مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

شانی جب سے رستم سے ملی تھی یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو اس نے رستم کے چہرے پر دیکھی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کی داڑھی اور مونچھوں کے بیچ سے اس کے سفید دانت لشکارا مارتے تھے اور آنکھوں میں چمک بھر جاتی تھی۔

نہ جانے کیوں اس رات بہت دیر تک رستم کی مسکراہٹ شانی کے ذہن میں چمکتی رہی۔ اسے یوں محسوس ہوتا رہا کہ یہ مسکراہٹ اس نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ بہت عرصے پہلے..... بہت زمانے پہلے..... لاکھوں سال قبل۔ شاید اس وقت جب اس کا وجود بھی نہیں تھا۔ ایک بار پھر ابا جی کی کہی ہوئی ”عالم ارواح“ والی بات اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ جوشکیں ہمیں پہلی بار دیکھ کر ہی جانی پہچانی لگتی ہیں ان سے ہماری شناسائی عالم ارواح میں ہوئی ہوتی ہے۔ کیا یہ شخص بھی اس کے لئے کسی اور جہان کا شناسا تھا؟ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے یا یہ صرف اس ”نرم گوشے“ کی کارستانی ہے جو پہلے روز سے شانی کے دل کی گہرائیوں میں موجود ہے؟

پھر اس نے یہ سارے خیالات اپنے ذہن سے جھٹک دیئے اور خود کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ جو راستہ اس نے اپنے لئے چنا تھا وہ بالکل موزوں تھا۔ اسی راستے پر چلنے میں اس کی سلامتی اور آبرو تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ رستم کے جذبے کی بے پناہ شدت سے آگاہ نہیں تھی لیکن وہ اس حقیقت کو بھی سمجھتی تھی کہ وہ اس جذبے کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ایک بلند و بالا اُن دیکھی دیوار تھی جو اس کے اور رستم کے درمیان حائل تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بات بھی بہت اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اس کا ”ساتھ“ رستم کے موجودہ مصائب میں اضافہ کرتا چلا جائے گا۔ وہ ایک بوجھ کی طرح رستم پر لدی ہوئی تھی اور رستم مانتا یا نہ مانتا لیکن اس بوجھ نے اس کے پاؤں زمین میں گاڑ رکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رستم سے دور چلی جانا چاہتی تھی۔ بس اس کے ارادے کے سامنے ایک رکاوٹ تھی۔ اس کی حساسیت کو گوارا نہیں تھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد رستم کا منہ زور جذبہ رستم کو توڑے پھوڑے یا اس کے شب و روز کو ویران کر دے۔ یہی سبب تھا کہ چند روز پہلے اس نے صدقِ دل سے یہ چاہا تھا کہ رستم کی زندگی میں کوئی عورت آجائے۔ کوئی ایسی خوش خلق لڑکی جو اپنی محبت کی بانہوں میں اسے سمیٹ لے۔

شانی کو تو قلع نہیں تھی کہ اس کی دعا اتنی جلدی پوری ہوگی اور اس انداز میں ہوگی۔ ماضی قریب کی ایک چمکتی وکتی اداکارہ سادگی اور خوش خلقی کے ایک نئے سانچے میں ڈھل کر وارد ہوئی تھی اور بہت کچھ بدل دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔

وہ بہت دیر تک سوچتی رہی اور پھر سوچتے سوچتے ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ دوبارہ شانی کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے ارد گرد زار پہل سی محسوس ہوئی۔ ماسی نینب نے اسے آواز دے کر جگایا تھا۔ ماسی نینب کی آنکھیں رونے سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ رستم بھی گم صم سا پاس ہی کھڑا تھا۔ ماسی نینب نے اشک بار لہجے میں بتایا۔ ”شانی بیٹا! شیر کی والدہ فوت ہو گئی ہیں۔ ابھی دس منٹ پہلے فون آیا ہے۔“

”اوہ میرے خدا!“ شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

شیری کا چہرہ اس کے تصور میں آیا۔ وہ اپنی والدہ سے بہت محبت کرتی تھی۔ ان کی اچانک موت نے یقیناً اسے بے حال کر دیا ہوگا۔
 ”زوار کہاں ہیں؟“ شانی نے پوچھا۔
 ”وہ تو خبر ملتے ہی چلے گئے ہیں۔“ ماسی نے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی جانا چاہئے۔“ شانی نے کہا۔ پھر سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھ کر بولی۔ ”تمہاری کیا رائے ہے؟“
 ”آپ ٹھیک کہتی ہیں بی بی۔“

تقریباً ایک گھنٹے بعد شانی روانہ ہو رہی تھی۔ رستم بھی ساتھ جا رہا تھا۔ ماسی زینب کو انہوں نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ شانی سیاہ برقع میں تھی صرف آنکھیں ہی نقاب سے باہر تھیں۔ زوار کے پاس تین گاڑیاں تھیں۔ ایک گرے خیر کی چابی اس نے احتیاطاً رستم کو دے رکھی تھی۔ رستم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شانی ایک لمحے کے لئے تذبذب میں رہی کہ کہاں بیٹھے۔ اس دوران میں رستم نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ شیری کا میکہ گلستان کالونی میں تھا۔ وہاں تک کا سفر خاموشی سے طے ہو گیا۔ بس ایک دو بار شانی نے عقب نما آئینے میں رستم کا چہرہ دیکھا۔ وہ بڑی محویت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ سڑکوں پر رش بھی کافی تھا۔ یہ دفتر اور سکول جانے کا وقت تھا۔

شانی نے بڑی دیر تک شیری کو گلے لگا کر دلاسا دیا۔ وہ خود بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ اسے اپنوں سے پھٹنے کے مناظر یاد آ گئے تھے۔ خاص طور سے امی کی جدائی کا منظر نگاہوں میں گھومنے لگا تھا۔ امی جو وفا، محبت اور ایثار کا پیکر تھیں۔ جنہوں نے لوگوں کے دلوں پر چوہدرائٹ کی تھی اور وہی آپا کے نام سے مکر بھی ذہن میں زندہ تھیں۔

فوتیدگی والے گھر سے شانی اور رستم کی واپسی دو پہر ایک بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ صدر کے علاقے سے گزر رہے تھے جب شانی نے اچانک رستم کو چونکتے دیکھا۔ وہ بڑے غور سے عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ پھر شانی کو محسوس ہوا کہ ایک 82 ماڈل سفید ٹویو ناگاڑی بڑی تیزی سے انہیں اوور ٹیک کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ شانی نے کارسواروں کی فقط ایک جھلک دیکھی۔ اسے ایک شخص پولیس کی وردی میں نظر آیا۔ باقی تین افراسفید کپڑوں میں تھے مگر صورتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی اس محکمے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک فربہ اندام شخص کی آنکھوں میں شانی کو آگ سی روشن دکھائی دی۔

رستم نے سفید کار کو اوور ٹیک نہیں کرنے دیا اور اپنی گاڑی کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ صدر جیسے بارونق علاقے کی سڑکوں پر گرے خیر لہراتی اور چرچراتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ”کیا بات ہے رستم؟“ شانی نے پوچھا۔
 ”کک..... کچھ نہیں۔ مجھے ذرا سا شک ہوا ہے۔“ رستم نے مختصر جواب دیا۔ تاہم اس کے لہجے کی گھمبیر تا شانی کو سمجھا رہی تھی کہ بات معمولی نہیں ہے۔

اگلے چار پانچ منٹ میں بہت کچھ واضح ہو گیا۔ خیر کار آندھی کی رفتار سے پنڈی کی بھری پُری سڑکوں پر بھاگ رہی تھی اور سفید کار (جس میں یقیناً پولیس والے تھے) بلائے ناگہانی کی طرح ان کے پیچھے آ رہی تھی۔

رستم کی تیز ڈرائیونگ کا مظاہرہ شانی ایک دفعہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ اس وقت وہ لوگ قریب المرگ فاخر کوٹار پور کی جلتی حویلی سے نکال کر ہسپتال کی طرف لے جا رہے تھے۔ بہر حال آج صورت حال بالکل مختلف تھی۔ آج ویران دیہاتی راستے کے بجائے شہر کی بھری پڑی سڑکیں ان کے سامنے تھیں۔ کئی جگہ تو یوں لگتا تھا کہ ٹریفک بلاک ہو گئی ہے۔ آخر ایک جگہ ٹریفک واقعی بلاک ہو گئی۔ رستم کے لئے گاڑی کو آگے بڑھانا ممکن نہ رہا۔ سفید کار بالکل سر پر پہنچنے والی تھی۔ رستم گاڑی کو بیچ سڑک پر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

<http://kitaabghar.com>

”بی بی آجائیں۔“ اس نے پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے رستم کے کہنے پر عمل کیا اور باہر آ گئی۔ ارد گرد کے لوگ حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ رستم نے شانی کا ہاتھ تھاما اور سڑک کر اس کر کے ایک گنجان مارکیٹ میں گھس گیا۔ یہاں لوگوں کا اژدھام تھا۔ وہ بھیڑ کا حصہ بن کر دوڑ نکل سکتے تھے۔ شاید رستم اکیلا ہوتا تو اب تک محفوظ دوری پر پہنچ گیا ہوتا مگر شانی کی وجہ سے وہ بہت تیز نہیں چل سکتا تھا۔ وہ لوگوں سے ٹکراتے بھڑتے آگے نکلتے چلے گئے۔ اچانک ایک آواز نے شانی کے جسم میں سرد لہر دوڑادی۔ ”وہ جا رہے ہیں۔“ کسی نے گرج کر کہا۔ یہ آواز پندرہ بیس میٹر پیچھے سے آئی تھی۔ ”وہ آگئے ہیں رستم۔“ شانی نے ہانپتی آواز میں کہا۔

رستم کے قدموں میں مزید تیزی آ گئی۔ تاہم شانی اس تیزی کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ شانی نے دیکھا کہ رستم نے اپنی قمیص کے نیچے سے سیاہ پٹل نکال لیا ہے۔ پیش آمدہ خطرات کے احساس نے شانی کو دہلا دیا۔ یکا یک ایک ہٹا کٹا شخص بائیں جانب سے چیل کی طرح جھپٹا۔ شانی کو اس کی آمد اور موجودگی کا احساس اس وقت ہوا جب وہ رستم کو اپنے لمبے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ چکا تھا۔

شانی کا ہاتھ تو رستم کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ رستم نے تڑپ کر خود کو آزاد کرنا چاہا، مگر گرائنڈیل شخص کی گرفت ”جن“ کی طرح تھی۔ بمشکل دو سیکنڈ گزرے ہوں گے دو خود کار رائفلیں رستم کے سر سے لگ گئیں۔ تعاقب کرنے والی پولیس پارٹی ان تک پہنچ گئی تھی۔

ارد گرد موجود لوگ شدید ہراس کے عالم میں تتر بتر ہو گئے۔ ایک سفید پوش پولیس والے نے رستم کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ دوسرے نے بڑے زور کا تھپڑ رستم کے منہ پر مارا۔ یہ تھپڑ بارش کے پہلے قطرے کی طرح تھا۔ ایک ساتھ تین پولیس اہلکار رستم پر پل پڑے اور اسے بے دریغ مارنے لگے۔ سفید ٹویٹا کار لہراتی چرچراتی ہوئی ان کے قریب آ کر رستم کو اٹھا کر اس میں پھینک دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ نہایت کڑخت ہاتھوں نے شانی کو بھی بے دردی سے کار میں دھکیل دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ڈرائیور کے علاوہ چار پولیس والے بھی کسی نہ کسی طرح گاڑی میں لد گئے۔ دو پولیس والے تو رستم پر تقریباً سوار نظر آ رہے تھے۔ تیسرے سفید پوش نے بڑی ڈھٹائی سے اپنی ٹانگیں شانی کی ٹانگوں پر چڑھا دی تھیں اور اس کے بازو کہنیوں کے اوپر سے یوں جکڑ رکھے تھے جیسے اسے اندیشہ ہو کہ وہ بند گاڑی کے اندر سے ہوا کی طرح اڑ جائے گی۔

جن دو بٹے کٹے افراد نے رستم کو دبوچ رکھا تھا ان میں سے ایک کے کندھے کے تین پھول بتا رہے تھے کہ وہ انسپٹر ہے۔ اس نے بڑے قطعی انداز میں خود کار رائفل کی نال رستم کی کہنی سے لگا رکھی تھی۔ اس کے باوجود انسپٹر کی صورت سے نظر آتا تھا کہ وہ رستم کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہے۔

”اس حرامی کو چھڑی چڑھالیں راجا صاحب۔“ ایک ماتحت نے ہانپتی ہوئی آواز میں انسپکٹر کو رائے دی۔

”چڑھالیتے ہیں۔ پہلے اس رش سے تو نکلو۔“ انسپکٹر نے کرخت لہجے میں کہا۔ پھر پھنکار کر ڈرائیور سے بولا۔ ”خدا بخشا! گاڑی تیز چلا۔ کیا ہتھکڑوں کی طرح ٹھک ٹھک کر رہا ہے۔“

ڈرائیور نے سپیڈ کچھ اور بڑھادی۔ اگلی نشست پر بیٹھا ہوا بھاری بھر کم سانولا شخص بولا۔ ”میرا خیال ہے گاڑی چوک پر دو منٹ کے لئے روک لو۔“

چند موڑ کاٹنے کے بعد گاڑی ایک نسبتاً ویران جگہ پر رک گئی۔ یہ ایک چوک نما جگہ تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کو کچے میں اتارا اور تین بند کھوکھوں کے عقب میں لے گیا۔ پاس ہی سے ایک گندانا لاگزر رہا تھا۔ اگلی نشست پر بیٹھے گہرے سانولے پولیس والے نے نشست کے نیچے سے اپنی ہتھکڑیاں نکالیں اور رستم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اگر وہ لوگ اسے سیدھی ہتھکڑی لگانا چاہتے تو یہ آسان کام تھا۔ مگر وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی احتیاط کر رہے تھے۔ وہ رستم کو اٹھا کر بٹھانا چاہتے تھے تاکہ اس کے بازو پیچھے کو موڑ کر ہتھکڑی میں جکڑ سکیں۔ رستم پہلو کے بل اگلی اور پچھلی نشستوں کے درمیان خلا میں پھنسا ہوا تھا اور حقیقت احوال یہ تھی کہ اسے ہتھکڑی لگانے کی کوئی ایسی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ فربہ اندام پولیس والوں کے نیچے اس کے لئے حرکت کرنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ جب پولیس والوں نے رستم کو کھینچ کر سیدھا کیا اور ماں بہن کی گالیاں بکتے ہوئے اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف لے جانے کی کوشش کی تو پہلی بار اس کی نگاہ شانی پر پڑی۔ رستم کی آنکھوں میں ایک ایسی تبدیلی رونما ہوئی جسے شانی کے سوا کسی نے نہیں دیکھا اور شاید شانی نے بھی اس تبدیلی کی شدت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ رستم کی آنکھوں میں رونما ہونے والی یہ تبدیلی ”بنوئی چمک“ سے مشابہ تھی۔ ایک ایسی کیفیت جو ایک بھڑکے ہوئے انسان کے اندرونی فشار کو انتہا تک پہنچاتی ہے اور اسے ارد گرد کے ماحول اور مصلحتوں سے بے گانہ کر دیتی ہے۔

گاڑی کے اندر ایک بد ہیئت پولیس والا شانی پر تقریباً اٹھایا ہوا تھا اور یقیناً یہی منظر تھا جس نے رستم کی جلتی پرتیل کا کام کیا تھا۔ وہ سرسراتی آواز میں بد ہیئت پولیس والے کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”ان سے پیچھے ہٹ جاؤ۔۔۔۔۔ ان کو ہاتھ مت لگاؤ۔“

”اوہو۔ یہ معشوقہ صاحبہ ہیں تمہاری؟“ انسپکٹر نے زہریلے انداز میں کہا۔

”میں کہتا ہوں کہ انہیں ہاتھ مت لگاؤ۔ مجھے جہاں لے جانا ہے لے جاؤ۔“

”ورنہ کیا کرو گے؟ ہیر و بن جاؤ گے؟ ہماری لاشیں گرا کر بھاگ جاؤ گے۔“ انسپکٹر نے خود کار رائل کی نال رستم کی گردن میں بے رحمی سے گھسیڑی۔

”اس جوہی چاول کا گھونگھٹ تو اٹھاؤ یا رستم کے لئے یہ خجے دت بن رہا ہے۔“ کالے پولیس والے نے کہا۔

کھینچا تانی میں شانی کے چہرے سے نقاب کافی حد تک کھسک گیا تھا جو رہ گیا تھا وہ دائیں طرف والے نے کھسکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی لپٹائی ہوئی نظریں شانی کے چہرے پر لڑ گئیں۔ وہی نگاہیں جو اکیلی دیکھی عورت کے حوالے سے قانون نافذ کرنے والوں کی پہچان ہیں۔

دھمکاتی ہوئی، اپنا مطلب بیان کرتی ہوئی اور پھر رعایتوں کا وعدہ کرتی ہوئی۔ یہ نگہ انسانیت نگاہیں کہاں موجود نہیں ہیں؟ یہ ہر جگہ..... تقریباً ہر جگہ موجود ہیں۔ صرف انہیں مناسب اور محفوظ موقع ملنے کا انتظار ہوتا ہے۔

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ گاڑی کے اندر رکھا ہوا کوئی بم پھٹ گیا ہے۔ جو کچھ ہوا اس کا صحیح علم تو شانی کو ہرگز نہیں ہوسکا۔ بس اس نے یہی دیکھا کہ شانی کا نقاب کھینچنے والا شخص گاڑی کا دروازہ توڑتے ہوئے باہر جاگرا۔

اس کے ساتھ ہی خود کار رائفیل کا برسٹ چلا اور شانی نے دیکھا کہ اگلی نشست پر بیٹھے گہرے سانولے شخص کے جسم کو زبردست جھٹکے لگے ہیں۔ وہ عجیب بے ڈھنگے طریقے سے ڈیش بورڈ پر گر گیا۔ رائفیل کی گولیاں نشست کو چیرتی ہوئی اس کی کمر میں لگی تھیں۔ شانی نے رستم کو دیکھا اس کا خون آلود چہرہ فرط غضب سے بگڑا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ فربہ اندام انسپکٹر کے گریبان پر تھے۔ رستم اور انسپکٹر راجا ایک ساتھ ہی گاڑی سے باہر گرے۔ انسپکٹر کے ہاتھ سے رائفیل نکل کر دوڑ لڑھک گئی۔ پھر شانی نے دیکھا کہ سر کی ایک نہایت سنگین ضرب انسپکٹر راجا کے منہ پر لگی۔ یہ ضرب رستم کے سر کی تھی اور یہ اتنی شدید تھی کہ انسپکٹر جیسے اڑتا ہوا سا پیچھے کی طرف گیا۔ نالے کے صین کناروں پر وہ چند لمحوں کے لئے ڈمگایا پھر تپورا کر سیاہی مائل پانی میں گر گیا۔

چوتھا پولیس اہلکار اس کوشش میں تھا کہ ڈیش بورڈ پر اوندھے پڑے سانولے پولیس والے کے نیچے سے رائفیل نکال لے۔ تاہم اس سے پہلے ہی انسپکٹر راجا کی رائفیل رستم کے ہاتھ میں آ گئی۔ تب تک شانی کا برقع کھینچنے والا پولیس اہلکار اپنی ناگوں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ غالباً اس کی نگاہوں میں اصل پولیس مقابلوں میں ہلاک ہونے والے بیٹی بھائیوں کے چہرے گھوم رہے تھے۔ رستم اس کے تصور کو حقیقت کا روپ دے سکتا تھا، مگر اس نے خود کار رائفیل کو دستے کی طرف سے استعمال کیا۔ پولیس والا چہرے پر شدید ضرب کھا کے کھوکھے کی دیوار سے ٹکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔

حواس باختہ پولیس والا ابھی تک اپنے سانولے افسر کے نیچے سے رائفیل نکالنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ جب اس نے رستم کے ہاتھ میں پکڑی رائفیل کا رخ اپنی طرف دیکھا تو اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ شانی نے تڑپ کر رستم کی رائفیل تھام لی۔ جیسے وہ رستم کو پولیس والوں کے قتل سے روکنا چاہتی ہو۔ یہ بالکل اضطراری حرکت تھی۔ کیونکہ اگر رستم فائر کرنے کا ارادہ رکھتا تو شانی اسے روک نہیں سکتی تھی۔ رستم کی انگلی ٹریگر پر تھی اور انگلی کا ذرا ساد باؤ تینوں پولیس اہلکاروں کو زندگی سے دور کر سکتا تھا۔

وہ تینوں بھی یہ بات بڑی اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ زندگی ان کے لئے بڑی قیمتی تھی۔ وہ ایک باختہ محکمے کے خدائی فوجدار تھے۔ حکم چلانے اور حاکمیت کا مزہ لینے کے لئے بہت سی لاچار ”خلق خدا“ انہیں میسر تھی۔ ابھی انہوں نے بھنے ہوئے لاتعداد مرغ کھانے تھے، وی سی آر پر بہت سی فلمیں دیکھنا تھیں، سرکاری خرچے پر پتا نہیں کہاں کہاں کی سیر کرنا تھی۔ نہیں نہیں ابھی مرنے کے دن کہاں تھے؟ ابھی تو آنکھوں میں عیش و عشرت کی ہوس تھی اور سر کے بالوں کی طرح دل بھی کالے سیاہ تھے۔ اس سر پھرے شخص کے ہاتھوں اس گندے نالے کے کنارے اپنی قیمتی زندگی سے وہ محروم ہو جاتے تو اس سے بڑی بے وقوفی کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

گاڑی ابھی تک سٹارٹ تھی۔ ڈرائیور نے ایکسپریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا..... پیسے چر چرائے اور گاڑی چینی چلاتی ہوئی دور ہوتی چلی گئی۔ وہ دور جاتے ہوئے جیسے بڑبان خاموشی پکار رہے تھے۔ تم سے پھر نہیں گے۔ تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ تم دونوں کو مزاحمت کا ایسا مزہ چکھائیں گے کہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی یاد رکھیں گی..... لیکن فی الحال ہمیں بھاگ جانے دو کہ رائفل تمہارے ہاتھ میں ہے۔

جونہی سفید گاڑی نظروں سے اوجھل ہوئی، رستم لپک کر سڑک کے درمیان آگیا۔ ایک سبز مہران کا درمیانی رفتار سے چلی آرہی تھی۔ رستم نے ہاتھ پھیلا کر اسے روک لیا۔ سرکاری رائفل ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ کھوکھے سے ٹکرانے والا پولیس اہلکار بھاگ چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ گاڑی چلانے والا دبلا پتلا لڑکا صورت حال کو پوری طرح سمجھ سکتا رستم اور شانی بائیں جانب کے دونوں دروازے کھول کر اندر بیٹھ چکے تھے۔ رستم کا خون آلود چہرہ اور ہاتھ میں رائفل دیکھ کر لڑکے کی گھگی بندھ گئی۔

”کیا بات ہے جی؟“ لڑکے کے حلق سے دہشت سے پھٹی ہوئی آواز نکلی۔

”ڈرومت۔ کچھ نہیں کہوں گا تمہیں۔ تھوڑا آگے جا کر اتر جائیں گے۔ بس گاڑی چلاؤ۔“

ایک لمحوں کے لئے محسوس ہوا کہ لڑکا اپنی طرف والا دروازہ کھول کر اتر جائے گا اور بھاگ جائے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس طرح کی کوئی نامعقول حرکت کرتا، رستم نے اس کی گدی دیوچ لی اور گاڑی آگے بڑھانے کو کہا ”جی سر“ وہ ہکلیا اور گاڑی بڑھادی۔ ارد گرد موجود لوگ ہکا بکا تھے۔ جن چند لوگوں نے پولیس اہلکاروں کے ساتھ رستم کی برق رفتار مبارزت دیکھی تھی ان کی آنکھوں میں خوف کی گہری پرچھائیاں نظر آرہی تھیں۔

لڑکا رستم کی ہدایت پر گاڑی کو تیزی سے چلاتا چلا گیا۔ چند لمحوں میں اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ شانی نے محسوس کیا کہ اس کے جسم سے پرفیوم کی خوشبو آرہی ہے۔ ”جل“ لگے ہوئے لمبے بال خوبصورتی سے کنپٹیوں پر جمائے گئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ بے چارہ سہ پہر کے وقت نوجوانوں کی مخصوص ڈیوٹی پر نکلا ہوا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسے دو چار لڑکیوں کو کالج سے گھر تک پہنچانا ہو۔ خرابی قسمت سے وہ اچانک اس افتاد میں پھنس گیا تھا۔ شانی خود بھی بری طرح گھبرائی ہوئی تھی لیکن اس نے لڑکے کو تسلی دینا ضروری سمجھا، ورنہ خدشہ تھا کہ گھبراہٹ میں وہ گاڑی کہیں ٹھونک دے گا۔

چند منٹ بعد ایک بھرے پُرے بازار میں رستم نے اچانک گاڑی رکوائی۔ انسپکٹر سے جھینپی ہوئی رائفل اس نے نشستوں کے درمیان خلا میں رکھ دی۔ لڑکے سے بولا۔ ”کہیں آگے جا کر اس رائفل کو کہیں پھینک دینا..... اور خبردار اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا، ورنہ بری طرح پھنس جاؤ گے۔ بس ہمارے اترتے ہی یہاں سے پھوٹ لو۔“

لڑکے نے تھوک نکل کر بے شکل اثبات میں سر ہلایا۔ رستم اور شانی کے اترتے ہی وہ ہوا ہو گیا۔ رستم اب کافی پُر سکون نظر آ رہا تھا۔ مہران گاڑی کے اندر ہی اس نے اپنا خون آلود چہرہ اچھی طرح صاف کر لیا تھا۔ شانی نے بھی کوشش کر کے اپنے حواس پر قابو پالیا تھا۔ رستم نے ایک موٹر رکشہ رکوا یا اور اسے گلزار ناؤن چلنے کو کہا..... گلزار ناؤن جہاں زوار کے گھر میں وہ قیام پذیر تھے۔

☆=====☆

گھر پہنچ کر لاتعداد اندیشے شانی کے ذہن پر یلغار کرتے رہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد رستم نہادھو کر اور کپڑے بدل کر آیا تو بالکل نارمل نظر آ رہا تھا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ دو تین گھنٹے پہلے اس شخص نے پولیس مقابلہ کیا ہے۔ ایک ایسا مقابلہ جس میں جانی نقصان کا اندیشہ بھی موجود ہے۔

شانے نے چھوٹے ہی پوچھا۔ ”اس گاڑی کا کیا بنے گا جسے سڑک پر چھوڑ آئے ہو؟“

”آپ بالکل بے فکر ہیں بی بی۔“ وہ سر جھکائے جھکائے بولا۔ ”گاڑی کے ذریعے پولیس ہم تک نہیں پہنچ سکتی اور نہ ہی زوار کو کوئی خطرہ ہے۔“

”یہ کیسے ہوگا؟“

”گاڑی کے سارے کاغذات فرضی ہیں۔ پولیس جب رجسٹریشن آفس سے ایڈریس لے کر ڈھونڈنے لگے گی تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”اور گاڑی میں موجود کسی چیز سے کوئی کھوج لگ گیا تو.....؟“

”اس میں ایسی کوئی چیز نہیں رکھی ہوئی تھی زوار نے۔“

شانے کچھ دیر خاموشی سے فرش کو گھورتی رہی پھر اس نے پوچھا۔ ”اس پولیس والے کا کیا بنا جسے گولیاں لگی ہیں؟“

”پتا چلا ہے کہ فوج گیا ہے۔ ہسپتال میں آپریشن ہو رہا ہے۔“

”اور جو نالے میں گرا تھا؟“

”وہ بھی ہسپتال میں ہے۔“

شانے نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”تمہارا یہ اندازہ درست ہے کہ پولیس تمہیں ہر جگہ سرگرمی سے ڈھونڈ رہی ہے..... لگتا ہے کہ

نارپور کے سیالوں نے تمہارے پیچھے پورا زور لگایا ہوا ہے۔“

”ہاں بی بی! انہیں یقین ہو گیا ہے کہ آگ لگنے سے پہلے حویلی میں جو ہنگامہ ہوا وہ میری وجہ سے ہوا تھا۔ انہوں نے ایک دو جھوٹے

ثبوت بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔“

”پھر تو رستم تمہارے لئے خطرہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ خاص طور سے یہاں راولپنڈی میں۔“

”خطرہ کہاں نہیں ہے بی بی! قدرت نہ بچائے تو ہم میں سے کوئی دو جا سانس نہ لے۔“ اس نے عجیب وجدانی لہجے میں کہا۔

شانے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ ان لمحوں میں وہ واقعی کوئی جوگی لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ

خوابیدہ سی آنکھوں والا شخص ابھی چند گھنٹے پہلے کسی پھرے ہوئے درندے کی طرح پولیس اہلکاروں پر حملہ آور ہوا تھا اور انہیں گنتی کا ناچ نچا دیا تھا۔ رستم

کی آواز جیسے ابھی تک شانے کے کانوں سے گزرا رہی تھی۔ اس نے پولیس اہلکار کو شانے پر لدے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔ ”..... ان سے پیچھے ہٹ

جاؤ..... ان کو ہاتھ لگاؤ۔“

انسپکٹر راجاز ہریلے لہجے میں بولا تھا۔ ”اوہو یہ معشوقہ صلابہ ہیں تمہاری۔“ رستم نے جنونی لہجے میں اپنی ”وارنگ“ دہرائی تھی۔ جواب میں

انسپکٹر چمکا رہا تھا ”اگر ہم نہ مانیں تو کیا کرو گے؟ ہیر و بن جاؤ گے؟ ہماری لاشیں گرا کر بھاگ جاؤ گے؟“ تب شاید انسپکٹر کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ

ابھی وہی کچھ ہو جائے گا جو وہ ازراہ مذاق کہہ رہا ہے۔

وہ سب کچھ شانی کو جاگتی آنکھوں سے خواب جیسا لگ رہا تھا۔ کتنا اچانک کتنا سنگین اور ڈرامائی تھا یہ واقعہ۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی اور رستم فون سننے کے لئے چلا گیا۔ شانی اپنی جگہ بیٹھی رہی اور خیالوں کے گورکھ دھندے میں ڈوبی رہی۔

وہ رہ کر اس کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر آنے لگا جب راجا بازار کے علاقے میں گرے خیر سے اترنے کے بعد رستم اس کا ہاتھ پکڑ کر دوڑا تھا۔ شاید اگر شانی اس کے ساتھ نہ ہوتی تو وہ بہت تیز رفتاری سے کسی طرف نکل جاتا اور اس نئے پولیس مقابلے کی نوبت ہی نہ آتی جو آج رستم کے کھاتے میں درج ہوا۔ شانی بازار میں رونا ہونے والے واقعے کو اپنے موجودہ حالات کے حوالے سے دیکھنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے شب و روز کے بازار میں رستم اسے اپنے ساتھ لے کر بھاگ رہا ہے اور ان گنت خطرات پولیس اہلکاروں کی طرح رستم کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ ان خطرات کو چکما دے کر برا سانی نکل سکتا ہے۔ مگر شانی کی وجہ سے ”تیز رفتار فرا“ اس کے لئے ممکن نہیں۔

اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ کہیں چلی جائے۔ ایک دم سب کچھ چھوڑ کر کسی طرف نکل جائے۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ درودل رکھنے والے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اسے کہیں تو سر چھپانے کی جگہ مل جائے گی۔ کوئی ایسی جگہ جہاں وہ اپنے بل بوتے پر عزت سے زندہ رہ سکے۔ اس دوران میں نادیہ آگئی۔ وہ شیر کی والدہ کا افسوس کرنے آئی تھی۔ وہ دس پندرہ منٹ تک شانی کے پاس بیٹھی رہی۔ باتوں میں اس نے رستم کا ذکر بھی کیا۔ کہنے لگی۔ ”ابھی میں نے اسے بالکونی میں دیکھا ہے۔ شاید چہرے پر چوٹیں لگی ہیں۔ کیا ہوا ہے اسے؟“

”بس رستے میں کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ ہم شیر کی گھر سے واپس آرہے تھے ایک ویگن والے نے سائیڈ سے گاڑی مار دی۔“ شانی نے مصلحت آمیز جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس کے علاوہ وہ کبھی کیا سکتی تھی۔

”اوہو۔ اسی لئے میں کہوں کہ آپ گئے تو کار میں تھے اور آئے رکشہ پر ہیں۔ کیا گاڑی کا زیادہ نقصان ہوا ہے؟“

”ہاں..... ورکشاپ میں ہے۔“ شانی نے مختصر جواب دیا۔ اسے نادیہ کے سوالوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے گھر کی کھڑکیوں سے ہر وقت رستم پر نگاہ رکھتی ہے۔ بہر حال ایک لحاظ سے یہ ”مگرانی“ نادیہ کی اس محبت کی بھی غماز تھی جو وہ اپنے دل میں رستم کے لئے رکھتی تھی۔

ان کی گفتگو کا رخ جلد ہی رستم کی چوٹوں کی طرف مڑ گیا۔ نادیہ کے لہجے میں ایک اپنائیت بھری فکر مند تھی۔ وہ شانی سے بولی۔ ”آپ ذرا خود اس کا خیال رکھیں۔ وہ بے حد بے پرواہ ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تھوڑا سا لنگڑا بھی رہا ہے۔ شاید پاؤں پر بھی چوٹ آئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ایکسرے وغیرہ کرائیں۔“

”ٹھیک ہے“ میں کہوں گی اس سے۔“ شانی نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

”اور اس سے یہ بھی کہیں کہ لڑائی جھگڑے کی طرف سے ہاتھ ذرا اٹھا کر رکھے۔ ہر وقت کی مارا ماری ٹھیک نہیں ہوتی۔“

”میں کہوں گی۔“

”اور مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ کی بات بہت مانتا ہے۔ بہت عزت کرتا ہے آپ کی۔“

شانی خاموش رہی۔ ایک دم اسے گہرا ہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نادیا اس موضوع پر مزید بات کرے۔

غالباً نادیا بھی سمجھ گئی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اچھا میں چلتی ہوں۔ اگر آپ کا پھر شیریں صاحبہ کے گھر جانا ہوا تو پلیز مجھے ضرور لے جائیے گا۔“

شانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شانی کے اندر جو کشمکش جاری تھی وہ اس رات عروج پر پہنچ گئی۔ شانی نے زوار کو کسی سے فون پر بات کرتے سنا۔ شاید لائن میں شور تھا۔ زوار کو قدرے بلند آواز میں بولنا پڑ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں نے اسے بڑا سمجھایا ہے یار! لیکن وہ مانتا نہیں۔ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ کچھ دنوں کے لئے کرم ایجنسی میں چلا جائے۔ وہاں دو تین بڑے پکے یار ہیں اس کے۔ ویسے تو جرائم پیشہ لوگ ہیں لیکن اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتے۔ پولیٹیکل ایجنٹ لاکھ ٹکریں ماریں مگر رستم کی گردنوں میں پائیں گے۔“

شانی کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ رستم کا ذکر ہی ہو رہا ہے۔

زوار کہہ رہا تھا۔ ”آج جو واقعہ ہوا ہے وہ کم سنگین نہیں ہے۔ نیچے سے اوپر تک کھلبلی پڑ جائے گی۔ جو اہلکار زخمی ہوا ہے وہ بھی پتا نہیں کہ بچتا ہے یا نہیں۔“

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔

جواب میں زوار بولا۔ ”مسئلہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک بھلی مانس خاتون بھی ہے۔ وہ خاتون کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا اور قبائلی علاقے میں ساتھ لے جانا بھی نہیں چاہتا۔ بس یہی کشمکش ہے۔“

شانی نے اس موضوع پر دو چار فقرے مزید سنے پھر وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کے ذہن میں آندھی سی چلنا شروع ہو گئی۔ یہ وہی صورت حال تھی جو پچھلے کئی دن سے شانی کے ذہن میں کھٹک رہی تھی اسے اذیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ آج کل اس کے پیچھے زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ اس کے اندر سے آواز آرہی تھی..... شانی اپنا بوجھ رستم کے کندھوں پر سے اتار لو۔ اسے ہلکا پھلکا ہو کر کسی طرف نکل جانے دو۔ حالات ایک خطرناک رخ پر جا رہے ہیں۔ اگر تمہاری وجہ سے رستم کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوا یا اس کی جان گئی تو کیا تم دیکھ سکو گی؟ رستم تم سے پیار کرتا ہے بلکہ شاید عشق کرتا ہے۔ اس عشق کو عشق ہی رہنے دو۔ اسے دنیا داری میں گھسیٹ کر فنا نہ کرو۔ کہیں دور چلی جاؤ۔ اپنے سینے میں محبت کی جوت لے کر اور اچھی یادوں کا سرمایہ سمیٹ کر کہیں دور نکل جاؤ..... بہت دور..... جہاں رستم کبھی تمہاری خبر نہ پاسکے اور نہ تم کبھی اس کی خبر پاسکو۔ اس کہانی کا یہی انجام بہترین ہے۔

پھر اس کے ذہن میں نادیا کی شبیہ ابھر آئی..... نہ جانے کیوں سرو قد نادیا کا تصور ذہن میں آتے ہی شانی کو اپنے ارادے میں مزید چٹنگی محسوس ہونے لگی۔ ہاں وہ یہاں سے جاسکتی تھی۔ بالکل جاسکتی تھی۔ رستم کو کچھ تکلیف تو ہونا تھی اور شاید کچھ تکلیف شانی کے حصے میں بھی آتا تھی۔ مگر یہ تکالیف ان مصائب کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں جو منہ پھاڑے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

☆=====☆=====☆

وہ رات کا درمیانی پہر تھا۔ آج سردی معمول سے زیادہ تھی۔ ہلکی سی ہوا بھی چل رہی تھی۔ شانی اپنے کمرے میں ٹیبل یسپ کے سامنے تھی اور رستم کے نام ایک مختصر خط لکھ رہی تھی۔ اس نے لکھا ”رستم! میں نے بہت سوچا ہے اور آخر اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میرا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے..... میں اپنا راستہ تم سے جدا کر رہی ہوں لیکن دل میں تمہارے لئے جو خاص جذبہ ہے وہ ہمیشہ رہے گا۔ جب تک زندگی ہے اپنی دعاؤں اور نیک تمناؤں میں تمہیں یاد رکھوں گی۔ یاد ہے چناب کے کنارے میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اگر میرا راستہ تم سے جدا ہو جائے تو تمہیں کوئی شکوہ تو نہیں ہوگا۔ تم نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا..... میں اپنے خون سے لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ مجھے امید ہے تمہیں اپنی وہ بات یاد ہوگی۔ رستم! میری التجا ہے کہ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اس شہر میں اور اس شہر سے آگے بہت دور تک..... تمہیں کہیں نہیں ملوں گی اور بالفرض ملی بھی تو میرے خیالات یہی ہوں گے جواب ہیں۔ تم انہیں بدل نہیں سکتے ہو اور نہ میں بدل سکتی ہوں۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ ہم تہہ دل سے اس صورت حال کو قبول کر لیں۔

تم نے اور تمہارے دوستوں نے مشکل وقت میں جس طرح میرا ساتھ دیا میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ تمہارے علاوہ میں ان کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی ہوں..... اور خاص طور سے مختار (گولنگے) کا جس نے میری زندگی کے لئے اپنی زندگی قربان کی۔ آخر میں تم سے آخری درخواست ہے..... میری خواہش ہے کہ تم اس پر غور کرو۔ نادیہ کا ماضی جو کچھ بھی تھا لیکن اب وہ ایک بدلی ہوئی لڑکی ہے۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جہاں تک میری سمجھ بوجھ نے کام کیا ہے وہ واقعی ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتی ہے..... نادیہ کی اس نئی زندگی میں مرکزی اور اہم ترین کردار تمہارا ہے رستم! وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہے اور اس گرفتاری کے خراج میں وہ تمہیں بہت کچھ دے سکتی ہے۔ بہت سی خوبصورتیاں بہت سے رنگ۔ وہ تمہاری زندگی کو سجا سکتی ہے..... اور ہر قسم کے حالات میں تمہارے شانہ بشانہ بھی چل سکتی ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں تم خود بھی اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب مجھے اجازت دو..... اور مجھے معاف بھی کر دو۔

والسلام۔“

خط لکھنے کے بعد شانی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ کچھ دیر تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر اٹھ کر خاموشی سے اپنا کچھ ضروری سامان ایک اٹنیٹی میں رکھنے لگی۔

صبح پانچ بجے کے قریب جب اندھیرے میں اجالے کی ہلکی سی آمیزش شروع ہوئی وہ جانے کے لئے تیار تھی۔ جانے سے پہلے اس نے خط رستم تک پہنچا دیا۔ وہ اوپر سے اس کے کمرے تک گئی۔ دروازے کی زیریں دراز کے نیچے سے اس نے ہند لافانہ اندر کھسکا دیا۔ واپس پلٹنے سے پہلے اس نے ایک الوداعی نظر کمرے میں ڈالی۔ نائٹ بلب کی روشنی میں رستم محو خواب تھا۔ کپٹی پر لگنے والی چوٹ کے اوپر پٹی چپکی ہوئی تھی۔ وہ حسب عادت سیدھا لیٹا تھا۔ ان سنگین لمحات سے بے خبر جو اسے اور شانی کو جدا کر رہے تھے شانی کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ تب وہ تیزی سے پلٹی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ گیٹ پر موجود چوکیدار عبداللہ اس وقت نماز کے لئے مسجد چلا جاتا ہے۔ گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ ایک متبادل

جاہی شانی کے پاس موجود تھی۔ اس نے چھوٹا گیسٹ کھولا اور محتاط انداز میں باہر نکل آئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بڑی سڑک پر تھی۔ اس نے ایک رکشہ رکوا لیا اور اس میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔ شروع میں وہ خوفزدہ تھی لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتی گئی اس کے اعتماد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی فطری ذہانت اور حوصلہ مندی اس کا سہارا بننے لگی۔ وہ اپنی منزل کا تعین بہت پہلے کر چکی تھی۔ لاہور کی ایک نواحی آبادی شاہدرہ میں شانی کی کالج کی سہیلی ریحانہ رہتی تھی۔ یوں تو وہ بھی رنگ والی کی رہنے والی تھی لیکن بیاہ کر لاہور پہنچی تھی۔ سیکنہ اور صغرا کی طرح ریحانہ سے بھی شانی کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس کا میاں بھی بہت اچھا تھا۔ وہ کویت کی ایک تعمیراتی فرم میں فورمین تھا۔..... ریحانہ لاہور میں اپنے ساس سر اور ایک نند کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ جب رنگ والی آتی تھی اس کا اصرار ہوتا تھا کہ شانی اس کے پاس آئے اور چند روز کے لئے وہاں رہے۔ اس کے میاں سلیم احمد نے بھی کئی بار شانی اور عادل کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ بہت کشادہ دل اور ملن سار شخص تھا۔

جب تک ریحانہ کے والدین رنگ والی میں تھے دو تین ماہ بعد اس سے ملاقات ہو جاتی تھی تاہم پچھلے سال کے آخر میں ریحانہ کے والد فوت ہو گئے تھے اور والدہ بڑے بیٹے کے پاس ملتان چلی گئی تھیں۔ تب سے ریحانہ کے ساتھ شانی کا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ بہر حال ریحانہ کا مکمل ایڈریس شانی کے پاس موجود تھا۔ ریحانہ نے قریباً دس مرتبہ زبانی بھی اسے یہ ایڈریس اتنی تفصیل سے سمجھایا تھا کہ اسے ازبر ہو گیا تھا۔ کم از کم وہ یہی سمجھتی تھی کہ ازبر ہو گیا ہے۔

یوں تو پنڈی سے لاہور تک کا سفر بذریعہ بس پانچ چھ گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے مگر راستے میں دو بار بس کے خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ شام کو ہی لاہور پہنچ پائی۔ پچھلی مرتبہ جب وہ لاہور آئی تھی تو اسے اپنی زندگی کی اندوہناک ترین ”خبر“ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا جان سے پیارا چیتا بھائی اسے لاش کی صورت میں ملا تھا۔ وہ منظر آج تک دو آنٹنیں تیروں کی طرح اس کی آنکھوں میں کھبا ہوا تھا۔ ان تلخ یادوں نے شانی کے بچھے ہوئے دل کو کچھ اور بھی بھجا دیا۔ وہ اپنا اسمارٹ سا ایڑھی سنبھالے خود کو سیاہ برقع میں لپیٹے بس اڈے سے باہر نکل آئی۔

گھر سے اکیلے باہر نکلنے کا یہ اس کے لئے پہلا تجربہ تھا۔ آج اسے احساس ہوا تھا کہ لوگوں کی نظروں میں کتنی گندگی بھری ہوتی ہے۔ قریباً نوے فیصد دیکھنے والے اسے ایک ہی جیسی نازیبا بلکہ لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک بے ساختہ اور قطعی ناروا چمک ابھرتی تھی۔ وہ اس پر پہلی نگاہ پڑنے کے بعد حدنگاہ تک اسے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جیسے وہ عورت نہ ہو دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہو۔ اس میں عمر کی بھی زیادہ تخصیص نہیں تھی۔ ہر عمر کے مرد اس ”کارخیز“ میں حصہ لیتے نظر آئے۔ خاص طور سے بس اڈے کے ارد گرد تو اسے یہی لگا کہ ہر نگاہ اس کے برقع سے پار ہو کر اس کے جسم کو چھید رہی ہے۔

لاہور کا موسم ابرا لود تھا۔ ابھی شام ہوئی تھی مگر گہرا اندھیرا اچھایا ہوا تھا۔ ٹھنڈ کے سبب لاہور کی روایتی گہما گہمی قدرے ماند نظر آتی تھی۔ شانی نے ایک رکشہ رکوا لیا اور اسے شاہدرہ ٹاؤن چلنے کو کہا۔

یہ ایک خاصا طویل سفر ثابت ہوا۔ داتا گنج بخش کے مزار کے قریب ٹریفک کا اژدھام تھا۔ اس اژدھام سے نکلنے نکلنے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ راوی کا پل پار کر کے وہ شاہدرہ ٹاؤن پہنچے اور شانی ایک جگہ رکشہ سے اتر گئی۔ وہ لکھے ہوئے ایڈریس کے مطابق ٹھیک جگہ اتری تھی مگر جب اس نے

سلیم احمد کا مکان ڈھونڈنا شروع کیا تو دانتوں پسینہ آ گیا۔ گلیوں کا جال تھا۔ مکانات کے نمبرز آپس میں گڈمڈ تھے۔ شانی کو ریحانہ کی بتائی ہوئی ایک دو نشانیاں یاد تھیں، اس نے ان نشانوں سے مدد لینے کی کوشش بھی کی مگر خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

تھکن اور بھوک سے اس کا بُرا حال تھا۔ خاص طور سے تھکن پریشان کر رہی تھی۔ اس پر مستزاد ”گھورنے والے“ خدائی فوجداروں کی نظریں تھیں۔ وہ اسے سرتاپا گھور رہے تھے اور جیسے ایک ہی نگاہ میں اس کے ماضی حال و مستقبل کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتے تھے۔

اسے شاہدہ ٹاؤن میں چکراتے اور ایڈریس پوچھتے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی۔ کئی گلیوں کی لائٹ غائب تھی۔ ویسے بھی اب رات کے نو بج چکے تھے۔ شانی کو اپنے آس پاس سے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ جس کام کو آسان سمجھتی تھی وہ اس کی توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس کے پاس ریحانہ کے گھر کا فون نمبر ہوتا۔

دفعتاً شانی کو محسوس ہوا کہ دو تین افراد کی ایک ٹولی اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ غالباً جس جنرل سنور سے اس نے آخری مرتبہ سلیم احمد کی ایڈریس پوچھا تھا، یہ لوگ وہیں سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے لمبے بالوں والا ایک لڑکا کچھ ہی دیر بعد شانی کے بالکل متوازی چلنا شروع ہو گیا۔ نیلی جنر کے نیچے اس کے پاؤں میں جہازی سائز جو گر تھے۔ کچھ دیر اس کے ساتھ چلنے کے بعد نوجوان نے کھکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ”کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“

”نہیں شکریہ۔“ شانی نے خشک لہجے میں کہا اور رفتار تیز کر دی۔ لڑکے نے بھی رفتار تیز کر دی اور بولا۔ ”آپ اکیلے ہیں۔ خواہ خواہ کوئی غلط بندہ آپ کے پیچھے لگ جائے گا۔ میرے پاس پک آپ ہے۔ مجھے بتائیں کہاں جانا ہے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔“ اس کے لہجے سے فساد کی بو آتی تھی۔ شانی نے اپنے لہجے کو مزید خشک بناتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کو بتایا ہے نا، مجھے آپ کی مدد نہیں چاہیے۔“

اس دوران میں دوسرا شخص بھی قریب آ چکا تھا۔ یہ ذرا پکی عمر کا لگتا تھا۔ اس نے تیز رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی بولا۔ ”کیا کہتی ہیں مس صاحبہ؟“ اس کی آواز سے عیاں تھا کہ اس نے منہ میں پان دبا رکھا ہے۔

”کہتی ہیں مدد نہیں چاہیے۔“ لمبے بالوں والوں نے جواب دیا۔ ”لگتا ہے شرمارہی ہیں۔“ اس نے کہا۔

تیسرا لڑکا قریب آتے ہوئے بولا۔ ”اس طرح شرممانے سے کام نہیں چلے گا میڈم..... یہاں دو ناگوں والے بڑے آوارہ کتے پھر رہے ہیں۔ کوئی آپ کی ٹانگ پکڑ کر اندر گھسیٹ لے گا تو کیا ہوگا؟“

پہلے والے دونوں بندے اب بالکل قریب آ گئے تھے۔ یہ گلی نسبتاً زیادہ سنسان تھی۔ ایک طرف چند گھروں کے بند دروازے تھے۔ دوسری طرف کسی کارخانے کی طویل دیوار تھی۔ شانی نے اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔ وہ تینوں بھی ساتھ ساتھ آرہے تھے۔ اچانک شانی کی نگاہ ایک باوردی شخص پر پڑی۔ یہ ایک سیکورٹی گارڈ تھا۔ وہ واپڈا کے کھمبے تلے رانفل تھا مے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر شانی کو قدرے تحفظ کا احساس ہوا۔ غالباً گارڈ

نے بھی بھانپ لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ خود چل کر شانی کی طرف آ گیا۔

گارڈ کو دیکھ کر دونوں لڑکے سڑک کے پار چلے گئے۔ ایک ذرا پیچھے تھا..... گارڈ نے شانی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے جی؟“
”یہ غنڈے مجھے تنگ کر رہے ہیں۔“ شانی نے سڑک پار اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

گارڈ نے غور سے لڑکوں کا جائزہ لیا۔ پھر ہولے سے بولا۔ ”یہ اچھے لوگ نہیں ہیں.....“ پھر اس نے بائیں جانب لوہے کا ایک دروازہ کھولا اور کہنے لگا۔ ”آپ تھوڑی دیر کے لئے ادھر آ جائیے..... میں انہیں دیکھتا ہوں۔“

گارڈ کے تسلی بخش لب و لہجے نے شانی کا خوف قدرے کم کر دیا تھا۔ ان آوارہ کتوں جیسے غنڈوں سے بچنے کے لئے شانی کو دروازہ غنیمت محسوس ہوا۔ وہ اندر چلی گئی۔

یہ ایک کھلا احاطہ تھا۔ ایک طرف کیکر اور ٹاہلی کی بہت سی لکڑی پڑی تھی..... دوسری طرف طویل شیڈ کے نیچے نامکمل کرسیاں، میز اور صوفے وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ یہ فرنیچر سازی کا کارخانہ تھا۔ اس کارخانے کی لمبی دیوار شانی نے تاریک گلی میں دیکھی تھی۔ دروازے سے بیس تیس فٹ دور ایک دفتر نما کمرہ تھا۔ اس کے بائیں جانب ایک ہال نما کمرہ تھا جہاں تیار شدہ فرنیچر کے کچھ آئیٹم نظر آ رہے تھے۔ فضا میں برادے، صمد بانڈ اور فوم کی ملی جلی بو تھی۔

ابھی شانی چار دیواری کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ گارڈ ذرا گھبرا ہوا اندر داخل ہوا۔ کہنے لگا ”بی بی جی! گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں الٹا چور کو تو ال کو..... ان میں علاقے کے کونسلر کا بیٹا کامی بھی ہے۔ کہتا ہے کہ آپ کے بارے میں پولیس کو اطلاع دیں گے۔ آپ مشکوک طریقے سے کالونی میں گھوم رہی ہیں۔“

”بڑے بے غیرت لوگ ہیں یہ۔ اکیلی عورت کو دیکھ کر کتوں کی طرح ان کی زبانیں لٹک آتی ہیں۔ آپ بلائیں پولیس والوں کو..... میں بتاتی ہوں سب کچھ۔“ شانی غضب ناک لہجے میں بولی۔

گارڈ کی عمر تیس سال سے اوپر تھی۔ تاہم کنپٹیوں کے سفید بال اسے ایک ”معتبر جھلک“ دے رہے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”نہیں جی۔ بات بڑھانے کا فائدہ نہیں ہے۔ خواہ مخواہ کی بکواس کر رہے ہیں یہ لوگ۔ میں سنبھال لیتا ہوں انہیں۔ ویسے آپ نے یہاں ملنا کس سے ہے؟“
شانی نے انڈریس نکال کر گارڈ کے سامنے رکھ دیا۔ وہ چند لمحے غور کرتا رہا۔ پھر بولا ”سڑک کا نام تو ٹھیک لکھا ہوا ہے، مگر آگے کچھ سمجھ میں نہیں آتا آپ کے پاس فون نمبر نہیں ہے؟“ شانی نے نفی میں جواب دیا۔ گارڈ نے کہا۔

”آپ آ کہاں سے رہی ہیں؟“

”وہ..... وہ گوجر خان سے۔“ شانی ہکا گئی۔

اور اس کے ساتھ ہی اسے اندازہ ہوا کہ اس کے جواب نے گارڈ پر کوئی مثبت اثر نہیں ڈالا۔

”وہاں کا فون نمبر ہے آپ کے پاس؟“ گارڈ نے پوچھا۔

”نن..... نہیں۔“ شانی نے کہا۔

پہلی بار اسے اپنی بے حد کمزور پوزیشن کا احساس ہوا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے ٹھسے سے کہہ دیا تھا کہ بلائیں پولیس کو..... اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس قسم کی صورت حال اس کے لئے کتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ فی الوقت اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ سچائی کے ساتھ کسی کے سوال و جواب کا سامنا کر سکے۔

گارڈ کالج تھوڑا سا تبدیل ہو گیا۔ بولا۔ ”دیکھیں بی بی! اگر آپ ٹھیک ٹھیک نہیں بتائیں گی تو میرے لئے آپ کی مدد کرنی مشکل ہو جائے گی۔“

”میں نے غلط تو..... کچھ نہیں کہا۔“

”دیکھیں۔ آپ گھبرائی ہوئی ہیں..... آپ یہاں اطمینان سے بیٹھ جائیں اور مجھے اپنا ہمدرد سمجھیں۔“ اس نے سامنے دفتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شانی پہلے تو ہچکچائی مگر جب گارڈ نے اصرار سے کہا تو وہ دفتر میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا..... اور دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ غیر محسوس طور پر ایک خطرناک صورت حال میں پھنس گئی ہے۔ وہ یہاں سے نکلنا چاہ رہی تھی مگر باہر تاریک گلی میں اسے غنڈوں کا خطرہ درپیش تھا۔ کسی اور کو مدد کے لئے بلانا بھی دشوار لگ رہا تھا۔

نیلی وردی والا گارڈ اسے وہیں چھوڑ کر باہر چلا گیا اور دو منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ کوئی شخص تھا۔ یہ دیکھ کر شانی کے اوسان خطا ہو گئے کہ یہ وہی لمبے بالوں والا لڑکا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال رہی ہوگی۔ ایک کان میں چھوٹی سی بالی تھی۔ اس نے سویٹر کی آستین چڑھا رکھی تھی۔ وہ تندرلجے میں شانی سے سوالات کرنے لگا۔ شانی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ گارڈ کا رویہ بھی بدلا ہوا ہے۔ ان کی تفتیش بڑھی تو شانی نے دو نوک لہجے میں کہا۔ ”میں کوئی مجرم نہیں ہوں کہ اس طرح تمہارے سوالوں کے جواب دوں۔ میرے پاس یہ ایڈریس ہے اور یہ ایک شریف گھرانے کا ایڈریس ہے۔ یہی ایڈریس تمہارے سارے سوالوں کا جواب ہے۔“

لمبے بالوں والا لڑکا جس کا نام کامران (کامی) تھا گہری سانس لے کر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں اس ایڈریس کو۔“ پھر وہ گارڈ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”بھاجیرے! جب تک میں واپس نہیں آتا یہ مس صاحبہ ادھر اُدھر نہیں جائیں گی۔ اگر گئیں تو ذمے داری تمہاری ہوگی۔“

گارڈ جیرے نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی ترخ کر بولی۔ ”دیکھو تم لوگ زیادہ تمنایدار بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں..... تمہاری..... قیدی نہیں ہوں۔“

”ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ مگر جب تک بات کلیئر نہیں ہوتی آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔“ کامی بولا۔

گارڈ جیرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تاکید کرتا ہوا کامی نامی لڑکا باہر نکل گیا۔ شانی اس صورت حال پر کھولتی اور ہولتی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ دل میں دعا کرتی رہی کہ سلیم احمد کا گھر مل جائے۔ گارڈ نے اسے تسلی دی تھی کہ ایڈریس مل گیا تو وہ ابھی اپنی حفاظت میں اسے وہاں لے کر جائے گا۔ کامی کی واپسی خلاف توقع چندرہ بیس منٹ بعد ہی ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مطلوبہ ایڈریس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ کامی کے ساتھ

ایک عمر رسیدہ شخص بھی آتا دکھائی دیا۔ شانی نے سوچا کہ وہ ریحانہ کے اہل خانہ میں سے کوئی ہوگا..... اس کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ نہ صرف ایڈریس مل گیا تھا بلکہ ریحانہ کا سر، لمبے بالوں والے کامی کے ساتھ آیا تھا۔

عمر رسیدہ شخص شلوار قمیص میں تھا۔ اس کا چہرہ جسم اور کندھوں کی نسبت کافی بڑا تھا اور جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بند چھتری تھی۔ جسے وہ لائٹھی کی طرح زمین پر ٹیک کر چل رہا تھا۔ شانی نے ریحانہ کے شوہر کو دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ بزرگ ریحانہ کے سر ہوں گے۔

یہ بزرگ اپنی سفید بھوؤں کے نیچے سر دیکھوں کے ساتھ شانی کو دیکھ رہے تھے۔ ”کون ہو تم؟“ انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”انکل جی! میں ریحانہ کے بچپن کی سہیلی ہوں۔ اس سے ملنے گوجر خان سے آئی ہوں۔ ریحانہ کی بڑی خواہش تھی کہ میں ایک بار لاہور آؤں۔ اتفاق یہ ہے کہ مجھے اکیلے آنا پڑا۔ راستے میں دو بار بس بھی خراب ہوئی اور دیر ہو گئی۔ اندھیرے میں آپ کا پتا ڈھونڈنا مشکل ہو گیا.....“ وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

عمر رسیدہ شخص سر دنگا ہوں سے شانی کو دیکھتا رہا۔ ریحانہ کا نام سن کر اس کے چہرے کی سختی کچھ اور بڑھ گئی۔ ”تو تم ریحانہ کی سہیلی ہو؟“

”جی ہاں۔“

”تمہارے بتانے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو رہا تھا۔“

”جی؟“

”وہ دفع ہو گئی ہے یہاں سے۔ اس کا اور ہمارا اب کوئی واسطہ نہیں..... اور نہ ہی اس کے کسی ملنے والے سے ہے۔“ عمر رسیدہ شخص نے پھٹکار کر کہا۔

شانہ حیرت سے اس کا چہرہ ہمتی چلی گئی۔ بزرگ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اٹیچی کیس لے کر آدھی رات کو اکیلی گلی گلی گھوم رہی ہو۔ یہ کہاں کا شریفانہ چلن ہے۔“

شانہ نے اپنے غصے پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے نہیں جانتے لیکن سلیم صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی شکیل مجھے بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ ان میں سے کسی کے ساتھ میری بات کروادیں۔“

”اگر تم انہیں جانتی ہو تو پھر تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ وہ دونوں کویت میں ہیں.....“ اس کے ساتھ ہی بزرگوار نے اس کی طرف سے منہ پھیرا اور چھتری کو لائٹھی کی طرح ٹیٹتے ہوئے باہر کی راہ لی۔ بزرگوار کی بڑ بڑاہٹ شانی کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

وہ ساکت و جامد کھڑی رہ گئی۔ کامی اور جبراب تیز چھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دو منٹ بعد کامی کے دونوں ساتھی بھی اندر آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں شانی کے لئے تضحیک اور غلاظت تھی۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ شانی کو اپنے گھیرے میں بے بس اور خوفزدہ دیکھ کر مسرور ہو رہے ہیں۔ گہرے رنگ کے کپڑوں والے شخص کا رنگ بھی گہرا تھا۔ اس نے پان کی پیک حلق میں گرا کر بازاری انداز میں کہا۔ ”یہ تو

سیدہ سیدہ ہائیس کیس ہے جان جی..... مس صاحبہ کا اٹیچی کیس بھی دیکھو۔ پتا نہیں کیا نکل آئے اس میں سے۔“

”خبردار کسی نے میرے اٹیچی کو ہاتھ لگایا تو۔“ شانی نے کہا۔

”ٹھیک ہے، نہیں لگاتے ہاتھ..... پولیس خود ہی تلاش لے گی اٹیچی کی..... اور آپ کی بھی۔“ کامی نے کہا۔

”اللہ معاف کرے مس صاحبہ..... پولیس والوں کی تلاش کچھ اور قسم کی ہوتی ہے اور آپ کا تو..... مجھے لگتا ہے..... آگے پیچھے بھی کوئی نہیں ہے۔“

”دیکھو تم لوگ مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔“ شانی نے یہ الفاظ کہہ کر اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود

اسے بھی شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔

”ہم دھمکا نہیں رہے، وہ بتا رہے ہیں جو آپ کے ساتھ ہونے والا ہے۔“ کامی غصے سے بولا۔ ”آپ اپنے آگے پیچھے کا کچھ نہیں

بتا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ کسی غلط ارادے سے اور غلط طریقے سے یہاں موجود ہیں۔“

پان والے نے جس کا نام سکندر تھا۔ دیوار سے کندھا ٹکا کر بڑے اسٹائل سے آنکھیں نیم وا کیں اور بولا۔ ”غلط ارادے کیا ہوتے ہیں مس

صاحبہ..... بس وہی ارادہ ہوگا جس نے آج کل ساری مسوں اور مسروں کو وخت میں ڈالا ہوا ہے، یعنی مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شانی نے پوچھا۔

سکندر ڈھنکائی سے مسکرا کر بولا۔ ”دیکھو مس صاحبہ! آپ کے منہ پر سچی بات کہہ رہا ہوں۔ آپ بُرا نہ مانیے گا۔ جو بزرگ ابھی یہاں آئے تھے

ان کا نام تاج دین ہے۔ یہ آپ کی سہیلی ریحانہ کے سرہن ہیں اور کس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ اور کہاں تک ہو رہا ہے؟ یہ ہم سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ بس یوں

سمجھیں کہ آپ کے یہ خادماں بند دروازوں اور دیواروں کے پیچھے دیکھ لیتے ہیں۔ آپ کی سہیلی صاحبہ کامیاں کویت میں کام کرتا تھا۔ یہ تو آپ کو پتا ہی ہوگا اور

یہ بھی پتا ہوگا کہ وہ سال ڈیڑھ سال بعد پاکستان آتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی سہیلی کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ جانتی ہوں گی۔ اس پر جوانی ٹوٹ کر آئی

ہوئی تھی۔ تو مس صاحبہ! جب شوہر صاحب ہزاروں میل دور بیٹھے عیدیں شب براتیں منا رہے ہوں تو عورت بے چاری بھی کیا کرے۔

وہ آپ کی سہیلی صاحبہ نے ہمسائے ارشد حسین سے تھوڑی سی دوستی گانٹھ لی۔ ٹیلی فون پر دو چار گھنٹے گپ شپ لگالیتی ہوگی اور پھر شاید ایک

دو بار دونوں نے کمرے میں بیٹھ کر دل کا بوجھ ہلکا کیا ہو..... یہ دنیا بڑی بے مروت ہے۔ کسی کو ہنستا کھیلتا اور بوجھ ہلکا کرتا نہیں دیکھ سکتی۔ پہلے آپ کی

سہیلی صاحبہ کی نند عاشی کو پتا چلا پھر ساس سر صاحب کو بھی پتا چل گیا۔ آخر میں وہی ہوا جو ہونا تھا۔ کویت میں شوہر صاحب کے کانوں کی کھڑکیاں بھی

کھل گئیں۔ انہوں نے وہاں سے ٹیلی فونی حکم دیا کہ بیوی جی کو دھکے دے کر گھر سے نکال دو۔“

شانی سنائے کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کا جسم خوف اور غصے سے لرز رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر آواز جیسے حلق میں پھنس

کر رہی تھی۔

سکندر نے ہتھی نکالتے ہوئے کہا۔ ”آپ ریحانہ صاحبہ کی سہیلی ہیں۔ یقینی بات ہے کہ آپ بھی اسی طرح کی معصوم اور سادہ ہیں۔ آپ

نے بھی ناظم پاس کرنے کے لئے کسی سے ذرا سی دوستی گانٹھ لی ہوگی۔ بعد میں یہ دوستی بڑھ کر دوستانہ اور یارانہ بن گئی ہوگی۔ لگتا تو یہی ہے کہ آپ اپنے

اس دوست صاحب سے ملنے کے لئے ہی یہاں آئی ہیں..... اب وہ اللہ کا بندہ آپ سے وعدہ کر کے پتا نہیں کہاں سٹک گیا ہے۔ شاید..... شاید اس نے اس یارِ ارمان کے کھاتے میں آپ سے ”کافی کچھ“ وصول کر لیا ہوا ہے۔ اب آپ کہیں آسرا ڈھونڈنے کے لئے تو پاؤں چلا رہی ہیں۔“

”بکواس بند کرو کتے۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔“ شانی نے پھٹکار کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھنے کے لئے سکندر کو زور سے دھکا دیا۔

کامی خطرناک انداز میں دروازے کے درمیان آگیا۔ ”نہ نہ..... نہ میڈم! زیادہ چالاکی نہ کرنا۔ ورنہ ہم بھی ہاتھ چلانے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

شانی نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔ ”میرا راستہ چھوڑو..... مجھے جانے دو۔ ورنہ..... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

”یہی تو ہم کہہ رہے ہیں کہ اچھا نہیں ہوگا۔ اگر آپ کو پولیس والوں نے اپنے حساب میں جمع کر لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ یہ پولیس والے ہر شے کو ضرب دیتے ہیں۔ آپ خوبصورت ہیں۔ آپ کو شاید ضرب تو نہ دیں، مگر دوسرے طریقے سے آپ کی ساری جمع تفریق خراب کر دیں گے..... اگر آپ کو یقین نہیں تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی رابطہ کر لیتا ہوں! ایس ایچ او سے۔“

کامی نے شانی کو زور سے ہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے جیب سے موبائل فون نکالا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ایسے مرحلے میں ہے کہ اپنی دھمکی پر عمل بھی کر سکتا ہے۔

شانی نے ذرا ڈھیلے پڑتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ تم جو سوچ رہے ہو غلط سوچ رہے ہو۔“

سکندر تاؤ دلانے والے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ”آپ کی سیٹلی صاحبہ کے سرالیوں کا بھی خیال تھا کہ شاید وہ غلط سوچ رہے ہیں لیکن بعد میں وہ سب کچھ غلط نہ نکلا۔“

شانی کا چہرہ ایک بار پھر غصے سے سُرخ ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی سکندر نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دفاعی انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے میڈم..... ٹھیک ہے۔ میں اب اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا ہی اندازہ غلط ہو۔ آپ اپنی سیٹلی کی طرح اپنے دوست سے ملنے نہ نکلی ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے آپ کو بس اڈے کا ناٹم شام بھی نہ دیا ہو۔ سب کچھ ہو سکتا ہے..... لیکن ایک بات ضرور ہے میڈم..... آپ کا کام بھی اپنی سیٹلی کے کام سے ملتا جلتا ہی ہوگا۔ کوئی گڑبڑ والا کام..... میرا مطلب ہے کہ کوئی میٹھا میٹھا، کھٹا کھٹا کام.....“ اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

شانی نے ایک بار پھر بھر کر باہر نکلنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ کامی نے اسے باقاعدہ ہاتھ سے روک دیا۔ اس کے ہاتھ شانی کے دونوں کندھوں پر آئے اور وہ سختی سے پیچھے دھکیل دی گئی۔

وہ گارڈ جیرے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”جیرے! تم ان کے پاس کمرے میں رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

جیرے نے اطاعت مندی سے سر ہلایا۔ وہ اب اس جیرے سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا جس کی پہلی جھلک شانی نے گلی میں دیکھی تھی۔

اس کی آنکھوں میں بھی اب شانی کو خباثت کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ یا شاید..... یہ صرف اس کا وہم تھا۔ وہ راقفل ہاتھ میں لئے بے گانگی سے اس سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا رہا۔ کامی اور سکندر باہر نکل گئے۔

شانی بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ بے حد تھکی ہوئی تھی اور قریباً بیس گھنٹے سے بھوکی بھی تھی۔ اب اس افتاد نے اس کی رہی سہی توانائی بھی چھوڑ لی۔ وہ کچھ دیر تک چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے۔ سینے میں دل بے بس پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس نے نقابت بھرے لہجے میں گارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو! تم مجھے کچھ بھلے شخص لگ رہے ہو۔ میں تمہارے کہنے پر اندر آئی تھی۔ اب اگر تم بھی ان لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاؤ گے تو میری بات کون سنے گا۔“

وہ بولا۔ ”آپ نے اپنا معاملہ خود خراب کیا ہے بی بی۔۔۔۔۔ آپ جن لوگوں کا ایڈریس لے کر پھر رہی ہیں انہوں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ جس سیٹل کی آپ نے بات کی ہے وہ پہلے ہی گھر سے نکال دی گئی ہے۔ سونے پر سہاگا کہ آپ اپنا اتا پتا بھی نہیں بتا رہی ہیں۔“

”دیکھو جیرے! میری کوئی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ کیا میں تمہیں۔۔۔۔۔ غلط عورت نظر آتی ہوں؟“

”آپ غلط عورت نہیں لگتیں۔ مگر جن حالات میں آپ یہاں پھر رہی ہیں وہ سارے کے سارے غلط ہیں۔ ایس ایچ اوصاحب نے چار دن پہلے ہی سارے چوکیداروں کو ہدایت کی ہے کہ کسی مشکوک بندے کو پوچھ گچھ کے بغیر نہ جانے دیا جائے۔ علاقے میں وارداتیں بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا ہو رہا ہے۔“

ایک دم شانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”جیرے! ہر بندے کی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ میری یہ مجبوری ہے کہ میں اس وقت اس بات کو بردھانا نہیں چاہتی۔ ورنہ۔۔۔۔۔ ورنہ۔“ جذبات کی شدت سے آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ آنسو پھر بہنے لگے۔

جبر اخاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ذرا توقف سے شانی نے خود کو سنبھالا اور کہا۔ ”جیرے! کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے؟“

”آپ بتائیں جی! میں کیا کروں۔“ جیرے کا لہجہ خلوص سے خالی تھا۔

”ان کو سمجھاؤ۔ یہ میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ مجھے جانے دیں یہاں سے۔ میں عزت دار ہوں۔“ شانی کے لہجے میں التجا کا رنگ آ گیا۔

شانی کے اس لہجے نے گارڈ جیرے پر مثبت کے بجائے منفی اثر ڈالا۔ اس نے بے باکی سے شانی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے سمجھانے بجھانے سے اب کچھ نہیں ہوگا جی۔ آپ کامی صاحب سے خود بات کر کے دیکھیں۔“

”تم ایک دوسرے کو جانتے ہو۔ ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہو۔ انہیں بتاؤ کہ ایک شریف لڑکی کو تما شانہ بنائیں۔ آخر وہ بھی ماؤں بہنوں والے ہیں۔“ شانی کا گلہ رندہ گیا۔

کہتے ہیں کہ عورت کے آنسو بہت کچھ پگھلا دیتے ہیں لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عورت جب مجبوری کے شکنجے میں پھنسی ہو تو ہوس کا مرد کو یہ آنسو پگھلانے کے بجائے اور بھی پتھر کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ جبر اجواب میں کچھ کہتا باہر سے کامی کے تیسرے ساتھی کی تیز باریک آواز آئی۔ ”جیرے بھائی۔۔۔۔۔ ذرا باہر آنا۔“

جیرا شانی کو اس کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ یہ دیکھ کر شانی کی اندرونی بے قراری انتہا کو پہنچ گئی کہ جیرے نے دروازہ باہر سے بند کر کے آہستہ سے کنڈی لگا دی ہے۔ وہ اب عملی طور پر یہاں پابند تھی۔

باہر کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ گزرنے والا ہر لمحہ شانی پر بھاری تھا۔ کسی وقت اس کے اندر خوف سرایت کر جاتا تھا کسی وقت غصے کی بلند لہر اٹھتی تھی۔ ایسے میں وہ سوچتی تھی۔ کیا ہو جائے گا۔ دنیا کو یہی پتا چل جائے گا کہ نا کرنگ والی کے چوہدری ارشاد کی بیٹی اور نار پور کے سیالوں کی بہو ابھی زندہ ہے۔ ابھی اس کے ساتھ کچھ دشمنوں کا پون صدی پرانا حساب کتاب باقی ہے۔ ابھی زندگی نے اس سے کچھ مزید خراج وصول کرنے ہیں۔ بہر حال یہ بات سوچنا آسان تھی۔ اس کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا بے حد..... بے حد مشکل تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور کامی کا پختہ عمر ساتھی سکندر اندر آ گیا۔ اس کا ایک کلا گھوری کی وجہ سے پھولا ہوا تھا۔ سر پر ٹوپی ذرا سی ترچھی تھی۔

”اندر آنے کی اجازت ہے میڈم؟“ اس نے اندر آ کر پوچھا۔

”ہاں کیا بات ہے؟“ شانی اپنی آواز کی لرزش پر بمشکل قابو پا رہی تھی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور سامنے کھڑے کھڑے دیوار سے ٹیک لگالی۔ شانی کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی کلباڑا ہو اور وہ اس شخص کے کلوے کر کے فرش پر بکھیر دے۔

سکندر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”میں بھاجیرے کے کہنے پر اندر آیا ہوں میڈم۔ میں بات کو گھما پھرا کر کرنا نہیں چاہتا۔ سچی بات یہ ہے کہ آپ بہت بُری طرح چھپنے والی ہیں۔ ایسی ایچ اورانا بڑا بد لحاظ بندہ ہے۔ اللہ ہر کسی کو اس کے شکبے سے بچائے.....“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولا۔ ”اگر آپ میرے دل کی بات پوچھیں تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ میں نے کامی جیرے اور مجید سے بھی کہا ہے کہ آپ کو جانے دیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ خاص طور سے یہ کامی..... یہ بالکل اور طرح کا بندہ ہے۔ بس سمجھیں کہ سر پھرا ہے۔ ہم اس کے یار نیلی ہیں پھر بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ آپ بھی جتنا ڈریں کم ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

سکندر نے پیک گنکی اور بولا۔ ”میڈم جی! آپ سیانی ہو۔ اس دنیا میں کوئی کام بھی حساب کتاب کے بغیر نہیں ہوتا۔ کچھ لینے کے لئے کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس طرح ہی معاملات طے ہوتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں خباثت بڑھتی جا رہی تھی۔

شانی نے کہا۔ ”اگر تم روپے پیسے کی بات کر رہے ہو تو میرے پاس زیادہ روپے نہیں ہیں۔ تم اٹپی کھول کر دیکھ سکتے ہو۔ عام کپڑوں کے علاوہ بیس بانکس سو روپے ہوں گے۔ زیور کے نام پر میرے کانوں میں بس یہ بالیاں ہیں۔“

”اوہو..... ہو..... ہو.....“ سکندر نے قہقہہ لگایا اور شانی کو اپنے ہاتھ کی پشت پر پیک کے چھینے محسوس ہوئے۔ ”آپ بھی بڑی بھولی ہو میڈم جی ہزار دو ہزار روپیہ یا چار چھ ماشے سونا ہمارا چائے پانی، تو ہو سکتا ہے لیکن کامی کو اس سے کیا غرض ہوگی..... وہ تو کھاتا پیتا بندہ ہے۔“

”تو کیا چاہتا ہے وہ؟“

سکندر کی نظر شانی کے چہرے سے اُتری اور ”فوٹو سٹیشن“ کی شعاع کی طرح اس کے برقع سے گزرتی ہوئی پاؤں تک چلی گئی۔ وہ بے حد گھٹیا لیکن بے باک لہجے میں بولا۔ ”میں اسے آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ اگر آپ ”کسی طرح“ اس کا دل نرم کر لیں تو بات بگڑنے سے بچ سکتی ہے۔“ یہ بات کہتے ہوئے سکندر کی آنکھیں دنیا کی سب سے کریہہ آنکھیں تھیں۔ بھوک، ہوس اور شیطانییت سے بھری ہوئی۔ یہ آنکھیں وہ کچھ بھی کہہ رہی تھیں جو ابھی تک سکندر کی لعنتی زبان پر نہیں آ سکا تھا۔

یہ آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ اس تاریک ابر آلود رات میں تم اکیلی عورت ہو اور یہ اتنا بڑا گناہ ہے جس کی سزا آبروریزی سے کم ہے ہی نہیں۔۔۔۔۔۔ ہاں اس کی سزا آبروریزی سے کم ہے ہی نہیں۔ تم ماہ و سال کے سارے روز نامچے دیکھ لو۔ تم ماضی کی ساری کھڑکیوں میں جھانک لو تاریخ کے تمام اوراق پلٹ لو۔ تمہیں بیشتر جگہ اس جرم کی تعزیر یہی ملے گی۔ آج تم ہم چاروں کا شکار ہو۔ تمہاری آبر و اور تمہارے مال پر ہمارا حق ہے۔ کیونکہ ہم مرد ہیں، طاقت ور اور زیادہ ہیں۔

شانی کے اندر سے غیظ کی ایک بلند لہر اٹھی۔ اس لہر نے اسے ان لمحوں میں شانی نہیں رہنے دیا، چھوٹی چوہدرانی بنا دیا۔ اپنے ابا جی کی بہادر بیٹی، اپنی ماں کی تصویر اپنے گاؤں کی شان۔ وہ کمزور اور ناتواں اور بے بس ہونے کے باوجود سب کچھ بھول گئی۔ اس نے پورے زور سے سکندر کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور گر گیا۔ شانی اٹھتی اٹھاتی ہوئی دروازے سے باہر نکلی اور تیر کی طرح مین گیٹ کی طرف بڑھی۔ باہر موجود تینوں افراد کو شاید اس عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ ہال نما کمرے میں موجود تھے۔ ان کے باخبر ہوتے ہوتے شانی مین گیٹ کی طرف نصف راستہ طے کر چکی تھی۔ اسے اپنے عقب میں کامی کی خطرناک آواز سنائی دی۔ ”رک جاؤ۔۔۔۔۔۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔“ شانی رکنے کے لئے نہیں بھاگی تھی۔ کامی اس کے پیچھے بھاگا لیکن پھر ٹھہر گیا۔ ”رک جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔“ اس نے جنونی لہجے میں جیسے آخری وارنگ دی۔

☆=====☆=====☆

اللہ والے

اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات و واقعات پر مشتمل ایک گرانقدر تصنیف جو خالد پرویز کی عالمانہ عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بازید بسطامی، حضرت بہاء الدین زکریا، حضرت داتا گنج بخش، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت میاں میر کے حالات زندگی رقم ہیں۔ گلدستہ اولیاء کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے تحقیق و تالیف سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

شانی ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ ان لہجوں میں اس کے اندر اتنی توانائی، اتنا اعتماد نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ اس کے دل کی گواہی تھی۔ یہ غنڈا اسے گولی نہیں مار سکتا..... یہ اسے گولی مار ہی نہیں سکتا۔ ایک وجدان تھا..... ایک یقین تھا۔ یہ ”یقین“ اسے بے حد مستحکم قدموں سے مین گیٹ کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں تیس چالیس قدم پیچھے کامی کی چنگھاڑتی آواز پھر ابھری۔ ”میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ میں گولی مار دوں گا۔“

شانی تب تک گیٹ کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ چکی تھی۔ اس نے کندی ہٹائی اور چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ عقب میں موجود افراد اپنی دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ یقیناً ان کے پاس آتشیں ہتھیار تھے مگر وہ اسے استعمال نہیں کر پائے تھے۔ ہچکچاہٹ کے ان چند لمحات نے شانی کو گیٹ سے باہر پہنچا دیا۔ اب وہ گلی میں تھی۔ اسے اپنے عقب میں بھاگتے قدموں کی آواز آئی تو وہ بھی بھاگ اٹھی۔ خود کو ہلکا کرنے کے لئے اس نے اٹیچی اپنے ہاتھ سے گرا دیا۔ وہ پختہ سڑک پر لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔ چالیس پچاس میٹر کا فاصلہ شانی نے اسی طرح طے کیا۔ اب وہ ایک تاریک چوراہے پر تھی۔ یکا یک ایک گاڑی کے نائز سڑک پر گھسنے کی خوفناک آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی ہیڈ لائٹس کی چمک نے شانی کی آنکھیں چندھیا دیں۔ چھوٹی سوزوکی کار کا بمپر اس کے گھسنے سے بمشکل چھانچنے کے فاصلے پر رکا ہوگا۔ دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص نفیس سوٹ میں ملبوس باہر نکلا۔ پہلے تو اس کے تیوروں سے نظر آیا کہ وہ شانی کو سخت جھاڑ پلائے گا۔ مگر اس کا حلیہ اور تاثرات دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔

شانی نے ہانپتی ہوئی آواز میں التجا کی۔ ”انکل..... وہ غنڈے میرے پیچھے آرہے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے بچائیے۔“ اسی دوران میں ایک لمبا ترنگا شخص بھی کار سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ ٹریفک پولیس کی وردی میں تھا۔ شانی نے مڑ کر دیکھا۔ کامی اور اس کے دونوں ساتھی تیس چالیس میٹر پیچھے ہی رک گئے تھے۔ گارڈ جبرائیل سڑک کے پار اندھیرے میں تھا۔ وردی والا شخص ٹریفک سارجنٹ تھا۔ اس نے ٹوپی اتار کر شاید گاڑی میں رکھی ہوئی تھی۔ گنجاسر بارش کی بوندوں سے بھیگ گیا اور ہیڈ لائٹس میں چمکنے لگا۔

”کون لوگ ہیں یہ؟“ نفیس سوٹ والے نے پوچھا۔
”مجھے نہیں پتا انکل۔ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔“
سارجنٹ چند قدم آگے آیا اور اونچی آواز میں بولا۔ ”کون ہے بھی؟“
گارڈ جبرائیل ہی اوجھل ہو چکا تھا۔ کامی کے ساتھی بھی پسپا ہو کر قریب گلی میں داخل ہو گئے۔ صرف کامی چند سینکڑا ہٹا رہا۔ پھر وہ بھی گلی میں اوجھل ہو گیا۔ نفیس سوٹ والے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ ”چلو تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“ لہجے میں شفقت تھی۔
شانی نے ایک نظر اس کے مہربان چہرے پر ڈالی پھر جلدی سے پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ٹریفک سارجنٹ اور ادھیڑ عمر شخص

بھی بڑبڑاتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے۔ بس اکا دکا افراد دور بند دکانوں کے سامنے کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ ادھیڑ عمر شخص نے پھر سے اسٹیرنگ سنبالا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

تقریباً ایک کلومیٹر آگے جا کر ادھیڑ عمر شخص نے کار روک دی۔ سارجنٹ اور وہ دونوں شانی سے سوالات کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سوالات کی نوعیت وہی تھی جو ہونی چاہئے تھی۔ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں؟ یہ لوگ آپ کے پیچھے کیسے لگے؟ انہوں نے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟ وغیرہ وغیرہ۔

شانے نے ان سوالات کے مختصر جواب دیئے اور انہیں بتایا کہ وہ گوجر خان سے اپنی ایک عزیز سہیلی سے ملنے یہاں لاہور آئی تھی، مگر اس سے ملاقات نہیں ہو سکی اب وہ واپس جانا چاہتی ہے۔ اس نے ادھیڑ عمر شخص سے درخواست کی۔ ”انکل آپ کسی طرح مجھے بس اڈے تک پہنچادیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ ”میں تمہیں ضرور پہنچا دیتا لیکن تم بالکل اکیلی ہو۔ موسم بھی ٹھیک نہیں۔ اس وقت سفر کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ صبح تک انتظار کر لیا جائے۔“

”صبح تک میں کہاں رہوں گی؟“

”اگر مناسب سمجھو اور اپنے انکل پر اعتبار کر سکو تو ساتھ چلو..... میرے گھر..... وہاں تمہاری آنٹی ہیں دیگر لوگ ہیں۔ ان سے مل کر تمہیں خوشی ہوگی۔“

”لیکن.....“

ٹریفک سارجنٹ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! یہ بھلے آدمی ہیں۔ تم صبح تک کے لئے ان کا سہارا لے سکتی ہو۔“
تھوڑی سی ہچکچاہٹ اور تھوڑی سی مزید گفتگو کے بعد شانی گھر چلنے پر آمادہ ہو گئی۔

ٹریفک سارجنٹ صاحب راتے میں اتر گئے۔ جب انہوں نے ادھیڑ عمر شخص کا شکریہ ادا کیا تو شانی کو پتا چلا کہ وہ راستے میں لفٹ لے کر گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ان کے جانے کے بعد شانی اور ادھیڑ عمر شخص گاڑی میں تنہا رہ گئے۔ ادھیڑ عمر شخص کے انداز میں شانی کی اور کسی حد تک شفقت بھی تھی۔ شانی کو محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک اچھے شخص کی تحویل میں ہے۔ عمومی نوعیت کے سوال جواب کرتے ہوئے وہ لوگ ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوئے۔ بالآخر گاڑی ایک کوٹھی نما مکان کے سامنے جا کر رکی۔ ہارن کی آواز پر ایک نو عمر لڑکے نے دروازہ کھولا اور وہ اندر چلے گئے۔

یہاں شانی کی ملاقات ایک ادھیڑ عمر خاتون سے ہوئی۔ یہ نفیس سوٹ والے انکل کی بیوی تھیں۔ شانی کو انکل کا نام ریاض عثمانی معلوم ہوا۔ وہ ایک سرکاری ملازم تھے۔ یہاں اپنی بیوی، دو بچوں اور ایک ملازم کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کی ایک بچی کی شادی ابھی دو تین ہفتے پہلے ہی ہوئی تھی۔

ادھیڑ عمر عورت نے بڑے اصرار کے ساتھ شانی کو کھانا کھلایا اور پھر اس سے باتیں کرتی رہیں۔ ان کی باتوں میں شانی کو اپنائیت ملی اور تحفظ کا احساس ہوا۔ شانی کے کپڑے بارش میں نم ہو چکے تھے۔ خاتون نے اسے اپنی بیٹی کے کپڑے پہننے کے لئے دیئے۔ رات کے آخری پہر

خاتون نے اصرار کے ساتھ شانی کو آرام کرنے کے لئے کہا۔ ان کے اصرار پر شانی لیٹ گئی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گزر جانے والے واقعات ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے اور اس کا دل لرزنے لگا۔ سکندر کی مکروہ مسکراہٹ ابھی تک اس کی نگاہوں میں تھی اور اس کی منحوس آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے کتنے لچر انداز میں کہا تھا۔ ”میڈم جی! آپ سیانی بیانی ہیں! اس دنیا میں کوئی کام بھی حساب کتاب کے بغیر نہیں ہوتا۔ کچھ لینے کے لئے کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس طرح ہی معاملے طے ہوتے ہیں۔“

اور پھر کامی کی وہ کڑکتی ہوئی آواز جس نے بھاگتی ہوئی شانی کا پیچھا کیا تھا۔ ”رک جاؤ..... ورنہ گولی مار دوں گا۔ رک جاؤ۔“ وہ سوچتی رہی اور کروٹیں لیتی رہی۔ اسے کچھ عرصے پہلے اخبار میں پڑھی ہوئی ایک خبر یاد آرہی تھی۔ گھر سے بھاگنے والے ایک بالغ لڑکے لڑکی کو شیخوپورہ کے قریب کچھ اوباش افراد نے پکڑ لیا تھا۔ ایک باغ میں ایک درخت سے رات بھر لڑکے کو الٹا لٹکائے رکھا تھا۔ اسے خاموش رکھنے کے لئے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ ایک قریبی کولڈ اسٹور میں لڑکی کی عزت لوٹی جاتی رہی تھی..... ایسے نہ جانے کتنے واقعات روزانہ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ان میں سے کتنے منظر عام پر آتے ہیں اور کتنے مصلحت اور عزت کی چادر اوڑھ کر تاریک گوشوں میں چھپ جاتے ہیں۔

شانہ خیالوں میں گم رہی اور اپنے موجودہ حالات پر غور کرتی رہی۔ وہ بالکل تہی دست تھی۔ اسے اپنے اٹیچی کا خیال آیا جو وہ سڑک پر پھینک آئی تھی۔ اس میں اس کی کل پونجی تھی۔ غنڈوں سے جان بچانے کے بعد جب وہ عثمانی صاحب کی گاڑی میں آئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ اسے کسی طرح بس اڈے تک پہنچا دیں۔ تب اس کے ذہن سے یہ بات بالکل نکل گئی تھی کہ اس کے پاس تو کرائے کے پیسے بھی نہیں ہیں۔

صبح نو بجے کے لگ بھگ ادھیڑ عمر خاتون دبے قدموں اندر داخل ہوئیں۔ شاید ان کا خیال تھا کہ شانی سو رہی ہے۔ اسے جاگتا دیکھ کر وہ بڑی محبت سے اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ انہوں نے بڑے اصرار کے ساتھ شانی کو نہانے پر مجبور کیا۔ اپنی بیٹی کا ایک اور جوڑا اسے پہننے کے لئے دیا۔ اس کے بعد ناشتہ کرایا۔ شانی دو پہر تک ان کی چاہت بھری باتوں کی پھوار میں بھٹکتی رہی۔ وہ بڑی جہانم دیدہ خاتون تھیں۔ جلد ہی سمجھ گئیں کہ اس وقت شانی کا آگے پیچھے کوئی نہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو وہ بوجہ اس کے پاس جانا نہیں چاہتی۔ انہوں نے اس معاملے میں شانی کو زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ شانی نے صرف اتنا بتایا کہ اس کا نام شہناز اور گھریلو نام شانی ہے۔ والدہ کافی عرصہ پہلے فوت ہو گئی تھیں۔ پھر بھائی بھی ایک حادثے میں چھن گیا۔ ایک والد تھے جو کافی عرصے سے بیمار تھے۔ چند ماہ پہلے وہ بھی چل بسے۔ اب جو عزیز ہیں ان سے اسے بھلائی کی توقع نہیں ہے۔ وہ ان کے پاس واپس جانا نہیں چاہتی۔

سہ پہر کو عثمانی صاحب گھر آئے تو ان کے پاس شانی کے لئے ریڈی میڈ کپڑوں کے دو جوڑے اور ایک گرم چادر تھی۔ اس کے علاوہ ایک درمیانے سائز کا اٹیچی کیس بھی تھا، وہ بھی شانی سے تسلی بخشی کی باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے رسمی انداز میں شانی سے اس کے کوائف معلوم کرنا چاہے مگر جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک حد سے زیادہ بتانا نہیں چاہتی تو موضوع بدل دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ آئندہ تمہیں جو بھی قدم اٹھانا ہے اس کے بارے میں اچھی طرح سوچ سوچ لو اور جب سوچ سمجھ لو تو ہمیں بتا دینا۔ اس دوران میں تم مکمل اطمینان کے ساتھ یہاں رہ سکتی ہو۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

شانی نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔ سر ہلاتے ہوئے اس کی آنکھوں سے دواؤں نپک کر خود بخود اس کی گود میں گر گئے۔

اگلے دو روز میں شانی نے اس حوالے سے واقعی کافی کچھ سوچا۔ اسے یہ چار دیواری اپنے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ کی طرح لگی۔ اس پناہ گاہ میں اسے انکل عثمانی اور آنٹی ماجدہ کی پُر خلوص محبت میسر تھی۔ وہ دونوں بڑے کشادہ دل کے مالک تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ شانی کا سہارا بنیں اور اس کی زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے میں اس کی مدد کریں۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ان کی فقط دو بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹی بیاہ کر جرمنی میں مقیم تھی۔ دوسری بیٹی کی شادی ابھی حال ہی میں ہوئی تھی۔ افشاں کی رخصتی کے بعد دونوں میاں بیوی خود کو ایک دم تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ ایک نو عمر لڑکا شاہد بھی اس گھر کا کلین تھا۔ اس کی عمر پندرہ سولہ سال تھی۔ وہ عثمانی صاحب کا دور کار شستے دار بھی تھا، گاؤں سے آیا تھا اور یہاں پڑھائی کے ساتھ گھر کا کام کاج کرتا تھا۔ عثمانی صاحب کی بیٹی افشاں کی شادی اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ وہ ایک دن اپنے شوہر کے ساتھ صرف تین چار گھنٹے کے لئے لاہور آئی۔ درمیانے قد اور مختصر سے جسم کی وہ ایک قبول صورت نازک سی لڑکی تھی۔ بڑے معصوم انداز میں بولتی تھی۔ اس کا شوہر اس کا ہم عمر ہی تھا۔ بعد ازاں شانی کو معلوم ہوا کہ وہ اس کا کلاس فیلو تھا۔ وہ بھی ایک خوش مزاج نوجوان تھا۔ مجموعی طور پر شانی کو یہ سارے لوگ اچھے دل کے لگے۔ اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ وہ غیر معینہ مدت تک اس چار دیواری میں قیام کر سکتی ہے اور اپنی زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دے سکتی ہے۔

☆=====☆

خواتین کے مقبول ترین ناول

ہمیں تمہارے دل کی خبر تھی

قیمت: 250

نگہت سیما

محبت فلاح اعظم

قیمت: 150

سیمابنت عامر

اپنے قریبی بکسٹال یا ہا کر سے طلب فرمائیں

علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میوہ ہسپتال، لاہور۔

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

Ph: 7247414

براہ راست
منگوانے
کا پتہ

وہ ایک زردی دوپہرتی۔ سامنے لان میں شہوت کے زرد پتے جھڑ جھڑ کر زردی مائل گھاس پر گر رہے تھے۔ آنٹی ماجدہ کو اچانک ایک فوسیدگی پر گلبرگ جانا پڑ گیا تھا، انکل عثمانی حسب معمول آفس میں تھے۔ وہ پی ٹی سی ایل میں ملازم تھے اور اعلیٰ گریڈ میں تھے۔ ان کی واپسی شام کو سات بجے کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ ملازم لڑکا شاہد ضروری کام کاج کے بعد اب اپنا ہوم ورک لے کر برآمدے میں بیٹھا تھا۔

شانی کمرے کی کھڑکی سے زرد پتوں کا سفر دیکھتی رہی اور اس کے دل پر پت جھڑکا موسم طاری رہا۔ ایک عجیب سی اداسی بھری ہوئی تھی اس کے رگ و پے میں۔ نگاہوں میں رہ رہ کر رستم، شیریں زوار اور ماسی زنب کے چہرے آرہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی صبح جب انہوں نے اسے گھر میں نہ پایا ہوگا تو ان پر کیا گزری ہوگی۔ سب سے زیادہ پریشانی اسے رستم کے حوالے سے تھی۔ وہ جانتی تھی اس کا رد عمل بہت سخت ہوگا۔ شانی کا چھوڑا ہوا خط پانے کے بعد وہ دیوانوں کی طرح اسے ڈھونڈنے نکل گیا ہوگا۔ اب بھی وہ نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ کہاں بھٹک رہا تھا۔ شانی نے اب تک اسے دکھ کے سوا کچھ نہیں دیا تھا اور شاید وہ کوئی دوسری چیز دے بھی نہیں سکتی تھی۔

اچانک فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ شاہد کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ شانی خود ہی ٹیلی فون تک پہنچی۔

اس نے ریسورٹ اٹھا کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔ ”عثمانی کہاں ہے؟“

”جی وہ تو دفتر میں ہیں۔“

”دفتر میں نہیں وہ۔“

”پھر..... مجھے تو پتا نہیں جی۔“

”تم کون ہو؟“

”میں ان کی عزیزہ ہوں۔“

”دیکھو جب وہ آئے تو اسے بتا دو کہ مجھ سے دفتر میں آکر ملے۔ ورنہ مجھے پھر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ہوگا..... میں قاسم برلاس بول رہا

ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔

پتا نہیں یہ کون تھا جس نے اتنے تند لہجے میں بات کی تھی۔ عثمانی صاحب بظاہر تو ایسے آدمی نہیں لگتے تھے جن سے لوگوں کو شدید قسم کی

شکایات پیدا ہوتی ہوں۔

وہ کچھ دیر تک اس فون کال پر غور کرتی رہی پھر چاول پکانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جب آنٹی واپس آئیں تو انہیں

پھر سے کچن میں گھسنا پڑے۔ اس نے دو چار روز میں ہی کچن کا بہت سا کام اپنے ذمے لے لیا تھا بلکہ اکثر وہ ایسے کام بھی کر گزرتی تھی جو اصل میں

شاہد کی ذمہ داری تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی اس سے بہت خوش تھا۔

بھیگے ہوئے چاولوں کو چولہے پر چڑھا کر وہ فارغ ہوئی ہی تھی کہ دروازے پر کال بیل ہوئی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ آواز دے کر شاہد کو جگائے لیکن وہ تھک کر سویا ہوا تھا۔ اسے جگانا شانی کو اچھا نہیں لگا۔ وہ سر پر اوڑھنی درست کرتی ہوئی خود ہی دروازے پر پہنچی۔ دوسری طرف عثمانی صاحب خود تھے۔ شانی نے دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”آج..... آپ جلدی آگئے؟“

”ہاں سر میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ انگلیوں سے پیشانی کو مسل کر بولے۔

”گاڑی کہاں ہے؟“

”ذرا اور کشاپ گئی ہے۔ مسٹری مجھے ڈراپ کر کے چلا گیا ہے.....“ پھر ذرا توقف سے بولے۔ ”ماجدہ تو شاید گلبرگ گئی ہوں گی، فوسیدگی پر۔“

شانی نے اثبات میں جواب دیا۔ عثمانی صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے اور ٹائی جوتے وغیرہ اتارنے لگے۔ ”آپ چائے پیئیں گے؟“ شانی نے پوچھا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”ہاں اچھی سی چائے مل جائے تو کیا بات ہے؟“

شانی کچن میں چلی گئی اور دس منٹ میں گرم گرامر چائے لے آئی۔ اس وقت تک عثمانی صاحب شلو اور قمیص پہن کر صوفے پر دراز ہو چکے تھے۔ شانی انہیں کچھ دیر پہلے آنے والی فون کال کے بارے میں بتانا چاہتی تھی مگر وہ اپنی طبیعت ناساز بتا رہے تھے اس لئے اس نے بہتر سمجھا کہ انہیں تھوڑا سا آرام کرنے دے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

عثمانی صاحب اٹھ کر چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگے۔ شانی پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ بولے ”بیٹھ جاؤ بھی..... تم تو نظر ہی نہیں آتی ہو۔“

”بس..... بس۔“

”بیٹھ جاؤ نا۔“ انہوں نے زور دے کر کہا۔

شانی پاس ہی سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسے تنہا کمرے میں کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ چائے پینے کے بعد عثمانی صاحب پھر صوفے پر دراز ہو گئے۔ ان کی انگلیاں گاہے بگاہے اپنی پیشانی کو مسلتی تھیں۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”آپ اسپرین وغیرہ کیوں نہیں کھا لیتے؟“

”نہیں وہ مجھے مافق نہیں آتی۔“

”تو ذرا دیوالیس۔“ شانی نے کہا ”میں شاہد کو بھیجتی ہوں۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”نہیں نہیں وہ دبا تا کم اور جھجھوڑتا زیادہ ہے۔“

شانی چند لمحے خاموش رہی..... پھر اسے یہ خاموشی بوجھل محسوس ہونے لگی۔ بوجھل اور ناروا..... وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”اگر کہیں تو میں

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

بادوں۔“

”ہاں..... اگر تمہیں بُرا نہ لگے تو۔“

”آپ کیسی بات کرتے ہیں انکل۔“ شانی نے بمشکل کہا اور اٹھ کر عثمانی صاحب کے سر ہانے آن بیٹھی۔ وہ نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اس کی انگلیاں ان کی پیشانی اور سر پر گردش کرنے لگیں۔ نہ جانے کیوں شانی کے دل پر بوجھ سا پڑنے لگا تھا۔ وہی بوجھ جو اس معاشرے کی دین ہے۔ جو ہر موڑ پر عورت سے اس کا اعتماد اور بھروسہ چھینتا ہے۔ اچانک عثمانی صاحب کی نرم آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”شانے تم اس گھر میں خود کو افشاں ہی کی طرح سمجھو۔ جیسے وہ میری بیٹی ہے، ویسے تم ہو۔ کسی طرح کی جھجک اپنے دل میں نہ رکھنا۔“

شانے ایک دم غصے کی طرح کھل گئی۔ اس کے ہاتھ مزید اپنائیت اور مستعدی سے عثمانی صاحب کی پیشانی پر حرکت کرنے لگے۔ وہ بولی۔

”انکل! یہ آپ کی محبت ہی ہے جس کی وجہ سے یہ چار دیواری مجھے اپنے گھر کی طرح لگتی ہے۔“

”یہ تمہارا گھر ہے بیٹی! تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو۔ میں اور ماجدہ ہر طرح سے تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔“

”بہت شکریہ انکل.....! آپ کا یہ کہہ دینا ہی بہت ہے۔“

وہ سوچ رہی تھی۔ انسان کے اندازے کتنے غلط ہوتے ہیں۔ اس کی سوچ کتنی محدود ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک عثمانی صاحب کے بارے میں انجانے اندیشے اس کے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے..... لیکن اب ذہن ایک دم صاف ہو گیا تھا۔ وہ خود کو ہلکی پھلکی محسوس کر رہی تھی۔ ایک جادوسا تھا لفظ ”بیٹی“ میں۔

اچانک اسے کچھ دیر پہلے کی ٹیلی فون کال یاد آئی۔ وہ بولی۔ ”انکل ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی قاسم صاحب کا فون آیا تھا۔ بڑے اکھرے اکھرے لہجے میں بول رہے تھے۔“

شانے نے دیکھا کہ ایک دم انکل عثمانی کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ”کب آیا تھا فون؟“ ان کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”آپ کے آنے سے پہلے..... وہ کہہ رہے تھے کہ آپ جلد سے جلد ان سے دفتر میں ملیں۔“

”ٹھیک ہے..... میں دیکھ لوں گا۔“ انکل عثمانی نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد بھی شانی پانچ دس منٹ تک ان کے پاس رہی۔ مگر ان کی توجہ منتشر تھی اور وہ پریشان نظر آ رہے تھے۔

یہ تیسرے روز سہ پہر کی بات ہے۔ اتوار کی چھٹی تھی، انکل عثمانی گھر میں ہی تھے۔ شانی اپنا دھیان بنانے کے لئے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ آنٹی ماجدہ ذرا گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ ”بیٹی شانی! تم چائے بڑی اچھی بنا لیتی ہو۔ ذرا بنا دو۔ تمہارے انکل کے خاص مہمان آئے ہیں۔ میں شاہد سے کہہ کر سکٹ وغیرہ منگوا لوں۔“

شانے فوراً کچن کی طرف لپک گئی۔ آنٹی ماجدہ کا ہاتھ بنانا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ جب وہ چائے بنا رہی تھی، انکل عثمانی کچھ گھبرائے گھبرائے سے کچن میں آئے اور ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر واپس چلے گئے۔ اسی دوران میں شاہد چائے کے بہت سے لوازمات لے آیا۔ آنٹی ماجدہ سب

کچھ ٹرائی میں سجانے لگیں۔ شانی کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ وہ واضح طور پر نروس تھیں۔

اس دوران میں دوبارہ انکل عثمانی کی صورت کچن کے دروازے پر نظر آئی۔ انہوں نے کہا: ”شانی بیٹی! اگر تم خود ہی چائے لے آؤ تو بہتر ہے۔“ شاید وہ نہ بھی کہتے تو شانی، آنٹی کو ڈرائنگ روم میں نہ جانے دیتی۔ وہ سر اور سینے پر آنچل کو درست کرتی ہوئی..... ٹی ٹرائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچی جہاں..... انکل عثمانی کے علاوہ دو اور افراد تھے۔ ان میں سے ایک شخص خاصا لمبا چوڑا تھا۔ اس کا سر نصف سے زیادہ گنجا تھا۔ گال پھولے ہوئے تھے۔ وہ پینٹ اور جرسی میں تھا۔ عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ دوسرا شخص درمیانے قد کا ٹھکانا تھا۔ اس کلرک ٹائپ شخص کی آنکھوں پر مونٹے شیشوں کی عینک تھی۔ اس کے سامنے میز پر ایک فائل رکھی تھی۔

”السلام علیکم۔“ شانی نے کہا۔

گرائڈیل شخص نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ پھر افسرانہ شان کے ساتھ انکل عثمانی سے پوچھا۔ ”عثمانی! یہ کون ہیں؟“

”میری عزیزہ ہیں۔ گوجرخان سے آئی ہیں۔ یہاں کسی اچھی جاب کی تلاش میں ہیں۔“

”بہت خوب۔“ افسر نما شخص نے شانی کو سر تاپا گھورتے ہوئے کہا..... اس کی آنکھوں میں شانی کو عجیب سی چمک نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ یہ بھاری بھر کم آواز اس نے کہیں سنی ہے۔ پھر ایک دم اسے یاد آگیا۔ یہ آواز اس نے فون پر سنی تھی۔ بولنے والے نے اپنا نام قاسم برلاس بتایا تھا۔

چائے پیش کر کے شانی جلدی سے باہر نکل آئی۔ تاہم اسے محسوس ہوا کہ دو پریش نگا ہیں اس کی پشت سے چپکی ہوئی ہیں۔

چائے پینے کے دوران میں اور بعد میں ڈرائنگ روم سے تیز لہجے میں بولنے کی آواز آتی رہی، عینک والا..... فائل بردار شخص چائے پینے کے فوراً بعد ہی واپس چلا گیا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ دروازے کے پاس سے گزری تو قاسم برلاس کی گرجتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ غالباً انکل عثمانی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ”تمہارے قول و فعل میں فرق ہے۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے..... کھلا دھوکا دیا ہے۔ مجھ سے تمہاری ملاقات ہر دوسرے تیسرے روز ہوتی تھی لیکن تم نے ایک بار بھی افشائ کی شادی کا ذکر نہیں کیا۔“

”بس جو کچھ ہوا اچانک ہوا۔“ انکل عثمانی کی معذرت خواہانہ آواز ابھری۔ جواب میں قاسم برلاس نے پھر چیخ کر کچھ کہا مگر الفاظ شانی کی سمجھ میں نہیں آئے۔ وہ دروازے سے دور جا چکی تھی۔

رات کو شانی نے اس بارے میں آنٹی ماجدہ سے بات کی تو کچھ نئی باتیں سامنے آئیں۔ آنٹی ماجدہ نے بتایا کہ دو ڈھائی سال پہلے عثمانی صاحب کے دوستا تھیوں نے افسران اعلیٰ سے ساز باز کر کے عثمانی صاحب کے خلاف ایک کیس بنوا دیا تھا۔ اس کیس کی حکمانہ انکوائری کئی ماہ تک ہوتی رہی۔ اب یہ کیس ناکافی ثبوتوں کی وجہ سے تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ مگر انکوائری کمیٹی کے ایک افسر نے بدینیتی کی وجہ سے اس معاملے کو پھر اچھا ل دیا ہے..... یہ افسر قاسم برلاس ہی ہے۔ اب وہ مختلف طریقوں سے عثمانی صاحب اور باقی اہل خانہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا تعلق محکمے کے انویسٹی گیشن سیل سے ہے۔

کمرے میں ہونے والی گفتگو میں شانی نے افشاں کا نام بھی سنا تھا۔ اسے شبہ ہو رہا تھا کہ شاید اس معاملے میں افشاں کا بھی کوئی کردار ہے۔ تاہم وہ آنٹی کے سامنے خود سے افشاں کا ذکر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آنٹی خود ہی اس بارے میں بات کریں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ رات کو شانی دیر تک اس گورکھ دھندے میں کھوئی رہی۔ اسے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ اہل خانہ اس قاسم نامی شخص سے خوفزدہ ہیں۔ ڈیل ڈول کے اعتبار سے بھی وہ خاصا دہنگ شخص نظر آتا تھا۔ قد سوا چھ فٹ سے کم نہیں رہا ہوگا۔ جسم چربلا اور پھیلا ہوا تھا۔ رگ سُرخی مائل سفید اور چہرہ تہمتا ہوا تھا۔

ٹی وی آن تھا۔ شانی کی نظریں سکرین پر تھیں مگر دھیان اس گھر کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ اچانک نگاہوں کے ساتھ ساتھ اس کی توجہ بھی ٹی وی سکرین پر مرکوز ہو گئی کسی ڈرامے کا سین تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کے ساتھ کشتی میں مصروف تھا۔ نہ جانے کیوں بچے اور اس کی ماں کو دیکھ کر شانی کو مینا یاد آ گیا۔ اپنی شرارت بھری آنکھوں، چمکیلی پیشانی اور گلابی ہونٹوں کے ساتھ اس کی پوری تصویر شانی کے تصور میں آ جا کر ہو گئی۔ ایک روز مئے نے بھی تو اسی طرح شانی سے کشتی کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شانی پتنگ اڑانے میں اس کی مدد کرے..... اور پھر وہ بے چارہ روشندان کے چھجے سے گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ بستر پر لٹا لیا تھا لیکن اتفاق سے اس رات وہ بستر خالی نہیں تھا۔ اس پر شانی کے ساتھ کسی اور کو لیٹنا تھا..... اور ہر صورت لیٹنا تھا۔ شانی روتے بسورتے مئے کو اٹھا کر بھابھو کے پاس چھوڑ آئی تھی اور بستر اپنے مخمور شوہر کے لئے خالی کر دیا تھا..... آہ..... ایسی کتنی ہی ناخوشگوار یادیں نارپور کی بلند و بالا حویلی سے منسوب تھیں۔

پھر شانی کا دھیان مئے سے بھابھو وغیرہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھے۔ کیا کر رہے تھے؟ اسے یاد بھی کرتے تھے یا نہیں۔ ان کے لئے تو شانی یقیناً مر چکی تھی۔ ان کے لئے ”شانی کی یادیں“ ایک مرے ہوئے کی یادیں ہی ہو سکتی تھیں..... شانی ان پچھڑے ہوؤں کے بارے میں سوچتی رہی۔ چچی پروین، تایا معصوم، بابا فخری، خادم حسین، سکینہ صغرا..... کتنے ہی ایسے چہرے تھے جنہیں وہ دیکھنا چاہتی تھی۔ جنہیں دیکھنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ ہاں ایک اور چہرہ بھی تھا جو بہت اہم تھا جو آپ ہی بہت اہم ہو گیا تھا۔ شانی کے نہ چاہنے کے باوجود وہ شخص اس کے دماغ کے ایک حصے پر قابض تھا۔ وہ اسے راولپنڈی میں چھوڑ کر دور چلی آئی تھی لیکن اس کے خیالات ہر وقت اس کے تعاقب میں تھے۔ یہ کیسا پھندا تھا، یہ کیسی زنجیریں تھیں؟ وہ دور جا کر بھی دور نہیں جاسکتی تھی۔ شانی کی دلی خواہش تھی کہ وہ راولپنڈی چھوڑ کر آزاد علاقے میں جا چکا ہو۔ ان سنگین خطرات کے زرخے سے نکل چکا ہو جو اس کے گرد ہر گھڑی اپنا گھیرا نگ کر رہے تھے۔ مگر کیا واقعی ایسا ہو چکا ہوگا؟ یہ بڑا مشکل سوال تھا۔ اس حوالے سے سوچتے ہوئے شانی کے ذہن میں خوش اندام نادیہ کا خیال بھی بار بار آتا تھا۔ وہ آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ رستم ہر گھڑی اس کی نگاہ میں تھا۔ وہ اس پر بُری طرح فریفتہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی طرح اسے آزاد علاقے میں جانے سے روک لیتی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی آزاد علاقے میں پہنچ جاتی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر یہ سب کچھ تب ہو سکتا تھا جب رستم شانی کے لکھے ہوئے آخری خط پر پھر وسا کرتا اور اس کی تلاش کا خیال (کم از کم وقتی طور پر) دل سے نکال دیتا۔

اگلے روز شانی کو اس کیس کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل ہوئیں جو بقول آنٹی ماجدہ کچھ بدخواہوں نے انکل عثمانی پر بنوا دیا

تھا۔ انکل عثمانی محکمہ ٹیلی فون میں ڈی ای تھے۔ آنٹی ماجدہ کی زبانی معلوم ہوا کہ انہیں تارچوری کے ایک معاملے میں ملوث کیا گیا تھا۔ تانبے کے کئی ٹن وزنی تار تھے جن کی مالیت لاکھوں میں تھی۔ انکل کے علاوہ محکمے کے ہی دو مزید افراد کو بھی ملزم ٹھہرایا گیا تھا۔

بہر حال یہ ساری باتیں پرانی ہو چکی تھیں۔ شانی کے سوچنے کی بات یہ تھی کہ اب اس باسی کڑی میں ابال آیا ہے تو کیوں۔ وہ چاہتی تھی کہ آنٹی ماجدہ خود ہی اسے اس بارے میں کچھ بتائیں۔ اسی روز شام کو گھر میں پھر سراسیمگی کی فضا پیدا ہو گئی۔ قاسم برلاس پھر آدھکا تھا۔ انکل عثمانی بوکھلائے بوکھلائے اندر باہر پھرنے لگے۔ آنٹی کے ہاتھ پاؤں بھی پھولے ہوئے لگ رہے تھے۔ شانی کو ان پر ترس بھی آرہا تھا۔ چائے بناتے ہوئے ان کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ آج پھر شانی کو ہی چائے لے کر اندر جانا پڑا۔ تاہم آج وہ خود بھی ہنچکا رہی تھی۔ اسے گرانڈیل شخص کی وہ پُرتیش نظریں یاد آ رہی تھیں جو کل کمرے سے واپسی پر شانی کی پشت سے چپک گئی تھیں۔

بادلِ نحو است وہ اندر داخل ہوئی۔ آج عینک والا کلرک نما شخص کمرے میں موجود نہیں تھا۔ گرانڈیل قاسم برلاس کے عین سامنے عثمانی صاحب صوفے پر سکرے سے بیٹھے تھے اور کچھ مٹھی سے نظر آ رہے تھے۔ آج خلاف توقع قاسم برلاس کا موڈ کچھ بہتر نظر آ رہا تھا۔ اس نے شانی کے سلام کا جواب مسکرا کر دیا پھر بولا۔ ”عثمان! تم نے ان کا نام نہیں بتایا؟“

”اس کا نام تو شہناز ہے لیکن ہم شانی کہتے ہیں۔ رشتے میں..... م..... میری بھتیجی لگتی ہے۔“

قاسم برلاس نے ایک بار پھر جلتی نظروں سے شانی کو سر تا پا گھورا اور بھاری آواز میں بولا۔ ”کتنا پڑھی ہوئی ہیں آپ؟“

”گریجویٹ.....“ شانی نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

”کمپیوٹر آپریٹ کرنے کا بھی تھوڑا بہت تجربہ ہے یا نہیں؟“

”نہیں جی۔“

”اگر ہوتا تو اچھی بات تھی۔ میرے ایک ملنے والے توفیق پراچہ صاحب ہیں۔ ٹریول ایجنسی ہے ان کی..... وہاں ایک آسامی خالی ہے..... لیکن کمپیوٹر سے واسطہ پڑے گا اس جاب میں۔“

”وہ تو کوئی بات نہیں جی۔“ انکل عثمانی نے کہا۔ ”ذہین بچی ہے۔ آپریٹنگ تو دو تین ہفتے میں سیکھ جائے گی۔“

”ہاں لگ تو واقعی ذہین رہی ہیں۔“ قاسم برلاس نے کہا پھر افسرانہ شان سے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”شان! بیٹھ جائیں آپ۔“

شان نے ایک نظر انکل عثمانی کے دھواں دھواں چہرے پر ڈالی۔ وہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہے تھے۔ بیٹھ جاؤ شان! میری مدد کرو۔ میں اس گھر مجھ کے جبرؤں میں ہوں..... تم کچھ دیر تک باتوں سے اس کا دھیان اپنی طرف لگاؤ۔ تاکہ میں ذرا سانس لے سکوں۔

شان بیٹھ گئی۔ قاسم برلاس انٹرویو لینے والے انداز میں اس سے سوال جواب کرنے لگا۔ شانی اس صورت حال کے لئے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار ہو گئی تھی۔ اس نے ان سوالوں کے نپے تلے جواب دیئے۔ اسی دوران میں اس نے چائے بنا کر قاسم اور انکل عثمانی کو بھی پیش کی۔ اس نے

اور دھنی سے اپنا سر اور سینہ اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیا بات تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس شکر اچشم افسر کے سامنے بے لباس بیٹھی ہے۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے لئے کوئی معقول بہانہ چاہئے تھا۔ آنٹی ماجدہ ہی اندر آ جاتیں تو شاید اسے باہر نکلنے کا موقع مل جاتا لیکن وہ تو جیسے کہیں غائب ہی ہو گئی تھیں۔

پھر شاید انکل عثمانی نے خود ہی محسوس کر لیا کہ شانی یہاں بہت بے آرام ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا۔ ”شانی بیٹا! ذرا دیکھنا میرا خیال ہے کہ میں اوپر والے کمرے میں ٹی وی کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ اسے آف کر دینا۔“

شانی ”جی اچھا“ کہتی تیزی سے باہر نکل گئی۔ ایک بار پھر اسے اپنی پشت پر دو آنکھیں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اسے دال میں کالانظر آنے لگا تھا۔ اس نے سوچا کہ آئندہ اگر یہ شخص آیا تو وہ اس کے سامنے نہیں جائے گی۔ ایسے کاموں کے لئے شاہد کو بھی استعمال کیا جاسکتا تھا..... یا پھر آنٹی بھی جیسے تیسے چائے سرو کر سکتی تھیں۔ شانی کو محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ ایک دو بار مزید اس قاسم نامی شخص کے سامنے گئی تو انکل آنٹی کے لئے اور خود شانی کے اپنے لئے بھی کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ وہ بے آسرا تھی۔ اس چار دیواری کی صورت میں اسے ایک موزوں پناہ گاہ میسر تھی۔ وہ اتنی جلدی اس پناہ گاہ سے محروم ہونا نہیں چاہ رہی تھی۔ بار بار اس کے ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہو رہا تھا کہ کتنا اچھا ہوتا کہ وہ پہلے دن ہی اس شخص کے روبرو نہ گئی ہوتی۔

یہ حقیقی بات تھی کہ کبھی کبھی شانی خود اپنے آپ سے ہی بے زار ہو جاتی تھی۔ وہ جوان تھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اللہ نے اسے اچھی صورت دی تھی۔ اب وہ اپنا چہرہ اور حلیہ بگاڑنے سے تو رہی۔ وہ صرف اتنا کر سکتی تھی کہ خود کو نمایاں نہ کرے۔ خود کو حتی الامکان سادگی اور سنجیدگی میں لپیٹ کر رکھے اور وہ یہ سب کچھ کرتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ اپنی ”جاذب نظری“ پر خود ہی شرمساری ظاہر کر رہی ہے..... آج کل بھی وہ بالکل سادہ لباس میں تھی۔ جو کپڑے اسے انکل عثمانی نے لا کر دیئے تھے ان میں دو پٹا قدرے شوخ اور خوش رنگ تھا۔ شانی نے وہ دو پٹا اٹیچی میں رکھ کر افشاں کا ایک سفید دو پٹا لے لیا تھا..... میک اپ کرنا تو دور کی بات تھی اس نے کبھی بال بھی ٹھیک سے سنوارے نہیں تھے۔ وہ انہیں بے حد کس کر باندھتی تھی اور دوپٹے سے ڈھانپ رکھتی تھی۔

وہ قاسم برلاس کے بارے میں سوچتی رہی اور اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ اس کے روبرو نہیں جائے گی۔ اسے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ یہ شخص اہل خانہ کو مرعوب کر کے بیٹھا ہوا ہے اور اب ان سے ہر جائز و ناجائز فائدہ اٹھانے کے چکر میں ہے۔ شاید اس معاملے میں انکل کی چھوٹی بیٹی افشاں کا بھی کوئی کردار رہا ہوگا۔ وہ سوچنے لگی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ شخص نرم و نازک افشاں کو بھی انہی نظروں سے دیکھتا ہو جن سے خود شانی کو دیکھ رہا تھا۔ شانی نے جب اس امکان کو اس فقرے کے ساتھ جوڑا جو اس نے چند دن پہلے قاسم برلاس کے منہ سے سنا تھا تو صورت حال کی ایک دھندلی سی تصویر نظر آنے لگی۔ اس روز قاسم برلاس نے بڑے تپے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ ”..... عثمانی! تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ کھلا دھوکا دیا ہے، مجھ سے تمہاری ملاقات ہر دوسرے تیسرے روز ہوتی تھی لیکن تم نے ایک بار بھی افشاں کی شادی کا ذکر نہیں کیا۔“

چار پانچ دن خیریت سے گزر گئے۔ انکل عثمانی نے شانی سے قاسم کے بارے میں کوئی بات نہیں کی..... نہ ہی آنٹی ماجدہ نے کچھ بتایا، پھر

ایک دن قاسم بلائے ناگہانی کی طرح پھر آدھمکا، شومنی قسمت اس دن آنٹی ماجدہ کے علاوہ لڑکا شاہد بھی گھر میں نہیں تھا۔ وہ دونوں مہینے کا سودا سلف لینے ڈیپارٹمنٹل سٹور گئے تھے۔ مرنے کی مانند کرتی کے مصداق شانی کو خود ہی چائے بنانی پڑی اور خود ہی پیش کرنا پڑی۔ کچھ دیر کے لئے وہ تذبذب کا شکار ضرور ہوئی مگر پھر انکل عثمانی کا زرد چہرہ دیکھ کر اور ان کے جسم کی کپکپاہٹ محسوس کر کے اس نے قاسم صاحب کے سامنے نہ جانے کا ارادہ بدل لیا۔

قاسم برلاس اس روز بھی خوشگوار موڈ میں تھا۔ وہ کچھ مٹھائی اور پھل بھی لے کر آیا تھا۔ اس کا مخصوص لباس پتلون اور جرسی تھا۔ اس کا نصف گنجا سر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمکتا رہتا تھا۔ اس چٹیل میدان کی وجہ سے اس کا چہرہ کچھ اور بھی وسیع و عریض معلوم ہوتا تھا۔

قاسم نے انکل عثمانی اور شانی کو مشترکہ طور پر یہ نوید سنائی کہ اس نے اپنے دوست پر اچھا صاحب سے بات کر لی ہے۔ امید ہے کہ ”کمپیوٹر آپریٹنگ“ کے بغیر بھی کام چل جائے گا اور شانی کو یہ جاب مل جائے گی۔ شانی خاموشی سے سنتی رہی۔ اس نے ہاں یا نہ میں کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاں انکل عثمانی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں قاسم کی آفر بری نہیں لگی۔ ابھی وہ تینوں ڈرائنگ روم میں چائے ہی پی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ عثمانی صاحب نے ریسپونڈ کیا۔

”کون؟ ماجدہ؟ کیا ہوا؟“ انہوں نے چاروں لفظ وقفے وقفے سے کہے۔ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔

عثمانی صاحب بولے۔ ”اوہ گاڈ..... کتنے روپے تھے؟“

جواب میں آنٹی ماجدہ نے تفصیل بتائی۔ عثمانی صاحب پریشان لہجے میں بولے۔ ”لیکن یہاں قاسم صاحب آئے ہوئے ہیں..... بہر حال میں آنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

فون بند کر کے انہوں نے بتایا۔ ”ماجدہ سے دو موٹر سائیکل سوار لڑکوں نے پرس چھین لیا ہے۔ دس بارہ ہزار روپے تھے اس میں۔ یہاں مین مارکیٹ میں ہیں وہ لوگ۔“

”تو جاؤ تم ہو آؤ۔ کہو تو..... میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔“ قاسم برلاس نے کہا۔

”نہیں..... نہیں آپ کیوں زحمت کریں گے۔ یہ کوئی ایسا بڑا معاملہ نہیں ہے۔ آپ بیٹھیں..... میں ابھی ہو کر آتا ہوں۔“

انکل عثمانی قدرے فکر مندی کے عالم میں اپنی سوزوکی کار لے کر نکل گئے۔

گھر میں آنا فانا قاسم اور شانی تنہا رہ گئے۔ شانی کے دل کی دھک دھک میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ قاسم برلاس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ پھر خود ہی بول پڑا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ عثمانی جہانمیدہ بندہ ہے۔ معاملے کو سنبھال لے گا۔“

”آ..... آپ اور چائے پیئیں گے؟“ شانی نے بات برائے ”بات“ کی۔

”نہیں..... چائے کی تو ضرورت نہیں..... لیکن اگر آپ نے کچھ کھانا پلانا ہی ہے تو پھر..... مولی والا ایک پراٹھا کھلا دیجئے۔ جب میں اندر داخل ہوا تھا تو مولی والے پراٹھے کی خوشبو آ رہی تھی۔“

”ہاں۔ وہ میں پکار رہی تھی، انکل کی فرمائش پر۔“

”بڑے خوش قسمت ہیں بھئی، آپ کے انکل۔“ قاسم نے معنی خیز انداز میں کہا۔
”اچھا..... میں آپ کے لئے لاتی ہوں۔“ شانی نے اٹھتے ہوئے کہا اور کچن میں چلی گئی۔

آنا گوندھ رکھا تھا۔ مولیٰ بھی کدو کش کی ہوئی تھی۔ شانی نے بیڑا بنایا اور تو سے پرگھی پھیلا دیا۔ ساتھ ساتھ وہ گھر کے بند دروازوں اور اس اکیلے غیر مرد کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی جو اس چار دیواری میں اس کے ساتھ موجود تھا۔ اگر..... اگر خدا نخواستہ اس کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ وہ مرد تھا بلکہ ایک گرائڈل مرد تھا۔ شانی کی تو شاید چیخ و پکار بھی کھڑکیوں سے باہر نہ جاسکتی۔ وہ خود کو بے چین محسوس کر رہی تھی لیکن ساتھ ساتھ کام میں بھی لگی ہوئی تھی۔ ذہن میں یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ قاسم نے انکل اور آنٹی کو کسی جال میں الجھایا ہو۔ عین موقع پر اس طرح کی فون کال کا آنا کیا معنی رکھتا تھا؟ وہ پراٹھا الٹ رہی تھی جب اچانک اسے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ پرتپش نگاہیں جو اس کی پشت سے چپک سی جاتی تھیں۔

اس نے یک دم پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس کے عقب میں موجود تھا۔ اس کے بھاری بھر کم وجود نے پورے دروازے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے نہ جانے وہ کتنی دیر سے بڑی محویت کے ساتھ شانی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنی مگن تھی کہ اسے اس کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ زمین پر لگتا ہوا دو پٹا اس نے جلدی سے اپنے گریبان اور سر پر پھیلا لیا۔ چہرے پر جھولتی بالوں کی آوارہ لٹیں کانوں کے پیچھے اُڑیں اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ”آپ بیٹھے! میں لے کر آتی ہوں۔“

وہ بے باکی سے بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ پراٹھا کھانے میں اتنا مزہ نہیں آئے گا جتنا پراٹھا پکنا ہوا دیکھنے میں آ رہا ہے۔“
”بس..... تقریباً تیار ہو گیا ہے۔“ شانی نے دو پٹا سینے پر کھینچا اور میکا کی انداز میں بائیں ہاتھ سے اسے اپنی پشت تک پھیلا لیا۔
وہ ڈھٹائی سے وہاں کھڑا ہوا اور شانی کو دیکھتا رہا۔ شانی کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ یوں کچن تک چلا آئے گا۔ کچھ دیر بعد اس کی گونج دار آواز شانی کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”بھئی! مولیٰ والے پراٹھے کا مزہ تو دہی کی لسی کے ساتھ آتا ہے۔“
”لسی بھی مل جائے گی سر۔“ شانی نے لہجے میں خوش اخلاقی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

پراٹھا اتار کر وہ جلدی جلدی لسی بنانے لگی۔ اسٹیل کے جگ میں مدھانی چلاتے ہوئے اس کا سارا جسم ڈولنے لگا تھا۔ جسم کا ڈولنا نارمل بات تھی لیکن جن نظروں کے سامنے ایسا ہو رہا تھا وہ ہرگز نارمل نہیں تھیں۔ وہ حجاب کے سبب اپنے اندر سمٹ سی گئی۔ مدانی پر اس کے ہاتھوں کی حرکت مدھم پڑ گئی۔ تب پانی لینے کے بہانے اس نے اپنا رخ تھوڑا سا پھیر لیا۔ ”نظارہ“ اوجھل ہو گیا تو دیکھنے والا بھی پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جا کر پھر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا تھا۔ شانی کے اندیشے لمحہ بلمحہ گھمبیر ہوتے جا رہے تھے۔ لسی تیار ہو گئی تو اس نے پراٹھا ٹرے میں رکھا اور دوپٹے کو اچھی طرح درست کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ وہ دزدیدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

نیم گرم پراٹھے کے چند تقمے لینے کے بعد اس نے نمکین لسی کے دو چار گھونٹ بھرے اور تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ”تمہارے ہاتھ میں بہت سواد ہے بھئی۔ ایسے پراٹھے کھانے کے لئے تو بندے کو سومیل سے چل کر آنا پڑے تو بھی گھائے کا سودا نہیں.....“

”شکریہ سر!“

”اوہو..... اب تم سر کہہ کر مزہ کر کر کر رہی ہو۔ سر مت کہا کرو۔ اس سے بے گانگی کی بو آتی ہے..... کوئی اور مناسب سا لفظ ڈھونڈ لو میرے لئے۔“ اس کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

”لیکن سر.....“

”ارے پھر وہی سر۔“ وہ زور سے ہنسا اور اس کے جسم کے ساتھ ساتھ پورا صوفہ بھی ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ قاسم اس غصیلے قاسم سے کتنا مختلف تھا جو چند روز پہلے انکل عثمانی پر برس رہا تھا۔

اس کا چوڑا جبر اتو پراٹھا چارہا تھا۔ مگر اس کی نظریں جیسے شانی کو چارہی تھیں۔ اس بند چارہیواری کے اندر شانی کی پیشانی عرق آلود تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ انکل اور آنٹی جلد از جلد واپس آ جائیں۔

دس پندرہ منٹ مزید اسی خوف اور کشمکش میں گزر گئے۔ آخر مین گیٹ پر انکل کی گاڑی کا بارن سنائی دیا۔ انکل اور آنٹی واپس آ گئے تھے۔ شانی کی جان میں جان آئی۔

☆=====☆=====☆

﴿اردو ٹائپنگ سروس﴾

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریریں کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنی تحریر و من اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا

☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھیج سکتے ہیں

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

ای میل: harfcomposers@yahoo.com

ویب سائٹ: http://pktypist.com

شانی کے دن عجب بے چینی میں گزر رہے تھے۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کے آنے کے بعد پنڈی میں کیا حالات پیش آئے ہیں؟ رستم کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ رستم اور نادیر والے معاملے نے کیا رخ اختیار کیا ہے؟ پنڈی پولیس اور رستم کی سنگین کشاکش کس نتیجے پہ پہنچی ہے؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ گاہے گاہے اخبار بھی دیکھتی رہتی تھی کہ شاید اسے رستم یا اس کے دوست زوار کے حوالے سے کوئی خبر نظر آجائے۔ پنڈی میں پولیس کے ساتھ جھڑپ کے دوران میں ایک پولیس اہلکار شدید زخمی ہوا تھا۔ شانی کو جو آخری اطلاع ملی تھی اس کے مطابق زخمی کی حالت خطرے میں تھی۔ اگر وہ شخص خدا نخواستہ مر گیا تو پھر رستم کے گرد پولیس کا گھیراؤ مزید تنگ ہونا تھا۔

راولپنڈی کی طرح شانی کو اپنی جنم بھومی رنگ والی کی بھی کوئی خبر نہیں تھی۔ رنگ والی اور اس کے ساتھ ساتھ نارپور کے سارے حالات تاریکی کے پردے میں تھے۔

قاسم برلاس تیسرے چوتھے روز انکل عثمانی کے گھر کا چکر لگا رہا تھا۔ وہ جب تک موجود رہتا شانی کی جان جیسے شکنجے میں ہوتی تھی۔ شانی کو نہ چاہنے کے باوجود اکثر اس کے سامنے بھی جانا پڑتا تھا۔ اس نے بظاہر تو کوئی غیر شائستہ بات..... یا حرکت نہیں کی تھی..... لیکن اس کی ہر دم تعاقب کرنے والی پرتیش نظریں شانی کے لئے باتوں اور حرکتوں سے زیادہ تکلیف دہ تھیں۔ گاہے گاہے وہ کوئی ذومعنی فقرہ بھی شانی کے کانوں میں ڈال دیتا تھا۔

ایک روز وہ سفید براق شلوار قمیص پہن کر آیا تھا، کھانا کھاتے ہوئے وہ مسلسل باتیں بھی کر رہا تھا۔ اس دوران میں آنٹی ماجدہ سالن کا ڈونگا لئے ہوئے اندر آئیں۔ قاسم کی موجودگی میں وہ بھی انکل کی طرح بہت زور سے رہتی تھیں۔ سالن میز پر رکھتے ہوئے آنٹی کا ہاتھ بل گیا اور تھوڑا سا سالن چھلک کر قاسم کی سفید قمیص پر گر پڑا۔ قاسم کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو لگا کہ وہ افسرانہ لب و لہجے میں آنٹی پر برس پڑے گا، مگر پھر اس نے خود کو ایک دم پُرسکون کر لیا اور اپنے بیکراں چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ سجائی، غالباً ایسا شانی کی موجودگی کے سبب ہی ہوا تھا۔

سالن گرنے کے بعد قاسم اٹھ کھڑا ہوا اور اب واش روم کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا مطلع نظر سمجھتے ہوئے شانی نے کہا۔ ”آئیے..... میں قمیص کا کنارہ دھو دیتی ہوں۔“

قاسم تو پہلے ہی اس قسم کی پتویش کا متلاشی رہتا تھا۔ وہ شانی کے ساتھ واش روم کے بیسن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شانی واش بیسن پر جھک کر قاسم کی قمیص کے کنارے کو صابن لگانے لگی۔ قاسم کی نگاہیں شانی کے گریبان میں اٹکی ہوئی تھیں اس کا جسم شانی کے پہلو سے مس ہو رہا تھا۔ یا شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا۔ شانی نے محسوس کیا کہ اس کی بھاری بھر کم سانس زبرد زور ہے، بمشکل یہ مرحلہ طے ہوا اور وہ ڈانگنگ ٹیبل پر واپس آئے۔

شروع کے دنوں میں قاسم برلاس نے شانی کی ملازمت کا ذکر بڑی شد و مد سے کیا تھا مگر اب وہ اس سلسلے میں کچھ ڈھیلا پڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ پتا نہیں کہ اس کی وجہ کیا تھی۔

دو تین روز مزید گزرے اور پھر اس کی وجہ شانی کو معلوم ہو گئی۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ انکل عثمانی گھر میں ہی تھے۔ اسلام آباد سے افشاں نے ملنے کے لئے آنا تھا لیکن بوجہ اس کا پروگرام چند دن آگے چلا گیا تھا۔ دس بجے ناشتا کرنے کے بعد انکل سٹڈی روم میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ملازم لڑکے شاہد نے کہا۔ ”باجی جان! انکل آپ کو بلا رہے ہیں۔“

شانی اسٹڈی میں پہنچی تو وہ کوئی اہم بات کرنے کے موڈ میں نظر آئے۔ تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد انکل نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ”شانی بیٹا! تم تھوڑے ہی عرصے میں اپنے بچوں کی طرح لگنے لگی ہو۔ تمہارے بارے میں بالکل اسی طرح سوچتا ہوں جس طرح عاصمہ اور افشاں کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان دونوں کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا مگر تمہارے بارے میں نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے بارے میں اور تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھ میں زیادہ اعتماد نہیں ہوتا۔“

انہوں نے چند لمحے خاموش رہ کر شانی کے ردِ عمل کا اندازہ لگایا پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ”میں تمہیں کسی بھی حوالے سے مجبور نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ شانی بیٹا! اگر تم کسی وجہ سے اپنے ماضی کو پردے میں رکھ رہی ہو تو یہ تمہارا حق ہے۔ میرے لئے یہ کافی ہے کہ تم اچھی سوچ رکھتی ہو۔ تمہاری فطرت نیک ہے اور تم کسی نیک ماں کی بیٹی ہو۔ ایک عاقل بالغ لڑکی ہونے کی حیثیت سے اپنی زندگی کے مسئلوں کے بارے میں فیصلہ کرنا تمہارا حق ہے اور تم پوری آزادی کے ساتھ ایسا کر سکتی ہو۔ اس کے باوجود میری طرف سے تمہیں ایک بار پھر خلاصہ پیشکش ہے کہ اگر تم اپنے وارثوں کے پاس واپس جانا چاہتی ہو تو میں اس سلسلے میں ہر طرح تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔“

اپنی بات ختم کر کے انکل عثمانی سوالیہ نظروں سے شانی کو دیکھنے لگے۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں انکل.....! ایسی بات نہیں۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم انہیں کہیں کھو بیٹھی ہو اور اب انہیں تلاش کرنا چاہتی ہو۔“

”نہیں انکل! یہ بات بھی نہیں..... بس میں واپس لوٹنا ہی نہیں چاہتی..... اگر میں آپ پر بوجھ.....“

”بس..... بس آگے کچھ مت کہنا۔“ انکل نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ”ایسی بات دماغ میں بھی نہیں لانا۔ تم..... ہماری بیٹی ہو..... اور بیٹی بوجھ نہیں ہوتی۔“

کچھ دیر تک اسٹڈی روم میں گہری خاموشی رہی۔ شانی کی بلوری آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ انکل بھی بالکل خاموش تھے۔ ایک طویل وقفے کے بعد انہوں نے گھمبیر آواز میں کہا۔ ”شانی بیٹا! قاسم یہاں آتا رہتا ہے۔ میں اسے بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ دیکھنے میں سخت لگتا ہے لیکن دل کا ایسا نہیں ہے۔ ہر بندے میں خامیاں اور خوبیاں ہوتی ہیں۔ پرکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ مجموعی طور پر بندہ کیسا ہے۔ قاسم نے پرسوں مجھ سے ایک بات کہی ہے۔ شروع میں تو مجھے بھی یہ بات عجیب لگی تھی۔ مگر اب دو دن تک غور کیا ہے تو یہ کچھ ایسی عجیب بھی نہیں لگ رہی۔“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں انکل؟“ شانی نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

انکل عثمانی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”شانی بیٹا! قاسم تم سے شادی کا خواہش مند ہے۔“ شانی سن ہو کر رہ گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر انکل عثمانی جلدی سے بولے۔ ”میں نے تمہیں صرف وہ بات بتائی ہے جو قاسم نے مجھ سے کہی ہے۔ اس میں میری کسی طرح کی رائے شامل نہیں ہے۔“

اسی دوران میں فون کی بیل بجنے لگی۔ شانی کی بات منہ میں ہی رہ گئی اور وہ فون سننے کے لئے اٹھ گئی۔ دوسری طرف افشاں تھی۔ وہ اسلام آباد سے بول رہی تھی اور پاپامی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ شانی اور انکل عثمانی کی گفتگو وہیں کی وہیں رہ گئی۔ بہر حال اب شانی کی سمجھ میں یہ بات

اچھی طرح آگئی تھی کہ قاسم صاحب نے اب اس کی سروس کی بات کرنا کیوں چھوڑ دی ہے۔

اگلے روز آنٹی ماجدہ کے ساتھ بھی اس حوالے سے شانی کی بات ہوئی۔ آنٹی ماجدہ بھی جانتی تھیں کہ تین روز پہلے قاسم برلاس نے کس خواہش کا اظہار کیا ہے..... آنٹی ماجدہ نے اس بارے میں غیر جانبداری سے بات کی۔ انہوں نے شانی کو بتایا کہ قاسم برلاس سے اس کی بیوی نے سات آٹھ سال پہلے خلع لے لیا تھا اس کی دو بچیاں بھی ہیں جو بیوی کے پاس ہیں۔ شادی ختم ہونے میں دونوں طرف سے تھوڑا تھوڑا قصور تھا۔ زیادہ قصور شاید قاسم کا ہی تھا۔ وہ ان دنوں کچھ زیادہ ہی سخت گیر تھا۔ بہر حال اب آہستہ آہستہ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آتا جا رہا ہے..... باپ کی طرف سے اسے کافی جائیداد ملی ہوئی ہے خود بھی ٹھیک ٹھاک کماتا ہے اور دوسروں پر خرچ بھی کرتا ہے کھلے دل کا مالک ہے۔

یہاں تک بتا کر آنٹی ماجدہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر بولیں۔ ”اپنی زندگی کے بارے میں جتنا بہتر تم خود سوچ سکتی ہو کوئی اور نہیں سوچ سکتا۔ جہاں تک قاسم کی بات ہے وہ تمہارے جوڑ کا تو نہیں ہے۔ عمر کے لحاظ سے بھی کافی بڑا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے تمہارے دل کا بھی پتا نہیں کیا خبر تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟ بہر حال بڑی ہونے کی حیثیت سے میں تم سے ایک بات ضرور کہوں گی۔ شادی کرنا کسی ایسے مرد سے جو تمہیں چاہتا اور مانگتا ہو..... نہ کہ ایسا مرد جسے تم چاہتی اور مانگتی ہو.....“

آنٹی اس موضوع پر کافی دیر تک بات کرتی رہیں۔ شانی نے ان کی ایک دو باتوں کے جواب بھی دیئے۔ ان جوابات نے یقیناً آنٹی کو سمجھا دیا تھا کہ وہ فی الوقت شادی وغیرہ کے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہی۔

بہر حال آنٹی نے قاسم کے بارے میں متوازن اور بے لاگ باتیں کی تھیں۔ اس کی شخصیت کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو وضاحت سے بیان کر دیئے تھے۔ ابھی شانی اور آنٹی ماجدہ میں بات ہوئی رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ ملازم لڑکے شاہد نے گیٹ کے اوپر سے باہر جھانکا اور آنٹی کے پاس آ کر بولا۔ ”لبوں کی امی آئی ہیں۔“

لبوں کی امی کی اصطلاح شانی نے پہلے بھی سنی تھی۔ محلے میں تین چار لمبے بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام ”لبوں کی امی“ پڑ گیا تھا۔ لبوں کی امی کا ذکر سن کر آنٹی نے شانی کو فوراً اندر چلے جانے کو کہا۔ لگتا تھا کہ وہ اس عورت کو زیادہ پسند نہیں کرتیں۔ ایک دن پہلے بھی یہ عورت ایک دوسری عورت کے ساتھ آئی تھی تو آنٹی نے شانی کو کمرے کے اندر ہی رہنے کے لئے کہا تھا۔ یہ کافی باتونی عورت لگتی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھیں چاروں طرف گردش کرتی رہتی تھیں جیسے وہ کچھ ڈھونڈ رہی ہو..... کھوج رہی ہو۔ غالباً آنٹی ماجدہ کو بھی اس کی طرف سے یہی اندیشہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ شانی والے معاملے کو کریدنے کی کوشش کرے گی اور اُلٹے سیدھے سوال داغنا شروع کر دے گی۔ شانی اندر چلی گئی اور آنٹی ماجدہ اس فیشن ایبل عورت سے صحن میں ہی کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگیں۔ (بعد ازاں پتا چلا کہ وہ آنٹی ماجدہ سے ان کے چھینے جانے والے پرس کا فاسوس کرنے آئی تھیں)

یہ دور وز بعد کا واقعہ ہے۔ فون کی گھنٹی بجنے پر شانی نے ریسور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک اجنبی نسوانی آواز سنائی دی۔ لمبے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑی عمر کی عورت ہے۔ اس نے کہا ”شانی تم مجھے نہیں جانتی ہو لیکن میں تمہیں بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں تم سے ایک خاص

بات کرنا چاہتی ہوں۔ یہ ایسی بات ہے جو تمہیں ایک بہت بڑے نقصان سے بچا سکتی ہے۔“

”میں..... آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ آپ ہیں کون؟“

”دیکھو..... میں فون پر تمہیں زیادہ نہیں بتا سکتی۔ زیادہ جاننے کے لئے تمہیں مجھے گھر سے باہر ملنا ہوگا لیکن ایسا کرتے ہوئے یہ احتیاط رہے کہ تمہاری آنٹی ماجدہ یا انکل کو خبر نہ ہو۔ اگر انہیں خبر ہوگئی تو سمجھو سب چوہٹ ہو جائے گا۔“

شانی کو عورت کے لہجے میں ہمدردی اور اپنائیت کی جھلک ملی ایک لمحے کے لئے تو اس کے ذہن میں آیا کہیں یہ وہی فیشن اسٹیل عورت تو نہیں جو دو روز پہلے بھی گھر میں آئی تھی۔ آواز بھی ملتی جلتی ہی لگ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل چاہا کہ عورت کی بات سنے لیکن کیسے؟ وہ کہہ رہی تھی کہ تفصیل جاننے کے لئے اسے گھر سے باہر ملنا ہوگا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی اس نے چار دیواری سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ بلکہ وہ تو صحن میں بھی زیادہ نہیں جاتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان تین آوارہ گردوں کے درمیان گھرنے کے بعد اور شدید ذہنی اذیت کا شکار ہونے کے بعد اس کا اعتماد بُری طرح مجروح ہوا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو بیٹی؟“ فون پر ابھرنے والی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”کک..... کچھ نہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ آپ اس بات چیت کو انکل اور آنٹی سے چھپانے کا کیوں کہہ رہی ہیں۔ ان کے علم میں لائے بغیر میں گھر سے کیسے نکل سکتی ہوں اور وہ ایسی کیا بات ہے جو ان سے چھپانا ضروری ہے؟“

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر خاتون کی آواز زیرِ پیس میں ابھری۔ ”اگر تم گھر سے باہر نہیں نکل سکتی ہو تو پھر ایک اور کام کرو۔ رات کو دس بجے کے بعد اپنے گھر کی چھت پر آ جاؤ۔ میں تمہیں وہاں نظر آ جاؤں گی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ اڑوس پڑوس کے کسی گھر سے بات کر رہی ہیں؟“

”چلو ایسا ہی سمجھ لو لیکن دیکھو میں پھر تمہیں بتا دوں۔ میں تمہاری خیر خواہ ہوں۔ میری بات سننے کے بعد تمہیں اندازہ ہوگا کہ میں نے تمہیں کتنی بڑی پریشانی سے بچایا ہے۔ اسے میری التجا سمجھ لو کہ ابھی اپنی آنٹی اور انکل کو میرے فون کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔“

شانی نے کچھ دیر سوچا پھر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے آنٹی! میں آپ کی بات سننے آ جاؤں گی لیکن آپ ہوں گی کہاں؟“

خاتون کا لہجہ کچھ اور دھیمہ اور راز دارانہ ہو گیا۔ کہنے لگیں۔ ”تمہارے گھر کے پچھواڑے جو کوٹھی ہے۔ وہ ہماری ہے۔ ہماری چھتوں کا تھوڑا سا حصہ آپس میں ملا ہوا ہے۔ تم اوپر آؤ گی تو پتا چل جائے گا لیکن ایک احتیاط رکھنا۔ چھت پر آ کر برساتی کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کر لینا۔ میں نہیں چاہتی کہ ماجدہ تمہیں ڈھونڈتی ہوئی اوپر آ جائے اور دیکھ لے۔“

شانی نے بند ہونٹوں سے ”ہوں“ کی آواز نکال کر اثبات میں جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے۔ دس بجے کے بعد چھت پر۔“ خاتون نے فون بند کرنے سے پہلے پھر تاکید کی۔

..... رات دس بجے تک کا وقت شانی نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ اس کا دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ کئی طرح کے دوسوے ذہن میں سر

اٹھا رہے تھے۔ نامعلوم آنٹی کی بات مان کر کہیں وہ اپنے لئے کوئی مصیبت ہی کھڑی نہ کر لے۔ اگر وہ برساتی کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کر کے عقبی حصے کی طرف جاتی اور وہاں تارکی میں کوئی چھپا ہوتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ رات دس بجے کے بعد ارد گرد کافی خاموشی ہوتی تھی ویسے بھی اب سردی بڑھ گئی تھی اور لوگ کمروں میں دیکنا شروع ہو گئے تھے۔

پھر اسے عورت کے لہجے میں موجود ہمدردی اور اپنائیت کی لہر یاد آئی..... اور وہ الفاظ یاد آئے جن میں اس نے تاکید کی تھی۔ وہ سوچنے لگی، یہ ضروری تو نہیں کہ وہ عورت کوئی ایسی بات کہے جو انکل اور آنٹی کے خلاف جاتی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ بات شانی کے ساتھ ساتھ انکل اور آنٹی کے فائدے میں بھی ہو۔ کوئی ایسی رائے..... کوئی ایسا مشورہ جس سے انکل اور آنٹی کے مسائل کم ہونے کی امید پیدا ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ چھت پر ضرور جائے گی۔

ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ جب انکل، آنٹی اور شاہد سونے کے لئے لیٹ چکے تھے، شانی دبے پاؤں میڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر پہنچ گئی۔ سردی سے بچنے کے لئے اس نے وہ دبیز شال لپیٹ رکھی تھی جو چند ہی دن پہلے انکل نے اسے لا کر دی تھی۔ چھت پر جا کر وہ سوچنے لگی کہ دروازہ اپنی طرف سے بند کرے یا نہیں۔ اگر وہ دروازہ اپنی طرف سے بند کر دیتی اور اتفاقاً آنٹی یا انکل میں سے کوئی اوپر آ جاتا تو وہ ضرور پوچھتا کہ اس نے چھت کی طرف سے دروازہ بند کیوں کیا ہے۔ اگر دروازہ کھلا ہوتا تو تشویش کی بات نہیں تھی۔ وہ کہہ سکتی تھی کہ چھت پر ٹہلنے کے لئے آئی ہے۔ وہ کچھ دیر ادھیڑ بن میں رہی۔ پھر اس نے نامعلوم آنٹی کی ہدایت پر عمل کرنا مناسب سمجھا اور دروازہ اپنی طرف سے بند کر دیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے چھت کے عقبی حصے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ قریبی چھت کی تقریباً پانچ فٹ اونچی منڈیر پر اسے ایک سر حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ یقیناً یہ کسی عورت کا سر تھا۔ شانی محتاط قدموں سے منڈیر کے قریب چلی گئی۔

”ڈرومت۔ آگے آ جاؤ۔“ عورت نے دبی آواز میں کہا۔ وہ ساتھ والی چھت پر تھی۔

شانی قریب پہنچی اور اس نے پہچان لیا۔ یہ ترشے ہوئے بالوں والی وہی عورت تھی جسے ”لمبوں کی امی“ کہا جاتا تھا۔ وہ خود بھی خاصی دراز قد تھی۔ منڈیر کے اوپر سے وہ بے آسانی شانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں آنٹی؟“ شانی نے اپنی لرزش پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

اصل بات شروع کرنے سے پہلے آنٹی نے اپنا مختصر تعارف کرایا۔ ان کا نام ارجمند بیگم تھا۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ عرصہ آٹھ سال سے اس گھر میں مقیم تھیں اور انکل عثمانی و آنٹی ماجدہ کو بہ خوبی جانتی تھیں۔

اپنا تعارف کرانے کے بعد ارجمند بیگم نے شانی سے پوچھا۔ ”تم کہاں سے آئی ہو بیٹی اور عثمانی کے گھر میں کیسے ہو؟“

شانی نے اس سوال کا جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا اور یہ وہی جواب تھا جو اس نے اس سے پیشتر انکل اور آنٹی کو بھی دیا تھا۔ یعنی وہ گوجر خان سے آئی ہے والدہ کافی عرصہ پہلے فوت ہو گئی تھیں پھر ایک بھائی بھی ایک حادثے میں چھن گیا۔ اس کے بعد والد کا ساتھ چھوٹا۔ اب جو عزیز ہیں وہ ان کے پاس رہنا نہیں چاہتی۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ کوئی مناسب ملازمت کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی ہے۔

ارجنند بیگم نے پوچھا کہ عثمانی صاحب اور ماجدہ سے اس کا رابطہ کیونکر ہوا۔ شانی نے مصلحت کے تحت کہا کہ وہ انہیں کافی عرصے سے جانتی ہے۔

ارجنند بیگم فوراً بولیں۔ ”بیٹی! میرا نہیں خیال کہ تم انہیں کافی عرصے سے جانتی ہو۔“

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

ارجنند بیگم نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں پتا ہے کہ قاسم برلاس نام کا جو بندہ عثمانی کے پاس آتا جاتا ہے وہ کون ہے؟“

”وہ محکمے کا کوئی افسر ہے۔“

”محکمے کا افسر تو وہ ہے لیکن عثمانی کے پاس اس لئے آتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں عثمانی کی دھکتی رگ ہے۔ وہ غبن کے اس کیس کی انکوائری کر رہا ہے جس کے بڑے ملزم عثمانی صاحب ہیں۔“

”مجھے اس بارے میں آنٹی ماجدہ نے بتایا تھا۔“

”مگر اس نے وہ کچھ نہیں بتایا ہوگا جو اسے بتانا چاہئے تھا۔“ ارجنند بیگم نے کہا۔

”میں آپ کی بات سمجھی نہیں؟“

”عثمانی پر جو کیس بنا، وہ سو فیصد درست ہے۔“

شانہی کچھ دیر کے لئے حیران رہ گئی پھر سنہل کر بولی۔ ”آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟“

”یہ میں ہی نہیں کہتی سارے لوگ کہتے ہیں۔ ہر کسی کو معلوم ہے کہ عثمانی نے اپنی پہلی بیٹی عاصمہ کی شادی غبن کے پیسے سے ہی کی تھی۔

بندے کی دیانت داری کا امتحان تو مشکل میں ہی ہوتا ہے اور جب عثمان پر مشکل آئی تو وہ پرلے درجے کا بددیانت اور بے ایمان ثابت ہوا۔ اس نے

اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر تار چوری کئے اور محکمے کو ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ کا نقصان پہنچایا۔“

”آپ..... انکل عثمانی کی کس مشکل کی بات کر رہی ہیں؟“

”عثمانی نے جہاں بیٹی کا رشتہ طے کیا تھا، وہ بھی عثمانی ہی کی طرح لالچی لوگ تھے۔ نام و نمود اور دولت کے پجاری۔ انہوں نے عثمانی سے

نہ صرف بھاری جہیز کا مطالبہ کیا، بلکہ یہ شرط بھی عائد کر دی تھی کہ وہ داماد کو بیرون ملک بھجوانے میں مدد کریں گے۔ عثمانی کو اپنے داماد سے غیر معمولی

فائدے کی توقع تھی اس لئے وہ غیر معمولی رسک اٹھانے کو تیار ہو گیا۔ اس نے داماد کی خاطر غبن کیا۔ یوں وہ داماد کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی رہا

لیکن داماد سے اس کی جو توقعات تھیں، وہ پوری نہیں ہوئیں۔ داماد بیٹی کے ساتھ مغربی جرمنی اٹرن چھو ہو گیا اور عثمانی یہاں چوری کے کیس میں پھنس

گیا..... یہ قاسم برلاس اسی ”کیس“ کی نشانی ہے۔“

اچانک شانہی کو یاد آیا کہ اس نے قاسم برلاس کے منہ سے افشاں کا نام سنا تھا۔ افشاں کا اس معاملے میں کیا کردار ہو سکتا تھا جب شانہی نے

یہ سوال ارجنند بیگم سے کیا تو اس کا جواب اسے حسب توقع ملا۔

ارجنند بیگم نے اپنا راز دارانہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”بھئی! میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گی، صاف دلی سے بتاؤں گی۔ اگر تمہیں میری کوئی بات بُری لگے تو اس کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ میں سمجھتی ہوں کہ عثمانی بددیانت ہی نہیں بڑی حد تک بے غیرت بھی ہے۔ جب اس پر قاسم برلاس انکوائری افسر مقرر ہوا تو اس نے اسے نئے طریقے سے پھانسنے کی کوشش کی۔ یہ اپنی چھوٹی بیٹی افشاں کو سامنے لے آیا۔ یہاں عثمانی کے پاس قاسم کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ روز دعوتیں ہونے لگیں۔ ہم سب کچھ دیکھتے تھے۔ قاسم کی گاڑی کئی کئی گھنٹے عثمانی کے گیٹ کے سامنے کھڑی رہتی تھی۔ پہلی بیوی سے طلاق کے بعد قاسم کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ وہ کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھا۔ ان میاں بیوی نے قاسم کو ایسے اشارے دیئے جس سے اس نے سمجھنا شروع کر دیا کہ یہ افشاں کا ہاتھ تو اس کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے۔ اس آڑ میں یہ دونوں قاسم سے پیسے بھی کھاتے رہے۔ اس کے علاوہ عثمانی نے اپنے ایک بھتیجے کو بھی محلے میں ملازم کروایا۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ سنانے بیٹھوں گی تو یہاں چھت پر ہی رات گزر جائے گی۔ قصہ مختصر یہ کہ جب غبن کا کیس ٹھنڈا پڑ گیا اور دوسرے دفتری معاملے بھی حل ہو گئے تو ان دونوں میاں بیوی نے قاسم کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ وہ اسے یہ باور کرانے کی کوشش کرنے لگے کہ لڑکی کی عمر کم ہے۔ وہ ابھی اوپر پڑھنا چاہتی ہے۔ ابھی شادی کا ارادہ نہیں رکھتی۔ وغیرہ وغیرہ۔ دراصل انہوں نے افشاں کے لئے افشاں کے ایک کلاس فیلو کا رشتہ ڈھونڈ لیا تھا اور اب قاسم سے ٹال مٹول کر رہے تھے۔ پھر ایک دن انہوں نے آنا فانا افشاں کی شادی بھی کر دی۔ اسلام آباد سے برات آئی اور وہ دہلی بن کر یہ جاوہ جا ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ وہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ ایک کچی عمر کے لمبے چوڑے بھوت کے ساتھ اس کی زندگی برباد کرنے کا فیصلہ کیسے کر سکتے تھے..... لیکن بیٹی! سوچنے کی بات یہ ہے کہ عثمانی اور ماجدہ نے یہ بات تب کیوں نہ سوچی جب وہ بیٹی کو اس کے سامنے چارے کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ میں سنی سنائی بات نہیں کر رہی۔ میں نے اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے رات ایک بجے کے قریب افشاں کو گھر کے سامنے قاسم کی گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھا ہے لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب عثمانی ”غبن کیس“ میں بُری طرح جکڑا ہوا تھا اور جناب کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔“

ارجنند بیگم نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”افشاں کی شادی ابھی کوئی تین مہینے پہلے ہی ہوئی ہے۔ تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ اس شادی کا اثر قاسم برلاس پر کیا ہوا ہوگا۔ وہ آج کل سخت غصے میں ہے اور سنا ہے کہ اس کے ارادے عثمانی کے لئے اچھے نہیں ہیں۔ وہ بار بار عثمانی کے دروازے پر بھی آ رہا ہے۔ کیا تمہاری اس سے ملاقات ہوئی ہے؟“

”ایک دودفعہ۔“ شانی نے مختصر جواب دیا۔

ارجنند بیگم نے اس کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”پتا چلا ہے کہ عثمانی کو کیس ”ری اوپن“ ہونے کی دھمکی ملی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بھتیجے کی ملازمت بھی شدید خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہ سارے حالات ایک خاص سمت میں اشارہ کر رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ تم سمجھ دار ہو۔ تمہیں ان حالات کو سمجھ جانا چاہئے.....“

”آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ انکل.....“ شانی کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

ارجنند بیگم نے ستاروں کی مدھم روشنی میں دھیان سے شانی کا چہرہ دیکھا اور جذباتی لہجے میں بولی۔ ”بیٹی! جہاں تک میں نے صورتِ حال

کو پرکھا ہے، میرا اندازہ یہی ہے کہ عثمانی سے تمہاری ملاقات کہیں اتفاقاً ہوئی ہے۔ تمہیں سہارے کی ضرورت تھی اور تم نے عثمانی کی ظاہری حالت اور اس کی باتوں سے دھوکا کھا کر اسے اپنا سہارا سمجھ لیا۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ جس طرح تمہیں سہارے کی ضرورت ہے اسی طرح اس خزانہ کو بھی ایک اچھی شکل کی جوان لڑکی کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسی لڑکی جسے یہ اپنی لاڈلی بیٹی کی جگہ قاسم برلاس کی بھیٹ چڑھا سکے۔ تمہیں پتا نہیں ہے بیٹی! کہ اس عثمانی کے اندر کا چہرہ کتنا مکروہ ہے۔ مجھے پتا ہے کہ اس نے تمہیں بڑے لاڈ سے رکھا ہوا ہے۔ تمہاری ہر ضرورت پوری کر رہا ہے لیکن یہ ویسے ہی چاؤ چو نچلے ہیں جو ہم قربانی کے بکرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ بالآخر ہم نے اس کے گلے پر چھری چلانا ہوتی ہے۔ یہ بھی قاسم برلاس کے ہاتھوں تمہارے گلے پر چھری چلوائے گا۔ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔ کتنی پیاری، کتنی من موہنی ہو۔ پتا نہیں کس ماں کے جگر کا ٹکڑا ہو۔ یہ قاسم برلاس بھوت بن کر تمہاری زندگی کو چٹ جائے گا اور برباد کر دے گا۔“

ارجنڈ بیگم نے ذرا تامل کر کے اپنی گرم شال کندھوں پر مضبوطی سے جھانکی اور بولیں۔ ”عثمانی یا ماجدہ نے تم سے شادی وغیرہ کی بات تو نہیں کی؟“

”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے کہ قاسم کے حوالے سے تمہارا ذہن بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے یہ دونوں؟“

”نہن..... نہیں آنٹی۔“ شانی نے مصلحتاً انکار کیا۔

ارجنڈ بیگم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اگر نہیں کیا..... تو یہ کریں گے۔ پہلے تمہیں پیار محبت سے اپنے راستے پر لانے کی کوشش کریں گے۔ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو انگلیاں ٹیڑھی کر لیں گے۔ ان دونوں میں سے کسی کو اپنا ہمدرد نہ سمجھنا۔ دونوں ایک سے ہیں۔ شروع شروع میں ماجدہ کا ذہن تھوڑا سا مختلف تھا لیکن اب وہ بھی عثمانی کے رنگ میں رنگ چکی ہے۔ بلکہ کسی وقت تو اس سے بھی آگے نظر آتی ہے۔ ایسی عورت کو تو ماں کہلوانے کا حق بھی نہیں ہے۔ ماں تو موم کی طرح ہوتی ہے اور یہ ایسی پتھر ہے کہ اپنی اولاد کو جس آگ سے نکال رہی ہے اسی آگ میں کسی دوسرے کے جگر کا ٹکڑا ڈال رہی ہے۔“ شانی کے ذہن میں آندھی سی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اسے ارجنڈ بیگم کی باتوں میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔

ارجنڈ بیگم نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ قاسم برلاس بڑا مند زور بندہ ہے۔ کوئی شریف شخص بھی ایسے بندے کے منہ لگنا نہیں چاہتا۔ ہم بھی نہیں چاہتے..... لیکن میری تمہیں یہ تاکید ہے کہ آنے والے خطرے کو محسوس کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے ان فریبی مددگاروں کو چھوڑ کر کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لو..... آخر کوئی نہ کوئی جگہ تو ہوگی جہاں تم جاسکو.....؟“

شانی نے مبہم انداز میں سر ہلایا۔

ارجنڈ بیگم نے کہا۔ ”اس کام میں جتنی دیر کرو گی اتنا ہی تمہارے لئے مشکل ہوتا جائے گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ.....“

اچانک ایک آواز نے شانی اور ارجنڈ بیگم دونوں کو بُری طرح چونکا دیا۔

”شانی، کون ہے وہاں؟“ یہ آواز آنٹی ماجدہ کی تھی۔

برساتی کی ایک سائڈ پر چھوٹی سی روزن نماکھڑکی تھی۔ آنٹی ماجدہ نے وہیں سے آواز دی تھی۔

ارجمند بیگم نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لو وہ آگئی ہے..... اچھا میں چلتی ہوں۔“ وہ جلدی سے پیچھے ہٹیں اور چھت کے اندھیرے میں اوجھل ہو گئیں۔

شانی بھی تیزی سے برساتی کے دروازے کی طرف آگئی۔ اس کا سینہ بڑی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے دروازہ کھولا۔ اس دوران میں آنٹی ماجدہ نے برساتی کی لائٹ جلا دی تھی۔ ان کے نکھرے بالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بستر سے اٹھ کر آئی ہیں۔

”شانئی بیٹا! کیا کر رہی تھیں وہاں؟“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”کک..... کچھ نہیں آنٹی..... ذرا سینے میں جلن سی ہو رہی تھی۔ شاید زیادہ کھا لیا ہے میں نے کہا کچھ دیر چھت پر گھوم لوں۔“

آنٹی ماجدہ نے دھیان سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے لگا تھا۔ شاید کسی سے باتیں کر رہی ہو۔“

”نہیں تو۔“ شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”دروازہ بھی بند تھا۔“ آنٹی نے دوسرا متوقع سوال داغا۔

”میں نے تو ویسے ہی بھیڑا تھا شاید خود کھکا لگ گیا ہے۔“

آنٹی ماجدہ کے چہرے پر الجھن تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی پوری تشفی نہیں ہوئی۔ بہر حال انہوں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور یہ کہتی ہوئی اسے نیچے لے آئیں کہ بغیر بتائے اسے چھت پر نہیں آنا چاہئے تھا۔

اس رات شانی دیر تک جاگتی رہی۔ دل و دماغ میں الجھن تھی۔ اسے رہ رہ کر کچھ باتیں یاد آ رہی تھیں۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی نو بیابا ہٹا افشاں نے فقط ایک بار یہاں قدم رکھا تھا اور وہ بھی صرف چند گھنٹوں کے لئے۔ اس دوران میں بھی وہ واضح طور پر بے چین سی رہی تھی۔ بعد ازاں اس نے دو تین بار لاہور آنے کا فون کیا تھا مگر آنٹی ایک بار بھی نہیں تھی۔ پھر اسے آنٹی اور انکل کی وہ گھبراہٹ یاد آئی جو قاسم برلاس کی آمد کے ساتھ ہی ان دونوں پر طاری ہو جاتی تھی۔ اس گھبراہٹ میں ایک طرح کا احساسِ پشیمانی بھی جھلک دکھاتا تھا..... کم از کم شانی کو تو یہی لگتا تھا۔ تب شانی کو وہ واقعہ یاد آیا جب انکل عثمانی اسے قاسم کے پاس اکیلا چھوڑ کر گھر سے نکل گئے تھے۔ انہیں آنٹی نے فون کر کے بلایا تھا اور بتایا تھا کہ ان سے پرس چھین لیا گیا ہے۔ کیا وہ سب پلان تھا؟ وہ سوچتی رہی اور الجھتی رہی۔ اسے وہ سب باتیں یاد آئیں جو آنٹی اور انکل نے اس سے شادی کے حوالے سے کی تھیں۔ ان باتوں کو آنٹی ارجمند بیگم کی باتوں سے ملا کر دیکھا جاتا تو سب کچھ ایک ہی سلسلے میں پرویا ہوا لگتا تھا۔

بند دروازوں اور کھڑکیوں سے باہر سردی کی وہ طویل رات آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی، جیسے ایک ناگن پُر پیچ راستوں پر آگے بڑھ رہی ہو۔ کسی کوڑھنے کے لئے۔ اس سے زندگی چھیننے کے لئے اور شانی تنہا تھی۔ یکسر اکیلی اور بے آسرا۔ ماں کی محفوظ آغوش، ایک مدت پہلے چھن چکی تھی۔ جوان غیرت مند بھائی کی محفوظ بانہوں کا حصار بھی ٹوٹ چکا تھا۔ سر پر سے ابا جی کا گھنا سا یہ بھی سرک چکا تھا۔ چچا..... تایا..... شوہر..... کوئی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ دنیا کے اژدھوں سے بھرے ہوئے جنگل میں وہ تنہا تھی۔ اسے اپنے سارے منہ پر ہونٹ کر یاد آئے۔ وہ رونے لگی۔ بچکے کو

بھگونے لگی۔ کیا اس کے پیارے ابا جی کو پتا تھا کہ چند ہی ماہ بعد ایسا وقت آئے گا کہ ان کی لاڈلی مکمل طور پر غیروں کے رحم و کرم پر ہوگی۔ دشمنی کے سپ گندل کا زہریلوں چڑھے گا کہ ہر گلی میں شیش ناگ پھنکائیں گے اور یہ ناگ ان کی بد نصیب بیٹی کو ہنکا ہنکا کر تخت اثری میں پہنچا دیں گے۔

کچھ دیر تک رونے سے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا۔ وہ مختلف انداز سے سوچنے لگی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صورتِ حال کی تصویر وہ نہ ہو جو اسے دکھائی دے رہی ہے۔ آنٹی ارجند نے جو کچھ کہا، اس میں وزن محسوس ہوتا تھا مگر یہ وزن کسی تعصب کی کار فرمائی بھی تو ہو سکتا تھا۔ آنٹی ماجدہ اور ارجند بیگم میں پرانی چپقلش کی موجودگی ثابت ہوتی تھی۔ ممکن تھا کہ ارجند بیگم نے جو کچھ کہا وہ اسی چپقلش کا شاخسانہ ہو۔ اکل اور آنٹی کے پاس رہتے ہوئے اسے اب تقریباً دو مہینے ہو چلے تھے۔ اس دوران میں اس نے ان میں ایسی کوئی معیوب چیز نہیں دیکھی تھی۔ جس سے کوئی گھمبیر نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔ اکل اور آنٹی اسے گھر کے فرد جیسی اہمیت دے رہے تھے اور بڑی محبت سے اس کی ضروریات کا خیال رکھ رہے تھے۔

انہی خیالات میں الجھے الجھے رات آخری پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اگلا دن معمول کے مطابق شروع ہوا اور معمول کے مطابق ختم ہوا۔ وہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہی۔ اس نے آنٹی کی ایک پرانی شلوار قمیص پہن لی۔ آنٹی کے منع کرنے کے باوجود وہ کبیل اور چادریں وغیرہ دھونے بیٹھ گئی اور سہ پہر تک جتی رہی۔ لڑکا شاید گاؤں گیا ہوا تھا۔ گھر کے دیگر چھوٹے بڑے کام بھی شانی خود ہی کرتی رہی۔ خود کو جو حکم میں ڈال کر اسے جسمانی مشقت تو اٹھانا پڑتی تھی تاہم ذہنی طور پر قدرے سکون رہتا تھا۔

شام تک وہ خاصی تھک چکی تھی۔ پتا نہیں کیوں آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آنٹی ماجدہ کچھ چپ چپ ہیں..... کچھ کچھ کچھی سی۔ یا شاید یہ اس کا وہم ہے۔ شانی یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ رات کو آنٹی نے اسے ارجند بیگم یعنی ”لمبوں کی امی“ سے باتیں کرتے واقعی دیکھا ہے یا نہیں..... دروازہ تو بند تھا۔ کھڑکی پر جالی لگی ہوئی تھی اور وہ ایسے رخ پر تھی کہ اس میں سے چھت کا وہ حصہ بمشکل دیکھا جاسکتا تھا جہاں شانی، ارجند بیگم کے پاس کھڑی تھی۔ بہر حال جس انداز سے آنٹی ماجدہ نے اسے آواز دی تھی اس سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ انہوں نے کچھ نہ کچھ دیکھا ہے۔

شام کے وقت جب شانی نڈ حال سی ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی، آنٹی کا موڈ قدرے بہتر محسوس ہوا۔ انہوں نے اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا۔

”اتنا کام نہ کیا کرو ذرا سامنے نکل آتا ہے۔“

”کچھ بھی نہیں ہوتا، ہنسی کٹی تو ہوں۔“

”کوئی نہیں ہو ہنسی کٹی.....“ انہوں نے کہا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دو گرما گرما کپ چائے کے لے آئیں۔ ساتھ میں بسکٹ اور دہی پکڑیاں تھیں۔

چائے پینے کے بعد شانی ادھر ہی بیٹھی رہی۔ ٹی وی پر ایک کوزہ پروگرام آرہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے شانی کو ادنگھی آگئی۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے لگائے غنودگی کی حالت میں رہی۔ آنکھ کھلی تو اجالا غائب تھا اور شام خاصی گہری ہو چکی تھی۔ کمرے اور اندرونی کمرے کی لائٹس روشن تھیں۔ ٹی وی بند پڑا تھا۔ ساتھ والے کمرے سے اسے قاسم برلاس کی آواز آئی۔ وہ اپنی بھاری بھر کم بلند آواز میں کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

”نہیں جی..... عثمانی صاحب اور بیگم دونوں نہیں ہیں۔ ابھی ابھی گئے ہیں۔ کہیں فوتیdg ہو گئی ہے..... پتا نہیں جی..... ہاں جی..... ہاں جی..... دوڑو ڈھاٹی گھٹے تو لگ جائیں گے..... ٹھیک ہے جی..... خدا حافظ۔“

اس نے فون بند کر دیا۔

شانی جھلا سی گئی۔ کہاں چلے گئے تھے وہ دونوں..... اور آج پھر یہ منحوس شخص گھر میں تھا..... اوہ گاڈ..... شاید بھی تو گیا ہوا تھا..... وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے اپنا سر ایک دم بھاری محسوس ہوا اور قدم ڈمگاتے ہوئے سے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ گرنے لگی ہے۔ وہ جلدی سے پھر بیٹھ گئی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے بڑی پریشانی کے عالم میں سوچا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔

یہی وقت تھا جب دیو بھل قاسم دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ حسب معمول سفید پتلون اور جرسی میں تھا۔ انرجی سیور کی روشنی میں اس کا نصف گنجا سر دک رہا تھا۔

”کیا بات ہے نصیب دشمنان طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اس نے بے تکلفی سے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”سر بھاری ہو رہا ہے۔“ شانی کی آواز بھی قدموں کی طرح ڈمگ رہی تھی۔

”لگتا ہے کہ بہت تھکی ہوئی ہو تم۔ اگر دل چاہتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جاؤ۔“

”نن..... نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ شانی نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”آ..... آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

”ڈرائنگ روم میں بڑی سردی ہے۔“ قاسم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ہر دم بڑھتی ہوئی غنودگی کے باوجود شانی نے قاسم کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

”انک..... انکل اور آنٹی کہاں..... ہیں؟“ شانی نے پوچھا۔

”وہ کسی مرگ پر چلے گئے ہیں دو تین گھنٹے کے لئے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون آیا تھا۔“

اچانک شانی کو احساس ہوا کہ وہ ایک نہایت خطرناک سازش کا شکار ہوئی ہے۔ اس کی یہ غیر معمولی غنودگی بے معنی نہیں تھی۔ اس نے شام پانچ بجے کے قریب یہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے آنٹی ماجدہ کے ساتھ چائے پی تھی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد آنٹی اٹھ کر چلی گئی تھیں اور اسے اونگھ آ گئی تھی۔ یہ غیر معمولی اونگھ تھی اور اب اسی غنودگی بھری کیفیت میں شانی قاسم کی زبانی سن رہی تھی کہ آنٹی اور انکل دونوں گھر میں نہیں۔ ایک دم دو تین باتوں نے شانی کے ذہن پر یلغار کی۔ پہلی بات تو ذہن میں یہ آئی کہ آنٹی ماجدہ نے کل رات اسے چھت پر ارجمند بیگم سے باتیں کرتا دیکھ لیا تھا اور یہ جو کچھ ہوا ہے اسی واقعے کا رد عمل ہے۔ پھر ارجمند بیگم کی یہ بات اس کے ذہن میں آئی کہ پہلے عثمانی اور ماجدہ سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی کوشش کریں گے اور اگر نہیں نکلا تو انگلیاں میز ہی کر لیں گے۔ تو کیا انگلیاں میز ہی کی جا چکی تھیں؟ یہ سوال ذہن میں آتے ہی ایک سرد لہر اس کے جسم میں سرتاپا دوڑ گئی۔ تیسری بات ذہن میں یہ آئی کہ قاسم برلاس یہاں کیوں موجود ہے؟ اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ اگر اس کی نیت خراب ہے تو وہ اس

کی مزاحمت کیونکر کر سکتی ہے؟

مزاحمت کی بات اس کے ذہن میں آ تو گئی تھی مگر یہ بہت دور دراز کی بات معلوم ہوتی تھی۔ اس کے جسم میں ہر دم نقاہت اُترتی جا رہی تھی اور آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں۔ یہی لگتا تھا کہ پلکوں پر منوں بوجھ رکھا گیا ہے۔ گلے میں بھی خراش سی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ جزوی طور پر ہی کامیاب ہو سکی۔ اس کے دھندلائے ہوئے ذہن نے اعلان کیا کہ اسے کوئی تیز اثر نشہ آور چیز دی گئی ہے۔

کیا اسے چیخنا چاہئے؟ اس نے سوچا۔ کیا اس کی آواز میں اتنا دم ختم بچا ہے کہ وہ ان دیواروں سے گزر کر کسی مددگار کے کانوں تک پہنچ سکے.....؟ کیا اسے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرنی چاہئے؟ کیا وہ دیواروں اور سامنے والے دروازے سے ٹکرائے بغیر بھاگ سکے گی؟

اس کے ڈوبتے ہوئے ذہن نے پکار کر کہا۔ ”شانی وقت گزر رہا ہے، بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ اگر اپنی آبرو اور جان بچانے کے لئے کچھ کرنا چاہتی ہے تو جلدی سے کر لے..... اس کے اندر کی باہمت چوہدرانی بیدار ہوئی..... رنگ والی کی باحوصلہ بیٹی..... وہ پوری طاقت جمع کر کے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ زمین جیسے اس کے ننگے پاؤں کے نیچے گول گول گھوم رہی تھی۔ بچپن میں اس کے اباجی حویلی کے کچے صحن میں اسے بازوؤں سے پکڑ کر گول گول گھماتے تھے اور پھر ہنستے ہنستے اسے زمین پر بٹھا دیتے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ زمین ایک طرف سے اٹھتی چلی جا رہی ہے۔ آج بھی دروہام کی یہی کیفیت تھی۔ پہلے وہ ٹی وی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی پھر ایک کرسی سے ٹکرائی۔ شاید وہ اوندھے منہ گرتی مگر گرائیڈیل قاسم کی مضبوط بانہوں نے اسے سہارا دیا۔ اس کے لمبے ریشمی بال کھل گئے اور چہرے پر جھونلے لگے۔

”میرا خیال ہے کہ تمہاری طبیعت خراب ہے میں تمہیں پانی پلاتا ہوں۔“ قاسم برلاس نے کہا اور اسے پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ قرب وجوار شانی کی نگاہوں میں غلط ملط تھے۔ شانی کو لگا جیسے قاسم اسے برآمدے کی طرف لے جا رہا ہے۔ مگر وہ اسے ایک اندرونی سنور میں لے آیا۔ یہ تقریباً چھ ضرب دس فٹ کا لمبوتر سنور تھا۔ ایک طرف لوہے کی الماری تھی۔ ایک طرف جستی پٹی تھی۔ اٹیچی کیس، بوسیدہ فوم کے گدے، کبل، گھریلو استعمال کے اوزار، گتے کے خالی ڈبے، پتا نہیں کیا کچھ یہاں بھرا ہوا تھا۔ ان سب اشیاء کے درمیان تقریباً تین فٹ ضرب آٹھ فٹ کی جگہ خالی تھی۔ یہاں قالین کا ایک ٹکڑا بچھا ہوا تھا۔

اس تابوت نما مختصر سنور میں پہنچ کر شانی کا دم گھٹنے لگا۔ قاسم نے اسے سہارا دیتے ہوئے قالین پر بٹھایا۔ شانی کی پشت دیوار سے ٹک گئی۔ غنودگی کا ایک جھونکا سا آیا اور اس مختصر جھونکے کے بعد شانی کو پتا چلا کہ اس سنور کا دروازہ اندر سے بند کیا جا چکا ہے۔ اب وہ ایک پنجرے کی قیدی تھی۔ چاروں طرف موٹی دیواریں تھیں اور بند دروازے تھے۔ یہ سنور گھر کے بیٹوں و بیٹیوں کا بیڈ روم تھا۔

”مجھے چھوڑ دو..... مجھے ہاتھ مت لگانا..... میں کہتی ہوں مجھے ہاتھ مت لگانا۔“ شانی کراہی۔ اسے اپنی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

اس کی دھندلائی ہوئی نگاہیں دیکھ رہی تھیں، قاسم برلاس کا چہرہ تنمائی ہوا تھا اور آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے بے باکی سے شانی

کے رخساروں کو سہلایا۔ اس کے بالوں کو اس کے چہرے سے پیچھے ہٹایا اور اس کے گالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”شانی! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں رانی بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس بہت کچھ ہے وہ سب کا سب تمہارا ہوگا۔ تمہارے قدموں میں ہوگا۔ پلیز! میرا دل مت توڑنا، مجھے اپنا بنالو۔ مجھے اپنے سینے سے لگا لو۔“

”خدا کے لئے۔ مجھ سے پیچھے ہٹ جاؤ۔ دور ہو جاؤ۔“ شانی نے سنور کے ایک گوشے میں سینے کی کوشش کی۔

”شانی! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم کو اپنا بنانا ہی ہے۔ کسی بھی طریقے سے۔ کسی بھی طرح۔ میں دعوے سے کہتا ہوں شانی! میرے جیسا چاہنے والا تمہیں کہیں اور نہیں ملے گا۔ مجھے تمہارے ماضی سے کوئی غرض نہیں ہے شانی۔ تم جو بھی تھیں، جہاں بھی تھیں۔ میں اس بارے میں کچھ جاننا نہیں چاہتا۔ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں، صرف تمہیں۔“

شانی نے اپنے سر دپاؤں سے پریش قاسم کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ ایک لمحے کے لئے لگا کہ وہ اپنے مخصوص حاکمانہ لہجے میں دہاڑ پڑے گا، مگر جب وہ بولا تو اس کی آواز میں نرمی برقرار تھی۔

”شانی! میں تمہیں دنیا کا ہر آرام دوں گا۔ تمہیں پتا نہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں کیا کیا سوچ کھا ہے۔ مجھے بس تمہاری ہاں چاہئے۔ پھر دیکھنا میں تمہارے لئے دنیا کو کس طرح بدلتا ہوں۔“ اس کے بھاری بھر کم ہاتھ کی گرفت شانی کے نازک گھٹنے پر قائم تھی اور مضبوط ہو رہی تھی۔

شانی نے یہ گرفت ختم کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”مجھے یہاں سے نکالو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

”میں خود بھی تمہیں یہاں رکھنا نہیں چاہتا۔ صرف اس لئے لایا ہوں کہ تم میری بات پوری توجہ سے سن سکو۔“

”میں سن رہی ہوں۔ سن رہی ہوں۔“

اس نے اپنی جرسی کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اندر سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ یہ فل اسکیپ کے صفحے سے کچھ بڑا تھا۔ شانی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس کاغذ کی پیشانی پر لکھا تھا۔ ”قارم نکاح نامہ!“

ہاں یہ ایک نکاح نامہ تھا۔ یہ تقریباً سارے کا سارا پڑ کیا جا چکا تھا۔ گواہوں کے نام اور دستخط موجود تھے۔ دولہا دلہن کی ازدواجی حیثیت، حق مہر کی رقم اور نکاح خواہ کے کوائف۔۔۔۔۔ سارے اندراجات مقررہ جگہوں پر موجود تھے۔ شانی نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ جگہ خالی تھی جہاں دلہن کے دستخط کئے جانے تھے۔۔۔۔۔ نکاح نامے میں دلہن کے ولی کے طور پر ریاض عثمانی کا نام پتا لکھا تھا۔

قاسم برلاس نے نکاح نامہ اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

”پلیز شانی! اس پر دستخط کر دو۔ تمہاری اور میری ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔“

شانی نے آنکھیں پھاڑ کر اس جعلی کاغذ کو دیکھا۔ پھر نہ جانے ایک دم اتنی ہمت اس میں کہاں سے آئی۔ اس نے کاغذ کے کٹڑے کر دیئے۔

قاسم اسے روکتا ہی رہ گیا۔

اس کے ساتھ ہی شانی نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اپنی الماری سے نکلرائی۔ اس نکر سے سنور کے مختصر خلا میں زبردست شور ہوا۔ اس مرتبہ قاسم

برلاس نے شانی کو سہارا دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے سر دنگا ہوں سے شانی کو الماری سے کھراتے اور پھر پہلو کے بل قالین پر گرتے دیکھا۔ شانی کا سر بُری طرح گھوم رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دیکھ رہی تھی کہ قاسم برلاس کے تیور بگڑتے جا رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت نمودار ہو گئی تھی۔ وہ دیوبیکل تھا اور سیدھا کھڑا تھا۔ قالین پر گر کر شانی کو وہ کچھ اور بھی بلند و بالا نظر آ رہا تھا۔ شانی کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی جرسی اور قیص اتار دی۔ اس کا تھل تھل کرتا چریلا جسم کر یہہ منظر پیش کرنے لگا۔ وہ گھٹنوں کے بل شانی کے پہلو میں بیٹھ گیا اور بڑے حریصانہ انداز میں اس کے بال سہلانے لگا۔ ”..... میری اور اپنی عمر کے فرق پر نہ جاؤ میری رانی!“ وہ چپا چپا کر بولا۔ ”میں آج کل کے ممی ڈیڈی لونڈوں سے کہیں زیادہ جوان اور تندرست ہوں۔ تمہیں ایک بھر پور زندگی دے سکتا ہوں۔“ اس کے منہ سے بو آرہی تھی۔

وہ اس سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی گرم سرگوشیاں شانی کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ مگر یوں لگتا تھا کہ آواز دور کسی کنویں کی تہہ سے آرہی ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تیرے پیار کی قسم تجھ سے دور رہنا مشکل ہے۔ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں بے بس ہوں۔“ قاسم کے ہاتھ شانی کے جسم پر تھے۔ پھر یہ ہاتھ ایک کرخت غلٹ کے ساتھ اسے بے لباس کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ شانی مزاحمت کرنا چاہتی تھی مگر مزاحمت کے لئے جس ہوش مند توانائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ شانی میں کہیں نہیں تھی۔ وہ اپنے سینے میں طاقت جمع کر کے چلائی۔ اس نے قاسم برلاس کے بھوکے ہاتھوں کو اپنے نیم عریاں جسم سے دور ہٹانا چاہا مگر یہ دونوں فعل بے حد لاغر و کمزور تھے۔ یہی وقت تھا جب شانی کی نگاہ ایک ڈرل مشین پر پڑی۔ یہ عام استعمال ہونے والی ایک درمیانے سائز کی ڈرل تھی اور جستی پٹی کے نچلے خلا سے اس کا نیلگون دستہ نظر آ رہا تھا۔ شانی کی نگاہیں اس مشین پر جم سی گئیں۔ ڈرل مشین دیواروں میں سوراخ کرتی ہے۔ اگر شانی کے بس میں ہوتا تو وہ اس سے قاسم کے سر میں سوراخ کر دیتی۔ فی الوقت وہ اس مشین کو صرف ایک وزنی شے کے طور پر استعمال کر سکتی تھی۔ شانی نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ قاسم برلاس اس کے اوپر تقریباً گرا ہوا تھا۔ شانی کو اس کی گتھی کھوپڑی اور تھل تھل کرتی چریلی پشت نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ ڈرل مشین کی طرف بڑھے۔ اپنے جسم سے توانائی کی آخری رمت نچوڑتے ہوئے شانی نے یہ ڈرل دونوں ہاتھوں میں اٹھائی اور قوت سے قاسم کے سر پر دے ماری۔ شانی نے بیجانی انداز میں ضرب لگائی تھی۔ کچھ مشین کا اپنا وزن بھی تھا۔ کھٹاک کی آواز پیدا ہوئی اور قاسم تیور کر پیچھے کی طرف گرا۔..... شانی نے سیدھے کھڑے ہو کر ایک اور ضرب اس کے سر پر لگائی، پھر ایک اور اس کے چہرے پر۔ قاسم کے منہ سے عجیب ڈکرائی ہوئی آواز نکلی۔ چند لمحوں کے اندر اس کا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ اس لہو کے اندر سے اس کی سفید سفید..... بند ہوتی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ وہ بے ہوش ہو رہا تھا۔..... یا شاید مر رہا تھا۔ شانی کو کچھ اندازہ نہیں تھا۔

اس نے ڈرل مشین ایک طرف پھینکی اور شور کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ وہ ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اس نے چپل پہنی، اس کے جسم پر ابھی تک آنٹی ماجدہ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے تھے۔ اس نے بستر کی ایک چادر گھسیٹ کر اپنے پچھٹے ہوئے لباس کو ڈھانپ لیا۔ پھر وہ تیر کی طرح برآمدے کی طرف آئی۔ وہ بُری طرح ڈنگا رہی تھی اور دروازوں سے مکر رہی تھی۔ برآمدے میں جالی دار گرل تھی اسی

گرل میں ایک دروازہ تھا۔ جس میں سے گزر کر صحن میں پہنچا جاتا تھا۔ شانی نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اس پر انکشاف ہوا کہ یہ دروازہ لاک ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح چابی ڈھونڈنے لگی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں اور قرب و جوار نگاہوں میں چکرار ہے تھے، گلے میں شدید جلن تھی۔ یوں لگتا تھا کہ حلق میں خنجر اترے ہوئے ہیں۔ چابی نہیں مل رہی تھی..... شاید وہ قاسم کے لباس میں ہی تھی لیکن وہ اب واپس اس منحوس سنور میں نہیں جانا چاہتی تھی اور نہ اس میں اتنی ہمت تھی کہ پھر سے خونچکاں قاسم برلاس کو دیکھ سکے۔ اچانک قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ اسے چابی مل گئی..... یہ شیشے کی ایک تپائی پر شراب کی نصف بوتل کے نیچے رکھی تھی۔ قریب ہی شیشے کا ایک گلاس الٹا پڑا تھا۔ گلاس کے ساتھ ہی قاسم برلاس کے پسندیدہ سگریٹوں کا پیکٹ اور اس کا لائسنر پڑا تھا۔ ایک پلیٹ میں تلی ہوئی نمکین مونگ پھلی کی باقیات تھیں۔

شانی کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ چائے پینے کے بعد وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی بیٹھی کتنی دیر تک قرب و جوار سے بے خبر رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی تو شام گہری ہو چکی تھی۔ غالباً قاسم تب آدھا پون گھنٹے سے یہاں موجود تھا۔ اسی دوران میں اس نے یہاں ان چیزوں سے شغل کیا تھا۔ شانی کو اس کا متمایا ہوا چہرہ اور چڑھی ہوئی آنکھیں یاد آئیں..... یقیناً وہ سب اسی سیال آتش کا کرشمہ تھا جو اس نے یہاں بیٹھ کر اپنے اندر راند لی تھی۔

شانی نے بوتل کے نیچے سے جالی دار دروازے کی چابی نکالی اور لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اب مختصر صحن اس کے سامنے تھا۔ اس صحن کو تقریباً دس فٹ اونچی چار دیواری نے گھیر رکھا تھا، شانی جلد از جلد اس خطرناک چار دیواری سے نکل جانا چاہتی تھی..... وہ بیرونی دروازے پر پہنچی اور یہ جان کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ یہ دروازہ بھی لاک ہے۔ قاسم ہر طرح کی پیش بندی کر کے ہی اسے سنور میں لے گیا تھا۔

”یا خدا میں کیا کروں۔“ شانی نے خود کلامی کی۔ اس کے حلق میں کانٹے سے تھے۔ منہ بھی بالکل خشک ہو رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر دیوانوں کی طرح بیرونی دروازے کی چابی ڈھونڈنے لگی۔ چابی کہیں نہیں تھی۔ اس نے بے قرار ہو کر بیرونی دروازے کو زور زور سے پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بس جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ دروازہ پیٹنے پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تو اس نے مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا۔ ”کوئی ہے..... کوئی ہے۔“

اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل پارہی۔ وہ پوری طاقت سے بول رہی تھی مگر آواز شاید چند فٹ تک ہی جارہی تھی۔ درحقیقت سنور روم میں ہونے والی زبردست کھینچا تانی کے دور میں وہ مسلسل چلاتی رہی تھی شاید کچھ اثر نشہ آور دوا کا بھی تھا۔ اس کا گلابری طرح بیٹھ چکا تھا۔ اس نے دروازہ پیٹنے کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی کہ اس کی آواز باہر تک پہنچ سکے۔ اس کوشش کا الٹا اثر ہوا۔ رہی سہی آواز بھی ختم ہوتی محسوس ہوئی۔

یہی وقت تھا جب اچانک اس پر ایک خوفناک انکشاف ہوا، گھر کے اندرونی حصے میں سنور روم کی طرف سے کھٹ پٹ کی آواز آئی تھی۔ وہاں حرکت ہو رہی تھی۔ قاسم برلاس کے سوا وہاں کون حرکت کر سکتا تھا۔ شانی کو اپنا خون رگوں میں جتا محسوس ہوا۔ اس نے بوکھلا کر برآمدے کی طرف دیکھا تب اسے قاسم برلاس کی ایک مختصر جھلک دکھائی دی۔ وہ دیو کا دیو ڈمگماتا ہوا کامن روم سے ٹی وی لائونج کی طرف آ رہا تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ برآمدے میں پہنچنے والا تھا۔ شانی کراہتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ خود کو قاسم برلاس کی نگاہوں سے بچانے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں

تھا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر چلی جاتی۔ وہ خود کو بالائی منزل کے ٹی وی لاونچ میں لے آئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

آوازوں سے صاف پتا چل رہا تھا کہ زخمی قاسم برلاس بڑے طیش کے عالم میں اسے نکلی منزل پر ڈھونڈ رہا ہے۔ دروازے بھی دھڑا دھڑا بج رہے تھے۔ گالیاں بکنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ پھر شانی نے محسوس کیا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل کی طرف آ رہا ہے۔

شانئی آخری دم تک مزاحمت کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے ”نشے سے متاثر اعصاب“ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس نے ٹی وی لاونچ میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ کوئی ایسی چیز ڈھونڈ رہی تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔ اوپر کا پورشن تقریباً بے آباد تھا۔ عثمانی کی بیٹیوں کی شادی کے بعد وہ کمرے تو بالکل خالی پڑے تھے۔ ٹی وی لاونچ کا بھی یہی حال تھا۔

چند ہی سیکنڈ بعد قاسم کی غصیلی آواز ٹی وی لاونچ کے سامنے سنائی دینے لگی۔ ”کہاں ہے تُو..... باہر نکل..... میں کہتا ہوں باہر نکل، نہیں تو پورے گھر کو آگ لگا دوں گا۔“ پھر وہ غلیظ گالیاں بکنے لگا۔ اس کی آواز سے عیاں تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ گالیوں کا انتخاب اس کے اندر کی بھوک اور ہوس کو ظاہر کرتا تھا۔

شانئی اپنی جگہ سکڑی سکڑی کھڑی رہی۔ اس کا دل جیسے سینے میں نہیں پورے جسم میں دھڑک رہا تھا۔ کچھ ہی لمحے بعد ٹی وی لاونچ کا دروازہ دھڑا دھڑا بجنے لگا..... بے پناہ وحشت کے عالم میں قاسم دروازے کو دھکے دے رہا تھا۔ شانئی نے سر اسیمہ نظروں سے دروازے کی اکلوتی چھتی کو دیکھا۔ یہ چھتی گرائنڈیل قاسم کی مزاحمت زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی۔ شانئی نے ٹی وی لاونچ چھوڑا اور پچھلے دروازے سے نکلتی ہوئی بالائی پورشن کے کچن میں آ گئی۔ یہ کچن بھی نہ جانے کب سے بے آباد پڑا تھا۔ یہاں ایک خستہ حال اے سی..... ایئر کولر اور پیڈل فین وغیرہ رکھے تھے۔ شانئی اس کچن میں گھس گئی اور یہاں بھی دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی۔ یہاں لائٹ وغیرہ نہیں تھی۔

کچن کی ایک کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ یہاں بھی ابھنی گرل اور جالی لگی ہوئی تھی۔ قاسم برلاس نے اب ٹی وی لاونچ کا دروازہ دھڑا دھڑا کر دیا تھا۔ غالباً وہ کسی اور طریقے سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یا شاید وہ اوپر چھت پر دیکھنے چلا گیا تھا پڑوس کا قریب ترین مکان بھی تقریباً سوفٹ کی دوری پر تھا، شانئی کی آواز تو گلے سے نکل نہیں رہی تھی۔ وہ صرف یہ کر سکتی تھی کہ کسی لکڑی لوہے کو کھڑکی سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتی اور پڑوسیوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتی۔ تاہم اس کوشش میں نقصان کا اندیشہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ دھند آلود سردی میں لوگ بند کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ کھڑکی کی آواز پڑوسیوں تک تو نہ پہنچتی مگر قاسم برلاس تک پہنچ جاتی بلکہ یقینی بات تھی کہ یہ آواز اس تک پہنچے گی۔ اسے یقین ہو جائے گا کہ شانئی کچن کے آس پاس موجود ہے۔

وہ اسی ادھیڑ بھن میں تھی جب اس کی نگاہ نیچے سڑک پر پڑی۔ اس نے دیکھا ایک موٹر رکشہ عثمانی کی بیٹی افشاں کو گیٹ پر اتارنے کے بعد گلی کے موڑ پر اوجھل ہو رہا تھا..... ہاں وہ افشاں ہی تھی۔ دبلی پتلی، سمارٹ سی، اس کے ہاتھوں میں تین چاروزنی شاپریگ جھول رہے تھے، کندھے پر اس نے شولڈر بیگ سنبھالا ہوا تھا۔ شانئی کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دوشا پریگ نیچے رکھے اور کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ نیچے برآمدے میں گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

سڑھیوں پر قاسم برلاس کے خمور لڑکھڑاتے قدموں کی آواز ابھری۔ وہ نیچے جا رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز اسے نیچے لے جا رہی تھی۔

”اوہ گاڈ..... یہ کیا ہو رہا ہے؟“ شانی نے بوجھل ذہن کے ساتھ سوچا۔ وہ کچن سے نکلی اور دو دروازوں میں سے گزرتی ہوئی پھرٹی وی لاونچ میں آگئی..... یہاں ایک کھڑکی سے وہ مین گیٹ کا منظر دیکھ سکتی تھی۔ اسے قاسم برلاس کی جھلک نظر آئی۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اس کا چہرہ اور کندھے لہولہان تھے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چمکتی ہوئی چیز تھی..... یہ جان کر شانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ یہ بڑے ساز کی تیز دھار چھری تھی۔ گوشت کاٹنے والی یہ چھری قاسم نے یقیناً چلی منزل کے کچن سے لی تھی۔ اس چھری اور اپنے لہولہان سراپا کے ساتھ وہ بے حد بھیانک نظر آ رہا تھا۔ گھنٹی ایک بار پھر بجی۔

قاسم کا انداز بتا رہا تھا کہ شانی کی طرح اس نے بھی بالائی منزل سے افشاں کی جھلک دیکھ لی ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گیٹ تک پہنچا۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس نے اپنے لباس میں سے چابی نکال لی تھی۔ چھوٹا گیٹ کھولنے کے ساتھ ہی وہ ایک طرف ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ زرق برق کپڑوں والی تو بیابا افشاں نے دروازہ کھولا اور بے تکلفی سے اندر آگئی۔ شاپر زاس کے ہاتھوں میں تھے۔ دروازہ کھولنے والا نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے تعجب سے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر ملازم لڑکے شاہد کو آواز دیتے ہوئے بولی۔ ”شاہدی! بڑے شرارتی ہوتے.....“

یقیناً اس کے ذہن میں یہی آیا تھا کہ ایسا شاہد نے کیا ہوگا۔ شانی کا دل چاہا، وہ پکار پکار کر افشاں کو اطلاع دے کہ وہ ایک گھمبیر خطرے کی زد میں آ رہی ہے..... یہاں ”ان“ میں سے کوئی نہیں ہے جن سے ملنے وہ آئی ہے۔ یہاں تو بس ”ان“ کا بچھایا ہوا وہ جال ہے جو نظر نہیں آ رہا لیکن جس کی پکڑ بے حد خوفناک ہے۔

لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا حلق ایک غجر صحرا کی طرح تھا۔ اس کا نطق اس سے جدا تھا۔ افشاں کی نوخیز آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ”امی کہاں ہیں آپ..... ابو..... ابو.....“ وہ برآمدے کے سامنے صحن میں چکرارہی تھی۔ اس نے اپنا وزن ہلکا کرنے کے لئے شاپر غالباً برآمدے میں بچھے تخت پر رکھے اور اندرونی کمرے کی طرف بڑھی۔ اب وہ شانی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ شانی کو صرف عفریت نما قاسم برلاس نظر آ رہا تھا۔ وہ گیٹ پھر سے لاک کرنے کے بعد برآمدے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دو لمبے بعد وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شانی سکتے میں کھڑی تھی۔ چند سیکنڈ گزرے اور پھر وہی کچھ ہوا جو بدترین اندیشے کی صورت، شانی کے ذہن میں موجود تھا۔ ایک گھٹی گھٹی دردناک چیخ کسی اندرونی کمرے میں سنائی دی، یقیناً یہ افشاں کی چیخ تھی۔ اس ادھوری چیخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے منہ کو فوراً ہی مضبوطی سے بند کر دیا گیا ہے۔

”اوہ..... خدایا۔“ شانی نے اپنا گھومتا ہوا سر دونوں ہاتھوں سے تھاما۔ عثمانی اور ماجدہ کے بچھائے ہوئے جال میں ان کی بیٹی آچھنی تھی..... وہی مکافات کی پرانی روایت۔ افشاں کو اتوار کے روز امی ابو سے ملنے آتا تھا لیکن بوجہ وہ نہیں آ سکی تھی۔ آج غالباً وہ انہیں سر پرانزد دینے اچانک ہی آدھمکی تھی۔

شانی نے خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کیا۔ اس کے اندر کی آواز تھی کہ جو کچھ بھی ہے اسے افشاں کو بچانے کی کوشش کرنی چاہئے..... لیکن

سوال یہ تھا کہ کیسے؟ شانی کے اعصاب اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں کی حرکات بے قاعدہ تھیں اور گلا تو جیسے سوکھ کر کڑی ہو چکا تھا۔ گلے کی اس صورتِ حال کے ڈانڈے یقیناً اس نشہ آور شے سے ملتے تھے جو اسے دہی پکڑیوں یا چائے میں ملا کر دی گئی تھی۔

شانئی کے اندازے کے مطابق اب مخمور قاسم برلاس عثمانی کی بیٹی کو وہیں لے جا چکا تھا جہاں کچھ دیر پہلے شانی موجود تھی۔ وہی قبر نما سٹور جس کے چاروں طرف کمرے تھے اور بند دروازے تھے۔ شانی کے لئے موقع تھا کہ وہ کسی طرح شور مچاتی اور اڑاؤں پڑوں کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ایک اور کوشش کرتی مگر یہاں جوش کے ساتھ تھوڑے سے ہوش کی ضرورت بھی تھی۔ اپنے پکڑائے ہوئے غبار آلود ذہن کے باوجود اتنی بات شانی کو سمجھ میں آرہی تھی کہ اگر اس نے پڑوسیوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی اور کسی وجہ سے وہ متوجہ نہ ہو سکے تو صورتِ حال مزید خراب ہو جائے گی۔ قاسم برلاس کو یقین ہو جائے گا کہ شانی بالائی منزل پر موجود ہے۔ وہ افشاں کو سٹور میں لا کر کئے یا کسی اور طرح سے بے بس کر کے پھر سے بالائی منزل کا رخ کر سکتا تھا۔ بہتر آپشن تو یہ تھا کہ وہ پہلے کسی طور اس گھر سے نکلتی۔ پھر مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی لیکن نکلا کیسے جاتا۔ گھر کا نقشہ کچھ ایسا تھا کہ وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ محفوظ طریقہ بس ایک یہ تھا۔ وہ صحن میں پہنچتی اور کسی طرح بیرونی دروازہ کھول کر باہر سڑک پر پہنچ جاتی۔

وہ اندھا حال ہی ہو کر ایک صوفے پر گر پڑی۔ آس پڑوس کے مکان کچھ فاصلے پر تھے۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے اور شاید مکینوں کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان کی آنکھیں اور کان بھی بند تھے۔ یہ بے حسی اور بے خبری بھی ہمارے موجودہ رہن بہن کی دین ہے۔ دیوار سے دیوار ملی ہوتی ہے لیکن پڑوسی ایک دوسرے کے احوال سے لائق ہوتے ہیں۔ شام ہوتے ہی کھڑکیاں دروازے بند کر کے ٹی وی لاؤنج آباد کر لئے جاتے ہیں۔ وہ سماجی زندگی ناپید ہو چکی ہے جو اہل محلہ کو ایک دوسرے سے مربوط رکھتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے مسائل اور حالات سے آگاہ ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شرکت کرتے تھے۔ شانی کو لگا کہ وہ ایک بند دروازے والے گونگے بہرے نگر میں ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنے حال میں مگن ہے۔ جان و مال پر ڈاکے پڑتے رہیں شیطان ناچتا رہے، درندے گوشت نوچتے رہیں مگر کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ بس اس کی ”مصیبت“ ہوتی ہے جس پر مصیبت پڑتی ہے۔ ہر کوئی الگ الگ اپنی ”قیامتِ صغریٰ“ کا سامنا کرتا ہے۔

وہ کچھ دیر تک بدحواسی سی بیٹھی رہی۔ پھر لڑکھڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تصور کی نگاہ سے نرم و نازک افشاں کو شرابی قاسم کے شکنجے میں دیکھ رہی تھی۔ ایک تیز دھار چھری افشاں کی گردن پر تھی اور قاسم کی عفریت کی طرح اس پر چھپٹ رہا تھا۔

”نہیں میں خاموش نہیں رہ سکتی..... مجھے کچھ کرنا چاہئے..... کچھ کرنا چاہئے۔“ اس نے بڑے کرب کے عالم میں سوچا۔

وہ سنسجیل سنسجیل کر سیزھیاں اُتری اور برآمدے کی طرف بڑھی۔ کامن روم میں ایک کرسی اونڈھی پڑی تھی۔ پاس ہی سُرخ رنگ کا لیڈرین سینڈل کا ایک پاؤں نظر آرہا تھا۔ یقیناً یہ اس کھینچا تانی کی نشانیاں تھیں جو قاسم برلاس اور افشاں کے درمیان سٹور کی طرف جاتے ہوئے ہوئی تھیں۔ شانی کی نگاہیں فون سیٹ کو تلاش کرنے لگیں۔ اس کے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ شاید فون سیٹ کسی طور اس کی مدد کر سکے۔ فون سیٹ اپنی مقررہ جگہ پر موجود نہیں تھا۔ وہ شانی کو قائلین پر نظر آیا۔ وہ اس کی طرف بڑھی تاہم فوراً ہی امید کی جگہ مایوسی نے لے لی۔ فون سیٹ کا تار توڑ کر علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ قاسم شانی کو سٹور روم کی طرف لے جانے سے پہلے یہ کارروائی کر چکا تھا۔

اچانک کچھ دبی دبی آوازوں نے شانی کا سینہ شق کر دیا۔ یہ روتی کراہتی آوازیں بند سٹور کی طرف سے آرہی تھیں۔

وہ جو ہوس کے زرخے میں تھی، سسک رہی تھی۔ آنسو بہا رہی تھی۔ شانی کو وہ بات پھر یاد آگئی۔ کہتے ہیں کہ عورت کے آنسو بہت کچھ پگھلا دیتے ہیں لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عورت جب مجبوری کے شکنجے میں ہو تو ہوس کا مرد کو یہ آنسو پگھلانے کے بجائے اور بھی پتھر کر دیتے ہیں۔

بند سٹور سے ابھرنے والی دبی دبی آوازیں گواہ تھیں کہ افشاں بدترین صورت حال سے گزر رہی ہے۔ دوسری طرف شانی لا چاری کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ان لحوں میں اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ایک دم ہی کوئی بھولا بھرا یاد آ گیا تھا۔ وہ جو اپنا تھا، جس کا چوڑا سینہ ایک دیوار کی طرح شانی کی حفاظت کرتا تھا۔ وہ جو اس کے ایک اشارے پر سر دھڑکی بازی لگانے کو تیار رہتا تھا۔ اگر وہ یہاں ہوتا اور شانی کو ان حالات میں دیکھتا تو کیا کرتا؟ شاید وہ شعلہ جوالہ بن جاتا اور اپنے سامنے آنے والے۔۔۔۔۔ قاسم جیسے ہر شخص کو جلا کر رکھ کر دیتا۔۔۔۔۔ ہاں ایسا ہی تھا رستم۔۔۔۔۔ شانی نے اس کے غیظ و غضب کی ایک مختصر جھلک راویلنڈی میں پولیس موبائل کے اندر دیکھی تھی۔ لیکن وہ یہاں نہیں تھا۔۔۔۔۔ پتا نہیں کہاں تھا؟ کس نگر میں تھا؟ کس بستی کے کس کوپے میں تھا؟ شانی نے اسے خود کھویا تھا۔ جان بوجھ کر گنوا یا تھا۔

یہ خیالات چار پانچ سینکڑ سے بھی کم وقت میں شانی کے ذہن سے گزر گئے۔ وہ ایک بار پھر اٹھی۔ وہ یہاں نہیں رک سکتی تھی۔ یہاں بند سٹور سے ابھرنے والی دبی آوازیں اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہی تھیں۔ وہ پلٹی اور ڈمگاتی ہوئی پھر صحن کی طرف بڑھی۔ برآمدے میں اسے شاپر بیگ تخت پر ڈھیر نظر آئے۔ جو کچھ دیر پہلے افشاں بڑے چاؤ سے لے کر اندر داخل ہوئی تھی۔ اب یہ بیگ بھی حسرت کی تصویر نظر آرہے تھے۔ وہ یہ شاپنگ غالباً اسلام آباد سے ہی کر کے لائی تھی۔ اس کا شو ہراس کے ساتھ نہیں تھا۔ شاید اسے بعد میں لاہور آنا تھا یا شاید وہ اسے مین گیٹ پر ڈراپ کر کے۔۔۔۔۔ موٹر رکشہ میں کہیں آگے نکل گیا تھا۔ اسے کچھ دیر بعد واپس آنا تھا۔۔۔۔۔ یا شاید یہ کوئی اور بات تھی۔ بہر حال وہ اس کے ساتھ نہیں تھا اور اس کا ساتھ نہ ہونا افشاں کے لئے ایک بہت بڑی آفت کا سبب بن چکا تھا۔

شانی ایک بار پھر مین گیٹ کی طرف آئی۔ اسے کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ یہ اندیشہ بھی اس کے ذہن میں ہر گھڑی گھمبیر ہو رہا تھا کہ کہیں وہ ہوش حواس کھو کر گر نہ جائے۔ اچانک اس کی نگاہ ایک چمکتی شے پر پڑی اور اس کی بند ہوتی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے غور سے دیکھا۔ یہ چمکتی چیز چھوٹے گیٹ کی چابی تھی جو تالے کے اندر ہی لگی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ شراب کے اندھے نشے نے کام دکھایا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے افشاں کے اندر آ جانے کے بعد قاسم برلاس نے دروازہ پھر مقفل کر دیا تھا۔ مقفل کرنے کے بعد وہ چابی اندر ہی چھوڑ گیا تھا۔

شانی نے لپک کر دروازہ کھولا اور باہر سڑک پر آ گئی۔ اس کے جسم کے گرد بستر کی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ بال منتشر ہو رہے تھے۔ ہوا کے سرد جھونکوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے نیم تاریک سڑک کے وسط میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر قریب ترین مکان کی طرف بڑھی۔ اس سہ منزلہ مکان کی درمیانی منزل پر روشنی ہو رہی تھی۔ شانی کی معلومات کے مطابق یہاں کوئی صحافی باجودہ صاحب رہتے تھے۔ شانی نے کال بیل کا بٹن دبایا اور وقفے وقفے سے دہاتی چلی گئی۔ ساتھ ساتھ وہ دستک بھی دے رہی تھی۔ اس کا حلق بند تھا۔ اس کے باوجود وہ پکارنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ دو تین منٹ کے جاں گسل انتظار کے بعد بالائی منزل کی ایک کھڑکی کھلنے کی آواز آئی۔ ایک سُست اور بے زار نسوانی آواز نے پوچھا۔

”کون ہے؟“

شانی نے پکار کر کہا۔ ”نیچے آئیں۔۔۔۔۔ بات سنیں۔“ مگر اس کی آواز اتنی پست تھی کہ بس اس کے ارد گرد ہی گونج کر رہ گئی۔

”کیا بات ہے؟“ اس مرتبہ مزید بے زاری اور کابلی سے پوچھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بڑبڑانے کی آواز آئی اور کھڑکی کھٹاک سے بند کر دی گئی۔ شانی نے تقریباً ایک منٹ تک مزید کال بیل بجائی اور دروازہ پیٹا۔۔۔۔۔ اندر سے کوئی آہٹ سنانی نہیں دی۔ اس دوران میں شانی کی نگاہ ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس پر پڑی۔۔۔۔۔ خالی سڑک پر گاڑی درمیانی رفتار سے شانی کی سمت آرہی تھی۔ شانی نے باجوه صاحب کا گیٹ چھوڑا اور گاڑی کی طرف بڑھی۔ گاڑی روکنے کے لئے وہ سڑک کے تقریباً وسط میں کھڑی ہو گئی۔ یہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا کہ گاڑی اس سے بچتی ہوئی آگے نکل گئی۔۔۔۔۔ اور پھر سڑک کے موڑ پر اوچھل ہو گئی۔

”یارب۔۔۔۔۔ میری مدد کر۔“ شانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟“ اس نے جیسے خود سے سوال کیا۔ اس نے کئی مرتبہ اخباروں میں پڑھا تھا اور اباجی کی زبانی سنا تھا کہ شہر جتنے بڑے ہوتے ہیں اتنے ہی بے جس ہوتے ہیں۔ حادثوں کے بعد سڑکوں پر زخمی تڑپا کرتے ہیں۔ بھرے پُرے چوراہوں پر لوگ اغوا ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ سر عام کسی غریب سڑک چھاپ کو کوئی ”پجار و سوار“ بنگا کر کے کھڑا کر دیتا ہے۔ بس دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں اور سننے والے کان سنتے رہتے ہیں۔ کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ کوئی مدد نہیں کرتا۔ اسے ان باتوں پر پوری طرح یقین نہیں ہوتا تھا۔ مگر آج سب کچھ اس کے اپنے اوپر بیت رہا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ دیکھ رہی تھی۔

اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اسے آنٹی ارجمند کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ ان کا گھر عقیبی جانب سے عثمانی کے گھر سے جڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بگلی گلی کی طرف بڑھی۔ یہ گلی اسے یقیناً عثمانی کے گھر کے عقب تک پہنچا سکتی تھی۔ یہ تیس فٹ چوڑی سڑک تھی۔ کہیں کہیں اسٹریٹ لائٹس بھی موجود تھیں۔ گہری غنودگی کے سبب شانی کو یہ دودھیا لائٹس لہراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس سڑک پر اچھا خاصا فاصلہ طے کر کے وہ بائیں طرف مڑی۔ یہاں ایک سٹریٹ لائٹ کے نیچے اسے چند لڑکے کھڑے نظر آئے۔ ایک جوان سال شخص موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا تھا۔

شانی ان کے قریب پہنچی۔ وہ بولی تو اس کے حلق سے بس ”گھیس گھیس“ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ وہ ان لڑکوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ آئیں اور اس کی مدد کریں۔۔۔۔۔

شانی کے الفاظ کسی نے نہیں سنے۔۔۔۔۔ یا شاید کسی کی سمجھ میں نہیں آئے۔ وہ چاروں لڑکے بس اس کے حلیے پر غور کر رہے تھے اور حلیہ واقعی چونکا دینے والا تھا۔ شانی کو اپنے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔ یقیناً قاسم سے ہونے والی دھینگا مشتی میں اس کا ہونٹ پھنسا تھا یا منہ اندر سے زخمی ہوا تھا۔ اس کے بال منتشر تھے اور جسم پر بستر کی چادر تھی۔ پھر جس انداز سے وہ مدد کے لئے کہہ رہی تھی وہ بھی چونکانے والا تھا۔

جب اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تو اس نے جھنجھلا کر ایک لڑکے کو بازو سے پکڑ کر کھینچا اور ساتھ ساتھ عثمانی کے گھر کی جانب اشارہ کیا۔ لڑکائیوں پیچھے ہٹا جیسے وہ اسے اغوا کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

موٹر سائیکل پر بیٹھے جوان سال شخص کی تفتیشی نگاہیں شانی کو سرتاپا گھور رہی تھیں۔

”کون ہیں آپ..... کس گھر سے آئی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ شانی جواب دینے کی کوشش کرتی، اس کی نگاہ دور نیلے رنگ کی ایک جلتی بجھتی روشنی پر پڑی۔ یہ روشنی کوئی نصف فرلانگ دور سڑک کے موڑ پر نمودار ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی..... شانی کی رگوں میں خون سنسناتا تھا۔ یہ پولیس کار کی روشنی تھی..... کیا وہ پولیس کا سامنا کر سکتی ہے؟ یہ سوال ایک تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گیا..... نہیں..... وہ نہیں کر سکتی تھی۔ پولیس کے سامنے آنے کا مطلب تھا۔ وہ سب کے سامنے آ جاتی۔ رنگ والی کے سامنے..... نارپور کے سامنے..... رستم کے سامنے..... اور سب سے بڑھ کر اس پھنکارتی ہوئی کہندہ دشمنی کے سامنے جو درجنوں سروں والے زہریلے اژدھے کی طرح اس کے ارد گرد موجود تھی۔ نارپور کا مہر جی اپنی حویلی میں جل کر مر چکا تھا مگر اس کے وارث تو موجود تھے۔ مہر کے وہ خونریز رشتے دار..... جو دشمنیاں پالنے کی ”خو“ اپنے لبو میں رکھتے تھے اور دشمنیاں چکانے کے ہنر میں یکتا تھے۔

یہ سب کچھ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں شانی کے ذہن میں آیا اور گزر گیا۔ اس کی نگاہ جلتی بجھتی نیلی روشنی پر تھی۔ اس نے کم فہم لڑکوں کو ان کے حال پر چھوڑا اور چند قدم چل کر ایک بغلی گلی میں مڑ گئی۔ یہ گلی تاریکی میں لٹی ہوئی تھی۔ ایک سرد کبر اور دو یو اکر کوڈھانپ رہا تھا۔ اب شانی جلد از جلد دور نکل جانا چاہتی تھی۔ اس کے لڑکھڑاتے قدموں میں تیزی آ گئی۔ ایک کارر یورس گیر میں ایک گیراج سے برآمد ہو رہی تھی۔ وہ اس سے بچتی ہوئی ایک اور سڑک پر مڑ گئی۔ اس کا دل سینے میں پھر پھر ہار رہا تھا۔ سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔

کچھ آگے جا کر اسے یوں لگا کہ دو افراد اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ کون تھے وہ؟ گلی کے کٹڑ پر کھڑے ہوئے لڑکے؟ پولیس والے؟ یا کوئی اور؟ یا پھر شاید یہ اس کا وہ ہم بھی تھا۔ بہر حال اس کے قدموں میں مزید تیزی آ گئی۔ اچانک اسے ایک رکشہ نظر آیا۔ رکشہ سٹارٹ تھا۔ پچھلی نشست خالی دکھائی دے رہی تھی۔ شانی کے پاس سوچ بچار کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ وہ سیدھی پچھلی نشست پر جا بیٹھی۔

رکشہ نے ایک جھٹکا لگایا اور حرکت میں آ گیا۔ رکشے والے نے فوری طور پر یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ اسے کہاں جانا ہے۔ بس جس طرف رکشے کا رخ تھا۔ وہ اسی طرف چلنے لگا۔

سرد ہوا کے جھونکے شانی کے چہرے اور جسم سے ٹکرائے تو اسے اپنے حواس کچھ بہتر ہوتے محسوس ہوئے۔ رکشے کی حرکت اسے بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس حرکت کے ساتھ ساتھ وہ لمحہ بلکہ ایک خوفناک شکنجے سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

تقریباً دو فرلانگ آگے جانے کے بعد رکشے والے نے اپنا رخ تھوڑا سا پھیر کر شانی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا۔ کنپٹیوں سے بال سفید تھے۔ اس نے پنجابی لب و لہجے میں پوچھا۔ ”آپ نے کدھر جانا ہے جی؟“

شانی نے اپنا گلا مسلا اور آواز کو جی الامکان حد تک بلند کرتے ہوئے بولی۔ ”ابھی سیدھے چلتے رہو۔“

”جی کیا کہا آپ نے؟“

”ابھی سیدھے چلتے رہو۔“ شانی نے اپنا جواب دہرایا۔

ابھی تک وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر پائی تھی کہ اسے کدھر جانا ہے۔ ذہن ماؤف تھا اور حالات اس سے بھی زیادہ ماؤف کر دینے والے تھے۔

اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اور کرائے کے بغیر وہ کہیں بھی نہیں جاسکتی تھی۔ بلکہ اصولی طور پر تو وہ اس رکشے میں بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔
 رکشہ کچھ دیر تک سیدھا چلتا رہا، پھر ایک جگہ رک گیا۔ اب تقریباً ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ ایک ٹھٹھری ہوئی تاریکی دھیرے دھیرے لاہور کے گلی کو چوں میں گہری ہو رہی تھی اور ایک طویل رات کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ چاروں طرف ٹریفک کا شور تھا۔ موٹر سائیکلیں، وگنیں، تانگے، کاریں، ہر نوع کی گاڑی اور ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ دھواں دھواں فضا میں یہ لوگ، جیکس، گرم ٹوپیاں اور گرم کپڑے پہنے اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں تھے۔ ہر شخص کی حرکت کسی خاص سمت کی جانب تھی۔ ایک شانی تھی جس کی کوئی سمت نہیں تھی۔

رکشے والے کی آواز نے شانی کو خیالوں سے چونکایا۔ ”جی..... آپ نے بتایا نہیں کس طرف جانا ہے؟“ اس مرتبہ اس کی آواز میں ہلکی سی

خنت تھی۔

”ہم کہاں پر ہیں؟“

”یہ نسبت روڈ ہے جی۔ ہم لکشمی چوک کے سامنے کھڑے ہیں۔“ رکشے والے نے تفصیل فراہم کی۔

دو دھیاروشنیوں والا جگمگاتا ہوا لکشمی چوک کچھ فاصلے پر تھا۔ فلموں کے بڑے بڑے بورڈ دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ ابا جی اور امی کے ساتھ لاہور کی سیر کو آئی تھی تو اس چوک سے انہوں نے کڑا ہی گوشت کھایا تھا۔ چوک کی گہما گہمی اور بڑے بڑے فلمی بورڈوں کی بھرمار نے اسے بڑا حیران کیا تھا۔ آج ایک بار پھر یہ چوک اس کے سامنے تھا لیکن آج کے حالات اور اُن حالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

رکشے والا اس کے جواب کا منتظر تھا۔ شانی نے گہری سانس لیتے ہوئے بے حد بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”دیکھو..... بات یہ ہے کہ میرا اٹیچی یہاں گم ہو گیا ہے۔ اسی میں میرے پیسے تھے اور وہ ایڈریس بھی تھا جہاں مجھے جانا تھا۔ میں اس وقت مشکل میں ہوں..... میں چاہتی ہوں کہ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں میں آج کی رات اطمینان سے گزار سکوں۔ کل میں کسی طرح فون کر کے گوبرخان سے اپنے کسی عزیز کو بلا لوں گی۔“

”جگہ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ رکشے والے نے آپ سے تم پر آتے ہوئے کہا۔

”سنا ہے..... یہاں ایسی جگہ ہیں جہاں عورتیں دو چار دنوں کے لئے حفاظت سے رہ سکتی ہیں۔ انہیں جس طرح کی مدد چاہئے ہوتی ہے

وہ بھی کی جاتی ہے۔“

”شاید تم دارالامان کی بات کر رہی ہو۔“

”میرا خیال ہے یہی نام ہے۔“ شانی نے کہا۔

رکشے والے نے پورا گھوم کر شانی کو سرتاپا گھورا۔ شکل و صورت سے وہ بھلا مانس ہی لگتا تھا۔ عمر بھی چھتہ تھی۔

شانی کا پوری طرح جائزہ لینے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”جس جگہ کی تم بات کر رہی ہو۔ وہاں تم کو ایسے ہی نہیں ڈکھ لیا جائے گا..... سو طرح کے سوال پوچھے جائیں گے۔ پوڑا شجرہ نسب پوچھا جائے گا کہاں سے آئی ہو؟ کیوں آئی ہو..... کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“

رکشے والے نے پھر ایک گہری سانس لی۔ رکشے کا انجن بند کر کے اپنی چھوٹی چھوٹی کھجری داڑھی کھائی اور بولا۔ ”تم مجھ کو کسی اچھے گھر کی لگتی ہو۔ لگتا ہے تم بڑی مصیبت آئی ہوئی ہے۔“

شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر تک شانی کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اگر دارالامان وغیرہ کے چکروں میں پڑو گی تو تمہاری مصیبت اور بھی بڑھ جائے گی۔“

”تو کیا کرنا چاہئے مجھے؟“ شانی نے اپنے گلے سے بمشکل آواز نکالتے ہوئے کہا۔ رکشے والے نے ایک بار پھر مڑ کر شانی کا جائزہ لیا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے داڑھی کھائی اور کہنے لگا۔ ”اگر تم نے کوئی جرم شرم نہیں کیا۔ اور سچ مچ مصیبت میں ہو تو میں تم کو اپنے گھر لے جاسکتا ہوں۔ کم از کم ایک رات تو تم وہاں گزار ہی سکتی ہو۔ وہاں میڑی ماں ہے، بیوی ہے، بیٹی اور بچے ہیں۔“

شانی کو ایک دفعہ پہلے بھی اس طرح کی پیشکش ہوئی تھی اور وہ عثمانی پر اعتبار کر کے اس کے ساتھ چلی آئی تھی لیکن عثمانی کے گھر میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہونے سے رہ گیا تھا وہ ناقابل بیان تھا۔

ایک لمحے کے لئے وہ لرز گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے لاتعداد اندیشے اس کے ذہن میں گھس گئے۔ وہ کہاں جائے گی؟ کیا کرے گی؟ گلی کو چوں میں لاتعداد خطرے ریگ رہے ہیں۔ کوئے کھدروں میں اُن گنت حوادث گھات لگائے بیٹھے ہیں؛ بند دروازوں اور کھڑکیوں والے اس بے مہر شہر میں ایک پہاڑ جیسی رات سر پر ہے..... کسی تاریک کوچے میں کوئی سکندر کوئی کامی اس سے ٹکرا سکتا ہے۔ کسی نامہرباں موٹر پر کوئی پولیس ناکا اس کے لئے وبال جان بن سکتا ہے۔ اس شہر میں نہ جانے کتنے مہرجی اور کتنے اکبرے آسیوں کی طرح چکراتے ہوں گے۔

یہ رکشے والا اس کے پیچھے تو نہیں گیا تھا۔ وہ خود اس کے رکشے میں آکر بیٹھی تھی۔ وہ بھلا مانس بھی لگتا تھا۔ بال بچے دار۔

شانی سوچ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”دیکھو..... تم نے جو بھی فیصلہ کڑنا ہے جلدی کرو..... میٹر اٹیم (وقت) کھوٹا مت کرو۔“

”کہاں ہے تمہارا گھر؟“ شانی نے پوچھا۔

”تھوڑا سا پیچھے جانا پڑے گا۔ زیادہ دُور نہیں ہے۔ پڑا ایک بات ہے مجھے پھر صاف صاف بتا دو۔ کوئی پولیس کا چکر شکر تو نہیں ہے

تمہارا۔ میں گڑبب بندہ ہوں۔ ان جھمیلوں میں نہیں پڑ سکتا۔“

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ شانی نے کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ چلیں گھر؟“

”چلو۔“ شانی نے زور لگا کر اپنی آواز اس کے کانوں تک پہنچاتے ہوئے کہا۔

☆=====☆=====☆

وہ تنگ گلیوں والی ایک نیم پتہ آبادی میں پہنچے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کے اندر سے ٹی وی چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آوارہ کتے بھی

چہل قدمی کرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر رکشے والے نے رکشہ پارک کیا اور شانی کو لے کر ایک دروازے کے سامنے آ گیا۔ باہر سے

بی اندازہ ہو جاتا تھا کہ مکان کا صحن گلی سے نیچا ہے۔ خستہ حال دروازے پر کپڑے کا میلا سا پردہ جھول رہا تھا۔

اس گھر میں بھاری جپے کی ایک صحت مند عورت سے شانی کی ملاقات ہوئی۔ یہ عورت رکشہ والے زکریا کی بیوی جنت بی بی تھی۔ اس نے بڑی تیز نظروں سے سر تا پا شانی کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ شانی کا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ سر شام جس وقت اس نے بدینیت آنٹی ماجدہ کے ساتھ چائے پی تھی۔ اور ڈھیروں کمبل اور چادریں دھو کر فارغ ہوئی تھی۔ دھلائی کے لئے اس نے میلے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہ آنٹی ماجدہ ہی کے کپڑے تھے۔ بعد ازاں قاسم برلاس کے ساتھ دھینکا مشقی کے دوران میں یہ کپڑے بھی ایک دو جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ قاسم برلاس کی گرفت سے نکلنے وقت اس نے افراتفری میں جو جوتی پہنی وہ گھر کا کام کرنے والی ماسی کی تھی۔ بستر کی جو چادر اس کے ہاتھ لگی وہ بھی خستہ حال تھی..... مستزاد یہ کہ شانی کے بال منتشر تھے اور مجموعی حلیہ ابتر ہو رہا تھا۔

رکشے والے زکریا کی بیوی جنت بی بی نے کڑی نظروں سے شوہر کو دیکھا اور پوچھا ”کہاں سے لائے ہو اسے؟“
 زکریا نے بیوی کو آنکھ سے اشارہ کیا اور ایک طرف لے گیا۔ اس دوران میں چودہ پندرہ سال کی ایک لڑکی بھی اس کے قریب آن کھڑی ہوئی اور متحس نظروں سے دیکھنے لگی۔ سات آٹھ سال عمر کے دو میلے کچیلے بچے میڑھیوں پر کھڑے شانی کا ناقدانہ جائزہ لے رہے تھے۔
 کچھ دیر بعد جنت بی بی قدرے تیز قدموں سے شانی کے پاس آئی اور اسے اپنے ساتھ لے کر کمرے میں آ گئی۔ یہاں ڈھیلی چارپائیوں پر کھد کے لحاف پڑے تھے۔ شکستہ فرش پر مومگ پھلی اور گنڈیری کے چھلکے تھے۔ ایک کونے میں پرانے ماڈل کا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی رکھا تھا۔
 جنت بی بی نے دروازہ اندر سے بند کیا اور شانی کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ وہ کھوجی نظروں سے اس کا جائزہ لیتی رہی۔ آخر بولی۔
 ”دیکھو..... تم مجھے اپنی ماں کی طرح سمجھو۔ تم مجھے جو کچھ بھی بتاؤ گی وہ صرف میرے تک ہی رہے گا۔ زکریا تک بھی نہیں پہنچے گا۔ جو بھی اچھی سے اچھی یابری سے بُری بات ہے ہمیں بتا دو۔ ہم جتنے جو گئے بھی ہوئے تمہاری مدد ضرور کریں گے۔“
 شانی خاموش رہی۔ ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔
 جنت نامی یہ عورت کچھ دیر تک شانی کو کریدنے کی ناکام کوشش کرتی رہی پھر تھک سی گئی۔ کہنے لگی ”..... اچھا صرف یہ بتا دو۔ رہتی کہاں ہو تم؟“
 شانی نے اپنے آنسو طوق کے اندر گرائے اور بمشکل بولی۔ ”یہیں ایک گھر میں کچھ دن رہی ہوں.....“ اس کی آواز بے حد پست اور بھرائی ہوئی تھی۔

شانی نے کہا تھا..... یہیں ایک گھر میں کچھ دن رہی ہوں۔

جنت بی بی نے اس فقرے کو یوں سمجھا۔ ”یہیں ایک گھر میں کام کرتی ہوں۔“
 شاید شانی کے حلیے کی وجہ سے جنت بی بی کا ذہن ”کام کرنے“ کی طرف چلا گیا تھا۔ ویسے بھی جو بات ذہن میں ہو وہ نہ ہونے کے باوجود سنائی دے جاتی ہے۔

”گھر میں کام کرتی ہو؟“ وہ ذرا حیرت سے بولی پھر کہنے لگی۔ ”تمہاری شکل و صورت تو کام کرنے والیوں جیسی نہیں لگتی۔“

شانی مسلسل خاموش تھی۔ جنت بی بی چند لمحے تک مترجم نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ تب طویل سانس لے کر رہ گئی۔ ”اللہ کیسے کیسوں پر کیسی کیسی مصیبتیں ڈال دیتا ہے۔“

اتنی دیر میں زکریا کھنکھارتا ہوا اندر آ گیا۔ جنت بی بی نے اسے دیکھ کر اوپر نیچے سر ہلایا اور بڑے دانائینا لہجے میں بولی۔ ”میں سمجھ گئی ہوں۔ سب سمجھ گئی ہوں۔ یہ امیر لوگ گریب بندے کو بندہ تھوڑا ہی سمجھتے ہیں اور گریب عورت تو ان کے لئے جانور ہوتی ہے اور اگر گریب عورت جوان اور سوتلی بھی ہو تو پھر..... اس وچاری کا اللہ ہی حافظ ہے۔ گھر میں کام کرنے والیوں کو یہ امیر زادے خریدی ہوئی چیز سمجھتے ہیں اور ان کی مائیں بہنیں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اندھی گوشتی بن جاتی ہیں۔ ان پر اللہ کی مار ہو..... میں سب سمجھ گئی ہوں۔“

زکریا قدرے حیران ہو کر بولا۔ ”تیرا مطلب ہے کہ یہ کسی گھر میں کام کرائی ہے۔“
”اور نہیں تو کیا۔“

”پر شکل و صورت سے تو.....“

”یہ شکل و صورت ہی تو ہم گریبوں کی دشمن بن جاتی ہے۔“ جنت بی بی نے پورے وثوق سے کہا۔

زکریا کی نگاہیں شانی کی قینچی چپل پر پڑیں اور اس کے خستہ حال کپڑوں سے ہوتی ہوئی منتشر بالوں تک چلی گئی۔ غالباً وہ اپنی بیوی کی اطلاع کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
شانی نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

جنت بی بی نے کہا۔ ”یہ گریب پہلے ہی بہت دکھی ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سوال جواب کر کے اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہئے۔ ابھی یہ سو جائے تو اچھا ہے۔ سویرے سب کچھ پوچھ لیں گے۔“

زکریا نے کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے جنتے! اسے کوئی گولی شولی بھی کھلائی ہے ان لوگوں نے..... دیکھتی نہیں اس کی آنکھیں کتنی لال ہو رہی ہیں؟“
جنتے نے شانی سے پوچھا۔ ”کوئی نشہ والی شے دی ہے انہوں نے تمہیں؟“

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کون تھے وہ؟ گھر کے بندے تھے یا باہر کے؟“ جنتے نے پوچھا۔

شانی خاموش رہی تو وہ اسے پچکار تے ہوئے بولی۔ ”دس نارے بتاتی کیوں نہیں ہم تیرے دشمن نہیں ہیں۔ کون تھے وہ۔ گھر کے تھے یا باہر کے؟“

”بب..... باہر کا بندہ تھا۔“ شانی نے اپنے گلے سے بمشکل الفاظ برآمد کئے۔

”کیا کوئی زبردستی گھر میں گھس آیا تھا؟“ شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کیا کوئی مہمان تھا؟“ شانی نے پھر نفی میں جواب دیا۔ ”کیا گھر والے کا کوئی دوست یا رشتہ تھا؟“ اس مرتبہ شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ پیسہ بندے کو ایک دم شیطان بنا دیتا ہے پپو کے ابا۔“ جنت بولی۔ ”تمہیں یاد ہی ہوگا وہ ہماری گواٹن (پڑوسن) حمیداس کی دیواری تھیا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اقبال ٹاؤن میں ڈاکٹر صاحب کے گھر کام کرتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے دوست نے اپنی گھڑی چوری کرنے کا الزام لگایا اور باورچی خانے میں بے چاری کی عزت خراب کر دی یاد ہے نا تمہیں؟“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

زکریا نے اثبات میں سر کو حرکت دی۔ جنت نے زکریا کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گیا۔ وہ اس کے کچھ اور قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے اس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ شانی نے ”ہوں ہاں“ میں جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے منتشر بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ ”کچ تو گئی ہے ناں تو؟“ شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مارا کتنا تو نہیں ہے تجھے؟“

”تھوڑا سا۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”تیرے ہوٹ (ہونٹ) سے اب بھی خون نکل رہا ہے۔ ٹھہر جا..... میں روٹی پر پنچر لگا کر لاتی ہوں۔“ وہ تیزی سے اٹھی۔ جسم فربہ ہونے کے باوجود وہ پھر تیلی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بڑی محبت سے اس کے خون آلود ہونٹ صاف کر رہی تھی۔ اس دوران میں چودہ پندرہ سال کی لڑکی مریم پلیٹ میں اچار رکھ کر لے آئی۔ بولی۔ ”لے آ پاں! تھوڑا تھوڑا چاٹ اسے۔ تیزی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ مریم زکریا اور جنت کی بیٹی تھی۔ باپ کی طرح وہ بھی (ر) اور (ڑ) میں گڑبڑ کرتی تھی۔ دوسرے بچوں کا بھی یہی حال تھا۔ تاہم جنت کے تلفظ میں یہ خرابی نہیں تھی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

شانی کو اچار کی بوہی سے الرجی تھی۔ اس نے پلیٹ پیچھے کھکا دی۔ جنت نے آنکھ سے اشارہ کیا اور مریم بھی باہر نکل گئی۔ وہ شانی کے ہاتھ اپنے کھر درے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولی۔ ”تیرے ہاتھ دیکھ کر لگتا ہے کہ کام کاج کرتے ہوئے تجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ تیرے ماں باپ ہیں؟“

”نہیں۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

جنت نے افسوس کے انداز میں سر کو جنبش دی پھر بولی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ کسی پنڈی رہنے والی ہے تو۔“

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”کون سا پنڈ ہے؟“

شانی نے اپنے گلے کو مسلتے ہوئے بے حد پست آواز میں کہا۔ ”ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھیں..... مم..... میرا سر گھوم رہا ہے۔ میں کچھ دیر لیٹنا چاہتی ہوں۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”اچھا ٹھیک ہے..... پرسونے سے پہلے تھوڑی سی روٹی کھا لے۔ میں تیرے لئے سالن گرم کر کے دو پھلکیاں پکالاتی ہوں۔“

”نہیں۔“ شانی نے شد و مد سے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے بھوک بالکل نہیں۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کافی بہتر ہے۔ تاہم نچلا ہونٹ سو جا سوا لگ رہا تھا اور جسم کے کئی حصوں میں شدید کچھاؤ تھا۔

جنتے کے دونوں چھوٹے بچے محلے کے ایک سکول میں پڑھنے جاتے تھے، مریم آٹھویں پاس کر کے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جنتے کا ایک بڑا بیٹا بھی تھا۔ وہ ابھی تک شانی کی نظروں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ اچانک شانی کو وہ دو آنکھیں یاد آئیں جو چچ کے دوٹوٹے ہوئے سر کندوں میں سے اسے گھور رہی تھیں۔ پھر ان آنکھوں کے ساتھ ہی ایک فربہ سا جسم اچانک اوجھل ہو گیا تھا۔ کہیں یہ جنتے کا وہی بڑا بیٹا تو نہیں تھا؟ شانی نے سوچا۔ بہر حال یہ سوال اس کی زبان پر نہیں آ سکا۔

بچوں کی سکول سے چھٹی تھی۔ ناشتے کے بعد جنتے ایک بار پھر تسلی سے شانی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ دن کی روشنی میں غور سے شانی کا چہرہ دیکھ کر بولی۔ ”تمہاری شکل سچ مچ اچھی ہے۔ تم نوکرانی کے بجائے مالکن لگتی ہو۔ مجھے پتہ ہے اچھی شکل کی نوکرانیوں سے مالکنیں بڑی چڑکھاتی ہیں۔ یہ بات ہے۔ تمہاری مالکن بھی ڈنڈا لے کر تمہارے پیچھے رہتی ہوگی۔“

شانی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کے بعد جنتے نے پھر سے شانی کا انٹرویو شروع کر دیا۔

وہ جیسے از خود یہ بات طے کر چکی تھی کہ شانی گاؤں سے آنے کے بعد یہاں کسی امیر گھر میں ملازمت کرتی تھی۔ موقع دیکھ کر گھر کے مالک کے دوست نے اس سے زیادتی کی کوشش کی۔ جسے ناکام بنا کر وہ نکل بھاگی۔

جنتے کے طویل سوالات کے جواب میں شانی نے مختصر الفاظ میں دیئے۔ شانی کو یہاں بھی مصلحت آمیز جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے اپنا پورا نام شہناز بتایا اور کہا کہ والدین کی وفات کے بعد اسے روزگار کی تلاش میں اپنی ایک سہیلی کے پاس لاہور آنا پڑا۔ وہ یہاں شاہدرہ میں رہتی تھی۔ شاہدرہ پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ گھر چھوڑ چکی ہے۔ ایک ادھیز عمر شخص اسے اپنی کار میں گھر لے گیا۔ یہاں وہ رہنے لگی اور گھر کا کام کاج کرنے لگی۔ ادھیز عمر شخص کا ایک ملنے والا اکثر گھر میں آتا رہتا تھا۔ اس کی نیت خراب ہو گئی اور کل رات وہ اپنی اصلیت دکھانے پر نکل گیا۔

اس مختصر روداد نے جنتے کو کافی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔ وہ از خود شانی کو گھر یلو ملازمہ کی پہچان دے چکی تھی۔ شانی نے اسی پہچان کے ساتھ رہنا مناسب سمجھا۔ جنتے سے بات کرتے ہوئے اس نے اپنے لب و لہجے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی تاکہ وہ گھر یلو ملازمہ ہی نظر آئے۔

”اب تیرا کیا ارادہ ہے شہناز؟“ جنتے نے پوچھا۔

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ آپ ہی کچھ بتائیں۔“

”دیکھ لو! ان امیر لوگوں سے تمہارا ناتو بالکل بے وقوفی کی بات ہے..... پلس بھی ایسے مالموں میں الٹا ہم گریبوں کی چڑی ہی ادھیزتی ہے۔ بس جو ہو گیا سو ہو گیا۔ پر جو کچھ ہوا ہے اس میں آئندہ کے بارے میں تیرے لئے بڑا چنگا سبق ہے۔“

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔

جنتے بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”ٹوٹا شکل و صورت کی اچھی ہے۔ پہلے تو کوئی سیانی گھر والی تجھے ملازم رکھے گی ہی نہیں۔ اگر کوئی رکھے گی تو اپنے لئے مصیبت بنائے گی اور تیرے لئے بھی۔ میری بات سمجھ رہی ہے ناں۔ یہ مرد ذات کسی کی نہیں ہوتی۔ یہ بس چٹے رنگ چاہتے

ہیں۔ گریب عورت کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے قسائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ میں ساروں کو تو برا نہیں کہتی۔ پرسو میں سے اسی نوے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ باتوں باتوں میں ٹھکر جھاڑتے ہیں۔ کچھ آنکھوں آنکھوں میں عورت کو کھاتے رہتے ہیں اور کچھ ہاتھ چالاک کرتے ہیں۔ جس طرح کل رات ایک شرابی کتے نے تیرے ساتھ کی ہے..... اس کے علاوہ ان مردوں کی ایک قسم اور بھی ہے یہ اوپر سے تو بڑے بھلے مانس اور نیکو کار لگتے ہیں پر اندر سے یہ بھی ندیدے ہوتے ہیں۔ بڑی شرافت سے کسی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب موقع مل جاتا ہے تو ان کا روپ ہی بدل جاتا ہے۔ سات آٹھ سال پہلے مریم کے لہنے کو بخار ہو گیا تھا۔ ان دنوں وہ دیہاڑی پر رکشہ چلاتا تھا۔ رکشہ بند ہوا تو چولہا ٹھنڈا ہو گیا۔ مجبوراً میں نے مریم کے ساتھ گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ کوئی چار سال مجھے یہ مصیبت کاٹنی پڑی۔ ان چار سالوں میں میں نے ان بندوں کے ایسے ایسے روپ دیکھے کہ اللہ مافی۔ خاص طور پر یہ امیروں کے جوان منڈے جو سارا دن گھروں میں کیبل دیکھتے ہیں اور پلنگ توڑتے ہیں بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ نہ کام کرنے والی کی عمر دیکھتے ہیں نہ شکل و صورت نہ کچھ اور..... بس موقع ملا نہیں اور اپنی اصلیت پر آئے نہیں۔ ان میں کچھ چنگے بھی ہوں گے پر میں نے بتایا ہے ناں روپے میں سے چودہ آنے ایسے ہی ہیں۔“

جنتے نے ذرا توقف کر کے سٹیل کے گلاس میں سے چائے کا گرم گھونٹ بھرا اور بولی۔ ”جن دنوں میں کام کرتی تھی، مریم کی عمر بس نو دس سال ہوگی۔ یہ بھی میرے ساتھ ہوتی تھی۔ ملتانویں کی کوٹھی میں چوبیس پچیس سال کا ایک منڈا تھا۔ چنگا قد کاٹھ تھا۔ پورا بھائی لگتا تھا۔ اتنا بھلا مانس کہ بندہ سبھے فرشتہ ہی ہے۔ بولتا بھی کم تھا۔ نظر ہر وقت فرش پر ہوتی تھی لیکن ایک دن میری مریم کو لے کر کمرے میں گھس گیا۔ وہ تو میری قسمت چنگی تھی۔ میں بازار سے جلدی واپس آ گئی۔ مریم کے رونے کی آواز سن کر میں نے واویلا کیا اور میری گڑی کی جان چھوٹی۔ اگلے دن میں نے وہ گھر چھوڑ دیا..... اب اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات میں تمہیں بتاؤں؟“ جنتے نے شانی سے پوچھا۔

”جی!“

”ملتانویں کے اسی خبیث منڈے نے چند مہینے بعد ایک اور نوکرانی کو پکڑا پتا ہے اس کی عمر کتنی تھی؟“

”کتنی؟“

”کوئی چالیس سال، رفیق کھوتی ریڑھی والے کی بیوی ہے۔ ہمارے پچھواڑے رہتی ہے۔ کالی سیاہ ہے۔ نہ منہ نہ متھا..... بس ذرا اپنے آپ کو کس کے رکھتی ہے۔ اس کی قسمت بھی چنگی تھی کہ ٹائم پر کوئی آگیا اور معاملہ ٹل گیا..... اب تم ہی بتاؤ ایک طرف دس سال کی بچی اور دوسری طرف چالیس سال کی مائی۔“

شرانی شاک کی سی کیفیت میں بیٹھی سنتی رہی۔ ایسی گفتگو سے کبھی اس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس طرح کے ایک دو مزید واقعات سنانے کے بعد جنتے بولی۔

”میں تو تجھے یہ مشورہ بالکل نہیں دوں گی کہ تو کسی اور گھر میں کام کرے۔ اگر تو اپنے کسی رشتے دار کے پاس واپس گوجر خان جانا چاہتی ہے تو چلی جا..... اور اگر نہیں جانا چاہتی تو پھر ادھر ہی میرے پاس رہ لے۔ میں اور مریم یہاں گھر میں لفافے بناتے ہیں۔ آسان سا کام ہے۔“

دیہاڑی میں پانچ چھ گھنٹے بھی لگ جائیں تو پچیس تیس روپے بن جاتے ہیں۔ رقم بھی گھر بیٹھ مل جاتی ہے۔ تو اپنا بوجھ بڑے آرام سے خود ہی اٹھا لے گی۔ باقی اصل فیصلہ تو ٹوٹنے ہی کرنا ہے۔ تسلی سے سوچ سمجھ لے۔“

شانی کا دل چاہتا تھا کہ اسے کہیں سے اخبار ملے۔ اس کے دل میں یہ خدشہ موجود تھا کہ کل رات والے واقعے کے حوالے سے کوئی خبر اخبار میں موجود ہوگی۔ وہ کل رات نوبے کے قریب عثمانی کی منخوس چار دیواری سے نکل آئی تھی۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ عثمانی اور ماجدہ گھر واپس آ گئے ہوں۔ یا پھر کسی مہمان نے ہی آکر افشاں کی جان قاسم برلاس سے چھڑادی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ افشاں کسی طرح جدوجہد کر کے خود ہی اس لعنتی سٹور روم سے نکل آئی ہو اور اس نے شور مچا دیا ہو۔ کئی امکانات تھے۔

شانی سوچتی رہی اور لیٹی رہی۔ اچانک ایک بار پھر اسے وہی احساس ہوا جو آج صبح سویرے ہوا تھا۔ کہیں سے دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے چونک کر چت کی طرف دیکھا۔ رگوں میں لہو سنسنا گیا۔ آنکھیں موجود تھیں۔ کالے رنگ کی بڑی بڑی آنکھیں سرکنڈوں کے خلا میں سے وہ صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔

صبح تو جونہی شانی نے دیکھا تھا، آنکھیں اوجھل ہو گئی تھیں مگر اب وہ اوجھل نہیں ہوئیں۔ شانی گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور سینے پر دو پٹا درست کیا۔ جب وہ اٹھی تو آنکھیں اوجھل ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی چت پر ایک فربہ سی پرچھائیں لہرا کر غائب ہو گئی۔ شانی نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

اتنے میں جتنے اندر داخل ہوئی۔ ”کیا بات ہے دھیے؟“

”ادھر..... ادھر کوئی تھاماسی چت میں سے دیکھ رہا تھا۔ مم..... میں اٹھی تو ایک دم بھاگ گیا۔“

”ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے گھر میں..... بس میرا اوڈا پتر گلابا ہے۔ وہ اوپر چوبارے میں بیٹھا ہے۔“

”کک..... کہیں وہی تو نہیں تھا؟“

”نہیں کڑیے۔ وہ تو بڑا سیدھا سادہ ہے۔ بس سمجھ اللہ میاں کی گائے ہے اور اتنا نیک ہے کہ تمہیں کیا بتاؤں؟ جب چھٹی ہو تو سارا دن تکیہ

شاہ جی میں بیٹھا رہتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب بھی وہیں سے آیا ہے۔“

اتنے میں جتنے کا چھوٹا بیٹا گڈوناک سے سوسوں کرتا اندر آیا۔ بولا۔ ”امی! بھاپو چتا ہے میڑا لال لنگوٹ کہاں ہے؟“

”وہ اوپر تار پر لٹکا ہوا ہے میں نے سوکھنے کے لئے۔ جاتا کر دے دے اسے۔“ گڈو چلا گیا تو جتنے کہنے لگی۔ ”یہ لال لنگوٹ گلابے کو

اس کے استاد نے انعام میں دیا تھا۔ جان سے لگا کر رکھتا ہے اور اس لنگوٹ میں کرامات بھی بڑی ہیں۔ جس کشتی میں گلابا یہ لنگوٹ پہنتا ہے جیت جاتا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے دینے گو جگر کے منڈے کو ہرا کر پورا بارہ سو روپیہ انعام لیا ہے اس نے۔“

”آپ..... کا بیٹا کشتیاں کرتا ہے؟“

”کوئی ایسی ویسی کشتیاں..... سیالکوٹی پہلوان استاد برکت کا پٹھا ہے میرا پتر۔“

”کوئی کام شام بھی کرتے ہیں وہ؟“

”گول چکروالے بازار میں گلابے کی اچار اور مربوں کی دکان تھی۔ آج کل وہ ذرا اچھے علاقے میں دکان ڈھونڈ رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہفتے دس دن میں مل جائے گی پھر سویرے کا گیا شام کو ہی آیا کرے گا۔“

ایک دم وہ چونک کر بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ ویٹرے میں ہے۔ میں اسے بلاتی ہوں۔“

اس نے داخلی دروازے کی طرف دیکھ کر آواز دی۔ ”گلابے..... گلابے..... ادھر دیکھ کون آیا ہے۔“

شانی نے سر پر اوڑھنی درست کر لی۔ کچھ دیر بعد وہ کھنکھارتا ہوا اندر آ گیا۔ شانی نے دیکھا وہ واقعی پہلوانوں جیسا تھا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال، منہ گول، گردن موٹی اور جشہ بھاری۔ اس نے آنکھوں میں خوب کھینچ کر سرمہ لگایا ہوا تھا۔ چہرے سے حماقت ٹپکتی تھی اور اسے دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ اس میں ذہنی طور پر کچھ کمی ہے۔ باقی جسم کے مقابلے میں اس کا سر بھی چھوٹا تھا۔ نچلا ہونٹ لٹکا ہوا تھا اور اس میں رال کی چمک نظر آرہی تھی۔

جتنے تعارف کرتے ہوئے بولی۔ ”گلابے! یہ شہناز ہے۔ کل رات تیرے لبے کے ساتھ آئی ہے۔ بڑی چنگی گڑی ہے۔ بے آسرا بھی ہے وچاری۔ میں تو اس سے یہی کہہ رہی ہوں کہ ہمارے گھر رہ لے۔“

”سلاماں لیکم جی۔“ گلابے نے عجیب بے ڈھنگی آواز میں کہا۔
”ولیکم السلام۔“ شانی اتنا ہی کہہ سکی۔

اس دوران میں اس کی نگاہ گلابے کی نگاہ سے ملی۔ آنکھیں جانی پہچانی محسوس ہوئیں۔ ایک دم شانی کو پتا چلا کہ یہی آنکھیں تھیں جو پُر اسرار انداز میں اسے جتن کے پیچھے سے گھورتی تھیں۔ کالی سیاہ اور پھیلی ہوئی سی آنکھیں۔

وہ شانی کو ہونٹوں کی طرح دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ تمہاڑا جب تک جی چاہے۔ یہاں آڑام سے رہو۔ ہمارے گھر میں تینوں ٹیم اچھا کھانا پکتا ہے۔ اتواڑ کی اتواڑا باسب کو سیر کڑانے باغ یا نہر پڑ بھی لے کر جاتا ہے۔“

فقہہ ختم کر کے اس نے گینڈے کی طرح گردن ہلائی اور بتیسی کی نمائش کی۔
”اچھا“ ٹو اب جا۔ بازار سے سبزی لے آ۔“

”آج گھر میں اتنی چنگی پڑونی آئی ہے۔ مڑخی شروخی پکا لے امی۔ بابے کڑیے کی دکان پر بڑی پھل مڑغیاں آئی ہوئی ہیں۔ ایک دم گوری جی۔“ فقہہ ختم کر کے وہ گنواروں کی طرح زور سے ہنسا، جیسے کوئی بڑی پڑمراحت بات کہہ ڈالی ہو۔

”اچھا جا جو مرضی لے آ۔ وہاں پڑچھتی سے پیسے لے لے۔“
گلابے کے جانے کے بعد جتنے بولی۔ ”دل کا بڑا چنگا ہے گلابا۔ دماغ بھی تیز ہے اس کا۔ دیکھنے میں سیدھا سادہ لگتا ہے پر کئی دفعہ اتنے

پتے کی بات کہتا ہے ہم سارے حیران رہ جاتے ہیں۔“

”جی۔“ شانی نے ہنکارا بھرا۔

”مختی اتنا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ جس کام پر لگ گیا، بس لگ گیا۔ تن من کا ہوش نہیں رہتا اسے۔ مر بہ بنانا اس کے چاہے بہشتی نے سکھایا تھا اسے۔ ایسا مر بہ بنانا ہے کہ بس کمال کر دیتا ہے۔“

جتنے کچھ دیر تک اپنے منجھوٹا الحواس بیٹے کی تعریفیں کرتی رہی پھر گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ بچے مختصر سے گھر میں کھیلنے کودنے اور اودھم مچانے لگے۔ پڑوس کی دو تین عورتیں بھی گھر میں آئیں۔ ایک خواجہ فروش کی بیوی تھی۔ ایک چڑا سی مشتاق کی بہن۔ ایک نذیر سبزی والے کی ماں۔۔۔۔۔ جتنے ان کے ساتھ سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہی۔ یقیناً انہیں شانی کی کہانی سے آگاہ کرتی رہی ہوگی۔ شانی نے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سلام دعا کے بعد پچھلے کمرے میں بیٹھی رہی۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی تنگ سی گلی میں کھلتی تھی۔ گلی میں بچے گولیاں کھیل رہے تھے۔ عورتیں ایک دوسرے کو مردانہ گالیاں دے رہی تھیں اور مرغیاں گندی نالیوں میں سے خوراک نکال کر کھا رہی تھیں۔

اس نیم کچی اور نیم پختہ بستی میں شانی زندگی کا ایک بالکل مختلف روپ دیکھ رہی تھی۔ یہ روپ متوجہ کرنے والا تھا لیکن شانی کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں تو مسلسل عثمانی کے گھر کی فلم چل رہی تھی۔

اگلے چوبیس گھنٹے بھی اسی طرح گزر گئے۔ شانی کمرہ نشین رہی۔ وہ جانتی تھی اڑوس پڑوس کے لوگ اس کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ طرح طرح کی مریج مسالے والی قیاس آرائیاں بھی جاری تھیں۔ بہر طور یہ سب کچھ آس پاس کے چند گھروں تک محدود تھا۔

☆=====☆=====☆

من و سلویٰ (معاشرتی رومانی ناول)

من و سلویٰ آپ کی پسندیدہ مصنفہ عمیرہ احمد کی ایک نہایت عمدہ تحریر ہے جو انہوں نے حرام، حلال رزق کے حصول جیسے اہم موضوع پر تحریر کی ہے۔ ہمارے معاشرے میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو اپنی روزی کمانے کے لئے رزق حلال کا راستہ چنتے ہیں اور دوسرے وہ جو کامیاب ہونے کے لئے شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتے ہیں اور حرام ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ اس ناول میں مصنفہ نے جائز اور ناجائز کا فرق بہت خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ حلال کی کمائی ہمیں برائی پر جانے سے روکتی رہتی ہے اور حرام کا ایک لقمہ بھی اگر ہمارے خون میں شامل ہو جائے تو وہ کس طرح ہمیں بربادی کے کنارے لے جاتا ہے۔ **عمیرہ احمد** کے یہ ناول کتاب گھر کے **معاشرتی رومانی ناول** سیکشن میں دستیاب ہے۔

یہ اگلے روز شام کی بات ہے۔ نذیر سبزی والے کا پندرہ سالہ بیٹا اپنے گھر کی دہلیز پر لٹوے کے جو گرہنے بیٹھا تھا۔ اس کے کانوں پر سستا سا ہیڈ فون نظر آ رہا تھا۔ غالباً کوئی شوخ و شنگ انڈین گانا سنتے ہوئے وہ ہولے ہولے سر بھی ہلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اور کام بھی کر رہا تھا۔ صبح کا باسی اخبار اس کے سامنے تھا اور وہ اس میں فلموں اور ڈراموں کے اشتہار بھی ملاحظہ کر رہا تھا۔

اخبار دیکھ کر فوراً شانی کا اندرونی تجسس جاگ اٹھا۔ اس نے گڈو سے کہا۔ ”ایک کام کرو گے؟“

”کہو آپاں۔“

وہ کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اس لڑکے سے دو منٹ کے لئے اخبار تو لے کر آؤ۔“

”میں لاتا ہوں۔“ اس نے کہا اور فرائے سے باہر نکل گیا۔

ایک منٹ بعد وہ اخبار پھڑ پھڑاتا ہوا واپس آ گیا۔

اخبار آج کا ہی تھا۔ مگر مزہ اترتا تھا اور اس پر تیل کے دھبے تھے۔ شانی نے دھڑکتے دل کے ساتھ صفحے الٹنے شروع کئے۔ پچھلے صفحے پر ایک دوکالی خبر نے اچانک شانی کی نگاہوں کو جکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری حیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی ہیں۔ وہ پتھر کا بت بنی بیٹھی رہ گئی۔ خبر یوں تھی۔

”افشاں عثمانی کی موت دم گھٹنے کی وجہ سے ہوئی۔“

سرخ کی نیچے متن اس طرح تھا۔ ”افشاں عثمانی قتل کیس کی کچھ اور تفصیلات سامنے آئی ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق سر پر زخم گہرا تھا مگر موت کی اصل وجہ دم گھٹنا ہے۔ لگتا ہے کہ قاتل نے زیادہ عرصے تک مقتول کا منہ دبائے رکھا..... اس کی سانس بند ہو گئی اور دماغ کو آکسیجن نہ ملنے کے سبب موت واقع ہوئی۔ پولیس ذرائع کے مطابق یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ مقتول کی حالت غیر ہونے کے بعد قاتل یا قاتلوں نے اس کی جان بچانے کی اپنی سی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ ایک دو ہومیو پیتھک میڈیسن بھی جائے واردات سے ملی ہیں بہر حال ابھی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ موقع واردات سے جو ایک دو شاہد ملے ہیں وہ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قاتل یا قاتلوں کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔“

ایک باکس میں اس حوالے سے ایک دوسری خبر اس طرح تھی۔ ”افشاں قتل کیس کے نامزد ملزم قاسم برلاس نے رات گئے از خود تھانے میں پیش ہو کر گرفتاری دے دی۔ قاسم برلاس کا کہنا ہے کہ اسے زیادتی اور قتل کے اس واقعے میں بدینتی کی بنا پر ملوث کیا جا رہا تھا۔ وقت ثابت کر دے گا کہ اس کا کوئی گناہ ہے تو وہ صرف یہ کہ وہ حکام بالا کی ہدایت پر ریاض عثمانی کے کیس کی محکمانہ انکوائری کر رہا تھا۔

مزید براس پتا چلا ہے کہ مقتول افشاں کے والد ریاض عثمانی جن پر کل دو پہر دل کا شدید دورہ پڑا تھا ابھی تک شیخ زائد ہسپتال کے کارڈیالوجی وارڈ میں ہیں اور انہیں انہنیائی نگہداشت میں رکھا گیا ہے۔“

شانی کی نگاہیں اخبار کے صفحے پر تھیں اور دل و دماغ میں زلزلہ برپا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ اس کے

ذہن میں وہ مناظر گھوم گئے جب اس نے افشاں کو دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور کندے پر شرپریگ جھول رہے تھے۔ وہ اپنی امی اور ڈیڈی کو آوازیں دیتی ہوئی اندر آئی تھی۔ اس کی آواز میں ”ایک سر پرانز دینے والا“ مخصوص جوش تھا۔ اس وقت اس بد قسمت کو کیا پتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری قدم اٹھا کر ایک قتل گاہ میں داخل ہو رہی ہے۔

شانی کا دماغ پختہ نہ تھا۔ اس نے تصور کی نگاہ سے ناتواں بے کس افشاں کو ایک پاگل ریچھ کے پنجوں میں دیکھا۔ اس کے آخری لمحات کے کرب نے شانی کا دل ریزہ ریزہ کر دیا۔ اسے لگا کہ اس کا دماغ شدت غم سے پھٹ جائے گا اور وہ یہیں بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔

”کیا بات ہے آپاں؟“ گڈو کی معصوم آواز نے اسے چونکایا۔

”نن..... نہیں کچھ بھی نہیں۔“ شانی بوکھلا کر بولی۔

اس نے جلدی جلدی یونہی ایک دو صفحات پلٹے اور اخبار گڈو کو واپس دیتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ..... دے آؤ۔“

گڈو جس طرح آیا تھا۔ اسی طرح اخبار لہراتا ہوا فرارے سے باہر نکل گیا۔

شانی کا دل بھرا ہوا تھا۔ آتش سیال آنکھوں سے نکلنا چاہتا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے نیچے ڈھلوان چھت والے تنگ باتھر روم میں گھس گئی۔ اس نے پلاسٹک کی مٹی کی پالی میں نکلا کھلا چھوڑا اور بچکیوں سے رونے لگی۔ افشاں سے اس کی ملاقات بس ایک ہی بار ہوئی تھی۔ پھر بھی وہ اس کی المناک موت کا غم دل کی اتھاہ گہرائیوں میں محسوس کر رہی تھی۔ اس غم میں کسی حد تک پچھتاوے کا عنصر بھی شامل تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ شاید..... شاید وہ تھوڑی سی کوشش مزید کرتی تو کسی طرح افشاں کی جان بچنے کا وسیلہ پیدا ہو جاتا لیکن..... وہ کیسے کرتی؟ کیونکر کرتی؟ وہ تو خود نیم دیوانی ہو رہی تھی۔ نشہ آور دوانے دماغ کے ساتھ ساتھ اس کا گلابھی یوں جکڑ لیا تھا کہ وہ اپنی آواز خود نہیں سن سکتی تھی۔

وہ روتی رہی اور اس کے دل میں اس بے مہر رات کا نوحہ گونجتا رہا جب اپنے دام میں خود صیاد آ گیا تھا۔

کافی دیر بعد وہ خود کو سنبھال سکی۔ اس نے منہ باتھ دھویا اور باہر نکل آئی۔ جتنے اور مریم کمرے میں بیٹھی لفافے بنا رہی تھیں۔ گلابا کو ٹھکے کی دھوپ میں بیٹھا تھا اور اپنے بازوؤں پر سرسوں کے تیل کی مالش کر رہا تھا۔ شانی کمرے میں چلی آئی..... اچھی طرح جانتی تھی کہ افشاں کا مجرم کون ہے۔ وہ اس سانچے کے ہر ہر لمحے کی شاہد تھی۔ اسے کیا کرنا چاہئے؟ کیا کرنا چاہئے؟ اس نے بے حد کرب کے عالم میں سوچا۔

اخباری خبر سے اس بات کا اشارہ ملتا تھا کہ افشاں کی موت واقع ہو جانے کے بعد سفاک قاسم نے تفتیش کو بھڑکانے کی کوشش کی ہے..... غالباً افشاں کی موت کے بعد بھی ”افشاں کے والدین کا دیا ہوا“ کافی وقت اس کے پاس موجود تھا..... اس وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی موجودگی کے شواہد وہاں سے مٹائے تھے اور موقع واردات پر کچھ ایسا رد و بدل کیا تھا کہ کیس خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے جان بوجھ کر وہاں کچھ ایسے شواہد چھوڑے ہوں جن کے سبب تفتیش کاروں کا دھیان بھٹک گیا ہو۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر خبر میں صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والے افراد کا ذکر کیوں تھا؟

شانی کا دل چاہنے لگا کہ وہ پچھلے دن کا اخبار دیکھ سکے۔ مگر وہ کہاں سے ڈھونڈا جاتا۔ وہ گھر والوں کو کسی طرح کے شبہ میں مبتلا کرنا نہیں

چاہتی تھی۔ کل کے اخبار میں نہ جانے کیا لکھا تھا۔ یقینی بات تھی کہ خبر میں اس علاقے کا ذکر بھی ہوگا جہاں یہ بہیمانہ واردات ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں خود شانی کا ذکر ہونا بھی بعید از قیاس نہیں تھا۔ خبر میں یہ مذکور ہو سکتا تھا کہ موقع واردات سے ایک لڑکی غائب ہوئی ہے جو عثمانی کے گھر میں مقیم تھی۔ اب اگر یہ ساری خبر رکتھ ڈرائیورز کی نظر سے گزرتی تو اس کا سارا دھیان کس طرف جاتا؟ یقیناً اس کا ذہن پرسوں رات والے واقعے کی طرف منتقل ہو جاتا جب شانی بدحواسی کے عالم میں اس رکتھ میں آ بیٹھی تھی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتا تھا کہ شانی ہی وہ لڑکی ہے جو پرسوں رات موقع واردات سے اوجھل ہوئی ہے۔

وہ دل کی گہرائی سے یہ دعا کرنے لگی کہ کل یہ خبر زکریا کی نظر سے نہ گزری ہو۔ نہ ہی کسی اور ایسے شخص کی نظر سے گزری ہو جو ”افشاں کے قتل“ اور ”شانہ کی یہاں موجودگی“ میں ربط ڈھونڈ سکتا ہو۔

افشاں کی دردناک موت کا غم کچھ اس طرح سے شانی کے ذہن پر سوار ہوا کہ وہ اگلے دو روز میں کوشش کے باوجود اس بوجھ سے چھٹکارا نہیں پاسکی۔ ہر گھڑی افشاں کے آخری لمحات کی بے بسی اور اذیت کا تصور اس کے ذہن میں موجود رہتا تھا۔ اگر معروضی انداز میں دیکھا جاتا تو افشاں کی موت مکافات عمل کے نتیجے میں واقع ہوئی۔ وہ ایک ایسے والدین کی بیٹی کی موت تھی جنہوں نے شانی کو پناہ دے کر برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ شانی کو اس موت کا بہت غم نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن وہ منفرد لڑکی تھی۔ وہ زخم کھا کر مسکرانے اور پتھر کھا کر پھول پیش کرنے کا میلان رکھتی تھی۔ وہ بدترین دشمنوں سے بھی نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ ایسا کرنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔

اس کے دل میں بار بار یہ خواہش سر اٹھاتی تھی کہ وہ مظلوم افشاں کے قاتل کے خلاف اپنی گواہی پیش کرے۔ اس کے ابا جی کہا کرتے تھے۔ گواہی ایک امانت ہوتی ہے۔ جو یہ امانت اپنے پاس رکھتا ہے وہ بددیانتی کرتا ہے۔ مگر وہ اس بددیانتی سے کیسے بچ سکتی تھی۔ اس کے حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ منظر عام پر آ سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو دشمنی اور عداوت کا وہ سارا میکینزم پھر حرکت میں آ جاتا جو اس سے پہلے شانی کو خون کے آنسوؤں لا چکا تھا۔ قانون کی مدد کرنے کی خواہش میں وہ اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی تھی۔

”کیا میں پس پردہ رہتے ہوئے کچھ کر سکتی ہوں؟“ شانی نے اپنے آپ سے سوال پوچھا۔ ”کوئی گمنام ٹیلی فون؟ کوئی خط؟ کیا ایسا ممکن ہے؟“

وہ متعلقہ ایس ایچ او یا کسی اعلیٰ مقامی پولیس افسر کو تفصیلی خط لکھ سکتی تھی بلکہ اس خط کی کچھ کاپیاں اخبارات کے دفاتر میں بھیجی جاسکتی تھیں۔ یقیناً اس کی تحریر کو زبردست اہمیت دی جاتی۔ وہ اس واردات کی اکلوتی چشم دید گواہ تھی۔ بلکہ قاتل کے خلاف مدعی بھی تھی۔ پھر سچائی کی اپنی طاقت بھی ہوتی ہے۔ وہ سیدھی دل پر اثر کرتی ہے۔ مگر کیا اس کے گمنام بیان کی کوئی قانونی حیثیت بھی ہوگی؟..... اس نے اپنے ابا جی اور تایا مصوم سے سن رکھا تھا کہ اس طرح کے بیان دینے کے لئے تفتیشی افسر کے سامنے آنا ضروری ہوتا ہے۔

وہ اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہی۔ آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے ایک خط ضرور لکھنا چاہئے..... وہ یہ خط لاہور کے کسی دوسرے علاقے سے جاکر پوسٹ کر سکتی تھی۔ کچھ اور نہ بھی ہوتا تو اس خط سے پولیس کو تفتیش میں مدد تو مل جاتی۔

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ آس پاس کوئی موجود ہے۔ اس نے چونک کر چق کی طرف دیکھا اور شپٹا گئی۔ ٹوٹے ہوئے سرکنڈوں میں کالی آنکھیں موجود تھیں۔ وہ اپنے دھیان میں مگن بے ترتیب لیٹی تھی۔ لباس بھی اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ جلدی سے اٹھ کر اس نے اوڑھنی سنبھالی اور جسم ڈھانپا۔ اس کا خیال تھا کہ کالی آنکھیں حسب سابق غائب ہو جائیں گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ چق میں حرکت پیدا ہوئی اور جھٹنے کا اول جلول بیٹا اندر آ گیا۔ ”سلاماں لیکم“ اس نے بے ڈھنگی آواز میں کہا۔

شانی نے ہونٹوں کی خاموش جنبش سے جواب دیا۔

گلابے کے ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا۔ لفافے پر لگی ہوئی چکنائی ظاہر کرتی تھی کہ اس میں کوئی کھانے کی شے ہے۔ گلابے نے اپنی سرمہ لگی آنکھوں کو شتابی سے دائیں بائیں گھمایا۔ جیسے جاننا چاہتا ہو کہ کوئی اور تو دیکھ نہیں رہا ہے۔ پھر وہ تیزی سے شانی کی چارپائی پر اس سے بمشکل ایک فٹ کی دوری پر بیٹھ گیا۔ اس کے فربہ جسم سے سروس کے تیل کی بو آرہی تھی۔ آنکھیں مڑکا کر بولا۔

”دیکھ شہناز! میں تیزے لئے گرم گرم جلیب لایا ہوں۔“

”ماسی کہاں ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”وہ ہانڈی لینے گئی ہے۔“ گلابے کے لہجے میں دبی دبی مسرت تھی۔

”میں جلیبی نہیں کھاتی۔“

”اوئے دیکھ تو سہی چکھ کے۔“ گلابے نے ایک جلیبی زبردستی اس کے ہاتھ میں تھادی۔

شانی نے ذرا سی چکھ کر واپس رکھ دی۔

”تجھے اوڑکون سی شے زیادہ چنگی لگتی ہے؟“ گلابے نے رازداری سے پوچھا۔

”میں مٹھائی کھاتی ہی نہیں۔“

”اچھا..... میں تیزے لئے کل گاڑ کا مڑبہ بناؤں گا۔“ شانی خاموش رہی۔ وہ چونک کر بولا۔ ”اوہو..... گاڑ کا مڑبہ بھی تو میٹھا ہوتا ہے۔“

میں سمجھ گیا تو نمک والی شے کھاتی ہے۔ گجی بات ہے کہ نمکین مجھے بھی بڑا پسند ہے۔ لون (نمک) والی مونگ پھلی پستہ..... تلے ہوئے بادام..... ایسی بہت ساڑی چیزیں میں نے اوڑا اپنے چو باڑے میں پوگڈو سے بچا کڑ رکھی ہوئی ہیں۔“ وہ باتیں کرتے ہوئے مسلسل شانی کے جسم کو لپٹائی نظروں سے دیکھ رہا تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں سے رال بہہ رہی ہے۔ سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ رازداری سے کہنے لگا۔ ”تورات کو میڑے پاس چو باڑے میں آیا کڑ۔ میں تجھے برا (بڑا) مزہ کڑاؤں گا۔“

اپنی دانست میں وہ شانی پر بڑے مضبوط ڈورے ڈال رہا تھا۔

اتنے میں دروازے کی طرف سے پو اور گڈو کی آواز آئی۔ وہ سکول سے واپس آرہے تھے۔ وہ اپنی دھوئی سنبھال کر جلدی سے اٹھتے

ہوئے بولا۔ ”میں امی سے بھی کہہ دوں گا۔ تجھ سے زیادہ کام نہ کڑا یا کڑے۔ بس ٹو نہادھو کڑاڑا م سے بیٹھا کڑ۔ یا لفافے شفا فے بنا لیا کڑ۔“

وہ چلا گیا تو پوپا اور گڈواندر آ گئے۔ پوپا میں بڑا تھا مگر دیکھنے میں گڈو بڑا لگتا تھا۔ دونوں کو پڑھائی سے زیادہ گولیاں کھیلنے اور کبوتر اڑانے کا شوق تھا۔ چھوٹی سی عمر میں ہی وہ ایسی فصیح و بلیغ گالیاں سیکھ گئے تھے کہ سن کر شانی کے کان جل جاتے تھے۔ غالباً یہ ہنر بچوں کو اپنے باپ سے ملتا تھا۔ زکریا بظاہر مزاج کا دھیمہ تھا مگر گالیاں گھڑنے اور ڈلیور کرنے میں اسے بھی کمال حاصل تھا۔

رات کو شانی نے پوپا کے بستے میں سے کاپی سائز کے چار کاغذ لئے اور ایک قلم بھی خاموشی سے نکال لیا۔ پوپا اور گڈو سو چکے تھے۔ دائیں طرف مریم کی چار پائی تھی۔ اس کے سانس کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ دن بھر لفافے بنانے کے بعد بے سدھ سو رہی ہے۔ شانی اس کھڑکی کے پاس آ بیٹھی جو برآمدے کی طرف کھلتی تھی۔ اس نے پٹ واکے تو برآمدے کے بلب کی مدھم روشنی اندر تک آنے لگی۔ اس روشنی میں شانی نے خط لکھنا شروع کیا۔

یہ ایک تفصیلی خط تھا۔ خط کے آغاز میں شانی نے لکھا۔ ”..... میں وہی لڑکی ہوں جو واردات کی رات عثمانی کے گھر سے غائب ہوئی۔ اپنی کچھ ناگزیر مجبوریوں کے سبب میں سامنے نہیں آ سکتی..... اور نہ ہی آئندہ آؤں گی۔ بہر حال جو کچھ میں واردات کے حوالے سے آپ کو لکھ رہی ہوں وہ حرف بحرف درست ہے۔“

اس تمہید کے بعد شانی نے واردات کی رات پیش آنے والے سارے واقعات پوری صداقت اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیئے۔ کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھا۔ اس کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ عثمانی کی کمینگی اور ماجدہ کی منافقت کے بارے میں بھی سب کچھ لکھ ڈالے مگر پھر اس نے اپنا قلم روک لیا۔ ان کے کئے کی سزا انہیں خوب مل رہی تھی۔ عثمانی ہارٹ ایک کا شکار ہو کر ہسپتال میں تھا اور یقیناً ماجدہ بھی دن میں کئی بار مر کر جیتی ہوگی۔ خط مکمل کرنے کے بعد شانی نے اسے تکیے کے غلاف میں سنبھال کر رکھا اور پوسٹ کرنے کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ خط ”پوسٹ کرنے“ کے حوالے سے وہ کس نئی افتاد کا شکار ہونے والی ہے

☆=====☆=====☆

ظلمت کدہ

ظلمت کدہ کہانی ہے ایک ایسے چور کی جو ایک رات واردات کرنے کے بعد پولیس سے بچنے کے لئے ایک ایسے مکان

میں جا کر چھپ جاتا ہے جو کہ آسیب زدہ ہے اور پھر اُسے وہاں جس قسم کے ہولناک حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُس کے بارے میں پڑھ کر قارئین خوف سے تھرا اُٹھتے ہیں۔ ایم۔ اے۔ عظیم نے اس ناول کو اتنی خوبصورتی سے لکھا ہے کہ قاری آخر تک اُس ظلمت کدہ کے طلسم سے باہر نہیں نکل پاتا۔ حیرت انگیز اور خوفناک واقعات سے بھرپور اس کتاب کو آپ **کتاب گھر کے ناول سیکشن** میں پڑھ سکتے ہیں۔

تیسرے روز دو پہر کو جب گلابا سوراہا تھا اور جنتے بچوں کے لئے دو چار کپڑے لینے بازار گئی ہوئی تھی، شانی گھر سے نکل آئی۔ اس نے مریم کو بتایا تھا کہ وہ شاہدرہ میں اپنی سہیلی کا گھر ڈھونڈنے جا رہی ہے۔ پچھلے سات آٹھ دنوں میں وہ جنتے کے کہنے پر تھوڑے تھوڑے لفافے بناتی رہی تھی۔ کل جنتے کو لفافوں کا معاوضہ ملا تھا اور اس میں سے ایک سو پندرہ روپے اس نے حوصلہ افزائی کے طور پر شانی کو دے دیئے تھے۔ اب یہ ایک سو پندرہ روپے شانی کے پاس موجود تھے اور وہ خط بھی جو اس نے لکھا تھا۔

جنتے کی ایک سوتی چادر میں لپیٹی پٹائی وہ بستی سے باہر نکلے۔ پاؤں میں وہی قینچی چپل تھی جو اس نے عثمانی کے گھر سے بھاگتے ہوئے پہنی تھی۔ پہلے اس نے ایک جنرل سنور سے خط کی پانچ فوٹو سٹیٹ کا پیاں کروائیں، پھر ڈاک خانے پہنچ گئی۔ ڈاک خانے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک اس کی نگاہ ایک چہرے پر پڑی۔ چند لمحوں کے لئے تو وہ اپنی جگہ ساکت و جامد رہ گئی۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں سیکیڑیں..... نہیں..... اس کی نگاہ دھوکہ نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی چہرہ تھا۔ اس کے سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخنوں تک ایک تیز سرزدلہر دوڑ گئی۔ وہ جالاں تھی۔ چوہدری مہر کی ذاتی اور با اعتماد ملازمہ۔ وہ درندہ صفت ملازم اکبرے کی رشتے دار بھی تھی۔ نارپور کی حویلی میں خطرناک پرچھائیں کی طرح پھرنے والی اس عورت کی آواز شانی نے آخری بار اکبرے کے کمرے میں ہی سنی تھی۔ شانی اکبرے کی بے رحم گرفت میں تھی۔ اکبرے کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کوہرا شانی کے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر پھنکار رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں جالاں نے داخل ہو کر چوہدری مہر کے کان میں کھسر پھسر کی تھی۔ وہ چوہدری مہر کو یہ بتانے کے بعد کہ فاجر واپس آ گیا ہے..... تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

یہ سارے خیالات شاید ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں شانی کے ذہن میں آئے اور گزر گئے۔ اس نے تیزی سے اپنا رخ پھیرا اور واپس پلٹی لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ شانی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ جالاں کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑ گئی ہے اور وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ ڈاک خانے کی سیڑھیاں اتر کر شانی تیز قدموں سے واپس چل دی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور چند لمحوں میں ہی منہ بالکل خشک ہو گیا تھا۔ وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ ایک تنگ گلی کے سامنے بدھ بازار کا رش تھا۔ وہ اس رش میں سے گزرتی ہوئی گلی میں داخل ہو گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ گلی آگے جا کر اسی نسبتاً چوڑی گلی سے مل جائے گی جو اسے کریم پورہ میں لے جائے گی۔ کریم پورہ اس بستی کا نام تھا جہاں وہ آج کل رہ رہی تھی۔

سوڈیڑھ سو میٹر چلنے کے بعد وہ ایک دوسری گلی میں مڑی۔ دوسری گلی میں مڑتے ہوئے اس نے دل کڑا کر کے اپنے عقب میں جھانکا..... اسے اپنی ناگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اس کے بدترین اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ جالاں نے ڈاک خانے کی سیڑھیوں پر اسے پہچان لیا تھا اور اب وہ اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ جالاں کا قدرے بھاری جسم تیزی سے جھولتا اور آگے بڑھتا ہوا نظر آیا۔ وہ کالے رنگ کی چادر میں تھی۔

گلی کا موڑ مڑتے ہی شانی کے قدموں میں اور تیزی آ گئی۔ شاید دس پندرہ قدم اس نے بھاگ کر بھی طے کئے۔ وہ زیادہ دور تک بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ گلیوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ نوجوان دیواروں سے لگے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کہیں کہیں کوئی میلی کچلی عورت بھی دہلیز پر کھڑی نظر آتی تھی۔ ایک غبارے بیچنے والے سے ٹکراتی ہوئی اور ایک پر نالے کے گندے چھینٹوں سے بچتی ہوئی وہ کریم پورہ جانے والی گلی میں آ گئی۔

اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے، بس وہ چلتی جا رہی تھی۔ ایک تنگ گلی میں داخل ہوتے ہوئے اسے اپنے عقب میں تیس چالیس قدم کے فاصلے پر ایک ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ٹھہرو..... بات سنو.....“ یہ کس کی آواز تھی؟ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ یہ جالاں کی آواز ہے۔

لیکن وہ رک سکتی تھی اور نہ پیچھے مڑ کر دیکھ سکتی تھی۔ کریم پورہ میں داخل ہوتے ہی وہ قدرے پرسکون ہو گئی۔ یہاں تنگ گلیوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ اس نے تیزی سے دو تین گلیاں تبدیل کیں۔ جہاں کہیں اسے چند قدم بھاگنے کا موقع ملا وہ بھاگی بھی۔ جلد ہی وہ اپنے عقب سے مطمئن ہو گئی۔ شکر تھا کہ جتنے ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھی۔ گلابدستور سویا پڑا تھا۔ بچے سکول میں تھے۔ مریم چھوٹے کمرے میں لفافے بنا رہی تھی۔ شانی نے بڑے کمرے میں جا کر چادر اتار پھینکی۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ سردی کے باوجود جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور خود پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ لاہور کی اس گنجان آبادی کے ایک ڈاک خانے پر اسے نارپور کی حویلی کا ایک چہرہ نظر آ جائے گا۔ صورت حال ایک دم ہی کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ اب تک وہ اپنے لواحقین کے لئے ”مری ہوئی تھی“ (عین ممکن تھا کہ نارپور یا رنگ والی میں اس کی قبر بھی وجود میں آ چکی ہو) لیکن آج والے واقعے کے بعد وہ مردہ نہیں رہی تھی۔ اسے جالاں نے دیکھ لیا تھا اور اب جالاں سے یہ خبر برق کی رفتار سے نارپور پہنچنے والی تھی۔

عین ممکن تھا کہ شروع میں جالاں کی بات پر یقین نہ کیا جاتا۔ اس کے بیان کو وہ مقرر دیا جاتا..... نظری دھوکا سمجھا جاتا لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت تھی کہ جالاں عام ملازمہ نہیں تھی۔ چہیتے ملازم اکبرے کی رشتے دار ہونے کی وجہ سے اسے حویلی میں خاصی اہمیت حاصل تھی۔ وہ بڑی چوکس اور ہوشیار کارکن بھی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ حویلی کی راکھ میں سے شانی کی لاش تو برآمد نہیں ہوئی تھی۔ اگر وہ مردہ تصور کی جا چکی تھی تو یقیناً کسی اور کی باقیات کو ہی اس کی باقیات سمجھ کر ”آخری آرام گاہ“ میں پہنچایا گیا ہوگا۔ اس قسم کے حالات میں ذہنوں میں شبے تو بہر صورت موجود رہتے ہیں۔ برسوں تک لوگ سوچتے رہتے ہیں۔ شاید یوں ہو گیا ہو..... شاید یوں ہو گیا ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ نارپور جا کر جالاں جو بیان دینے والی ہے وہ جلد ہی زبردست اہمیت اختیار کر لے گا۔ وہ سوچتی رہی اور اپنے پریشان ذہن میں مستقبل کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کرتی رہی۔

جو کام وہ کرنے لگی تھی وہ وہیں کا وہیں رہ گیا تھا۔ خط اور اس کی فوٹو سٹیٹ کا پیاں ابھی تک اس کے سامنے دھری تھیں۔ سب سے پہلے اس نے ان کاغذات کو چھپایا پھر منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں چلی گئی۔

☆=====☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ شانی برتن دھونے کے بعد ذرا ستانے کے لئے کمرے میں آ کر لیٹ گئی، گلاب پہلوانی کرنے لگا ہوا تھا۔ وہ جب تک گھر میں رہتا تھا دزدیدہ آنکھوں سے اسے تکتا رہتا تھا۔ عجیب و اہیات نگاہ تھی اس کی۔ معاملہ اگر دیکھنے تک رہتا تو بھی کوئی بات نہیں تھی مگر وہ بڑے احقانہ طریقے سے گاہے بگاہے شانی کو ”ایمپریس“ کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ کبھی بہانے بہانے سے شانی کو اپنا ورزشی جسم دکھاتا، کبھی اپنی

کسی ”تاریخی“ کشتی کا قصہ سنانے بیٹھ جاتا، کبھی کھانے کی کوئی شے چپکے سے شانی تک پہنچانے کی کوشش کرتا۔ اس کی اوگی بوگی حرکتوں کی وجہ سے بعض اوقات شانی کے اداس ہونٹوں میں مسکراہٹ کا ارتعاش پیدا ہو جاتا۔

اس وقت وہ گھر سے باہر تھا لہذا شانی قدرے سکون محسوس کر رہی تھی۔ جتنے کسی پڑوسن کی چغلیاں کھانے کسی دوسری پڑوسن کی طرف گئی ہوئی تھی۔ بچے چھت پر کبوتر بازی کی مشق کر رہے تھے۔ شانی کو لیٹے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسے دبی دبی ہنسی کی آواز آئی۔ یہ آواز ساتھ والے کمرے سے آرہی تھی۔ پہلے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ بند تھا لیکن اب چونکہ ہوا سے کھل گیا تھا لہذا آواز بہ آسانی شانی کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ یہ مریم کی آواز تھی۔ اس کا رخ کھڑکی کی طرف تھا۔ غالباً وہ سمجھ رہی تھی کہ شانی سو رہی ہے۔ کھڑکی میں سے گلی کے پار ندریں بڑی والے کا دو منزلہ مکان نظر آرہا تھا۔ بالائی کمرے کی کھڑکی میں کوئی موجود تھا۔ شانی نے ذرا دھیان سے دیکھا۔ یہ ندریں کا بڑا بیٹا تھا۔ مریم اس کے ساتھ اشارے بازی میں مصروف تھی۔ اکی کے ہاتھ میں گنا تھا۔ وہ گنا چوسنے کے ساتھ ساتھ مریم کو الٹے سیدھے اشارے بھی کر رہا تھا۔ جوابی طور پر مریم بھی ادا کیں دکھا رہی تھی۔ شانی نے ناگواری سے کروٹ بدل لی۔ بہر حال اس کا دھیان مریم ہی کی طرف رہا۔ وہ ماں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔

چند منٹ بعد اس نے پھر کروٹ بدل کر دیکھا۔ اشارے بازی کا کھیل جاری تھا پھر شاید مریم کو شک ہوا ہوگا اس نے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ بند کر دیا۔ شانی کو الجھن سی ہونے لگی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لڑکے کو کمرے میں ہی بلا لے؟ اس نے بے چینی سے سوچا۔

وہ آواز پیدا کئے بغیر چار پائی سے اٹھی اور کھڑکی تک پہنچی اور کھلی کھڑکی میں جھانک کر اسے اتنا اطمینان تو ہو گیا کہ وہ کمرے میں اکیلی ہی ہے۔ بہر حال اس کی حرکات و سکنات ہرگز قابل اطمینان نہیں تھیں۔ وہ اپنے بوائے فرینڈ کی فرمائش پر اپنی قمیص کا پلو اوپر تک اٹھا رہی تھی۔ پھر اسے اپنے جو بن کی ایک جھلک دکھا کر اس نے پلو نیچے گرالیا اور شرماتی اور ہنستی ہوئی برآمدے کی طرف بھاگی۔

یہی وقت تھا جب جتنے اندر داخل ہوئی۔ ماں بیٹی کی لکڑ ہوئے ہوتے پچی۔ ”کس بات کی خوشیاں چڑھی ہوئی ہیں تجھے حرام زادے۔“ جتنے نے دانت پیس کر مریم کو دو ہنر مارا۔

”مم..... میں نے کیا کیا ہے امی۔“ مریم ہلکائی۔

”میں تیرا بوتھا توڑ دوں گی چہرہ مار کر۔ مجھے پتا ہے وہ جیرے کا لڑکا اور پرکھڑا ہے کھڑکی میں۔ اس سے آنکھ ملکا کر رہی ہے تو.....“

”تم تو ویسے ہی ڈانگ لے کر میڑے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ میں تو لیٹی ہوئی تھی کمرے میں۔“

”مجھے سب پتا ہے تیرے لیٹنے کا..... آنے دے آج تیرے پوکو۔ تیری ہڈیاں نہ تڑوائیں تو میرا نام نہیں.....“ جتنے زہریلی سرگوشی میں

بولی۔ لگتا تھا کہ شانی کی موجودگی کے سبب وہ دبے لہجے میں بول رہی ہے۔

”مڑو لینا..... مڑو لینا..... جان سے مڑو لینا مجھے۔“ وہ جل کر بولی۔

مریم کی زبان چلتے دیکھی تو جتنے نے ایک اور دو ہنر اس کے سر پر مارا۔ ”ہاں جب بہت کچھ ہو گیا تو پتا چلے گا تجھے اور تیرے پوکو.....“

مریم جتنے کو ایک طرف دھکیلتی ہوئی غصے میں چوبارے کی طرف چلی گئی۔ جتنے وہیں کھڑی بڑبڑاتی رہی۔

شانی جلدی سے دوبارہ چارپائی پر لیٹ گئی اور یہ ظاہر کرنے لگی کہ وہ نڈھال ہو کر سوئی ہوئی ہے۔

جتنے نے کمرے میں آکر محتاط نظروں سے شانی کو دیکھا۔ ایک دوبارہ کھکاری۔ تاکہ پتا چل سکے کہ شانی جاگ تو نہیں رہی۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کمرے کی کھڑکی زوردار آواز سے بند کی۔ یہ وہی کھڑکی تھی جس میں سے نوخیز مریم تاکا جھانکی کر رہی تھی۔ کھڑکی اور دروازہ بند کر کے وہ صحن میں آگئی۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر گھومنے اور بڑبڑانے کے بعد وہ پھر پڑوسن کی طرف چلی گئی۔ وہ غالباً بڑھتی ہوئی سردی کے سبب اپنا سویٹر پہننے کے لئے گھر آئی تھی۔ مریم کی بد قسمتی کہ اس کے بوائے فرینڈ پر اس کی نظر پڑ گئی۔

جتنے کے جانے کے بعد شانی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں مریم بھی سیڑھیاں اُترتی نیچے چلی آئی۔ اس کا ایک گال ابھی تک سُرخ ہو رہا تھا۔ بہر طور شانی نے اس پر غصہ نہیں ہونے دیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی مار کٹائی سے باخبر ہے۔ ماں کے حوالے سے مریم کا موڈ بڑا خراب نظر آ رہا تھا۔ وہ شانی کے پاس بیٹھ گئی۔ پہلے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔ ”آپاں! تجھے لفافوں کے کتنے پیسے دیئے تھے امی نے؟“

شانی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ایک سو پندرہ روپے..... لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“
وہ انتقامی انداز میں مسکرائی۔ ”امی نے پورا ڈھائی سو لیا تھا لفافوں والے سے..... وہ تجھے کبھی پوڑے پیسے نہیں دے گی..... اور تجھے تنگ بھی بہت کڑے گی..... ساڑا دن کھوتے کی طرح کام کرائے گی تجھ سے۔“

”مریم! اپنی ماں کے بارے میں تم کس طرح سے بات کرتی ہو۔“
”کوئی ماں شاں نہیں ہے میڑی۔ مجھے پیدا کرنے والی تو مڑ گئی۔ میں تب مشکل سے دو ڈھائی سال کی تھی۔ میڑے ایتنے نے دوسری شادی کی۔ یہ بھائی گلابا میڑی اس دوسری ماں کے ساتھ ہی آیا تھا۔“

”اور پوڈ گڈو؟“

”وہ دونوں بعد میں پیدا ہوئے۔“

شانی کو یہاں رہتے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے اور آج پہلی بار اس پر یہ انکشاف ہو رہا تھا کہ مریم جتنے کی سگی بیٹی نہیں ہے۔ ابھی شانی اور مریم باتیں کر رہی تھیں کہ جتنے اچانک اندر داخل ہو گئی۔ اس وقت مریم پھر لفافوں اور ان کے معاوضے وغیرہ کی بات کر رہی تھی۔ وہ شانی کو بتا رہی تھی کہ درمیانے سائز کے لفافے اٹھارہ روپے میں ساٹھ تیار ہوتے ہیں۔ شاید مریم کے ایک دولفظ جتنے کے کانوں میں بھی پڑے۔ وہ اندر آنے کے بعد کڑی نظروں سے مریم کو دیکھنے لگی۔ مریم نے بُرا سامنہ بنایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی پھر سے چوبارے کی طرف چلی گئی۔

”یہ کیا کہہ رہی تھی دھی رانی؟“ جتنے نے شانی سے نرم لہجے میں پوچھا۔
”کچھ نہیں ماسی..... ویسے ہی باتیں کر رہے تھے ہم۔“

”یہ ایک فتنی ہے۔ مجھ سے زیادہ بھلا کون جانے گا اسے۔ مجھے پتا ہے یہ تجھ سے ان ایک سو پندرہ روپوں کی بات کر رہی ہوگی جو میں نے تم کو دیئے۔“

شانی خاموش رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے دل ہی دل میں جتنے کی ”زود فہمی“ پر داد دی۔

شانی کی خاموشی کو جتنے نے ”ہاں“ سمجھا۔ اس کے چہرے پر غصے کی لہری دوڑ گئی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر شانی کے قریب بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ ”کڑوے! یہ بات ٹھیک ہے کہ لفافوں کے ڈھائی سو روپے ہی ملے تھے۔ میں نے تجھ کو ایک سو پندرہ دیئے باقی ایک سو پینتیس روپے تیری امانت کے طور پر میرے پاس پڑے ہیں۔ آگے بھی جو تیرے پیسے ہوں گے وہ تیرے ہی رہیں گے۔ تیرے ہی کام آئیں گے۔ تُو جیسے کہے گی ویسے کر لیں گے۔“

شانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جتنے نے خوش ہو کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”اپنی ان باتوں کی وجہ سے ہی تُو مجھ کو چنگی لگتی ہے۔ اللہ دی قسے! کبھی کبھی تو میں مریم سے زیادہ تجھے اپنی دھی سمجھنے لگتی ہوں۔ تیرے بارے میں کئی طرح کے خیال میرے دل میں آنے لگتے ہیں.....“ اس نے ذرا توقف کیا اور بولی ”کسی وقت سوچتی ہوں تیرے جیسی نوں (بہو) مجھے مل جائے تو میرا اگلا وقت آسان ہو جائے۔“

شانی نے چونک کر جتنے کی طرف دیکھا۔

وہ ہوشیاری سے بولی۔ ”مجھے لگتا ہے گلاب کو بھی تُو چنگی لگتی ہے۔ گلاب کی ایک پھوپھی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اپنی دھی کا رشتہ دینا چاہتی ہے۔ میں نے تو ابھی صاف انکار کر دینا ہے اس کو۔ امیر ہوں گے تو اپنے گھر ہوں گے۔ مجھے تو اپنی من مرضی کی وہ بیٹی چاہئے.....“ پھر وہ بات کرتے کرتے ایک دم چونک کر بولی۔ ”ہاں شہناز! میں تجھے بتانا ہی بھول گئی۔ گلاب کو کوئی دکان کے لئے جگہ مل گئی ہے۔ بڑا موقع کا اڈہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرسوں سے دکان پر جانے لگے گا..... تجھے کیا بتاؤں..... کتنا ہوشیار منڈا ہے یہ..... اوپر سے بالکل اونگا بونگا لگتا ہے پر اپنے کاروبار میں ایک دم چوکس ہے۔ دیکھنا اس نے چار چھ مہینے میں ہی گھر کی حالت بدل دینی ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے اپنے کو بھی ہر حال میں نیا رکشہ لے کر دینا ہے اور مجھے پتا ہے رکشے کے فوراً بعد اس کے دماغ میں اپنا مکان بنانے کی بات آتی ہے۔“

شانی ہولے ہولے اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ وہ چھوٹی چوہدرانی تھی۔ اس نے اپنے ارد گرد مال و زر کے ڈھیر دیکھے تھے۔ وہ اب بھی لاکھوں کی جائیداد کی وارث تھی اور یہ عورت اس کے سامنے اپنے ”کماؤ پتر“ کی تعریفیں کر کے اس کا ذہن بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ وہ شانی کو اپنی بہو بنانے کا حتمی فیصلہ کر کے اس پر بہت بڑا احسان کرے گی۔

اگلے روز شام کو جب جتنے محلے کے ڈاکٹر سے چھوٹے لڈو کی دوا لینے گئی ہوئی تھی، مریم پھر سے اس کے پاس آئی۔ اپنی سوتیلی ماں کے حوالے سے اس کا موڈ ابھی تک ٹھیک نہیں تھا۔ گلاب اوپر چوہارے میں بیٹھا تھا اور ٹیپ ریکارڈر پر ایک لوفرسا پنجاہی گانا بار بار بجا رہا تھا۔

مریم نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”بھابھا! کسی دن کسی لڑکی سے ضرور جو تیاں کھائے گا۔ اس کی عقل مت روز بہ روز خواب ہوتی جا رہی ہے۔“

شانی نے کہا۔ ”ماسی بتا رہی تھی کہ گلاب کو کوئی دکان مل گئی ہے؟“

”دکان؟“ مریم نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔ ”ریڑھی کھوآ پاں ریڑھی۔ یہ کل سے ریڑھی لگا رہا ہے مین ماریٹ کی پیچھے والی گلے میں۔ امی نے تمہیں بالکل غلط بتایا ہے۔ تم بھی سیانی بیانی ہو۔ اتنی پاگل تو نہیں۔ تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا آپاں..... امی تمہیں گلابے کے لئے گھیر رہی ہے۔ بھا گلابے کو تو کوئی لولی لٹکڑی بھی نہیں مل سکتی۔ تم جیسی حسین خوبصورت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ آج کل دن رات اسی چکڑ میں ہے کہ تجھے گلابے کی ووہٹی بنادے۔ ایک دفعہ بھا گلابے کے ساتھ تیرا نکاح ہو گیا ناں پھر دیکھنا امی کا اصل روپ۔ میں سچ کہتی ہوں آپاں! دن رات لفافے بنوا ہوا کرتیڑی انگلیاں ڈنگی (ٹیرھی) کڑوا دے گی۔“

شانی نے کہا۔ ”وہ تو کہتی تھی گلابے کی گول چکروا لے بازار میں دکان تھی..... جو گلابے نے خود چھوڑی ہے۔ اب اچھی جگہ دکان لے رہا ہے۔“ مریم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔ ”وہاں بھی مڑے اور اچاڑ کی ریڑھی لگاتا تھا آپاں..... صوفی مشتاق کی دکان کے سامنے بیٹھتا تھا۔ اسے روز کے پچاس روپے کڑائے کے دیتا تھا۔ ایک دن صوفی کو کسی کام سے جانا پڑ گیا۔ اس نے گلابے کو کہا کہ ذرا ہوشیار ہو کڑ بیٹھو میں ابھی آ جاتا ہوں۔ گلابے نے ہوشیار کہاں ہونا تھا۔ روز سویرے تین لمبے گلاس تو شردائی کے پی کڑ جاتا ہے۔ اوپر سے کبھی کبھی افیم بھی کھا لیتا ہے۔ ادھر صوفی کام سے نکلا ادھر بھا گلابا ریڑھی پڑا تھا رکھ کر سو گیا۔ دو ماگنے والی عورتیں صوفی کی دکان میں گھسیں۔ گدی کے نیچے سے چابی نکال کر صوفی کا غلہ صاف کڑ دیا اور دو چار ہنراڑ کا سامان بھی اپنے کپڑوں میں چھپا کڑ لے گئیں۔ تم کو پتا ہی ہوگا کہ نیاڑی کا سامان کتنا مہنگا ہوتا ہے بس پھر اسی دن شام کو صوفی مشتاق نے بھا گلابے کو دھکے مار مار کر گھر بھیج دیا۔ ساڑا مڑ بہ اور اچاڑ بھی اس نے جڑمانے کے طور پر رکھ لیا۔ بس لوگوں کے کہنے سننے پر خالی ریڑھی واپس کی۔“

”لیکن..... گلابا تو اپنے طور پر بڑا پہلوان بنتا ہے؟“ شانی نے مریم کو اسیا۔

وہ چمک کر بولی۔ ”تم کس پہلوانی کی بات کڑتی ہو آپاں..... میڑی ایک استانی کہا کڑتی تھی کہ سکولوں میں انگریزی اس لئے پڑھائی جاتی ہے کہ وہ بچے بھی فیل ہو سکیں جو کسی اوڑ طرح فیل نہیں ہوتے۔ اسی طرح بھا گلابا بھی اس لئے کشتیاں لڑتا ہے کہ وہ لوگ بھی جیت سکیں جو پہلے کبھی نہیں جیتے۔ حوام ہے جو بھا گلابے نے آج تک کوئی کشتی جیتی ہو۔ بس ایک بازوہ بازوہ سو روپے کا انعام لے کڑ آیا تھا اس بات کا پتا آج تک نہیں چل سکا کہ وہ کون سا جھاڑا پہلوان تھا جو بھا گلابے سے بھی ہار گیا.....“

شانی مریم کی باتیں سنتی رہی اور سر دھتی رہی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ مریم غلط بیانی نہیں کر رہی۔ کم از کم اس معاملے میں وہ صاف گوئی سے کام لے رہی تھی..... شانی نے حویلی سے نکلنے کے بعد دنیا کا ایک بالکل مختلف روپ دیکھا تھا۔ اسے ابھی تک اپنے ارد گرد جھوٹ اور مکرو فریب ہی نظر آیا تھا۔ اس نے تاحال جس طرف نگاہ اٹھائی تھی مطلب پرستی ابن الوقتی اور حرص و ہوس کے تاریک سائے دیکھے تھے۔ ہر کسی نے اپنے اپنے انداز میں اپنی اپنی سطح پر اپنے مفاد کو ”خدا“ بنا رکھا تھا۔ کامی اور سکندرے سے لے کر قاسم اور جنتے تک ہر چہرے کے پیچھے اسے ایک اور چہرہ دکھائی دیا تھا۔

رات نوبے کے لگ بھگ زکریا گھر آیا تو خوش نظر آتا تھا۔ وہ آج خلاف معمول رکشہ دروازے پر ہی لے آیا تھا۔ گلابے کے ساتھ مل کر

اس نے رکشے پر سے ایک 18 انچ کارنگین ٹی وی اتارا۔ اس ٹی وی کو بڑے چاؤ کے ساتھ پرانے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کی جگہ دے دی گئی۔ بچے بھی خوش نظر آرہے تھے۔ سب گھر والے رات گئے تک ٹی وی کے گرد جمع رہے۔ مریم تھکی ہوئی تھی وہ جلدی سو گئی۔ اس کی دیکھا دیکھی شانی بھی دس ساڑھے دس بجے تک سو گئی۔

رات ایک بجے کے قریب اتفاقاً شانی کی آنکھ کھلی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پانی پینے کے لئے باورچی خانے کی طرف گئی۔ زکریا اور جنتے کے کمرے والا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ باورچی خانے کی نیم تاریکی میں سے کمرے کا منظر صاف نظر آنے لگا۔

میز پر پلیٹوں میں روٹ چکن اور روغنی نانوں کے بچے کھچے نکلے پڑے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بچوں کو سنانے کے بعد زکریا اور جنتے نے زبردست ”ڈنر“ کیا ہے۔ اب جنتے جامنی رنگ کے نمل کا ایک قیمتی سوٹ پہنے کھڑی تھی۔ آئینے کے سامنے گھوم گھوم کر وہ اپنے فربہ جسم کا جائزہ بھی لے رہی تھی شانی کو اس کے کانوں میں پتی بلیوں کی جگہ وزنی بندے نظر آئے۔ غالباً یہ بھی سونے کے ہی تھے۔ سوٹ بھی نیا تھا۔

پانی پینے کے بعد شانی واپس بستر پر جا لیٹی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتی رہی اور اس صورت حال کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے رکشہ ڈرائیور زکریا کے پاس اچانک کافی روپے آگئے ہیں۔ کل شام شانی نے اس کی کلائی پر ایک نئی ٹور گھڑی بھی دیکھی تھی۔

اس گھر میں زکریا واحد شخص تھا جس کا ظاہر و باطن شانی کو ایک جیسا لگا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ صاف سیدھی بات کرتا ہے اور دل میں میل نہیں رکھتا۔ مگر اب شانی کو لگ رہا تھا کہ شاید اس شخص کے حوالے سے بھی کوئی گڑبڑ موجود ہے۔۔۔۔۔ یا شاید یہ صرف اس کا وہم تھا۔ بد قسمتی سے حویلی چھوڑنے کے بعد شانی کو جو زیادہ تر افراد ملے وہ دہرے چہرے رکھتے تھے۔ اب شانی کو ہر چہرے کے پیچھے ایک چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے خود سے سوال کیا۔۔۔۔۔ کہیں تم بے جا قنوطیت کا شکار تو نہیں ہو رہی ہو۔ کچھ دیر تک زکریا اور جنتے کے بارے میں سوچنے کے بعد اس کا دھیان ایک بار پھر چند روز پہلے والے واقعے کی طرف چلا گیا۔ اس کی نگاہوں میں جالاں کا بھاری بھر کم چہرہ گھومنے لگا اور وہ سارے منظر یاد آنے لگے جو جالاں کو ڈاک خانے کی میز پر دیکھنے کے بعد نظر آئے تھے۔ بے نام اندیشے سوچ کی لہروں میں ابھرتے اور ڈوبتے رہے۔ بستی کی کچی تنگ گلیوں میں ایک ٹھہری ہوئی تاریک رات سنسناتی رہی۔ ساتھ والے کمرے سے زکریا اور جنتے کی ناقابل فہم سرگوشیاں ابھرتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ کھدر کے لحاف میں دبکی دبکی پھر سے نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

☆=====☆=====☆

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں، جو کتاب گھر پر فی الحال پیش نہیں کیا جائے گا۔

پبلشر نے صرف پہلا حصہ شائع کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس طویل داستان کے باقی ماندہ حصوں کے لیے پبلشرز سے رابطہ کیجئے۔

علی میاں پبلی کیشنز..... 20- عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور۔ 042-37247414

ادارہ علی میاں پبلی کیشنز کی دیگر کتب

20- عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 7247414

http://kibkash.com کتاب گھر کی پیشکش

خواتین کے معاشرتی، اصلاحی اور روحانی ناول

| | | | |
|----------|------------------------|------------------------|---------------------------|
| 400 روپے | ISBN 978-969-517-274-2 | گفتہ بھٹی | فاصلے اور چاہتیں |
| 350 روپے | ISBN 978-969-517-257-5 | گفتہ بھٹی | مڑا کے مول نہ جائیں |
| 200 روپے | ISBN 978-969-517-257-5 | گفتہ بھٹی | راستے محبت کے |
| 200 روپے | ISBN 978-969-517-257-5 | گفتہ بھٹی | ہمد |
| 350 روپے | ISBN 978-969-517-262-9 | نشاط خان | تیسرا کنارہ |
| 200 روپے | ISBN 978-969-517-275-9 | نشاط خان | دوریاں اور قربتیں |
| 400 روپے | ISBN 978-969-517-273-5 | زمر نعیم | روشنی میرا استعارہ |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-288-9 | زمر نعیم | دریہ بے کراں |
| 350 روپے | ISBN 978-969-517-261-2 | یاسمین نشاط اختر | پریم کتھا کا انت نہ کوئی |
| 400 روپے | ISBN 969-517-219-9 | فریدہ اشفاق | شکستِ شب |
| 200 روپے | ISBN 978-969-517-220-9 | رخ چوہدری | کسے دیار نہ چھڑے |
| 350 روپے | ISBN 978-969-517-247-6 | سعدیہ غزل | ایک رات کی بات |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-261-2 | گنہت سیمہ | ہمیں تمہارے دل کی خبر تھی |
| 400 روپے | ISBN 978-969-517-296-4 | فائزہ افتخار | داسی ڈھولن یا رومی |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-247-6 | فائزہ افتخار | روگ |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-247-6 | فائزہ افتخار | تو کیا جانے پگی کوئل |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-247-6 | فائزہ افتخار | کوئچ و چھڑ گئی ڈاروں |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-247-6 | فائزہ افتخار (زیر طبع) | کیا اسیری کیا رہائی |

| | | | |
|----------|------------------------|------------------------------|--|
| 150 روپے | ISBN 978-969-517-284-1 | سیمائت ماسم | محبت فاتح اعظم |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-289-6 | غزالہ عزیز | ایمان اُمید اور روشنی |
| 150 روپے | ISBN 978-969-517-295-7 | نگہت اعظمی | اک بار کہو |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-293-3 | بلیقیں کنول | قطرے سے گہر ہونے تک |
| 150 روپے | ISBN 969-517-128-1 | بلیقیں کنول | نقش قدم |
| | | | اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنے والی لڑکی کی کہانی۔ |
| 150 روپے | ISBN 969-517-094-3 | بلیقیں کنول | وفا |
| | | | محبت صرف محبت نہیں ہوتی، یہ وہ آگ ہوتی ہے جو جلا کر جسم کر دیتی ہے۔ |
| 150 روپے | ISBN 969-517-129-X | | مہندی رچے ہاتھ |
| | | | خواب ٹوٹ کر کبھر جائیں تو آرزوئیں سسکیں اور آہوں میں ڈھلے گئیں ہیں۔ |
| 150 روپے | ISBN 969-517-130-3 | بلیقیں کنول | گرداب |
| | | | ایک درد آشنائری کی دنگلدار داستان۔ |
| 400 روپے | ISBN 969-517-198-2 | بلیقیں کنول | سیپ |
| 800 روپے | ISBN 978-969-517-253-7 | ناہید سلطانہ اختر (دو جلدیں) | سانباں |
| | | | محبت کی چاشنی اور نفرت کے زہر میں رچی کہانی۔ |
| 300 روپے | ISBN 969-517-063-3 | ناہید سلطانہ اختر | زندانی میں پھول |
| | | | لوہ پلہ، سطر، سطر، تھیر، تھیر اور درویش ڈوبی چار پیارے بچوں کی ایک حقیقی داستان۔ |
| 125 روپے | ISBN 969-517-134-6 | ناہید سلطانہ اختر | سمن پوش |
| | | | ایک حرام نصیب لڑکی کے عدم سے وجود میں آنے کا فسانہ۔ |

معروف مصنفہ ہما کوکب بخاری کے شہرہ آفاق ناول

| | | | |
|----------|------------------------|------------|---------------------------------|
| 800 روپے | ISBN 978-969-517-254-4 | (دو جلدیں) | ماہی ماہی کوکدی میں |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-255-1 | | کسی خوب کے یقین میں |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-256-8 | | بیٹے پل کا سایہ |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-267-4 | | ایک بھی لڑکی زویا |
| 200 روپے | ISBN 978-969-517-271-1 | | اک عمر کے طلسم میں |
| 150 روپے | ISBN 978-969-517-269-8 | | اکھاں چھم چھم و سیاں |
| 150 روپے | ISBN 978-969-517-270-4 | | زندگی میرے لیے گنبد بے درگھمیری |
| 250 روپے | ISBN 978-969-517-268-1 | | پیاری خوشبو |

قلم کے نواب محی الدین نواب کے شاہکار ناول

ISBN-969-517-221-0 225 روپے

(تین حصے)

مقدور

ISBN-969-517-152-4 600 روپے

(چار جلدیں)

سرپرست

ISBN-969-517-031-5 600 روپے

(چار جلدیں)

اندھیر نگری

ISBN-969-8429-26-3 300 روپے

(دو جلدیں)

پتھر

ISBN-969-8429-18-2 150 روپے

شعلوں کی سیج

ISBN-969-8429-17-4 150 روپے

آبلہ بدن

ISBN-969-8429-16-6 200 روپے

ادھورا ادھوری

ISBN-969-8429-12-3 150 روپے

(زیر طبع)

شارٹ کٹ

ISBN-969-8429-13-1 150 روپے

دل پارہ پارہ

ISBN-969-8429-42-5 150 روپے

اجازت

ISBN-969-8429-45-X 200 روپے

جرم وفا

ISBN-969-8429-54-9 180 روپے

کمبل

ISBN-969-8429-94-8 225 روپے

اجل نامہ

ISBN-969-8429-95-6 225 روپے

ایمان والے

ISBN-969-8429-98-0 125 روپے

پل صراط

ISBN-969-517-004-8 150 روپے

خالی سیپ

ISBN-969-517-005-6 150 روپے

یوم حساب

ISBN-969-517-008-0 100 روپے

راہ خارزار

ISBN-969-517-011-0 100 روپے

آخری موسم

ISBN-969-517-007-2 100 روپے

بدی الجمع

ISBN-969-517-010-2 125 روپے

بند مٹھی

150 روپے

جوڑے کا پھول

150 روپے

آخری وعدہ

125 روپے

پیاسے کو شبنم

ISBN-969-517-006-4 100 روپے

خوش دامنی

| | | |
|----------|--------------------|------------------------|
| 100 روپے | ISBN-969-517-012-9 | گندی گلی |
| 80 روپے | ISBN-969-517-025-0 | طاعون |
| 150 روپے | ISBN-969-517-023-4 | قدیم رشتہ (زیر طبع) |
| 100 روپے | ISBN-969-517-026-9 | آنچل |
| 100 روپے | ISBN-969-517-027-7 | جلوہ نمائی |
| 100 روپے | ISBN-969-517-024-2 | خوفِ خدا |
| 100 روپے | ISBN-969-517-009-9 | نیک کمائی |
| 90 روپے | ISBN-969-517-035-8 | علاج |
| 90 روپے | ISBN-969-517-044-7 | نوسر باز |
| 125 روپے | ISBN-969-517-043-9 | عذابِ آگہی |
| 150 روپے | ISBN-969-517-045-5 | کاغذی پیر بہن |
| 90 روپے | ISBN-969-517-099-8 | عذابِ آخر |
| 90 روپے | ISBN-969-517-051-X | قصہ نصف صدی کا |
| 90 روپے | ISBN-969-517-056-0 | باسی پھول |
| 100 روپے | ISBN-969-517-046-3 | سنے سب اپنے |
| 100 روپے | ISBN-969-517-060-9 | شجر ممنوعہ |
| 100 روپے | ISBN-969-517-062-5 | چلمن |
| 100 روپے | ISBN-969-517-050-1 | ناگزیر |
| 100 روپے | ISBN-969-517-048-X | ممتا کا عذاب (زیر طبع) |
| 150 روپے | ISBN-969-517-047-1 | محبت کا عذاب (زیر طبع) |
| 90 روپے | ISBN-969-517-091-9 | دور اندیش |
| 150 روپے | ISBN-969-517-121-5 | سحر شبِ گزیدہ |
| 150 روپے | ISBN-969-517-092-7 | کچے رشتے |
| 150 روپے | ISBN-969-517-113-3 | مخاطرہ |
| 150 روپے | ISBN-969-517-090-0 | انہونی |
| 150 روپے | ISBN-969-517-115-X | زہریلا پھول |

150 روپے ISBN-969-517-061-7

150 روپے ISBN-969-517-117-6

150 روپے ISBN-969-517-199-0

250 روپے ISBN-969-517-200-8

150 روپے ISBN-969-517-201-6

100 روپے ISBN-969-517-120-7

200 روپے ISBN-969-517-150-8

250 روپے ISBN-969-517-116-8

200 روپے ISBN-969-517-114-1

250 روپے ISBN-969-517-072-2

250 روپے ISBN-969-517-071-4

250 روپے ISBN-969-517-151-6

300 روپے

250 روپے

250 روپے

پتھر کا شیشہ

اندھی چال

حیا کی سولی پر

بے نام رشتے

خریدار وفا

انسان اور شیطان

طلسمِ محبت

سچا فریب

لبادہ

روح کی واپسی

بھرم

رشتوں کی بازی

بخت گزیدہ

منکر

داؤ چچ

ایم اے راحت کے پُر اسرار، خوفناک اور ایڈونچر سے بھرپور ناول

500 روپے ISBN-969-517-126-5

400 روپے ISBN-969-517-074-9

400 روپے ISBN-969-517-077-3

300 روپے

400 روپے

300 روپے ISBN-969-517-214-8

300 روپے ISBN-969-517-144-3

250 روپے ISBN-969-517-143-5

180 روپے ISBN-969-517-076-5

تاریک کائنات کے مسافر (دو جلدیں)

معصوم چڑیل (دو جلدیں)

کالی قبر (دو جلدی)

پجاری

وش کنیا

دیوالی

بچھو (زیر طبع)

اکال ساگر

روپ کنڈ کی روپا

کالے چراغ

کتاب فرعون

مقدس نشان

سنہری جونک

مقدس عہد

ناگ دیوتا

مقدس خنجر

مہم جو

محافظ

جن زادی

دھند

نایاب

احساس

دہشت کدہ

آسیب

سوکھے گلاب

کھلاڑی

سرفروش

راز داراں

200 روپے ISBN-969-517-067-6

450 روپے ISBN-969-517-041-2

90 روپے ISBN-969-517-035-2

90 روپے ISBN-969-517-052-8

90 روپے ISBN-969-517-053-6

100 روپے ISBN-969-517-002-1

125 روپے ISBN-969-517-000-5

150 روپے ISBN-969-517-99-9

150 روپے ISBN-969-517-001-3

250 روپے ISBN-969-8429-92-1

300 روپے ISBN-969-8429-46-8

100 روپے ISBN-969-8429-07-7

100 روپے ISBN-969-8429-06-9

125 روپے ISBN-969-8429-00-X

200 روپے ISBN-969-8429-23-9

300 روپے

300 روپے

320 روپے

300 روپے

(دو جلدیں)

(زیر طبع)

(دو جلدیں) (زیر طبع)

(زیر طبع)

(زیر طبع)

(دو جلدیں)

(دو جلدیں)

علیم الحق حق کے قلم سے شہرہ آفاق ناول

100 روپے ISBN-969-8429-15-8

100 روپے ISBN-969-517-057-9

100 روپے ISBN-969-517-102-8

(ناگٹ ایڈیشن)

عشق مجازی، عشق حقیقی میں کیسے بدلتا ہے۔ محبت کی روح کو سمجھنے والوں کے لیے ایک یادگار ناول۔

محبت کی نیرنگی اور کارفرمائی سے معمور ایک دلنواز داستان۔

الاؤ

باری مسیح کی جگہ بننے والے رام مندر کو چا کر نے والے جیالوں کی داستان شجاعت۔

ISBN-969-517-103-6 100 روپے

ISBN-969-517-104-4 100 روپے

ISBN-969-8429-13 100 روپے

ISBN-969-8429-20-4 200 روپے

ISBN-969-8429-21-2 150 روپے

ISBN-969-8429-22-0 160 روپے

ISBN-969-517-140-0 150 روپے

ISBN-969-517-139-7 150 روپے

ISBN-969-8429-03-4 100 روپے

100 روپے

ISBN-969-517-141-9 100 روپے

100 روپے

ISBN-969-8429-016-1 100 روپے

ISBN-969-8429-04-2 100 روپے

ISBN-969-8429-05-0 150 روپے

ISBN-969-8429-19-0 80 روپے

ISBN-969-8429-14-X 100 روپے

ISBN-969-8429-10-7 150 روپے

ISBN-969-8429-43-3 100 روپے

ISBN-969-8429-44-1 100 روپے

ISBN-969-8429-55-7 100 روپے

اسم اعظم

اس شخص کی کہانی جسے اسم اعظم کی قوت حاصل ہو گئی تھی۔

گھر وندا

اس شخص کا فسانہ عبرت جس سے ایک لمحے کی خطا ہو گئی تھی۔

شناخت

ایک ایسے نوجوان کی کہانی جس کی شناخت مسلم پاکستانی تھی۔

اماوس کا دیا

عشق مجازی کی ایسی داستان جسے آپ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

بول

پر ماتما

تاش کے پتے

ہٹلر کی واپسی

آنکھوں میں دھنک

میر کارواں

کلا کار

برف کے باٹ

انسانی قیامت

زنداں نامہ

طوفان کے بعد

اچھوت

ہزاروں خواہشیں

لہو کے تاجر

نسلوں کا قرض

شب احتساب

چوتھی سمت

| | | |
|----------|--------------------|--------------------------|
| 100 روپے | ISBN-969-8429-90-5 | چہار درویش |
| 100 روپے | ISBN-969-8429-56-5 | کارِ مسلسل (زیر طبع) |
| 100 روپے | ISBN-969-8429-57-3 | تحریک مزاحمت (زیر طبع) |
| 100 روپے | ISBN-969-8429-96-4 | پس نقاب (زیر طبع) |
| 100 روپے | ISBN-969-8429-97-2 | شفقِ لوکا پیڑ |
| 100 روپے | ISBN-969-517-014-5 | فسادِ قامت (زیر طبع) |
| 100 روپے | ISBN-969-517-013-7 | حسابِ دشمنان (زیر طبع) |
| 100 روپے | ISBN-969-517-015-3 | شاہ چور (زیر طبع) |
| 150 روپے | ISBN-969-517-020-X | خوابوں کے عذاب (زیر طبع) |
| 100 روپے | ISBN-969-517-029-3 | تنگ آمد (زیر طبع) |
| 100 روپے | ISBN-969-517-096-X | نقابِ چہرے (زیر طبع) |
| 100 روپے | ISBN-969-517-097-8 | آکاش بیل |
| 150 روپے | ISBN-969-517-175-3 | بادشاہِ گر |
| 150 روپے | ISBN-969-517-230-X | ناقابلِ شکست |
| 150 روپے | ISBN-969-517-244-X | برف کا پھول |

طاہر جاوید مغل کے ناقابلِ فراموش ناول

| | | |
|-----------|--------------------|---|
| 1300 روپے | ISBN-969-8429-28-X | تتاوان (17 حصوں میں مکمل) |
| 150 روپے | ISBN-969-517-136-2 | زندگی کی ناہوار راہوں پر چلنے والے نوجوان کی کہانی جسے حالات نے ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ |
| 40 روپے | | پرستش |
| 400 روپے | ISBN-969-517-137-0 | طاہر جاوید مغل کے قلم سے محبت کے موضوع پر لازوال کہانیاں۔ |
| | | الاؤانگارے آنج (انسپکٹورِ آف لاء) |
| | | جرم و سزا کے موضوع پر چھ بہترین تفتیشی کہانیاں۔ |
| | | آندھی (دو حصے) (زیر طبع) |
| | | ایک نرم و نازک حسینہ کی داستان جو دشمنوں کے لیے آندھی ثابت ہوئی۔ |

- نور کی یلغار (دو حصے) ISBN-969-8429-58-1 400 روپے
تاریخ کے کم عمر ترین سپر سٹار کی ہندوستان کے عظمت کدوں پر نورانی یلغار۔
- تابان ISBN-969-517-48-4 300 روپے
ایک شہریدہ سرنگام کی سرکشی کی داستان اس نے غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکا تھا۔
- جستجو ISBN-969-517-0 100 روپے
ایک بڑا سراپا پیلے لفافے کی کہانی۔ خوف و دہشت سے بھرپور کتاب۔
- فیصلہ ISBN-969-517-028-5 100 روپے
شمالی علاقوں کے دلفریب نظاروں میں پروان چڑھتی ہوئی محبت کے حسین لمحوں کی داستان۔
- اباقتہ (دو جلدیں) ISBN-969-517-065-X 500 روپے
پہاڑوں سے نکلنے والے، چٹانوں سے لڑنے والے اباقتہ کی طویل ہوش رُبا داستان۔
- تاخیر پسند ISBN-969-517-123-1 100 روپے
دو طویل ناقابل فراموش کہانیاں ایک ناول میں۔
- صدقے واری ISBN-969-517-122-3 100 روپے
ایثار اور محبت کے موضوع پر لازوال ناول۔
- درندہ ISBN-969-517-245-8 180 روپے
اسرار اور تھر کے پردوں میں چھپے درندے کی لرزہ خیز کہانی۔
- دیوی (سات جلدیں) ISBN-978-969-517-282-7 1850 روپے
دیوی ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو اپنی فطرت میں شہنشاہی۔
- پرواز (دو جلدیں) ISBN-978-969-517-297-1 600 روپے
- جوتی، جھمکا اور جیل طاہر جاوید مغل انسپکٹر نواز خان ISBN-969-517-224-5 150 روپے
- لاش، میمجزا اور حسینہ طاہر جاوید مغل انسپکٹر نواز خان ISBN-969-517-225-3 150 روپے
- لڑکی، چور اور سپاہی طاہر جاوید مغل انسپکٹر نواز خان ISBN-969-517-226-1 200 روپے
- پہلوان، پٹھا اور مریدنی طاہر جاوید مغل انسپکٹر نواز خان ISBN-969-517-227-X 200 روپے
- کالی حویلی گوری لڑکی طاہر جاوید مغل انسپکٹر نواز خان ISBN-969-517-228-8 200 روپے
- قانون جنگل اور عورت طاہر جاوید مغل انسپکٹر نواز خان ISBN-969-517-229-6 200 روپے

محمود احمد مودودی کے لازوال ناول

80 روپے

لہو کا سراغ

نیکی اور بدی کی کشمکش کے گرد گھومتی حیرت انگیز کہانی۔

150 روپے

سمندر

سمندر کی تہ سے آنے والے ایک انوکھے انسان کی داستان محب۔

150 روپے

(زیر طبع)

کنارہ

ایک آدم زاد کی داستان عبرت اسے اولاد آدم نے ڈس لیا تھا

150 روپے

ISBN-969-8429-101-X

خلش

وہ ایک مرد کا دیا ہوا زخم سودھتے لوٹنے کو بے قرار تھی۔

ابو جواد کے قلم سے انڈیا کے پس منظر میں لکھے جانے والے بہترین مکائنڈ ناول

150 روپے

ISBN-969-8429-017-X

جودھ پورا کا رکھشس (زیر طبع)

بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے چال میں چھٹنے والے ایک پاکستانی نوجوان کی بچی داستان۔

150 روپے

ISBN-969-8429-018-8

(زیر طبع)

دیوانگھ کا سپوت

پاک فوج کے جری اور میم جو نوجوان کی داستان جرأت۔

100 روپے

ISBN-969-8429-019-6

(زیر طبع)

جے پور کے پوتر پانی

انتقام کا جذبہ لے کر لاہور سے بھارت جانے والے پاکستانی نوجوان کی لرزہ خیز کہانی۔

ایم الیاس کے شاہکار ناول

180 روپے

ISBN-969-517-068-4

آفت

لہر بھر رگ بیتی ہوئی ایک آفت کہانی۔

100 روپے

ISBN-969-517-069-2

پراسرار شکاری

انسانی خون پینے والے خون آشام ڈاکٹر کی لرزہ خیز داستان۔

100 روپے

ISBN-969-517-088-9

دشمن

ایک رٹائرڈ فوجی کی سنسنی خیز آپ بیتی، اسے ایک ناپید دشمن کا سامنا تھا۔

150 روپے

ISBN-969-517-106-0

شکنجہ

ایک کرائم رپورٹر کی زندگی کی ہنگامہ خیز داستان۔

100 روپے

ISBN-969-517-107-9

میتلی

ایک آوارہ تملی کی داستان عبرت۔

100 روپے

ISBN-969-517-108-7

بازی

اس دو شیر و کا دلچسپ قصہ جسے کسی صورت ہار پندر نہیں تھی۔

200 روپے

ISBN-969-517-148-6

(زیر طبع)

کالا منتر

ایک مظلوم کے ہاتھ میں غلطی آئی تو وہ کھولتا ہوا لاوا بن گیا۔

200 روپے

ISBN-969-517-105-2

شرارہ

ایک چالباز جوان کا فسانہ عبرت۔

اسیر خواب

اس کہانی کا ہر کردار اپنے اپنے خواب کا اسیر نظر آئے گا

ISBN-969-517-191-5 200 روپے

پیاس

پیار کی پیاسی ایک معصوم دوشیزہ کی کہانی۔

ISBN-969-517-109-5 100 روپے

کومل

(زیر طبع)

اس دلہن کی الٹانک کہانی، جس کی مانگ میں افٹاس کی جگہ بوجھ رویا گیا تھا۔

ISBN-969-517-110-9 100 روپے

سپنا

(زیر طبع)

تین عورتوں کی شلت میں پھنسے ہوئے ڈاکٹر کی عجیب کہانی۔

ISBN-969-517-111-7 100 روپے

تیر نظر

(زیر طبع)

پیار بھی سمجھتا نہیں کرتا، جیت جاتا ہے یا ہار کر مر جاتا ہے۔

ISBN-969-517-112-5 100 روپے

ڈائجسٹ کے سلسلے

سامون

(تین حصے) ایم اے راحت

آتش و آہن سے پھیلنے والے لاشعہ صفت نوجوان کی داستان۔

ISBN-969-8429-83-2 225 روپے

سمندر کا بیٹا

(تین حصے) (زیر طبع)

سمندر کی ہولناک لہروں کی آغوش سے نمودار ہونے والے ایک بچے کی انوکھی داستان۔

ISBN-969-8429-64-6 225 روپے

جھرنے

(تین حصے) (زیر طبع)

ان نادانوں کی کہانی جو بزرگوں کے فیصلوں کو فکھرا کر زندگی بھر خون کے آنسو روتے ہیں۔

ISBN-969-8429-78-6 225 روپے

شہ زور

(دو حصے) (زیر طبع)

ایک خاتون شہ زور پر پور کی تہلکہ خیز داستان۔

ISBN-969-8429-62-X 150 روپے

ہمالیہ

(چار حصے) (زیر طبع)

سنگلاخ چٹانوں کے دلس سے خون اور آہوں میں ڈوبی داستان۔

ISBN-969-8429-70-0 300 روپے

بساط

(چار حصے)

حج کے تلاش ایک شوریدہ سر نوجوان وکیل کی داستان عمل۔

ISBN-969-8429-74-3 300 روپے

اثر دھما

(پانچ حصے) (زیر طبع)

درندگی اور بربریت کے پیکر ایک پھر صفت انسان کی داستان۔

ISBN-969-8429-036-6 375 روپے

لاوا

(تین حصے)

تکوار کی طرح تیز دھار، گولی سے زیادہ برق رفتار شاہ نور کی طوفانی داستان۔

ISBN-969-517-153-2 225 روپے

باغی

(زیر طبع)

ایک بیٹے نے ماں کو آسمان کی بلند یوں تک پہنچانے کے لیے زمین کی پستیاں سیٹ لیں۔

ISBN-969-8429-81-6 100 روپے

پارس

(زیر طبع)

ISBN-969-8429-86-7 75 روپے

اپنی ذات کی تلاش میں سرگرداں ایک انوکھے انسان کی داستان۔

75 روپے ISBN-969-8429-87-5

(زیر طبع)

پرواز

ایک ہانگے پچیلے نوجوان کی سرگزشت جس کی رگوں میں وطن کی محبت دوڑ رہی تھی۔

75 روپے ISBN-969-8429-61-1

(زیر طبع)

خون آشام

داستان درد داستان ایک ظلم خانہ۔ ہر صبح پنجسے سے بھر پور، ایک خونخاک ناول۔

75 روپے ISBN-969-8429-11-X

(زیر طبع)

انکا

باشت بھر، شوخ و پچیل بھولی بھالی اور نہ اسرار توں کی مالک ”انکارانی“ کی آپ بیتی۔

100 روپے ISBN-969-8429-60-3

(زیر طبع)

ہیرو

ایک نوجوان کی سرگزشت جس کی زندگی قلم اور تقدیر کے درمیان ایک پل صراط پر اٹک گئی تھی۔

525 روپے ISBN-969-517-167-2

(سات حصے)

دید بان

محترم شمیم نوید کے قلم سے ایک نہ اسرار جادو چمکتی داستان۔

525 روپے ISBN-969-517-176-1

(سات حصے)

جن زاد

ایک جن زادی حیرت انگیز خود پوشت۔ کبھی شعلہ کبھی شبنم۔

450 روپے ISBN-969-517-180-X

(چھ حصے)

چارہ گر

کہانی در کہانی ایک داستان ہزار رنگ۔

900 روپے ISBN-969-517-080-3

(بارہ حصے)

مداری

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ۔

300 روپے ISBN-969-517-080-3

(چار حصے)

انٹری (زیر طبع)

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ۔

225 روپے ISBN-969-517-207-5

(تین حصے)

موم کا آدم

ایک سرکٹ مچلے جیلے کی زندگی کی رنگینیوں اور چاشنیوں سے مزین حیرت انگیز سرگزشت۔

225 روپے ISBN-969-517-221-0

(تین حصے)

مقدور

ایک ایسی کہانی جس کے کردار کو تقدیر کا نام دیا گیا

300 روپے ISBN-969-517-231-8

(چار حصے)

خازن

سندھ کی سر زمین میں دہلی ہوئی چنگاڑی کی داستان جو اچانک شعلہ بن گئی۔

1300 روپے ISBN-969-517-28-X

(سترہ حصے)

تاوان

زندگی کی ناہمواریاں ہوں پر طے والے نوجوان کی کہانی جسے حالات نے زخموں پر رکھ لیا

انور احسن صدیقی کی افسانوی تخلیقات

250 روپے ISBN-969-517-093-5

(سات حصے)

ٹوٹے تارے

ان معصوم بچوں کی المناک کہانی جنہیں ہوش سنبھالنے ہی زندگی کے بے رحم خازنوں میں بے رہنے پڑنا ہے۔

- ایندھن
نسل در نسل انتقام کے جلے شعلوں میں محبت کے پھول کھلانے والے دو دلوں کی اچھوتی اور خوبصورت داستان۔
200 روپے ISBN-969-517-135-4
- ابو پھر ٹیکا
اس بد نصیب پتھر کی کہانی جہاں ابویانی سے سستا ہے۔
150 روپے ISBN-969-517-147-8
- اس دشت کی تنہائی میں
معمولی خوروں میں بھیجی ہوئی بڑی کہانیاں۔
150 روپے ISBN-969-517-159-1
- رقصاں سر بازار
مرد کے معاشرے میں عورتیں طوائف کیسے بنتی ہیں۔
150 روپے ISBN-969-517-163-X
- کنکنی محسین بلور مونس
انسانی اعضاء کی تجارت کرنے والے مکروہ چہروں کی قلاب کشائی کی کہانی۔
150 روپے ISBN-969-517-202-4
- جنون
انسانی رشتوں کے پتھر خیم میں اُلجھی ہوئی کہانی
150 روپے ISBN-969-517-217-2
- جلتی چھاؤں
انسانی رشتوں کے پتھر خیم میں اُلجھی ہوئی داستان۔
150 روپے ISBN-969-517-259-9
- قفص

معروف مصنفین کے شہرہ آفاق ناول

- تپش
محمد فاروق انجم
150 روپے ISBN 978-969-517294-0
- پیار کی صلیب پر
احمد یار خان
200 روپے ISBN 978-969-517286-5
- تیاگی
(زیر طبع) صابر علی ہاشمی
- عجیب لڑکی
یعقوب جمیل
200 روپے ISBN 978-969-517258-2
- ہر ایا آسمان
(زیر طبع) محمد اعظم خاں
150 روپے
- حتمی کی بے وقافتی اور کسی کی وقافتوں کا قصہ۔
- ہزار داستان
انوار علیگی
250 روپے ISBN-969-8429-030-7
- ایک دشت ناک اور مسموم کن داستان جو پڑھنے والوں کو اپنے بحر میں جکڑ لے گی۔
- چاند کے قیدی
(دو حصے) سیما غزل
600 روپے ISBN-969-8429-298-8
- کال نیل
(دو حصے) سیما غزل
300 روپے ISBN-969-8429-68-9
- زرد پتوں کا بھنور
(دو حصے) سیما غزل
300 روپے ISBN-969-8429-52-2
- ایک آبلہ بالڑکی کی داستان الم موت اس کا تقدیر تھی اور وہ موت سے بھاگ رہی تھی۔
- پاتال
(دو جلدیں) مشاق احمد قریشی
350 روپے ISBN-969-8429-24-7
- ایک جنونی سائنسدان کی انوکھی کہانی۔ وہ انسانی ذہن کی پاتال کے راز بے نقاب کرنے چلا تھا۔

| | | |
|----------|---------------------|---|
| 100 روپے | ابن حسن عثمان آبادی | چیل کوٹھی |
| | | چیل کوٹھی پر صدیوں سے مسلط بدعاجونوں کا گتھی تھی۔ |
| 700 روپے | ISBN-969-517-161-3 | داستان شہد زورائیں |
| | | یہ کتاب نامور پہلو انوں کے حالات زندگی اور نادر تصاویر سے مزین ہے۔ |
| 100 روپے | ISBN-969-8429-89-1 | سحر زادہ |
| | | ایک مرد کامل اور آجی طاقتوں کا خوفناک نگرار۔ |
| 100 روپے | ISBN-969-517-055-2 | راکھ |
| | | انسانی عقل سے ماورائیک اعصاب شکن اور خوفناک داستان۔ |
| 125 روپے | ISBN-969-517-058-7 | ساحر جیل سید |
| | | ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔ نئی اور ہدی کا نگرار۔ |
| 125 روپے | ISBN-969-517-070-6 | وارث |
| | | ایڈوکیٹ سے بھرپور اپنے معاشرے کے گرد گھومتی ہوئی داستان۔ |
| 150 روپے | ISBN-969-517-079-0 | دہشت گرد |
| | | ملک میں دہشت گردی کرنے والے مجرموں کی کہانی۔ |
| 100 روپے | ISBN-969-517-098-6 | شاطر |
| | | جرم و سرافرازی پر مبنی سنسنی خیز ناول۔ |
| 150 روپے | ISBN-969-517-160-5 | موساد |
| | | ایک خطرناک منصوبے کی کہانی جو یہودیوں کی تباہی و بربادی کا نگرار۔ |
| 150 روپے | ISBN-969-517-184-2 | پیادہ |
| | | ایک پیادہ کا قصہ جو شاہ کو مات دینے چلا تھا۔ |
| 250 روپے | ISBN-969-8429-40-9 | شعلہ حریت |
| | | اپنے لبو سے آزادی کے چراغ جلانے والے جیالوں کی کہانی۔ |
| 250 روپے | ISBN-969-8429-38-7 | چرخ |
| | | آزادی کے لئے کٹ مرنے والوں کی روگئے کھڑے کرنے والی کہانی۔ |
| 120 روپے | ISBN-969-517-095-1 | ایرے غیرے |
| | | ظہور مزاح پر مبنی قہقہہ بارشاہکار۔ |
| 250 روپے | ISBN-969-517-195-1 | بابل و نینوا |
| | | بابل کے قید خانے سے اٹھنے والے ایک گولے کی داستان۔ |
| 150 روپے | ISBN-969-517-156-7 | بدروحوں کے پجاری |
| | | ایک قلعہ گر کی داستان جب بڑے بڑے عامل اس سے گھبراتے تھے۔ |
| 120 روپے | ISBN-969-517-142-7 | روح کی پیاس |
| | | محمد علی قادری |

ایک نوجوان کی زندگی میں پیش آنے والے دہشت ناک واقعات۔

100 روپے ISBN-969-517-145-1 اے ایچ گیلانی ہفت طلسم

طلسم در طلسم ابھی ہوئی داستان جو آپ کو پکرا کر رکھ دے گی۔

180 روپے ISBN-969-517-218-6 محمد فیاض مانی گیلے پتھر

اس پتھری کہانی جو عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں روتا رہتا تھا۔

200 روپے ISBN-969-517-260-5 محمد فیاض مانی کانچ کا مسیحا

محبت جیسے کول اور فطری جذبے کی کہانی

250 روپے ISBN-978-969-517-290-2 محمد فیاض مانی عین شین قاف

125 روپے ISBN-969-517-216-4 ناصر اکرم دریدہ بدن

طلسم در طلسم ابھی ہوئی داستان جو آپ کو پکرا کر رکھ دے گی۔

250 روپے ISBN-969-517-162-1 شاہد نذیر چوہدری رستم زماں

شیر این شیر منظور حسین بھلو کی داستان شہزوری۔ نادر تصاویر سے آراستہ۔

150 روپے ISBN-969-517-203-2 ڈاکٹر عبدالرب بھٹی بے پتوار

معاشرے کے فرسودہ رسم و رواج کی الم ناک کہانی۔

180 روپے ISBN-969-517-213-X ڈاکٹر عبدالرب بھٹی برگ خزاں

ایک کاروان دشت کے بے منزل ہونے کی داستان۔

180 روپے ISBN-969-517-246-6 ڈاکٹر عبدالرب بھٹی زنجیر

125 روپے ISBN 978-969-517-248-3 ڈاکٹر عبدالرب بھٹی بدروح

ایک ایسی بدروح کی روگئے کھڑے کروینے والی داستان۔

150 روپے ISBN 978-969-517-272-8 ڈاکٹر عبدالرب بھٹی دراڑ

150 روپے پرویز بگرا می فرار

180 روپے ISBN-969-517-215-6 پرویز بگرا می غازی

ایک غازی کی کہانی جس نے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے۔

100 روپے ISBN-969-517-212-1 پرویز بگرا می تاریک کھنڈر

سحر و اسرار کے پردوں میں پوشیدہ اسرار اور خوفناک داستان۔

250 روپے ISBN 978-969-517-290-0 پرویز بگرا می دوسرا جنم

پراسراریت، سائنس، تھرل اور ایکشن سے بھرپور کہانی۔

150 روپے ISBN-969-517-211-3 شمیم نوید پیکار

پراسرار عملیات اور وظائف کرنے والے ایک نوجوان کی حیرت انگیز سرگزشت۔

250 روپے شمیم نوید زنجیر

اولوالعزم کفن بدروش و جوان کی سرگذشت

سر باز شمیم نوید ISBN-969-517-193-1 100 روپے

ایک بہادر پٹھان و جوان کا قصہ جس سے انگریز بھی ڈرتے تھے۔

ادھورا طارق علی شہزاد 180 روپے

ایک بد نصیب کی اپنی ماں کے آٹھل سے چھڑ کر پھرا بننے کی ارزہ خیرداستان

عشق زیر عشق زبر سرور شاؤ 100 روپے

محبت جیسے امول جذبہ کی کہانی

لبیک زیر طبع ممتاز مفتی ISBN-969-517-188-5 100 روپے

ایک الونکھا سفر نامہ ج جو آپ کی روحانیت بیدار کر دے گا

کھانا پکانے اور کچن گائیڈ پر بہترین کتابیں

ڈالڈا کے مزیدار کھانے (کڑتھویریں) انیلا خالد ISBN 978-969-517-263-6 150 روپے

ڈالڈا کے 300 ذائقے مع بیڑائی ترکیبیں شازیہ سلطانہ ISBN-969-517-149-4 150 روپے

خوش ذائقہ پکوان (کڑتھویریں) عذرا سعید بھٹی ISBN-969-517-164-8 120 روپے

لذیذ کھانا پکانا (کڑتھویریں) عطرت بھٹی ISBN-969-517-16-6 120 روپے

چٹ پٹے ذائقے (کڑتھویریں) غبرین ISBN-969-517-206-7 120 روپے

کھانوں کے لذیذ ذائقے (کڑتھویریں) غبرین ISBN-969-517-166-4 120 روپے

ڈالڈا کے ذائقے (کڑتھویریں) یاسمین ہاشمی ISBN 978-969-517-264-3 300 روپے

ڈالڈا کے پکوان (کڑتھویریں) یاسمین ہاشمی ISBN 978-969-517-265-0 300 روپے

اسلامی کتب

ہمہ قرآن در شان محمد صلی اللہ علیہ وسلم پروفیسر خالد پرویز ISBN-969-517-192-3 150 روپے

ائمہ حدیث پروفیسر خالد پرویز ISBN-969-517-194-X 100 روپے

اللہ والے پروفیسر خالد پرویز ISBN 978-969-517-283-4 250 روپے

اولیاء اللہ پروفیسر خالد پرویز ISBN 978-969-517-285-8 250 روپے

تعبیر الروایا ابن سیرین ISBN-969-517-208-3 300 روپے

رومانی ناول

پکار مینا ناز 80 روپے

انتقام مینا ناز 80 روپے

آپ کی قسم مینا ناز 80 روپے

| | | |
|---------|----------|------------|
| 80 روپے | مینا ناز | میرے حضور |
| 60 روپے | مینا ناز | شوق آوارگی |
| 60 روپے | مینا ناز | مہر و |

سعادت حسن منٹو

| | | |
|----------|--------------------|----------------------|
| 125 روپے | ISBN 969-517-243-1 | منٹو کے افسانے |
| 75 روپے | ISBN 969-517-235-0 | ٹھنڈا گوشت |
| 75 روپے | ISBN 969-517-240-7 | خالی بوتلیں خالی ڈبے |
| 60 روپے | ISBN 969-517-236-9 | کالی شلوار |
| 50 روپے | ISBN 969-517-238-5 | شکاری عورتیں |

پراسرار ڈاؤنی کتب

| | | |
|----------|--------------|-----------------------|
| 450 روپے | ایم اے راحت | فرعون (دو جلدیں) |
| 400 روپے | ایم اے راحت | معصوم چڑیل (دو جلدیں) |
| 400 روپے | ایم اے راحت | کالی قبر (دو جلدیں) |
| 300 روپے | ایم اے راحت | دیوالی |
| 300 روپے | ایم اے راحت | بچھو |
| 200 روپے | ایم اے راحت | اکال ساگر |
| 200 روپے | ایم اے راحت | کالے چراغ |
| 200 روپے | ایم اے راحت | جن زادی |
| 200 روپے | ایم اے راحت | آسیب |
| 180 روپے | ایم اے راحت | روپ کنڈ کی روپا |
| 100 روپے | ایم اے راحت | ناگ دیوتا |
| 125 روپے | ایم اے راحت | مقدس حجر |
| 125 روپے | ایم اے راحت | دہشت کدہ |
| 90 روپے | ایم اے راحت | مقدس نشان |
| 90 روپے | ایم اے راحت | مقدس عہد |
| 90 روپے | ایم اے راحت | سنہری چونک |
| 60 روپے | ایم اے راحت | خون آشام |
| 420 روپے | سنجیدہ خاتون | جن زاد (7 حصے) |

| | | | |
|----------|--------------------|---------|------------------|
| 420 روپے | شیم نوید | (7 حصے) | دید بان |
| 150 روپے | شیم نوید | | پیکار |
| 250 روپے | انوار علیگی | | ہزار داستان |
| 200 روپے | ایم الیاس | | کالا منتر |
| 200 روپے | عبدالستار آکاش | | صدیوں بعد |
| 150 روپے | اسلم راہی | | بدروحوں کے پجاری |
| 125 روپے | ساحر جمیل سید | | راکشش |
| 120 روپے | محمد علی قادری | | روح کی پیاس |
| 100 روپے | اے ایچ گیلانی | | ہفت طلسم |
| 100 روپے | وجیہہ ححر | | راکھ |
| 100 روپے | وجیہہ ححر | | سحر زادہ |
| 125 روپے | ڈاکٹر عبدالرب بھٹی | | بدروح |

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے پائرسز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ

ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

.....! مکر می جناب!

السلام علیکم مزاج شریف!

○ آپ کی خدمت میں ہماری نئی فہرست مطبوعات پیش کی جا رہی ہے۔

○ امید ہے کہ آپ حسب سابق اپنے قیمتی آرڈر سے مطلع فرمائیں گے۔

○ تاجران کتب اور ایجنٹ حضرات کو معقول کمیشن دیا جاتا ہے۔

○ آرڈر بھیجتے وقت اپنا نام اور پتہ صاف اور خوش خط تحریر فرمائیں۔

○ اگر مطلوبہ کتب کی تعداد زیادہ ہو تو قریبی ریلوے اسٹیشن یا گڈز کمپنی کا نام صاف اور خوش

خط تحریر فرمائیں۔

○ اگر بل کے متعلق کسی قسم کی شکایت ہو تو براہ کرم پیکٹ یا بلٹی واپس نہ کریں بلکہ

وصول کر لیں اور بعد میں بل نمبر کا حوالہ دے کر اطلاع کر دیں، تلافی کر دی

جائے گی۔

○ کتاب پر طبع شدہ قیمت ہی صحیح تصور ہوگی۔

محترم!

آپ واقف ہی ہیں کہ کتاب کی اشاعت کے لیے مطلوبہ اشیاء (کاغذ، کمپوزنگ،

چھپائی وغیرہ) کی قیمتوں میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ ڈاک خرچ میں بھی کئی گنا

اضافہ ہوا ہے۔ اس کے باوجود ہماری یہی کوشش رہی ہے کہ ہم اپنی مطبوعات کی کم سے کم

قیمت مقرر کریں۔ امید ہے آپ حسب معمول ادارہ کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔ شکریہ۔

نیاز مند

عبدالغفار

علی میاں پبلی کیشنز

20- عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 7247414